قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 25 ❖ شمارہ 06 ❖ جون 2015ء

ماہنامہ کراچی

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

شعبہ اشتہارات

نیجر اشتہارات	محمد شہزاد خان	0333-2256789
نمائندہ کراچی	محمد رمضان خان	0333-2168391
	راجا محمد حمید	0323-2895528
نمائندہ لاہور	افراز علی بخش	0300-4214400

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 800 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قارئین کرام!
السلام علیکم!

جب ہم اپنے اطراف پر نظر ڈالتے ہیں تو اپنی پست قامتی دہلانے لگتی ہے۔ جاپان جس کے دو شہروں کو ہماری آزادی سے صرف چند سال پہلے ایٹم بم سے تباہ کیا گیا پھر اس کے گھٹنے ٹیکنے کے بعد اسے بری طرح لوٹا گیا، یہی حال جرمنی کا ہوا۔ لیکن یہ دونوں تباہ حال ملک اب اتنے مستحکم ہیں کہ دنیا حیران ہے۔ چین جو ہماری آزادی کے بعد آزاد ہوا یعنی ایسا ملک جس کی ایک تہائی سے زائد آبادی افیون پی کر نشے میں چور رہنے والی تھی مگر آج اس کی اقتصادی قوت سے تمام ترقی یافتہ ممالک خوف زدہ ہیں۔ ملائیشیا اور سنگاپور وغیرہ کا ذکر تو چھوڑیں اب اپنے آپ پر نظر ڈالتے ہیں، ہم نے 1947ء میں آزادی حاصل کی اور اقتصادی طور پر کتنے مضبوط ہیں اس کا ادراک سب کو ہے۔ آخر میں خلیل رامپوری کا ایک شعر عرض ہے۔

مٹی بھی کیمیا ہے اگر کام لیجیے
اندھے بھی اس جہان کے اہلِ نگاہ ہیں

معراج رسول

شکارِ طبیب

سرگزشت

4 فروری 1936ء کو کراچی میں پیدا ہونے والے بچے کے بارے میں شاید ہی کسی کو اندازہ ہو کہ وہ ایک دن عالمی شہرت کی بلندیوں کو چھولے گا۔ یوں بھی وہ ایک انتہائی غریب گھرانے کا فرد تھا۔ اس کے والد کراچی جیم خانہ میں معمولی ملازم تھے۔ رہائش بھی جیم خانہ کے احاطے میں..... ایک خستہ حال مکان میں تھی جو کبھی کسی ضرورت کے تحت تعمیر کیا گیا تھا۔ مگر متروک ہو جانے کی وجہ سے اب ان کے کام آرہا تھا۔ وہ دور انگریزوں کا تھا اس دور میں جیم خانہ خالص یورپین کلب تھا اور اس میں دیسی افراد کا داخلہ ممنوع تھا۔ وہ اسی احاطے میں رہتا تھا اس لیے انگریز جب کرکٹ کھیلتے تو وہ ایک جانب بیٹھا چھپ چھپ کر انہیں دیکھا کرتا اور کرکٹ کے رموز ذہن نشین کرتا رہتا پھر جب یورپین بچے کرکٹ کھیلنے میدان میں آتے تو وہ ان کی منت سماجت کر کے ان کے ساتھ شامل ہو جاتا۔ اسے وہ لوگ بیٹنگ کا موقع کم کم دیتے مگر فیلڈنگ خوب کراتے۔ اسی وجہ سے وہ فیلڈنگ میں چست درست بنتا جارہا تھا۔ جب اسے سینٹ پیٹرک اسکول میں داخل کیا گیا تو اس نے وہاں کرکٹ کھیلنے والوں کی خوب حوصلہ افزائی ہوتے دیکھی۔ انگریز برصغیر کے کھیلوں کی جگہ ولایتی کھیل رائج کرنا چاہتے تھے۔ کشتی، کبڈی، تیراکی، تیراندازی وغیرہ وغیرہ کی جگہ فٹ بال اور کرکٹ کی خوب حوصلہ افزائی کی جاتی۔ یہ اسکول بھی عیسائی مشنری کا تھا اور اس کے اساتذہ سے انتظامیہ تک بھی انگریز تھے اسی لیے وہ خود بھی چاہتے تھے کہ کرکٹ کا بول بالا ہو۔ انہیں جب پتا چلا کہ یہ بچہ نہ صرف پڑھائی میں تیز ہے بلکہ بہت اچھی کرکٹ بھی کھیلتا ہے تو اس کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس دوران میں پاکستان کا قیام عمل میں آگیا اور اس کی اہمیت مزید بڑھ گئی۔ 1949ء سے وہ سندھ کا سب سے بڑا مقابلہ روبی شیلڈ کھیلنے لگا۔ 1951ء میں سینٹ پیٹرک اور سندھ مدرسہ کے درمیان KMC گراؤنڈ میں روبی شیلڈ کا فائنل مقابلہ ہوا۔ سندھ مدرسہ کی جانب سے حنیف محمد، محمد مناف اور اکرم جیسے کھلاڑی تھے جنہوں نے بعد میں بہت نام کمایا۔ اس مقابلے میں ان کے مقابلے میں اس نے پانچ کھلاڑیوں کو آؤٹ بھی کیا اور انفرادی طور پر سنچری بھی بنائی۔ اب وہ شہرت حاصل کرنے لگا تھا۔ 1955ء میں انڈیا کی ٹیم پاکستان آئی تو حیدرآباد سندھ کی جانب سے اس نے ایک نمائشی میچ کھیلا پھر اسے لاہور ٹیسٹ میں پاکستانی ٹیم میں کرلیا گیا لیکن اسے ریزرو میں رکھا گیا۔ 1956ء میں جب نیوزی لینڈ کی ٹیم پاکستان آئی تو اسے بھی پاکستانی ٹیم میں شامل کرلیا گیا۔ اس بار ٹیم کی قیادت عبدالحفیظ کاردار کر رہے تھے۔ 58-1957ء میں اسے پاکستان کے واحد غیر مسلم کھلاڑی کے اعزاز کے ساتھ ویسٹ انڈیز کے دورہ پر بھیجا گیا۔ 1959ء میں ویسٹ انڈیز کی ٹیم پاکستان آئی تو اسے بھی پاکستانی ٹیم کی طرف سے جوہر دکھانے کے لیے منتخب کیا گیا۔ ڈھاکا میں دوسرے ٹیسٹ میں 65 رنز پر اس نے 5 کھلاڑیوں کو آؤٹ کر دیا۔ اس میچ میں اس نے شجاع کے اشتراک سے سنچری بنائی۔ اب وہ آل راؤنڈر بن چکا تھا۔ باؤلنگ اور بیٹنگ میں یکساں جوہر دکھاتا۔ 1960ء میں اسے پاکستانی ٹیم کے ساتھ انڈیا کے دورے پر بھیجا گیا جہاں اس نے کانپور، بمبئی، کلکتہ، مدراس اور دہلی میں اپنے جوہر دکھائے۔ اب وہ پاکستانی ٹیم کا عالمی شہرت یافتہ کھلاڑی بن چکا تھا کہ ایک اندوہناک سانحہ پیش آگیا۔ دوران میچ بال آکر اس کی ایک انگلی پر لگی اور انگلی ٹوٹ گئی۔ اسے فوراً جناح اسپتال پہنچایا گیا جہاں طبی امداد دی گئی لیکن ڈاکٹروں کی غفلت کی وجہ سے نقص بڑھتا چلا گیا اور اسے ٹیسٹ کرکٹ سے ریٹائر ہونا پڑا۔ اس وقت اس کی عمر صرف 27 سال تھی۔ ایک بڑے کرکٹ اسٹار کا مستقبل ڈاکٹروں کی غفلت کے سبب اندھیرے میں آگیا۔ مجبوراً اسے بینک میں نوکری کرنا پڑ گئی۔ اس کرکٹ اسٹار کا نام والس متھائس تھا۔

☆ اعجاز حسین سٹھار کا بھرپور تبصرہ نور پور تھل سے۔ ''پرچے میں کافی نیا پن نظر آرہا ہے۔ ادارے نے کئی نئے موضوعات پر کام شروع کیا ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے جمود ٹوٹ رہا ہے۔ ''سالگرہ کے دن''، ''کھیل'' اور ''سدا بہار'' اس سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ''تین کھلاڑی'' پڑھ کر جہاں معلومات میں اضافہ ہوا ہے وہاں پاکستانی کھلاڑیوں کی اپنے ملک اور ٹیم کے لیے کارکردگی اور مختلف مواقع پر کارہائے نمایاں سرانجام دینے پر سر فخر سے بلند ہوگیا۔ ''سراب'' میں ہیجان، تجسس، تسلسل اور داستان گوئی کے پورے لوازمات اور لذت ہے۔ واقعات کے ساتھ دل کی دھڑکن گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ موجودہ قسط مکمل مہم جوئی پر مشتمل ہے۔ اب شارٹ کٹ کرتے ہوئے سچ بیانیوں کی طرف آتے ہیں۔ ''آواز دوست نئے انداز اور موضوع کی کہانی ہے۔ قوت سماعت اور بصارت سے محروم افراد کے بھی اپنے خیالات، جذبات اور احساسات ہوتے ہیں وہ اظہار نہیں کرتے لیکن ان کی خواہشات اور انا کو بھی ٹھیس پہنچتی ہے۔ کسی کے تصور میں ان کا دل بھی دھڑکتا ہے۔ ذہن میں گھر محبوب اور بچوں کے مستقبل کے منصوبے ہوتے ہیں اب یہ ذمے داری ہماری ہے کہ ان کے جذبات اور ضروریات کا خیال رکھیں یوں ہم ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرتے ہوئے بااحسن طریقے سے کام میں لاسکتے ہیں آخر میں دعا ہے کہ اللہ سب کو نازگل جیسا مثبت کردار رکھنے والی اولاد دے۔ آمین۔ ''سیدھا راستہ'' میں بات جلد بازی کی نہیں ہے بلکہ یہ ملاپ قسمت میں نہ تھا ورنہ کئی راستے نکل آتے جب مقدر خراب ہو تو ایسے ہی شاک لگتے ہیں۔ ''حقیقت'' میں زبیر سے ذرا سی چوک ہوگئی گو نوشین مثالی لڑکی تھی ہر اونچ نیچ میں ساتھ دینے والی لیکن دل نہ چھوڑیں، خلوص نیت سے تلاش جاری رکھیں کوئی دوسری ٹکرا ہی جائے گی۔ ''بہروپ'' میں انجم فیروز جھوٹ بول کر خوانخواہ اپنی عاقبت خراب کرتے رہے۔ منفرد موضوع لیے مسکراہٹ لانے والی کہانی تھی۔ ''کوما'' کے جسیم الدین کے خیالات بدل گئے ہیں لیکن جو مسائل معمولی اور جائز کاموں کے لیے خوار ہوتے رہے یہ ازالہ کیونکر ہوسکے گا۔ ''جوکر انکل'' دل بہلانے کے لیے پڑھنا شروع کی لیکن سچی بات ہے اس نے اُلٹا دکھی کردیا ہے۔ بڑوں سے بڑھ کر بچوں کی محرومیاں اور دکھ زندگی کے راستے بدل دیتے ہیں۔ چند دن پہلے ٹی وی پر ایک جوکر کے حالات دکھائے جارہے تھے میری یادداشت کے مطابق وہ فیصل آباد کا رہائشی تھا وہ شیشہ کھا کر روزی پیدا کررہا تھا اور کئی بار موت کے قریب چلا گیا تھا۔ ایسے لوگ قابلِ ستائش ہیں جو اذیت برداشت کرکے دوسروں کو خوشیاں دیتے ہیں ایسی بے غرض مسکراہٹیں تقسیم کرنے والوں کی عظمت کو سلام کیجیے۔ شہر خیال کے تمام ساتھیوں کا شکریہ کہ وہ یاد کرنے کے ساتھ تبصرہ کو بھی شامل کرتے ہیں۔ اللہ شاہد جہانگیر کو صحت کاملہ عطا کرے، آمین۔ تاکہ اس محفل کی رونق میں اضافہ ہو۔ سلور جوبلی کی اشاعت خوش آئند ہے ساتھ مستقل کہانی نگاروں جیسے ڈاکٹر ساجد امجد، کاشف زبیر، منظر امام، انور فرہاد، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی اور طاہر جاوید مغل کا تعارف اور فنی زندگی کے سفر پر روشنی ڈال دی جائے تو یہ سونے پر سہاگہ والی بات ہوگی۔''

☆ نجمی رحمان نے برٹ لٹ (یو ایس اے) سے لکھا۔ ''ہم وطن سے دور لوگوں کی طرف سے آپ سب کو سلام پہنچے۔ یہاں بہت دیر سے رسائل ملتے ہیں۔ پڑھنے میں بھی وقت لگتا ہے آپ تک خط دیر سے پہنچے گا۔ ضائع مت کیجیے۔ کیا شاندار کلیکشن ہے ایک سے ایک پُراثر سچی کہانیاں، معلوماتی مضامین 98 سے جو ایک شمارہ ہاتھ لگا تو آج تک الگ نہ ہوا۔ سب سے پہلے آفاقی صاحب کی تحریر دیکھ کر تسلی ہوجاتی تھی کہ فلمی الف لیلہ موجود ہے آرام سے پڑھیں گے۔ ان کا سب سے بڑا ہنر یہ تھا کہ وہ قاری کو ہمراہ لے کر چلتے تھے، سادہ سا انداز اپنی کہانی بھی سناتے۔ پاکستان کے حالات پر بھی اظہار خیال کرتے۔ میں تو انہیں خط لکھنے کا سوچتی ہی رہی داد و تحسین کے لیے مگر

وہ آناً فاناً ہی چلے گئے۔ آپ نے پوری تفصیل نہیں لکھی آفاقی صاحب پر تو خاص نمبر شائع ہونا چاہیے تھا۔ 19 ویں اور 20 ویں صدی میں جو دانشور، شاعر، ادیب، فلم ساز قوموں کی تقدیر بدلنے والے گئے ان کا ثانی نہ دوبارہ پیدا ہوا نہ آئندہ کوئی امکان ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد، کاشف زبیر، انور فرہاد، شکیل صدیقی، طاہر جاوید مغل، ضیا تسنیم بلگرامی، محی الدین نواب، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی۔ کس کس کا ذکر کریں۔ سبھی ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ آپ نے جو اردو کی شمع روشن کر رکھی ہے قابلِ فخر ہے خاص کر ہم وطن سے دور لوگوں کے لیے۔ نسرین اعجاز کا کتاب گھر ہم سب کے لیے، بہت دلچسپی کی جگہ ہے اب تو ہر علاقے کی لائبریری میں ایک اردو کتابوں کا گوشہ بھی ضرور ہوتا ہے (برٹ لٹ میں کاشف عباس جیسا کہنہ مشق شاعر بھی ہے سلام کہہ دیں گی) اللہ تعالیٰ آپ سب سچے پاکستانیوں کو سلامت رکھے اور دعا ہے پاکستان کو اچھی قیادت ملے۔ میرے قائداعظم کا ثانی تو شاید اب نہ پیدا ہوگا۔''

☆ سلمٰی غزل کی آمد کراچی سے۔'' آپ نے حوصلہ افزائی کی تو سوچا آپ کو ڈائریکٹ بھیج دوں۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ 3 مئی کو اپنے دونوں بیٹوں کے پاس امریکا جا رہی ہوں بمشکل وقت نکال کر اس روداد کو مکمل کیا ہے، اُمید ہے آپ کے معیار پر پورا اترے گا اب وہاں بیٹھ کر لکھوں گی۔''

☆ سدرہ بانو ناگوری کا خط کراچی سے۔'' اداریہ پڑھ کر دل سے بے اختیار آہ نکلی۔ انکل جی آپ نے بجا فرمایا، جس جگہ نظر ڈالو سب ہی لوٹنے کو تیار بیٹھے ہیں۔ عوام کو بے وقوف بنانے کے ایسے ایسے طریقے اپنائے جاتے ہیں کہ سوچ کر ہی روح لرزنے لگتی ہے۔ اب ماہ رمضان قریب ہے، اس لوٹ کھسوٹ میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ بارشوں کے عذابوں میں گھرا شہر پشاور اور نیپال کے شدید زلزلے میں لاشوں کے ڈھیر دیکھ کر بھی ہم سنبھلنے کو تیار نہیں پھر شکوہ بھی کریں تو کس سے کریں کیونکہ خدا بھی اس قوم کی حالت نہیں بدلتا نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا۔ شہر خیال کا رخ کیا جہاں مسند صدارت پر بیٹھے اویس شیخ اپنے اظہاریے میں پاک فوج کا ذکر کرتے نظر آئے۔ دعا ہے کہ خدا پاک دھرتی ماں کے عظیم سپوتوں کو اپنی امان میں رکھے، آمین۔ اعجاز حسین سٹھار، جانے والوں کو روکا نہیں جا سکتا، وہ ہمیں یہ سبق سکھا کر جاتے ہیں کہ کائنات کی ہر شے فانی ہے لیکن آفاقی انکل یادوں کی صورت ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ منشی عزیز مئے آپ کے خط میں بڑے بھائیوں جیسا مان اچھا لگا۔ عبدالجبار رومی، شہر خیال میں آپ کی آمد اچھی لگی۔ شاہد جہانگیر، آپ کی صحت یابی کا پڑھ کر خوشی ہوئی۔ اگلے ماہ بھرپور تبصرہ کے ساتھ حاضری دیجیے گا۔ رانا محمد شاہد رب تعالیٰ آپ کو صبر دے اور آپ کی والدہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ، آمین۔ آخر میں شہر خیال کے ساتھیوں تبصرے کی پسندیدگی کا اور پُرخلوص محبتوں کا شکریہ۔ ''فلسفی'' میں ڈاکٹر ساجد امجد نے افلاطون کا زندگی نامہ خوب صورت انداز میں تحریر کیا۔ ''غلام حسین میمن'' کی زبانی ''سالگرہ کے دن'' موت کی گود میں سو جانے والوں کے تذکرے نے حیران کیا تو منظر امام کے حیرت انگیز ''کھیلوں'' نے پریشان کیا۔ ویلڈن منظر امام، آپ نہ جانے کہاں سے دلچسپ مشاغل ڈھونڈ کر لاتے ہیں اور چھا جاتے ہیں، منظر میں رنگ بھرنا تو کوئی آپ سے سیکھے۔ ''سدا بہار'' میں انور فرہاد نے فلمی دنیا کے ایک اور چہرے سے متعارف کروایا۔ داد اجی کی خوب صورت یادوں کے ساتھ ''شمشاد بیگم'' کا تذکرہ اچھا لگا۔ شمشاد بیگم کی نوجوانی کا دلکش انداز اور بڑھاپے کی تصاویر دیکھ کر دل دکھ سے بھر گیا کہ ظالم وقت نے کتنے خوب صورت چہرے کو گہن لگا دیا ہے۔ ''آواز دوست'' پہلی سچ بیانی کا The end بہت اچھا ہوا۔ حمیرا کے ساتھ قسمت نے اچھا کھیل کھیلا۔ ''فیصلہ'' میں اسماء صاحبہ نے اپنی بیٹی کو اچھا سبق سکھایا۔ ''جوکر انکل'' نے بے حد متاثر کیا یوں لگا وہ جو نم آنکھوں سے کہہ رہا ہو کہ '' ہے جینے کا مقصد اوروں کے کام آنا''۔ آخری سچ بیانی نے دل کو چھو لیا واقعی خدا اپنے بندوں کو ایسی ایسی جگہوں سے نوازتا ہے کہ جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا فقط اس صورت کہ خدا کو سچے دل سے پکارا جائے اور اس معقولے پر عمل کیا جائے کہ '' کر بھلا تو ہو بھلا''۔

☆ محمد سلیم قیصر نے سینٹرل جیل ملتان سے لکھا ہے۔'' اللہ تعالیٰ سے اس اُمید کے ساتھ کہ آپ سب خیریت و عافیت سے ہوں گے حاضر ہوں۔ ماہ اپریل کا آغاز ہو چکا۔ نظریں نئے سرگزشت کی متلاشی، انتظار نہ جانے کب ختم ہوگا۔ باہر سے منگوانے کی اجازت نہیں، جیل انتظامیہ اپنے طریقہ کار کے تحت سپلائی کرتی ہے۔ بہت بے بس ہوں خیر۔ ماہ مارچ میں حسب معمول سب پرفیکٹ تھا۔ سرگزشت سے وابستہ ہو کر بہت Comfortable محسوس کرتا ہوں۔ اللہ سلامت رکھے، قابلِ احترام بہن ڈاکٹر قراۃ العین کو، مجھے قانونی ماہر کی تجویز دے ڈالی ممکن ہے آپ نے اپنی طرف سے درست کہا ہو لیکن اگر مجھے کسی قانونی ماہر کی ضرورت ہوتی تو یقیناً میں آپ سے التجا نہ کرتا۔ آپ سب جانتے ہیں پھر ایک انسان کو تھانہ، وکیل اور جیل کے جس اذیت ناک پروسس سے گزرنا پڑتا ہے وہ میں آنے والے وقتوں میں سرگزشت کی وساطت سے سب کے گوش گزار کروں گا بشرطیکہ زندگی نے وفا کی۔ گل باجی آپ کتنی اچھی ہیں۔ آپ

کی تفصیلی تحریریں آپ کے پُرخلوص جذبوں کی عکاسی ہوتی ہے۔ میری بہن بشریٰ افضل کس قدر ذمے داری کا ثبوت دیتی ہیں اس کا اندازہ ان کی باقاعدہ حاضری سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ محترمہ عظمیٰ شکور کہیں اور متوجہ ہیں پلیز واپس آئیں۔ منشی عزیز مئے لندن سے خانیوال کی مسافت کچھ زیادہ تو نہیں ہے۔ سرگزشت کے لیے لکھنے اور ہمیشہ لکھنے پر آپ کا مشکور ہوں اچھی لگتی ہے آپ کی باتیں۔ میرا نام اتنا مشکل تو نہیں جو آپ کو یاد بھی نہیں رہتا۔ اللہ کا شکر بجالاتے ہیں بہت تسکین محسوس کرتا ہوں جب کراچی میں بیٹھی میری پیاری بہن سدرہ بانو ناگوری، جناب عمران جونانی، جناب احمد خان توحیدی مجھے دعاؤں کے ہمراہ یاد رکھتے ہیں آپ کے لیے بھی بندہ عاجز دست دراز دعا رہتا ہے علاوہ ازیں رانا سجاد صاحب، جناب قیصر خان، جناب سید انوار عباس شاہ بہت دعائیں آپ کے لیے۔ ناصرہ احمد نیویارک سے ہمارے ساتھ موجود ہیں اللہ پاک آپ کو سلامت رکھے ہمارے ساتھ رہنا اللہ آپ کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ سرگزشت نے ہمارے دلوں کو ایک دوسرے سے جوڑ رکھا ہے۔

All credit goes to Sarguzasht and the whole team as well آخر میں سب کے لیے دعا گوہوں کہ آپ جہاں کہیں بھی رہیں اللہ آپ کا حامی وناصر ہو۔ آپ سب اپنا اور اپنے چاہنے والوں کا بہت خیال رکھیں۔''

☆ احمد خان توحیدی نے راول پنڈی سے لکھا ہے۔ ''شمارہ مئی کلمہ چوک راول پنڈی سے ملا۔ وجہ گندم کی کٹائی ہے کہ ہم آبائی گاؤں میں ہیں۔ اگر وہ بھی گھر میں پڑے رہ کر سرگزشت پڑھتا تھا تو گھر والوں کی ڈانٹ پڑھنا ہی تھی کہ کراچی سے نہ آتے، مجبوری یہ ہے کہ پرچہ مل جانے کے بعد پہلا کام یہی ہوتا ہے۔ برادر معراج رسول صاحب دوسرے ممالک میں سیاست جمہوریت مسائل حل کا نام ہے مگر یہاں سیاست لوٹ مار، غریب عوام کو تنگ کرنے کا بہانہ ہے۔ دیکھ لیں کالا باغ ڈیم نہ بننے سے ہمارا کیا حال ہے۔ اب چین اور پاکستان میں ہونے والے معاہدے پر دشمنان ملک وملت روڑے اٹکانے پر کمربستہ ہیں۔ استاد اردو، عندلیب شادانی کی سوانح جامع تفصیل سے پڑھی تھی شکریہ۔ اب تک شائع شدہ تمام یک صفحی کو کتابی شکل دے دیں۔ اب شہر خیال میں آمد ہے کہ اولیس شیخ کرسی صدارت پر جلوہ افروز ہیں مبارک باد۔ بھائی شاہد جہانگیر، کراچی سے باہر ہونے اور بوجہ مصروفیت سابقہ محفل میں شرکت نہ کرسکا۔ اللہ آپ کو صحت کاملہ دیں، آمین۔ بھائی انور عباس، معراج رسول اور ایدھی جیسے لوگوں کی موجودگی کے باعث زندگی کی سانسیں چل رہی ہیں ورنہ لیڈران نے زندہ درگور کرنے میں کسر نہ چھوڑا۔ تبصرہ اچھا ہے۔ برادر اعجاز ستھار، آفاقی جیسے عظیم رائٹر کی جگہ پُر کرنا ناممکن ہے سدا بہار جیسی کہانیوں میں مجھے وہ چاشنی نہیں نظر آئی۔ جناب منشی عزیز مئے، بہاولنگر جاتے ہوئے کھڑکی سے سرنکال کر لندن سے گزرتے ہوئے آپ کو بلند آواز میں سلام کیا تھا، آپ کا تبصرہ اچھا تھا۔ معراج رسول کے زیرسایہ سرگزشت جیسا کوئی اور شمارہ نہیں ہے۔ برادر حبیب الرحمن اگر آپ نے چھوٹے بڑے پلانٹ بنادیے تو راشی بھوکے مرجائیں گے۔ بنادیں نا غریب عوام کے لیے سستی بجلی دعائیں لیں گے۔ بھائی رانا شاہد میں روزانہ تلاوت کرتا ہوں اللہ مرحوم کو جنت الفردوس اور پسماندگان کو صبر جمیل فرمائیں۔ طویل کہانیاں ڈاکٹر ساجد امجد کی عظیم قلفی، لاجواب اسٹوری تھی۔ سالگرہ کے دن برصغیر کے رہنماؤں کے سیاسی ونجی حالات بچوں کی معلومات میں اضافہ، ویری گڈ جاری رکھیں۔ منظر امام کا کھیل اچھی تحریر بمعہ تصاویر تھی شکریہ۔ ماہ مئی سلیم الحق فاروقی، شیر میسور ودیگر عظیم رہنماؤں پر اچھی تحریر۔ کمال احمد رضوی اور ننھا مرحوم الف نون وڈیو میرے پاس اب بھی ہیں اس مزاحیہ پروگرام کو کسی چینل کو دوبارہ شروع کرنا چاہیے۔''

☆ فقیر غلام حسین ضیا کی بھکر سے آمد۔ ''ہر مضمون بے مثل اور محنت سے تحریر کیا گیا ہے۔ فلسفی اور تصوف جیسے مضامین عظیم رائٹرز کی تحقیق ہے۔ آواز دوست ایک بھولی بھالی بچی کی سچ بیانی ہے۔ محبت بھی عجیب چیز ہے اس کا احساس، انداز، خلوص، معصومیت اور وہ پیار بھرے الفاظ جو اچانک زبان پر آجاتے ہیں دو انسانوں کو ایک دوسرے کے اتنا قریب کردیتے ہیں کہ ادب اور احترام ہر حال میں قائم رہتا ہے۔ آپ بیتی کا انداز تحریر اتنا پیارا ہے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے نازگل صاحبہ ہمیں بچپن کی معصومانہ باتیں خود سنا رہی ہے، جزاک اللہ۔ شہر خیال کے قلمی دوستوں کے لیے خصوصی دعائیں۔''

☆ محمد احمد رضا انصاری نے کوٹ ادو سے لکھا۔ ''کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے اتنے خطوط لکھے مگر ایک بھی شائع نہیں ہوا مگر میں نے دو ہی خط لکھے اور دونوں شائع ہوگئے۔ کچھ لوگ خط لیٹ بھیجتے ہیں اور کچھ محکمہ ڈاک والوں کی مہربانی سے دیر سے پہنچتے ہیں جس کی وجہ سے شاملِ اشاعت نہیں ہوسکتے۔ مئی کا سرورق اچھا لگا۔ ہر ماہ سرورق بہترین ہی ہوتا ہے۔ ڈھیر سارے اشتہارات سے گزرتے ہوئے سیدھے اداریے میں جارکے۔ مہنگائی بہت ہوتی جارہی ہے۔ آپ نے یہ بالکل ٹھیک کہا ہے کہ موبائل کمپنیاں عوام کو نت نئے

طریقوں سے لوٹ رہی ہیں ساتھ لالچ بھی دیتے ہیں کہ 300 یا 400 کا بیلنس ڈلوانے پر آپ کو یہ ملے گا وہ ملے گا سب فراڈ ہی ہوتا ہے۔ شہرِ خیال میں تمام تبصرے شاندار تھے۔ انکل جی یہ سلور جوبلی کب آرہا ہے اور آپ پُراسرار یت نمبر کب شائع کر رہے ہیں۔ مجھے ابن کبیر کی تحریریں زیادہ اچھی لگتی ہیں۔ ان سے گزارش ہے کہ جلدی سے اپنی تحریر لے کر حاضر ہوں۔ مجھے کارٹون مووِیز دیکھنے کا بہت شوق ہے آپ دنیا کی مشہور کارٹون مووِیز کے بارے میں بھی کوئی مضمون شائع کیجیے (والٹ ڈیزنی پر تحریر لگ چکی ہے) فلسفی، سالگرہ کے دن، صحرائے اعظم، کھیل، ماہ مئی، پُراسرار قتل اور انقلابی بہترین تحریریں تھیں۔ سراب بہت سست جا رہی ہے۔ پہلی سچ بیانی پسند آئی۔ کیا کروں پڑھ کر بہت ہنسی آئی دوسری سچ بیانیاں بھی خوب تھیں۔''

☆ مجید احمد جائی نے ملتان شریف سے لکھا ہے۔ '' ماہ مئی کا سرگزشت یوم مزدور کو دسترس میں آیا۔ سیاسی، سرکاری، نجی ادارے مزدور ڈے کی چھٹی کے مزے لوٹ رہے تھے اور بیچارے مزدوروں کو خبر تک نہیں کہ یوم مئی کیوں منایا جاتا ہے۔ انہیں تو صرف اور صرف خود کو زندہ رکھنے کے لیے جتن کرنے ہیں۔ سرورق دیدہ زیب تھا۔ پہلے سے قدرے بھلا لگا۔ اداریہ پڑھا معراج رسول صاحب موبائل لوٹ مار کی طرف توجہ دلا رہے تھے۔ محترم ایسے بہت سے مسائل ہیں جن سے ہم دوچار ہیں۔ ہم تو بنیادی ضروریاتِ زندگی کے مسائل سے نہیں نکل سکے۔ ملاوٹ، کرپشن، راہ زنی، چوری، دھوکا، فراڈ دو نمبری کام عام ہے۔ اب تو ادویات تک خالص نہیں ملتی۔ ڈاکٹرز، جعل سازوں سے ملے ہوئے ہیں اور مسیحا کے روپ میں موت بانٹ رہے ہیں۔ استاد اردو میں عندلیب شادانی کے بارے میں مکمل جان کاری ملی۔ یہ سرگزشت کا خاصہ رہا ہے۔ کم الفاظ، کم وقت میں بہت سی معلومات فراہم کرتا ہے۔ یوں سمجھیں ادبی درس گاہ ہے جس سے مجھ جیسے ہزاروں لوگ فیض یاب ہو رہے ہیں۔ شہرِ خیال میں اویس شیخ صدارت کی کرسی سنبھالے تھے۔ رانا محمد سجاد، محمد احمد انصاری، سید انور عباس شاہ، قیصر خان، ایم انور، آصفیہ ضیا، اعجاز حسین سنھار، مجید احمد جائی، یعنی بندہ ناچیز، حبیب الرحمٰن، شگفتہ مشتاق، ناصر حسین رند، فیروز علی عاجز، سدرہ بانو ناگوری، بشریٰ افضل، عامر شہزاد، محمد عثمان آفریدی، عبدالجبار رومی، شاہد جہانگیر شاہد، رانا محمد شاہد، ملک عاشق حسین ساجد خلوص نامہ لیے حاضر تھے اور بہترین الفاظوں کا چناؤ لائے تھے۔ سبھی کو مبارکاں۔ شہرِ خیال سے نکل کر سچ بیانی میں گئے سب سے پہلے آواز دوست سرورق کی کہانی پڑھی۔ نازگل نے متاثر نہیں کیا طوالت سے کام لیا گیا اور عمر رسیدہ استاد سے اسٹوڈنٹ کی شادی، سر، سر کہنے والی کیسے عرفان کو شوہر مان کر عرفان جان کہتی ہوگی؟ جو کر انکل میں ڈاکٹر فوزیہ نے کمال کر دیا۔ اس جملے سے ہر موئے تن کھڑے ہو گئے۔ آپ کے بچے کہاں ہیں؟ کہاں ہیں آپ کے بچے؟ نہ جانے کس امر نے مجھے رلا دیا۔ بہت خوب اسٹوری تھی۔ '' کیا کروں'' کامران بٹ نے بہت خوب لکھا۔ خودکشی کا واقعہ میرے علاقے میں بھی ہوا ہے۔ جلدی لکھ بھیجوں گا۔ سید حارث، شیریں بی بی نے کمال لکھا۔ سردار یوسف جیسے کردار بہت کم ملتے ہیں اور خرم نے جلد بازی کا مظاہرہ کر کے اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی۔ ورنہ آرینہ بیوی کے روپ میں اس کے آنگن میں خوش خوش پھرتی ہوتی۔ فیصلہ ارشد علی ارشد نے حیران کر دیا۔ ماں نے جھوٹ بول کر بیٹی کا پیار گنوا دیا۔ '' بہروپ، کوما، کر بھلا'' زبردست سچ بیانیاں تھیں۔ تین کھلاڑی میں مصباح الحق، شاہد خان آفریدی، یونس خان کے بارے میں پڑھا۔ مصباح الحق کے ساتھ قوم نے واقعی ناانصافی برتی ہے۔ ہمارے ہیروز کو زیرو بنانے والے اقتدار کی کرسی کے بھوکے ہیں اور یوں ناانصافیاں کر کے جہنم خرید رہے ہیں۔ سالگرہ کا دن، بہت خوب جس دن پیدا ہوئے اسی دن واپس اللہ تعالیٰ کے ہاں چلے گئے۔ کھیل میں عجیب و غریب کھیلوں کا ذکر کر کے ہم پر احسان کر دیا۔ '' وہم '' کیا خوب تحریر تھی۔ آج کے دور میں کوئی بھی شخص ایسا نہیں جو کسی نہ کسی وہم میں مبتلا نہ ہو۔ پُراسرار قتل، سامری، صحرائے اعظم اچھی تحریریں تھیں۔ سراب ابھی پڑھی نہیں۔ فلسفی زیرِ مطالعہ ہے۔ وقت کی قلت اور شہرِ خیال میں شمولیت ضروری تھی سو بعد میں پڑھوں گا۔ '' کیا برقی شہرِ خیال بھیجنا ممنون ہے۔ '' میں نے ای میل سے شہرِ خیال بھیجا جو شائع نہ ہو سکا۔ (پرنٹ ہم تک دیر میں پہنچا تھا)۔ '' پھولوں والی قبر'' کے نام سے سچ بیانی ای میل کر چکا ہوں سرگزشت پر پوری اترے تو سند دیجیے گا۔ سرگزشت کے لیے ڈھیروں دعائیں اور اللہ تعالیٰ پاکستان کو ہمیشہ قائم و دائم رکھے، آمین۔ شہرِ خیال میں بہت سے دوست غیر حاضر تھے پلیز لوٹ آئیں۔''

☆ اعجاز احمد راحیل، ضلع ساہیوال سے رقم طراز ہیں۔ '' ہماری زندگی کی تلخ و شیریں حالات و واقعات ہی کہانیوں کو جنم دیتے ہیں۔ میری زندگی میں بہت سے ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ عقل دنگ رہ گئی تھی۔ زیرِ نظر سرگزشت میری زندگی کا ایک ناقابلِ فراموش واقعہ ہے جسے میں بہ شکل کہانی ارسال کر رہا ہوں۔ آخر میں جناب ناصر ملک، طاہر جاوید مغل اور ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کا تہہ دل سے مشکور ہوں جن کی وجہ سے مجھ میں لکھنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔'' (بورڈ پڑھ کر کہانی پر فیصلہ دے دے گی)

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی، لاہور سے لکھتے ہیں۔ ”میری اہلیہ روبینہ آفتاب اشرفی 30 اپریل بروز جمعرات اچانک مجھے چھوڑ کر اپنے مالک حقیقی سے جاملیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ کی مشیت کے سامنے میری اور میری بچوں صبح آفتاب اور برھان آفتاب کی یاسیت اور بے بسی رواں آنسوؤں کے ساتھ دعا گو ہے کہ ہمیں صبر عطا فرمائے اور شہر خیال کے تمام دوستوں سے گزارش ہے ان کے لیے مغفرت کے ساتھ درجات کی بلندی کی بھی دعا کریں۔ 23 سالہ ازدواجی زندگی میں میری اہلیہ کا کردار نہ صرف مثالی رہا بلکہ رشتے ناطے نبھانے میں انسانی دوستی کی حدوں کو چھوتا نظر آتا ہے۔ ان کو جاننے والے کیا اپنے کیا پرائے سب اس کی ناگہانی جدائی پر افسردگی کی عملی تفسیر بنے بیٹھے ہیں۔“

☆ عبدالجبار رومی انصاری کی لاہور سے آمد۔ ”لوٹ کھسوٹ میں نجی کمپنیاں تو شامل ہی ہیں مگر یہ بھی حکومت کی ذمے داری ہے کہ عوام کو بلاوجہ لوٹنے والوں پر کڑی نظر رکھے۔ استاد اردو عندلیب شادانی کی سرگزشت اچھی لگی۔ شہر خیال میں اویس شیخ کو کرسیٔ صدارت پر براجمان پایا مبارک ہو۔ ہماری آرمی دنیا کی بہترین فوج ہے جس پر پوری قوم کو فخر ہے رانا محمد سجاد کا خلوص، محمد احمد رضا انصاری کا پیام، سید انور عباس شاہ کا تفصیلی تحفہ اور اعجاز حسین سٹھار کی باتیں اچھی لگیں۔ مجید احمد جائی کی تحقیق و تفتیش بھی زبردست لگی۔ حبیب الرحمٰن، شگفتہ مشتاق اور فیروز علی کے مختصر خط بھی اچھے تھے۔ عزیز مئے، دوست بھی تو قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں ناں ویسے آپ کا انتخاب پسند آیا۔ سدرہ بانو، ٹھیک فرمایا بے شک ہمارا وطن لازوال قربانیوں کے بعد حاصل ہوا ہے۔ سازشیں اپنی جگہ مگر اللہ وطن کی حفاظت کرنے والا ہے۔ آپ کا تبصرہ عمدہ لگا۔ شاہد جہانگیر، بعض اوقات پتا نہیں چلتا کیا کیا ہو جاتا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جلدی صحت یاب کرے، آمین۔ رانا محمد شاہد ماں کی کمی کو کون پورا کر سکتا ہے آپ کے جذبات کی دل سے قدر کرتے ہیں خدا آپ کی والدہ محترمہ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔ دوسرے تبصرہ نگاروں میں بشریٰ افضل، عامر شہزاد اللہ دتہ چشتی اور ملک عاشق حسین کے مختصر مگر جامع خطوط اچھے لگے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر فلسفی میں سقراط، افلاطون، فیثا غورث، ارسطو کے بارے میں پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ غلام حسین میمن کی ”سالگرہ کے دن“، منظر امام کے ”کھیل“ اور انور فرہاد کی ”سدا بہار“ زبردست معلوماتی تحریریں تھیں۔ زویا اعجاز کی تین مایہ ناز کھلاڑیوں پر کنٹری دلچسپ اور بہت اچھی لگی۔ کاشف زبیر نے سراب کو کافی سنسنی خیز بنا دیا ہے اور بہت اچھا لگا پڑھتے ہوئے۔ سچائی سے معمور اور جن کے رونما ہونے میں کوئی شک نہیں، انسانی عقل کے لیے حیران کن اسرار کے پردے میں چھپے بے شمار واقعات جنہیں پڑھ کے اور غور و فکر کرنے سے قوت ایمانی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی شیراز خان کی تحریر اسرار بھی دنیا کے عجیب و غریب بھید کھولتی ہے تو بے اختیار یقین کے ساتھ ساتھ غور و فکر میں ذہن ڈوب جاتا ہے اور دل اللہ کی بڑائی اور کبریائی پر اش اش کر اٹھتا ہے۔ اس کے علاوہ سامری، انقلابی اور فیصلہ بھی بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ فلمی دنیا سے انور فرہاد کی سدا بہار شمشاد بیگم کی زندگی کے بارے میں پڑھ کر بہت اچھا لگا۔“

☆ منشی محمد عزیز مئے کے خیالات لڈن وہاڑی سے۔ ”اداریہ میں انکل محترم عوام کے دکھڑے رو رہے ہیں لیکن صاحبان اقتدار پر اس کا اثر کم ہی ہوگا۔ یک صفحی داستان میں عندلیب شادانی کی حالات زندگی کا مفصل احاطہ کیا گیا تھا۔ شہر خیال کی صدارت اس بار اویس شیخ فرما رہے تھے (مبارک باد) بڑی باریک بینی سے تبصرہ کیا تھا۔ مبارک باد۔ شاہد جہانگیر شاہد صاحب اب یوں غیروں کی طرح شکریہ ادا کر کے ہمیں شرمندہ تو نہ کریں۔ پلیز رانا محمد شاہد بے شک ماں کا کوئی نعم البدل نہیں ہے اس دنیا میں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر عطا فرمائے۔ ویلکم جناب عاشق حسین ساجد، بڑی خوشی ہوئی شہر خیال میں آپ کا نام دیکھ کر۔ اویس شیخ کے علاوہ سید انور عباس شاہ، مجید احمد جائی، سدرہ بانو ناگوری اور شاہد جہانگیر کے خطوط بھرپور تھے۔ باجی طاہرہ گلزار کے علاوہ محمد عمران جوتانی بھی اس مرتبہ غیر حاضر تھے۔ ملک جاوید احمد سرکانی درانی صاحب اب آپ بھی ہمت باندھ لیں اور جلد از جلد شہر خیال میں حاضری لگوائیں۔ ان کے علاوہ ہماری ڈاکٹر اور وکیل بہنیں کافی دنوں سے غیر حاضر ہیں۔ روبینہ نفیس انصاری اور قرۃ العین زینب آپ لوگ اپنی خیریت کی اطلاع تو دے دیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب فلسفی کے عنوان سے اس بار افلاطون کی داستانِ حیات بیان کر رہے تھے۔ جس کا نام ہی آج کل لوگوں کے لیے ایک مثال بلکہ ضرب المثل بن گیا ہے۔ سالگرہ کے دن، بھی بہت اچھا اور معلوماتی مضمون تھا۔ کھیل پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ بہت ہی معلوماتی اور دلچسپ مضمون تھا۔ ماہ مئی کے حوالے سے محترم سلیم الحق فاروقی صاحب بھی معلوماتی مواد اکٹھا کر کے لائے تھے۔ سدا بہار، محترم انور فرہاد کا بہت اچھا مضمون تھا۔ شمشاد بیگم یقیناً درجہ اوّل کی گلوکارہ تھیں۔ تین کھلاڑی کی رائٹر زویا اعجاز یہ سسپنس ڈائجسٹ کی باقاعدہ لکھاری ہیں نا جو ہر ماہ ”آپ کے خط“ میں خط لکھتی ہیں؟ اگر وہی ہیں تو ڈبل مبارک باد کی مستحق ہیں۔ موقع کی مناسبت سے بہت اچھا انتخاب ہے آپ کا۔ بیت بازی میں نسیم منظر، آصفہ بتول، اشرف علی اور حسنہ جعفری کا انتخاب پسند آیا۔ پہلی سچ بیانی آواز دوست نے بہت متاثر کیا۔ اس میں معذور افراد کے لیے بھی ایک سبق ہے کہ اگر آپ ہمت اور حوصلہ نہ ہاریں تو یقیناً نازگل کی طرح منزل بہ آسانی پاسکتے ہیں۔ بہروپ

میں بے چارہ انجم فیروز دو کے چکر میں ایک سے بھی گیا نہ شاہینہ ملی نہ زرین، ویری بیڈ۔ جوکر انکل اگرچہ رنجیدہ کردینے والی تحریر تھی لیکن انجام خوشگوار تھا۔ ڈاکٹر فوزیہ کو جوکر انکل کے روپ میں زندگی کا ہم سفر مل ہی گیا۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے والے یقیناً کبھی بھی کسی کے محتاج نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ بڑا مسبب الاسباب ہے اوراس کی حکمت کی باتیں ہم گناہ گاروں کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔''

☆ رانا محمد شاہد کا اظہاریہ بورے والا سے۔ ''مئی کا اداریہ ایک اہم نکتے پر تھا۔ ہمارے ملک کی ستر فیصد سے زیادہ آبادی شاید یہ نہیں جانتی کہ پارلیمنٹ کیا ہے؟ سینیٹ کیا ہے اورٹی وی چینلوں کی ریٹنگ کیا ہوتی ہے۔ اسے بڑھانے کے لیے اینکرز کیا کرتے ہیں؟ البتہ ان ستر فی صد سے زیادہ آبادی کو اس بات کی فکر بہت زیادہ ہوتی ہے کہ کیا بڑھتی مہنگائی میں وہ اپنی ضروریات زندگی پوری کرسکیں گے؟ بچوں کی صحت اور تعلیم سستی ہوجائے توان کی زندگیاں آسان ہوجائیں۔ ان بیچاروں کو کیا معلوم کہ این آر او کیا ہے؟ آٹھویں ترمیم کیا ہے؟ اس لیے بقول معراج رسول سیاست کو ہی فوکس کیا جاتا ہے کہ اگر عوام کے مسائل ہی حل کردیے تو پھر سیاست دانوں کو کون پوچھے گا۔ ان کے آگے پیچھے کون پھرے گا؟ گویا بقول سیاست داں عوام کی زندگیاں اجیرن ہوں گی تو وہ سیاست دانوں کی طرف توجہ کریں گے۔ یک صفحی سرگزشت میں استاد اردو عندلیب شادانی کی دلچسپ روداد پڑھی۔ بہت اچھا لگا کہ بنگال کی سرزمین پر ایک لمبا عرصہ رہنے والا استاد اردو کہلایا۔ اویس شیخ کرسیٔ صدارت پر دلچسپ باتیں کررہے تھے۔ میرا قلم پکڑنے کو جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ والدہ محترمہ کے اللہ کے پاس چلے جانے کے بعد سرگزشت زیر مطالعہ ضرور رہا مگر لکھنے کو جی نہیں چاہا۔ 1994 کے بعد سے یہ واحد چار ماہ تھے جب کچھ بھی نہیں لکھا۔ آپ دوستوں کی محبت کھینچ لائی ورنہ زندگی اب پہلے جیسی نہیں رہی۔ یہ اپنا دکھ شاید میں الفاظ میں بیان نہ کرسکوں۔ ناصر حسین رند کا مکتوب بھی اچھا تھا۔ شاہد جہانگیر آپ کے لیے دعا گو ہوں۔ اللہ آپ کو صحت یاب کرے، آمین۔ رمضان المبارک آرہا ہے۔ یہ پہلا رمضان ہوگا جو میں اپنی والدہ کے بغیر گزاروں گا۔ میرا آپ لوگوں سے، سرگزشت سے کافی پرانا رشتہ ہے۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ میری والدہ کی مغفرت اور میرے صبر کے لیے دعا ضرور کیجیے گا۔''

☆ طاہرہ گلزار کی آمد پشاور سے۔ ''پشاور کے 24 اور 25 اپریل کی قدرتی آفت کی وجہ سے دل دکھی تھا اللہ تعالیٰ ہمارے ملک پر رحم کرے، آمین۔ کہانیوں کی فہرست میں جب مریم کے خان، عبدالرب بھٹی، منظر امام، ڈاکٹر ساجد امجد اور اپنے فیورٹ رائٹر کاشف زبیر کے ساتھ اپنی تبصرہ نگار سویٹ سسٹر زویا اعجاز کا نام دیکھا تو بہت خوشی ہوئی۔ یک صفحی میں شاعر عندلیب شادانی کے بارے میں پڑھا۔ دل میں ایک نیا جوش بڑھ گیا۔ پہلا خط اویس شیخ کا پورے 33 سطر کا تھا۔ بھائی مبارکاں کافی شاندار خط تھا۔ رانا محمد سجاد صاحب شکایت اپنوں سے ہی کی جاتی ہے اور انکل معراج اور سرگزشت ہم سب کا ہے۔ بھائی سجاد، محمد احمد رضا کا مشورہ سرآنکھوں پر، میری بھی ایک تجویز ہے کہ طاہر جاوید مغل سے سفرنامہ لکھوایا جائے (وہ سفرنامہ نہیں لکھتے) انور عباس بھائی انکل معراج جیسے عظیم انسان نہ ہوتے تو آج ہمیں اتنے اچھے ڈائجسٹ کہاں پڑھنے کو ملتے۔ اللہ ان کو صحت کامل عطا کریں۔ ہاں شاہد جہانگیر شاہد صاحب کو اللہ نے دوبارہ زندگی عطا کی ہے۔ اعجاز حسین سہار بھائی پھر آپ مردوں کو میری بات بری لگ گئی، کمال امروہوی صاحب تھے تو وہی بیوی کو مردانگی دکھانے والا مطلبی۔ مجید احمد جائی کا خط بھی بہت زبردست اور دلچسپ رہا یاد رکھنے اور دعا دینے کا شکریہ بھائی، خوش رہو۔ بھائی ناصر حسین رند کا مشورہ بھی اچھا ہے ادارے والوں کو اس پر سوچنا چاہیے۔ بھائی فیروز علی عاجز آپ کا دوبارہ آنا اچھا لگا۔ بھائی میں بھی میرہ عمرزئی کی ہوں۔ مختصر خط کے ساتھ بشریٰ افضل بھی اس بار حاضر تھی۔ ڈیئر آیا کرو اور خوش رہو۔ عامر شہزاد شکر ہے خدا کا کہ آپ نے میرے تبصرے کو عقلمندانہ کہا ورنہ یہاں تو لوگوں کو میری سچ بات سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ ارے عبدالجبار رومی انصاری سسپنس اور جاسوسی کی طرح یہاں بھی، ویلکم۔ اب آتے رہیے۔ شاہد جہانگیر شاہد آپ اور خٹک لالہ تو اپنی تحریروں کی وجہ سے سرگزشت میں چمکتے ہیں۔ رانا شاہد اللہ آپ کی والدہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے، آمین۔ زویا اعجاز کی معلوماتی اور دلچسپ تحریر تین کھلاڑی پڑھی ویلڈن زویا اعجاز۔ کاشف زبیر کی ایکشن فل تحریر سراب واہ بھائی اس بار تو ریکارڈ توڑ قسط لکھی۔ سچ بیانوں میں پہلی کہانی آواز دوست بہت شاندار کہانی پڑھنے کو ملی۔ دوسری کہانی کچھ غیر فطری لگی۔ تیسری کہانی حقیقت واقعی اس ماہ کی سب سے سبق آموز اور اس معاشرے کے مردہ ذہنیت کے منہ پر تھپڑ ہے۔ چوتھی کہانی بہروپ پڑھ کے ہنسی بھی آئی اور دل سے دعا بھی نکلی کہ شکر ہے کہ اس دھوکے باز انجم فیروز بہروپیے سے زرین اور شاہینہ بچ گئی۔ پانچویں کہانی کیا کروں اس ظالم معاشرے کا ہی ایک روپ تھی۔ چھٹی کہانی کوما پاکستان کے تیس سالہ دور کی کہانی جہاں سے ہماری تباہی کی ابتدا ہوئی تھی۔ ساتویں کہانی فیصلہ وہی مرد کی ازلی ہوس کی کہانی اور عورت، محبت کے لیے ازلی بھوکی۔ جھوٹے محبت کے ہاتھوں عزت گنوادیتی ہے۔ آٹھویں کہانی جوکر انکل بہت زبردست کہانی۔ دودکھی انسان مل گئے۔ ساجد اور فوزیہ کتنے خوش قسمت انسان تھے مل گئے تو زندگی بھی خوب صورت لگنے لگی۔ آخری کہانی کر بھلا جو محنت، ایماندار اور انسانی خدمت اور ان کی ضرورتیں بغیر ریاکاری کے پورے کیے جاتے رہے

اس لیے تو اللہ نے ایمانداری اور محنت کا صلہ بھی دیا۔ مریم کے خان کی معلوماتی تحریر انقلابی بہت دلچسپ تحریر، ویلڈن مریم کے خان۔ شیراز خان کی مذہبی تحریر پُراسرار بہت اچھی اور معلوماتی تحریر تھی۔ محمد ساجد کی مذہبی تحریر سامری بھی روح کو سرشار کرنے والی تحریر ثابت ہوئی۔ باقی سرگزشت بعد میں پڑھوں گی اور وہ بھی کافی شاندار ہوگا۔"

☆ سید انور عباس شاہ کی دریا خان بھکر سے آمد۔ "ہمارے ملک میں واقعی لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہے سرکاری ادارے ہوں یا غیر سرکاری بھی نت نئے طریقے اپنا کر غریب عوام کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں اور ان سے باز پرس کرنے والا کوئی نہیں کیونکہ باز پرس کرنے والوں کو اپنی جیب گرم رکھنا ہوتی ہے۔ موبائل کمپنیوں کے تو ڈیلی بیس پر عوام کے لوٹنے کے طریقے معرض وجود میں آتے ہیں۔ پہلے پہل تو سبز باغ دکھا کر یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ آفر حاصل کرنے کے لیے فلاں نمبر ملائیں جب نمبر مل جاتا ہے تو ہوتا کچھ بھی نہیں البتہ نمبر ملاتے ملاتے کافی سارا بیلنس کاٹ لیا جاتا ہے اور نتیجہ صفر ہوتا ہے۔ (یہی نہیں نت نئے پیکج میں خود ہی شامل کر کے بیلنس لوٹ لیتے ہیں) شہر خیال میں اویس شیخ کرسی صدارت کی زینت بنے، بھئی بہت بہت مبارک ہو۔ آپ کا تبصرہ بھی شاندار تھا۔ رانا محمد سجاد اپنے خوبصورت تبصرے کے ساتھ شہر خیال کی زینت بنے، بہت بہت شکریہ جناب۔ باقی آپ کی یہ تجویز دل کو بہت بھلی لگی کہ ہر ماہ کسی ایک اداکار کے بارے میں مضمون ضرور ہونا چاہیے۔ محمد احمد رضا انصاری آپ کو بہت بہت مبارک ہو کہ آپ کا دوسرا خط بھی شائع ہو گیا لہٰذا آتے رہا کریں۔ قیصر عباس خان، ایم انور، آصفہ ضیا، احسان سحر، حبیب الرحمٰن، شگفتہ مشتاق، ناصر حسین رند، فیروز علی اور بشریٰ افضل مختصر لیکن خوبصورت تبصرے کے ساتھ شہر خیال کی زینت بنے۔ منشی محمد عزیز اور ناصر حسین رند کی میٹھی میٹھی باتیں پڑھنے کو ملیں۔ سدرہ بانو نا گوری جاندار تبصرے کے ساتھ شہر خیال پر چھا گئیں لیکن طاہرہ باجی کے متعلق آپ کا یہ خیال کہ دس سالہ بچی کے لیے شاک کچھ عجیب سا لگتا ہے میں متفق نہیں ہوں کیونکہ احساس بچوں کو بھی ہوتا ہے۔ محترم ہستی شاہد جہانگیر شاہد کو محفل میں شامل پا کر دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ خداوند کریم ان کو مکمل طور پر جلد از جلد صحت وتندرستی عطا فرمائے، آمین۔ طاہر گلزار اس دفعہ پھر غیر حاضر تھیں جن کی کمی شدت سے محسوس کی گئی خدا کرے خیریت سے ہوں۔ مجید احمد جائی کی صاف اور کھری کھری باتیں پڑھنے کو ملیں بہت ہی شاندار خط تھا۔ رانا محمد شاہد تعزیت بھرے خط کے ساتھ حاضر تھے ایک دفعہ پھر ہم ان کی والدہ کے لیے صدق دل سے دعا گو ہیں کہ خداوند کریم انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ اس دفعہ کے شہر خیال میں محمد سلیم قیصر، آفتاب احمد نصیر اشرفی اور احمد خان توحیدی کی کمی شدت سے محسوس کی گئی۔ یہ تمام دوست اپنی خیریت سے ضرور مطلع فرمائیں۔ فلسفی ایک بے حد معلوماتی اور دلچسپ تحریر تھی۔ صحرائے اعظم بھی ایک بے مثال اور خوب صورت تحریر تھی۔ سالگرہ کے دن دنیا کی معروف ترین شخصیات کے بارے میں جان کر بہت کچھ حاصل ہوا۔ دلچسپ اور حیرت انگیز کھیلوں پر مبنی تحریر "کھیل" بھی اپنی مثال آپ تھی اس تحریر کے کافی سارے کھیلوں کے بارے میں ہم جانتے بھی نہ تھے۔ عیسوی مہینوں کے بارے میں خزانہ معلومات کی گاڑی مئی کے اسٹاپ تک آ پہنچی۔ اسی مہینے کی اہم شخصیات کا تذکرہ اور ان کے بارے میں معلومات ہمارے لیے بہت مفید ثابت ہوئیں۔ تھینکس جناب سلیم الحق فاروقی۔ سدا بہار گانوں کی گائیکا شمشاد بیگم کے بارے میں مضمون سدا بہار نے تو دل موہ لیا۔ جیسا کہ مشورہ دیا جا چکا ہے کہ اسی طرح ہر ماہ کسی ایک اداکار یا گلوکار کے بارے میں مضمون سرگزشت کو چار چاند لگا دے گا اور فلمی الف لیلہ کی کمی بھی پوری ہوتی رہے گی۔ سسپنس اور تجسس سے بھرپور سلسلے وار کہانی سراب تیزی سے اپنی منزلیں طے کرتی جارہی ہے۔ کامران بٹ کی تحریر کیا کروں کے متعلق رائے دینے سے ہم بھی گیا کریں۔ آواز دوست ایک باہمت لڑکی کی آپ بیتی تھی جو کہ ہمت ہار جانے والے انسانوں کے لیے سبق آموز تحریر تھی۔"

☆ ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی کی خیال آفرینی، پچھ سے۔ "دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جناب معراج رسول اور جناب شاہد جہانگیر شاہد کو صحت کاملہ اور جناب علی سفیان آفاقی جنہیں مرحوم لکھنے پر قلم بھی آمادہ نہیں اور رانا محمد شاہد کی والدہ صاحبہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے (آمین) سرگزشت کے دیرینہ قاری ماسٹر محمد صادق قریشی سکنہ ملک وال اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ فلمی الف لیلہ کی آخری قسط میں ایک قومی یا سرکاری زبان کے تنازعہ کے حوالے سے مسعود کھدر پوش کا ذکر بار بار ایم مسعود کے نام سے کیا گیا حالانکہ مسعود کھدر پوش اپنے اسی نام سے جانے جاتے ہیں۔ سلیم الحق فاروقی کے مضمون ماہ موسم بہار میں عمر شریف کے ڈرامے مرحوم معین اختر کے نام منسوب کر دیے گئے ہیں حالانکہ بڈھا گھر پر ہے، بکرا قسطوں پر وغیرہ ڈرامے عمر شریف کے ہیں (تو کیا معین اختر ان میں نہیں تھے؟) انوار عباس شاہ کی خدمت میں عرض ہے کہ ناصر حسین رند صاحب اگر ثبوت کے ساتھ سلور جوبلی کی تجویز کی بات کر رہے ہیں تو حق یہی ہے کہ آپ دعوے سے دست بردار ہو جائیں ہاں اتنا یاد ہے کہ میری طرف سے اس تجویز کی تائید کی گئی تھی۔ محمد عزیز صاحب سرگزشت سے آپ کی محبت سے کسے انکار ہے۔ ایک گزارش ہے کہ جس طرح ایک بات دوسرے تک پہنچانا اچھائی کی تبلیغ ہے اسی طرح

موبائل کے ذریعے فضول قسم کی پیغام رسانی برائی کی تبلیغ بن جاتی ہے اللہ تعالیٰ سمجھ عطا فرمائے۔ (بجا فرمایا یہ نئی وبا بہت بری ہے۔ ذہنی کوفت پیدا کرنے والی) محمد عارف قریشی بھکر کتاب کی اشاعت مبارک ہو آپ کو یاد ہوگا میں نے دو نام مولانا اللہ یار خان چکڑالوی اور مولانا عبداللہ چکڑالوی کے نام بھی شہر خیال کے واسطے سے آپ کی خدمت میں پیش کیے تھے۔ اُمید ہے انہیں بھی شامل تحقیق کیا ہوگا۔ مولانا اللہ یار خان ایک ممتاز عالم دین، مناظر، سلسلہ نقش بندیہ اویسیہ کے شیخ طریقت اور کثیر التصانیف مصنف تھے۔ محمد احمد رضا انصاری کی تجویز پسند نہیں آئی علمی آزمائش میں شخصیت والا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔''

☆ اویس شیخ نے شیخوپورہ سے لکھا ہے۔ ''اس بار شمارے کا سرورق دیدہ زیب تھا۔ اس دفعہ آپ اداریے میں ایک اہم مضمون لے کر آئے لیکن کیا کریں اس سیاست کی ایک تازہ مثال ملاحظہ فرمائیں۔ چینی صدر کے دورہ پاکستان پر 146 ارب ڈالرز کے 51 معاہدوں پر دستخط ہوئے۔ معاہدوں کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں یہ معاہدے پورے ہوں گے یا نہیں اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔ ان 51 معاہدوں کو پڑھتے ہوئے یہ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کاش اس میں عوام کو باشعور اور مہذب شہری بنانے کے لیے تعلیمی منصوبوں پر بھی زور رہا ہوتا۔ عوام کی صحت و عافیت کے حوالے سے اسپتالوں کی حالت زار پر توجہ دی جاتی سب سے بڑھ کر صاف پینے کے پانی کا بندوبست کیا ہوتا۔ چین کے تعاون سے یہ سب ممکن تھا مگر عوام کو اقتصادی راہ داری کے خواب دکھا کر حکمران کون سا فرض ادا کر رہے ہیں۔ غریب آدمی اس سے کیا فائدہ اٹھا سکے گا؟ ان معاہدوں میں تعلیم، صحت اور روزگار یہ سب منصوبے مفقود تھے دراصل حکمرانوں کی ترجیحات میں ہے ہی نہیں تو دوسرے ٹھیکا اٹھانے سے رہے۔ ''استاد اردو'' کا تذکرہ پڑھا تو یہ محسوس ہوا کہ تعلیم ہی سب کچھ ہے۔ شہر خیال میں، میں خود کو مسند صدارت پر براجمان ہوتے دیکھ کر خوشی ہوئی۔ سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ دن سال کی پہلی عید کی مانند تھا۔ دیگر ساتھیوں کے خطوط پڑھنا شروع کیے۔ حبیب الرحمٰن صاحب بجلی بحران کے خاتمے کے لیے اپنی خدمات کا نذرانہ پیش کرتے نظر آئے مگر یہ بجلی بحران ہماری زندگی میں کبھی ختم نہیں ہوگا۔ عزیز مئے کا شعر بہت پسند آیا۔ سدرہ صاحبہ عامر شہزاد کے خط کا جواب گول کر گئیں۔ بشریٰ افضل کی روداد پڑھی، آپ دل چھوٹا نہ کریں۔ اگر آپ کا حلقہ ایسا ہے تو میرا حلقہ N-A246 سے کم نہیں۔ چودھری عامر صاحب، معذرت والی کوئی بات نہیں۔ مجھے آپ کی تنقید کا انداز پسند آیا۔ بس ذرا تم لفظ اچھا نہیں لگا۔ شاہد جہانگیر بھائی کو اللہ صحت اور ایمان والی زندگی دے۔ رانا شاہد صاحب خدا آپ کو صبر دے۔ شہر خیال میں شگفتہ مشتاق اور مئے عزیز کا شکریہ مجھے بینا بینا نمبر کی کاپیاں شورکوٹ کینٹ سے مل چکی ہیں۔ عزیز مئے آپ کا نمبر پرویز صاحب نے نہیں دیا کہتے ہیں وہ خود کال کر کے کہیں گے تب ہی آپ کو دیا جائے گا (ادارے کی پالیسی نہیں ہے کہ وہ کسی کا نمبر کسی اور کو دے) عمران جونانی صاحب دوبارہ محفل میں لوٹ آئیں۔ طاہرہ گلزار کی غیر حاضری خیر سے ہی ہو۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر پڑھ کے آدھی دعا پوری ہوگئی۔ تحریر صدیوں یاد رکھی جائے گی۔ ''بابا جمہوریت'' کی اگر لکھی گئی شقوں پر نظر دوڑائیں تو سوائے موسیقی کے بھی باتیں اسلامی قوانین سے ملتی جلتی ہیں۔

☆ شاہد جہانگیر شاہد کا مکتوب پشاور سے۔ ''اس ماہ کا سرورق بہت پُرکشش تھا دیکھتے ہی یہ شعر زبان پر آ گیا۔ ''بے محابہ ہو اگر حسن تو وہ بات کہاں۔ چھپ کے جس شان سے ہوتا ہے نمایاں کوئی۔'' یونانی فلاسفی افلاطون پر ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر ہمیشہ کی طرح خوب صورت تھی۔ ماہ مئی کے حوالے سے اہم شخصیات پر مختصر تحریر بے حد معلوماتی اور دلچسپ تھیں۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ شکیل صدیقی کا مشہور مصور مائیکل اینجلو کے بارے میں شاندار تحقیقی مضمون پڑھنے کو ملا۔ مینا کماری کے بارے میں انور فرہاد کی خوب صورت تحریر پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ یہ ایک پُراثر تحریر تھی لیکن مینا کی کہانی میں ایک تشنگی رہ گئی اس میں نرگس اور سنیل دت کی جانب سے مینا کی تیمارداری کا ذکر نہیں کیا گیا اور نہ ہی دھرمندر کی بے وفائی اور مینا کی شراب نوشی میں مبتلا ہونے کا ذکر موجود ہے۔ اس ماہ کوئل جیسی خوب صورت اور کھنکتی ہوئی آواز کی مالک شمشاد بیگم پر انور فرہاد نے ایک خوب صورت اور مختلف انداز کی تحریر پیش کی ہے لیکن مقبول شاعر نخشب کی فلموں میں نوشاد نے کبھی موسیقی نہیں دی تھی ان کے انکار پر ضد میں آ کر نخشب نے شوکت دہلوی کا نام تبدیل کر کے ناشاد رکھ دیا تاکہ عام لوگ اس معمولی فرق کو نہ سمجھ سکیں کیونکہ اس زمانے میں نوشاد کا طوطی بولتا تھا اس طرح نخشب نے کاروباری فائدہ اٹھایا۔ یہ الگ بات ہے ناشاد ایک بہت کامیاب موسیقار ثابت ہوئے جو بعد میں نخشب کے ساتھ پاکستان آ گئے اور یہاں بھی بہت خوبصورت دھنیں ترتیب دیں۔ شہر خیال کے دوستوں رانا محمد سجاد، رعنا محمد شاہد، انور عباس شاہ، سدرہ بانو ناگوری، عزیز مئے، قیصر خان، مجید امجد، ایس رحمان خٹک اور طاہرہ گلزار کا بے حد مشکور ہوں کہ سب نے اپنی دعاؤں میں یاد رکھا ڈاکٹرز نے دو ماہ تک مکمل آرام کی ہدایت کی ہے۔ اپنی دعا میں شامل رکھیں۔''

تاخیر سے موصول خطوط: بشیر احمد بھٹی، عبدالحمید جانی، بہاولپور۔ سلیم رشید، لاہور۔ قدیر رانا، راولپنڈی۔ منظر علی خان، لاہور۔ رانا محمد سجاد، مظفر گڑھ۔

ڈاکٹر ساجد امجد

امیرِ ملت

برصغیر صوفیوں کی پسندیدہ سرزمین رہی ہے جن کی تبلیغ نے کفاروں سے بھرے دیس میں ایمان کا نور پھیلایا۔ قریہ قریہ نگر نگر چپہ چپہ پر صوفیوں نے کفر کے خلاف معرکہ آرائی کی۔ یہ تمام کے تمام صوفی باہر سے آئے لیکن برصغیر کے مسلمانوں میں سے بھی ایسے بہت سے نام سامنے آئے جنہوں نے دین اسلام کے لیے زندگی وقف کردی۔ جید علماء کی ایک بڑی تعداد ایسی ملتی ہے جن کے علم نے برصغیر کے مسلمانوں کے ایمان کو تازہ کیا۔ انہی اہلِ علم حضرات میں سے ایک بڑا نام حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کا ہے جنہوں نے دین کی خاطر حکومت کے ایوانوں میں زلزلہ پیدا کیا جن کے شاگردوں نے عملی خدمات کے ذریعے دین کی وہ خدمت کی جنہیں تاریخ کبھی بھلا نہیں سکتی۔

ایک ولی کامل کا زندگی نامہ، ایک مشعل راہ تحریر

گلی میں مورچے بنے ہوئے تھے۔ ایک گروہ دوسرے گروہ کے قلعے پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ انہی میں ایک بچہ سید احمد بھی تھا۔ یہ بچہ نہ صرف اس کھیل میں شریک تھا بلکہ ایک گروہ کا سپہ سالار بھی تھا۔ یہ فرضی جنگ ابھی چھڑی نہیں تھی کہ اس کے بڑے بھائی سید اسحٰق اس طرف آنکلے اور اس ننھے سپہ سالار کو کان سے پکڑ کر والدہ کے سامنے پیش کردیا۔

”لیجیے سنبھالیے انہیں۔ موصوف آج مکتب بھی نہیں گئے۔ آوارہ لڑکوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔“

”کیوں سید احمد، یہ میں کیا سن رہی ہوں؟ بیٹا پڑھوگے لکھوگے نہیں تو دنیا میں کیا کروگے؟“

”میں کافروں سے جہاد کروں گا۔“

یہ تھے سید احمد جو پڑھنے لکھنے سے بھاگتے رہے لیکن شوق جہاد دل میں پلتا رہا۔ مارا باندھی کچھ نہ کچھ پڑھ بھی لیا لیکن بقول غالب ”رفت گیا اور بود تھا۔“ عربی فارسی کے کچھ ابتدائی اسباق کے سوا کچھ نہ سیکھ سکے۔ بچپن کھیل کود میں گزر گیا۔ جوانی آئی تو یہ احساس ہوا کہ جہاد کے لیے اچھی صحت بھی ضروری ہے۔ پہلوانی اور تیراکی میں دن گزرنے لگے۔ اٹھارہ سال کی عمر ہوئی اور صحت قابل رشک ہوگئی۔ سپہ گری کی عملی تربیت بھی ہونی چاہیے۔ کسی امیر کی جمعیت میں شامل ہونا چاہیے۔ والدہ سے اجازت لی اور لکھنو پہنچ گئے۔ چند دوست بھی ملازمت کے لالچ میں ساتھ ہوگئے تھے۔

کئی مہینے گزر گئے۔ ملازمت کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو دوستوں پر گھبراہٹ طاری ہوئی۔

”ملازمت کا ارادہ چھوڑو واپسی کا ٹھکانا کرو۔“ سید احمد نے دوستوں سے کہا۔

”کس منہ سے وطن جائیں؟“ دوستوں نے منہ لٹکا کر کہا۔

”پھر دہلی چلتے ہیں۔ دہلی میں سیکڑوں مدرسے ہیں سب سے بڑی بات یہ کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی موجود ہیں۔ ان سے کسب فیض کا موقع ملے گا۔“

دوستوں کو تعجب ہو رہا تھا کہ جو تعلیم سے ہمیشہ بھاگتا رہا تھا اب سب کو تعلیم کی طرف بلا رہا ہے۔ یہ کون سی عمر ہے تعلیم حاصل کرنے کی۔ سب نے کوئی نہ کوئی بہانہ کردیا۔ سید احمد جنگلوں کی خاک چھانتے ہوئے دہلی پہنچ گئے۔ سفر کی تکان اتارے بغیر شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں پہنچ گئے۔

دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔

”کہاں سے آئے ہو؟“

”رائے بریلی سے۔“

”کس قوم سے تعلق ہے؟“

”سادات سے ہوں۔“

”سید ابو سعید اور سید نعمان کو جانتے ہو؟“

”سید ابوسعید میرے حقیقی نانا تھے اور سید نعمان حقیقی چچا۔“

”تو یوں کیوں نہیں کہتے۔“ حضرت شاہ عبدالعزیز نے فرمایا اور گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ ”تم تو اپنے ہوئے

پھر غیروں کی طرح آ کر کیوں بیٹھ گئے۔ آتے ہی کیوں نہیں بتایا۔ خیر یہ بتاؤ کس غرض سے رائے بریلی سے یہاں تک کے سفر کی صعوبت گوارا کی؟''

''آپ کی ذات مقدس کو غنیمت سمجھ کر اللہ تعالیٰ جل شانہ کی طلب میں پہنچا ہوں۔''

''خدا کا فضل شامل حال رہا تو اپنی پدری اور مادری وراثت حاصل کر لوگے۔'' حضرت نے فرمایا اور ایک خادم کو حکم دیا۔''انہیں بھائی عبدالقادر کے پاس اکبری مسجد لے جاؤ۔''

جس تعارف کے ساتھ بھیجا گیا تھا اس کے بعد ضروری تھا کہ شاہ عبدالقادر (برادر شاہ عبدالعزیزؒ) بھی ان کی پذیرائی کرتے۔ شاہ صاحب کی طرف سے حکم ہوا کہ شغل وذکر کے وقت میری سہ دری کے پاس بیٹھا کرو۔ اس کے ساتھ ہی انہیں عربی، فارسی کی کتابیں پڑھانی شروع کر دیں۔

وہ حصول تعلیم میں تو اتنے مستفید نہیں ہو رہے تھے لیکن ذکر کے وقت وہ اس مستعدی سے سہ دری کے پاس بیٹھے رہتے کہ نہ دھوپ کی پروا کرتے نہ بارش کی۔

تعلیم کی طرف توجہ نہ ہونے کے باوجود شاہ عبدالقادر کی مخصوص تربیت کی بدولت انہوں نے میزان، کافیہ اور مشکوٰۃ شریف کے درس مکمل کر لیے۔ درسی نقطہ نگاہ سے وہ کسی ممتاز درجے پر فائز نہ ہو سکے لیکن اتنا ہوا کہ عربی فارسی بے تکلف بولنے لگے اور ایک خاص علمی ذہن بن گیا۔

دہلی میں رہتے ہوئے تقریباً چار سال گزر چکے تھے۔ ضروری تعلیم بھی حاصل ہو گئی تھی۔ علما کی مجالس میں بیٹھتے بیٹھتے تزکیہ نفس کی طرف میلان بھی ہو گیا تھا۔ پیری مریدی گھر کا شغل تھا لیکن وہ ابھی تک کسی کے مرید نہیں ہوئے تھے۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی شاہ عبدالعزیزؒ سے بہتر کوئی نظر نہ آیا۔ شاہ صاحب نے بھی بھانپ لیا اور سمجھ لیا کہ ایسا مرید قسمت والوں کو میسر آتا ہے۔ سید احمد نے قادریہ، چشتیہ اور نقش بندیہ سلسلوں میں بہ یک وقت بیعت کی اور تینوں سلسلوں میں سیر وسلوک کی منزلیں اس خوبی سے طے کیں کہ خود پیر طریقت کہہ اٹھے۔

''یہ علم باطن میں اتنے ذکی ہیں کہ معمولی سے اشارے کی بنا پر مقامات عالیہ کو سمجھ جاتے ہیں اور انہیں طے کر لیتے ہیں۔''

سلوک کی منزلیں طے کرتے ہی آپ نے ریاضتیں اور مجاہدے شروع کر دیے۔ عشا کی نماز کے بعد کھڑے ہوتے تو فجر کی نماز کے بعد مصلے سے اٹھتے۔ قیام لیل کے باعث پاؤں متورم ہو جاتے۔

جب دہلی کی مسجدوں کے میناروں نے آپ کی مقبولیت کا رنگ خوب اچھی طرح دیکھ لیا تو آپ نے وعظ و تلقین اور اصلاح احوال کے لیے دہلی سے باہر قدم نکالا۔ راہ خدا میں جہاد کی آگ اب بھی دل میں جل رہی تھی لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ اس مہم کے لیے راہ ہموار کی جائے۔ آپ تبلیغی دوروں کی غرض سے دہلی سے نکلے۔ جس شہر میں جاتے لوگ پروانہ وار نثار ہوتے۔ جب آپ دوآبہ کا دورہ فرما رہے تھے تو لوگوں کے دلوں میں ایمان و جہاد کی شمعیں جلاتے ہوئے سہارن پور سے قریباً بیس میل کے فاصلے پر قصبہ نانوتہ پہنچے۔ یہاں ایک کم سن بچہ حصول برکت وسعادت کے لیے حضرت سید صاحب کی گود میں دے دیا گیا۔ آپ نے اسے بیعت تبرک میں قبول فرما لیا۔ اس وقت اس بچے کی عمر تین سال تھی۔

اس بچے کو سید صاحب کی آغوش میں دیکھ کر سب کی زبانوں سے نکلا تھا کہ اس سعادت کے طفیل برکت کے آثار ضرور ظاہر ہوں گے۔ کچھ لوگوں نے اسے محض خوش عقیدگی سے تعبیر کیا تھا لیکن بزرگوں کی دعاؤں میں اثر ہوتا ہے۔ یہ بچہ جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا یہ آثار نمودار ہوتے گئے۔ یہ نہ بچوں جیسی شرارتیں نہ کھیل کود، پڑھنے کی عمر کو پہنچا تو پڑھنے کے سوا کوئی کام ہی نہیں۔ والد کا انتقال پہلے ہی ہو چکا تھا۔ سات سال کی عمر ہوئی تو تہجد گزار والدہ بی بی حسینی کا بھی انتقال ہو گیا۔ کسی نے نہ زور دیا نہ راہ سجھائی خود ہی شوق ہوا۔ ایک ولولہ سا جی میں اٹھا اور قرآن پاک حفظ کرنے بیٹھ گیا، قرآن پاک دل میں اترا تو حصول علم کے لیے مقامی اساتذہ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ کچھ فارسی رسائل پڑھے۔ حسن حصین اور مثنوی مولانا روم کی اسباق ختم کیے۔

مولانا مملوک علی دہلی جا رہے تھے۔ اپنے نوجوان شاگرد امداد اللہ کو بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ اس وقت مغلیہ سلطنت اپنے زوال کی آخری حدوں سے گزر رہی تھی لیکن علمی مراکز ابھی زندہ تھے۔ مدرسوں کا بازار تھا۔ مساجد میں حجروں کی قطاریں تھیں۔ بیرونی طلبہ ان حجروں میں آ کر ٹھہرتے تھے اور اپنے اپنے نصیب کا علمی خزانہ سمیٹ کر اپنے وطن لوٹتے تھے۔ خانوادہ شاہ ولی اللہ نے وہ رونق بخشی تھی کہ دہلی کو ہندوستان کا بخارا بنا دیا تھا۔ وہ اس وقت اکبر

آبادی مسجد کے قریب سے گزر رہے تھے۔ قلعہ معلیٰ کی دیواریں انہیں غور سے دیکھ رہی تھیں پھر وہ ایک پُررونق بازار سے گزرے۔ یہ سب ان کے لیے نیا اور دلچسپ تھا لیکن مولانا مملوک کی منزل کوئی اور تھی۔ امداد اللہ بھی ان کے ساتھ چلے جا رہے تھے۔ دائیں بائیں دو مینار نظر آئے پھر عمارت بھی نظر آئی۔ پوری عمارت سنگ سرخ کی بنی ہوئی تھی۔ سامنے کی طرف سیڑھیاں تھیں۔ شمال اور جنوب کی سمت حجروں کی قطاریں تھیں۔ حجروں کے آگے برآمدہ اور برآمدے کے آگے ایک چوڑا چبوترا تھا۔ عمارت کے وسیع و عریض صحن میں کچھ لوگ دائرہ بنا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ درمیان میں ایک فرشتہ صورت نوجوان بیٹھا تھا۔ مولانا مملوک کو دیکھتے ہی اس نوجوان نے گفتگو کو درمیان میں چھوڑا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ ہاتھ مولانا مملوک کی طرف تھا اور آنکھیں امداد اللہ پر جمی ہوئی تھیں۔ ان بابرکت آنکھوں میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ امداد اللہ نے اپنے اندر ایک روشنی سی اترتی ہوئی محسوس کی۔ دل بے اختیار ان کی طرف کھنچنے لگا۔ مولانا مملوک اور وہ ایک طرف بیٹھ گئے پھر مولانا نے اس نوجوان کے کان میں کچھ کہا۔ کام کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ دوسرے دن آنے کا وعدہ ہوا۔ مولانا اسے لے کر اٹھ گئے۔ وہ اس وقت اکبری مسجد میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ مختلف بازاروں سے ہوتے ہوئے اکبری مسجد پہنچ گئے۔

"امداد اللہ تم نے یہ نہیں پوچھا کہ یہ صاحب کون تھے جن سے میں مل کر آرہا ہوں۔"

"یہ بے ادبی تھی کہ میں کچھ پوچھتا۔ میں سوچ رہا تھا آپ خود کچھ بتائیں گے۔"

"یہ مولانا نصیرالدین صاحب تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ سے ننھیالی رشتہ رکھتے ہیں اور ددھیالی تعلق ناصرالدین صاحب تھانسیری سے ہے۔ بڑے پائے کے عالم ہیں۔ دہلی کے بہت سے مدرسوں میں آپ کی بھی ایک درس گاہ ہے۔ خصوصیت اس کی یہ ہے کہ یہاں علم ظاہر کے ساتھ عشق و معرفت کا درس بھی دیا جاتا ہے۔ حضرت سید احمد بریلوی انگریزوں سے نجات کے لیے جو تحریک چلا رہے ہیں یہ صاحب بھی اس تحریک جہاد کے ایک خاص رکن ہیں۔

سید احمد بریلوی کا نام آیا تو امداد اللہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ سنتے چلے آئے تھے کہ بچپن میں انہیں سید احمد کی گود میں دیا گیا تھا لہٰذا ایک فطری عقیدت تھی جوان

کے دل میں پیدا ہوگئی تھی۔ مولانا نصیرالدین کی طرف سے بھی ان کے دل میں بھی عقیدت پیدا ہوگئی۔ زبان سے تو کچھ نہ کہہ سکے لیکن دل کی عجیب حالت ہوگئی۔ کسی طرح چین نہ آتا تھا۔ وہ رات جوں توں کاٹی۔ صبح ہوئی اور مولانا مملوک مولانا نصیرالدین سے ملاقات کے لیے جانے لگے تو امداداللہ نے دامن پکڑلیا۔

''کیا کوئی صورت ایسی ہوسکتی ہے کہ میں دہلی میں رہ جاؤں اور مولانا نصیرالدین سے تعلیم حاصل کروں۔''

''ہو تو سکتا ہے لیکن نانوتہ کیا برا ہے جو تم دلی میں رہنے کی ضد کر رہے ہو۔''

''کوئی جگہ بہتر یا بدتر نہیں ہوتی۔ جہاں انسان کا دل لگ جائے وہی جگہ بہتر ہے۔ نانوتہ میں سب کچھ ہے لیکن مولانا نصیرالدین تو نہیں ہیں۔ یہ بڑا شہر ہے مولانا کے علاوہ دیگر علوم کے اساتذہ بھی موجود ہوں گے۔ تحصیل علم کے لیے دہلی سے بہتر کوئی جگہ نہیں، نانوتہ کے محدود وسائل سے کام لینے کے بعد بالآخر مجھے دہلی آنا ہوگا تو پھر ابھی کیوں نہیں۔ اس وقت آپ بھی ساتھ ہیں سفارش کا اچھا موقع ہے۔''

''خدا تمہارے علمی ذوق کو فروغ دے۔ میں وہاں جا تو رہا ہوں تمہارا ذکر بھی ضرور کروں گا بلکہ تم بھی ساتھ ہی چلو۔''

مولانا نصیرالدین کی آنکھوں نے پہلے ہی انہیں اپنے لیے منتخب کرلیا تھا۔ دوسرے دن گئے تو انہیں بطور طالب علم قبول بھی کرلیا۔ سید احمد رائے بریلوی نے انہیں گود میں لے کر دعا دی تھی بالآخر اپنے ہی سلسلے کے لوگوں میں پہنچا دیا۔ یہیں ان کی تربیت ہونی تھی۔ یہیں انہیں ایک خاص کام کے لیے تیار کرنا تھا۔

مولانا مملوک نے سفارش کی اور مولانا نصیرالدین نے انہیں اپنی آغوش تربیت میں لے لیا۔ علوم ظاہری تحصیل شروع ہوئی۔ امداداللہ عربی، فارسی کی کتابیں کھولے بیٹھے تھے لیکن ورق گردانی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو رہا تھا۔ وہ غبی نہیں تھے اور نہ ہی کتابوں سے جی چراتے تھے لیکن لگتا تھا کسی پرواز کے لیے بے تاب ہیں۔ جس کی گود میں گئے تھے اسی کے نقش قدم پر چلنے کی تیاری ہو رہی تھی۔ سید احمد شہید بھی معروف معنوں میں عالم نہیں تھے، مجاہد بے ریا تھے۔ امداداللہ بھی ایسے ہی کسی راستے کی تلاش میں تھے۔

حضرت سید احمد رائے بریلوی کے جہادی سفر کی تمام داستانیں دہلی تک پہنچ رہی تھیں کامیابیاں ان کے قدم چوم رہی تھیں۔ وہ برابر اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ اس وقت ان کی منزل سکھوں سے جہاد تھا جنہوں نے سرحد کے مسلمانوں کی زندگی اجیرن بنائے رکھی تھی۔ پل پل کی خبریں اس مدرسے تک پہنچ رہی تھیں جہاں امداداللہ قیام پذیر تھے۔ یہ خبریں سن سن کر ان کا لہو جوش مارتا رہتا تھا۔ کتابیں انہیں بوجھ معلوم ہونے لگتی تھیں۔

یہاں رہتے ہوئے دو سال ہوگئے تھے۔ علوم ظاہری کی ابھی تکمیل نہیں ہوئی تھی کہ علوم باطنیہ کی طرف کشش ہوئی۔ ابھی تک وہ کسی کے مرید نہیں ہوئے تھے۔ کسی کے دست حق پرست پر بیعت نہیں کی تھی۔ بچپن میں سید احمد بریلوی نے بیعت تبرک سے نوازا تھا۔ یہ تبرک انہیں اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ بے اختیار مولانا نصیرالدین کا خیال آیا۔ وہ بھی تو اسی چمن کے پھول ہیں۔ سید احمد شہید تو اب میدان کارزار میں تھے اور نہ جانے کب تک رہیں۔ انہوں نے مولانا سید نصیرالدین کے دست مبارک پر بیعت کرلی اور اذکار نقشبندیہ اخذ فرمائے۔

حضرت نصیرالدین شیخ المشائخ شاہ محمد آفاق کے خلیفہ اور مسند وقت شیخ الحدیث شاہ محمد اسحق کے شاگرد اور داماد تھے۔

امداداللہ کو چند روز ہی شیخ کی خدمت میں رہنے کی نوبت آئی تھی کہ شیخ کی طرف سے خرقہ و اجازت سے مشرف ہوئے۔ معرکہ ہائے جہاد کی خبریں برابر دہلی پہنچ رہی تھیں۔ یہ خبریں بھی پہنچیں کہ بالاکوٹ کے مقام پر سکھوں اور مجاہدین کے درمیان گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے۔ ان معرکوں میں مجاہدین کو کامیابیاں مل رہی ہیں لیکن جنگوں میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں۔ حالات بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی ایک کی فتح یقینی ہوجاتی ہے کبھی دوسرے کی۔ فتوحات کی خبریں آتے آتے ایک دن اچانک خبر آئی کہ حضرت سید احمد نے جام شہادت پی لیا۔ تحریک جہاد کچھ دنوں کے لیے دم توڑ گئی۔ یہ سانحہ ہی ایسا تھا۔

سید احمد رائے بریلوی جام شہادت نوش فرماگئے تھے مگر وہ مرکز جو انہیں مالی امداد اور افرادی قوت فراہم کر رہا تھا، مولانا شاہ محمد اسحاق کی سرپرستی میں محفوظ و متحرک تھا۔ اسی محاذ کو سرگرم عمل کرنے کے لیے شاہ محمد اسحاق نے اپنے داماد مولانا نصیرالدین کو دہلی سے روانہ کیا کہ وہ دعوت و تبلیغ کے ذریعے لوگوں کو آمادہ جہاد کریں اور جب معقول تعداد میسر آجائے تو بالاکوٹ جانے کی تیاری کریں۔ مجاہدوں کے قافلے بالاکوٹ کی طرف روانہ کریں تاکہ ان غازیوں کو

طاقت ملے جو تعداد کی کمی کی وجہ سے کمزور ہوگئے ہیں۔

مولانا نصیر الدین کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ وہ دوبارہ ایک بڑی جماعت تیار کرکے آزاد علاقے میں بھیجیں جس سے ان کی تحریک میں ایک نئی روح پیدا ہو چنانچہ انہوں نے سید احمد شہیدؒ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کیا اور لوگوں کو دعوت جہاد دے کر بالا کوٹ چلنے پر رضامند کیا۔

ان کی خواہش تھی کہ وہ ٹونک، اجمیر، میرٹھ، امروہہ اور رام پور وغیرہ کے دوروں کے بعد ملک کے اور حصوں کا بھی دورہ کریں تاکہ دعوت و تبلیغ کی ان مساعی میں تنظیم پیدا کرکے اندازہ کرلیں کہ کل کتنی جمیعت کا انتظام ہوسکے گا لہٰذا یہی فیصلہ ہوا کہ زیادہ تاخیر نہ کی جائے۔ جہاد کے میدان میں اترنا بذات خود دعوت تبلیغ کا ایک مؤثر نمونہ ہے۔

مولانا نصیر الدین جلد سے جلد روانہ ہونا چاہتے تھے لیکن مسئلہ والدہ کی اجازت کا تھا۔ یہ موقع یوں میسر آگیا کہ انہی دنوں رمضان شریف آگئے۔

سید نصیر الدین کی والدہ ماجدہ حضرت شاہ ولی اللہ کی پوتی تھیں لیکن اس کے باوجود پردے کی پابندی کی وجہ سے جامع مسجد دہلی میں کوئی نماز ادا نہ کرسکی تھیں۔ یہ تمنا دل میں مچلتی رہتی تھی کہ جامع مسجد میں نماز ادا کریں۔ کئی مرتبہ بیٹے کے سامنے بھی اس آرزو کا اظہار کرچکی تھیں۔ مولانا نصیر الدین نے اجازت کی تمہید تیار کرنے کی غرض سے اپنی والدہ کو جامع مسجد لے جانے کی تیاری کرلی۔ والدہ محترمہ جامع مسجد پہنچیں۔ خدا کا شکر ادا کیا اور نماز میں مصروف ہوگئیں۔ والدہ کو خوش دیکھ کر آپ حرف طلب زبان پر لے آئے۔

ماں کی اجازت ملتے ہی مختصر سا رخت سفر باندھا اور عرب سرائے میں قیام پذیر ہوگئے۔ عرب سرائے سے روانہ ہوکر پہلے ریواڑی پہنچے پھر جے پور میں قیام کیا۔ یہاں سے روانہ ہوکر ٹانک پہنچے جہاں نواب وزیر الدولہ کا دور حکومت تھا۔ وہاں بہت سے لوگ آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے۔ یہ قافلہ اجمیر پہنچا اور پھر اردگرد کے شہروں سے ہوتا ہوا سندھ میں داخل ہوا جہاں مختلف مقامات پر قیام ہوا۔ سندھ کے علما اور مشائخ سے تبادلہ خیال کیا۔

ان مرحلوں سے گزرنے کے بعد یہ قافلہ مزاری بلوچوں کے علاقے میں پہنچا اور اسی علاقے کو قیام کے لیے منتخب کرلیا پھر آپ ستھانہ تشریف لے گئے اور اسی کو جہاد حریت کا مرکز بنالیا۔

مولانا نصیر الدین کے جہادی قافلے نے کوچ شروع کیا تو امداد اللہ ابھی درجہ وسطیٰ کی کتابیں پڑھ رہے تھے۔ استاد کے اس سفر نے ان کے دل و دماغ پر ایسا اثر کیا کہ کتابوں کی ورق گردانی بار معلوم ہونے لگی چنانچہ آپ نے رواج کے مطابق درسی کتابوں کی تکمیل نہیں کی مگر ذاتی مطالعے میں مشغول ہوگئے۔ احادیث پر آپ کی نظر بہت وسیع تھی اور اسرار شریعت و طریقت کے ماہر تھے۔

مولانا نصیر الدین بلوچوں کے علاقے میں تھے اور جہاد حریت کے لیے تیاری کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے کہ پیغام اجل آگیا۔

اس اچانک موت نے پانسہ ہی پلٹ کر رکھ دیا۔ ان کے خسر شاہ محمد اسحاق نے جو اس تحریک کے روح رواں تھے رخت سفر باندھا اور مکہ مکرمہ منتقل ہوگئے۔ وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ وہاں رہ کر انہوں نے ہندوستان تحریک کی رہنمائی اور مالی امداد فراہم کرنے کا کام شروع کردیا۔ انگریز ان پر پوری نظر رکھے ہوئے تھے کیونکہ اب ہندوستان میں انگریزوں کے قدم جمنے لگے تھے۔ یہاں کے مغل حکمران انگریزوں کے دست نگر بن گئے تھے۔ راجا اور نواب بھی اپنی حفاظت کے لیے انگریزوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ صرف علما تھے جو انگریزوں کے خلاف ڈٹے ہوئے تھے۔ انگریز نہیں چاہتا تھا کہ علما کی طاقت بڑھے اور ان کے عزائم میں سد راہ بنے۔ انگریزوں نے کوشش کی کہ شاہ محمد اسحاق کو مکہ سے نکال دیا جائے۔ انہیں جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے شیخ الحرم کو بیچ میں ڈال کر معاملے کو درست کرلیا لیکن اس شرط پر کہ وہ ایک پناہ گزیں کی حیثیت سے رہ سکتے ہیں۔ ان کی تمام کارروائیوں پر قدغن لگادی گئی لہٰذا ان کی وہ تمام آرزوئیں اور امنگیں دل ہی میں رہ گئیں جو مکہ جانے سے قبل انہوں نے ہندوستان تحریک کی مدد کے لیے سوچی تھیں۔

ان پابندیوں کی وجہ سے ہندوستان کی تحریک میں اضمحلال پیدا ہوگیا چنانچہ اس تحریک کو قائم و دائم رکھنے اور اس میں پھر نئی روح پھونکنے کے لیے حضرت مولانا مملوک علی نانوتوی کی زیر صدارت ایک بورڈ بنایا گیا جس کے اہم اور خصوصی ارکان مولانا قطب الدین دہلوی، مولانا مظفر حسین کاندھلوی اور مولانا عبدالغنی دہلوی تھے۔

حضرت مولانا نصیر الدین کا انتقال ہوگیا تو امداد اللہ کو کسی مرشد کی تلاش ہوئی۔ بہت دن تلاش میں سرگرداں

رہے سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کسے رہنما کیا جائے۔ بہت سے نام سامنے آئے تھے لیکن دل کسی طرف نہ جھکتا تھا۔ ایک روز جو سونے کے لیے لیٹے اور نیند آنکھوں میں اتر آئی تو ایک خواب کے ذریعے بشارت مل گئی۔ آپ نے دیکھا کہ مجلس اعلیٰ واقدس سرور عالم مرشد اتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہیں۔ غایت رعب سے قدم آگے نہیں بڑھتا ہے کہ ناگاہ جدامجد حضرت حاجی حافظ بلاقیؒ تشریف لائے اور ان کا ہاتھ پکڑ کر حضور کی بارگاہ میں پہنچا دیا۔ حضور اکرمؐ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک بزرگ کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد آنکھ کھل گئی۔

خواب سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ انہیں اپنا ہاتھ کس کے ہاتھ میں دینا ہے لیکن وہ بزرگ ہیں کون یہ عقدہ اپنی جگہ برقرار تھا۔ خواب میں ان کے نام کی صراحت نہیں کی گئی تھی۔ صورت سے بھی وہ بزرگ ان کے لیے اجنبی تھے۔ عجیب انتشار کا عالم تھا۔ امداد اللہ صاحب ایک ایک صورت میں اس صورت کو تلاش کرتے پھرتے تھے۔ ”کسی تصویر سے ملتی نہ تھی صورت تیری۔“

کئی سال اسی پریشانی میں گزر گئے اور گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا۔ ایک روز اپنے ایک استاد مولانا محمد قلندر محدث کے پاس بیٹھے تھے کہ یہی تذکرہ نکل آیا۔ مولانا قلندر نے ان کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے فرمایا۔ ”تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔ موضع لوہاری یہاں سے قریب ہے وہاں جاؤ اور حضرت میاں جی نور محمد سے ملاقات کرو۔ شاید تمہارا دلی مقصد پورا ہو۔“

ان کی یہ نصیحت دل کو ایسی لگی کہ آپ پاپیادہ لوہاری کی طرف روانہ ہو گئے۔ آستانہ شریف پہنچے اور یہ دیکھ کر وارفتگی طاری ہو گئی کہ وہی بزرگ سامنے کھڑے ہیں جن کی صورت انور کو خواب میں دیکھا تھا۔ یہ بزرگ حضرت میاں حاجی نور محمد تھے۔ یہی وہ تھے حضور اکرمؐ نے امداد اللہ صاحب کا ہاتھ جن کے ہاتھ میں دیا تھا۔ قدموں میں گر پڑے بڑا دل تھا کہ بے ہوش نہیں ہوئے۔ میاں جی نے بہ کمال شفقت اٹھایا اور سینے سے لگا لیا۔

میاں جی نور محمد سید احمد شہید بریلوی سے بیعت تھے اور اتفاق سے انہی دنوں بیعت ہوئے تھے جب امداد اللہ بہ عمر صغیر سنی سید احمد کی گود میں دیے گئے۔ گویا کسی کشش نے آپ کو اسی طرف کھینچ لیا۔ سید احمد بریلوی کے خلیفہ کے مرید ہو گئے۔ ایک دائرہ تھا جو مکمل ہوا۔

حضرت میاں جی نور محمد سے آپ نے طریقہ چشتیہ میں بیعت کی اور آپ کے زیر تربیت سلوک طے کر کے خرقہ خلافت حاصل کیا۔

واپس تھانہ بھون آئے اور طریقت وسلوک کی مزید منزلیں طے کرنے لگے۔

☆☆☆

حضرت میاں جی نور محمد اگرچہ متعدد سلسلوں کے جرعہ نوش اور متعدد مرشدین سے صاحب اجازت تھے لیکن اپنے مقام ومرتبہ اور خود کو کچھ نہ سمجھنا طبیعت کا حصہ بن گیا تھا اس لیے بہت کم لوگوں کو بیعت کیا اور محض چند لوگوں کو اجازت و خلافت عطا فرمائی۔ ایک گفتگو کے دوران میں مولانا نصر اللہ خان خورشگی نے میاں جی سے بطور خاص گزارش کی کہ اپنے خلفا میں سے جس نے بھی سیر وسلوک کی منزل مکمل کی ہے اسے اپنا جانشین طریقت نامزد فرما دیجیے۔ حضرت میاں جی نے فرمایا، حافظ ضامن ہیں جنہوں نے میری رہنمائی میں سیر سلوک مکمل کی ہے۔ تھانہ بھون کے رہنے والے امداد اللہ ہیں۔ مولانا نصیر اللہ نے عرض کیا کہ کسی روز اہل علم کو اکٹھا کر کے اس کا اعلان فرما دیں۔ ہو سکتا تھا کہ میاں جی اس مشورے پر عمل کر لیتے لیکن ہوا یہ کہ کچھ دن بعد ہی میاں جی کا انتقال ہو گیا ورنہ وہ اپنا خلیفہ اور جانشین حضرت امداد اللہ ہی کو مقرر فرماتے۔

مولانا نصیر الدین کے انتقال کو پانچ سال گزر چکے تھے لیکن مفارقت کا صدمہ کم نہیں ہوا تھا۔ میاں جی نور محمد کو اپنا رہنما بنایا تھا۔ ان کی رہنمائی میں سیر وسلوک کی منزلیں طے کی تھیں۔ ان کے اٹھ جانے کے بعد یہ سہارا بھی چھن گیا۔ اب ہندوستان میں جی گھبرانے لگا تھا۔ ایک دن دل میں ہوک سی اٹھی۔ حج کا زمانہ بھی قریب تھا۔ دل میں سمائی کہ حج پر جایا جائے۔ حج بھی ہو جائے گا حضورؐ کے قدموں کی زیارت بھی ہو گی اور حضرت شاہ محمد اسحاق سے بھی ملاقات ہو جائے گی جو عرصہ دراز سے مکہ مکرمہ میں تھے اور تحریک آزادی ہند کے لیے جو بن پڑ رہا تھا کر رہے تھے۔ حضرت امداد اللہ، اللہ کا نام لے کر حج بیت اللہ کو روانہ ہو گئے۔

یہ بھی گویا ایک خاص کام کے لیے بلاوا تھا جس کا اظہار بعد میں ہوا۔

حج کے ارکان وایام سے گزرنے کے بعد آپ ایک روز مدینہ منورہ میں مسجد نبوی میں ریاض الجنہ کے مقام پر

مراقبے کی حالت میں تھے کہ انہیں یوں لگا جیسے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبر مقدس سے خود بصورت میاں جی نکلے اور ایک لپٹا اور بھیگا ہوا عمامہ اپنے دست مبارک میں لیے ہوئے تھے جو حضرت امداد اللہ کے سر پر غایت شفقت سے رکھ دیا اور واپس تشریف لے گئے۔

جس طرح دربار نبوی سے بذریعہ خواب حضرت میاں جی نور محمد کی مریدی کا شرف بخشا گیا تھا اور حضورؐ نے ان کا ہاتھ میاں جی کے ہاتھ میں دیا تھا اسی طرح مراقبہ کی حالت میں یہ بتایا گیا کہ تم ہی خلیفہ خصوصی اور عمامہ امامتِ امت کے حق دار ہو۔

اس مراقبے کی صداقت اس وقت بھی ظاہر ہوگئی جب روانہ ہوتے وقت آپ نے شاہ محمد اسحاق سے ملاقات کی اور ان سے تحریک کا لائحہ عمل اور پروگرام معلوم کیا۔ شاہ اسحاق نے امداد اللہ صاحب جواب حاجی امداد اللہ ہو چکے تھے کو بہت سی ہدایات کیں اور انہیں اس تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے ہندوستان میں بنائے گئے بورڈ کا صدر بنا دیا۔

جب آپ ہندوستان تشریف لائے تو جو لوگ اس سلسلے اور تحریک سے وابستہ تھے انہوں نے حضرت حاجی امداد اللہ کو اپنے تعلقات کا مرکز بنا لیا۔ علمائے ہند کی ایک بہت بڑی جماعت آپ کے گرد جمع ہوگئی۔ اب قدرت خود بخود ایسے لوگوں کو آپ کی طرف روانہ کر رہی تھی جو تحریک آزادی کے لیے نہایت مفید ثابت ہونے والے تھے۔ ان میں رشید احمد گنگوہی اور قاسم نانوتوی نمایاں تھے۔

☆☆☆

حضرت رشید احمد گنگوہی طالب علمی کے اعلیٰ مدارج میں تھے۔ ایک روز ان کے استاد سبق پڑھا رہے تھے کہ ایک شخص نیلی لنگی کندھے پر ڈالے آیا۔ انہیں دیکھ کر استاد مکرم کھڑے ہوگئے اور فرمایا۔ ''لو بھائی حاجی صاحب آگئے۔'' پھر رشید احمد گنگوہی سے مخاطب ہوئے۔ ''لو بھائی رشید احمد اب سبق پھر ہوگا۔'' رشید احمد یہ سن کر سخت افسردہ ہوئے کیونکہ یہ سبق ہفتہ میں دو دن ہوا کرتا تھا۔ ایک دن ضائع ہوگیا۔ بے اختیار منہ سے نکلا۔

''اچھا حاجی آیا ہمارا تو سبق چلا گیا۔''

اس پر ان کے ایک ساتھی قاسم نانوتوی نے انہیں ٹوکا۔ ''ایسا مت کہو۔ یہ حاجی امداد اللہ ہیں۔'' اور اس کے بعد ان کے فضائل و برکات بتانے لگے۔ رشید احمد گنگوہی کا ان سے یہ پہلا تعارف تھا۔

قاسم نانوتوی حاجی صاحب سے واقف تھے۔ اس لیے کہ دونوں کا وطن ایک تھا۔ اس دن کے بعد سے وہ ان کی بزرگی اور کرامات کا تذکرہ رشید احمد گنگوہی کے سامنے کرتے رہتے تھے۔ حضرت گنگوہی اس وقت تک کسی سے بیعت نہیں ہوئے تھے۔ چاہتے ضرور تھے لیکن اطمینان کلی حاصل کیے بغیر کسی کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دینا نہیں چاہتے تھے۔ اب آپ حضرت حاجی صاحب کی زیارت سے بھی مشرف ہو چکے تھے لیکن اب بھی دل کسی ایک طرف مائل نہیں تھا کبھی دل اپنے استاد شریعت مولانا عبدالغنی کی طرف جھکتا تھا کبھی حضرت حاجی صاحب کی طرف۔ اسی حیص بیص میں بہت سا وقت گزر گیا۔

پے در پے تین یا چار ملاقاتیں ہو چکی تھیں کہ ایک ملاقات میں حضرت حاجی صاحب نے مولانا گنگوہی سے دریافت فرمایا۔ (جب ان کا دور طالب علمی ختم ہو چکا تھا)

''میاں رشید احمد اللہ کا نام سیکھنے اور مرید ہونے کی بھی تمنا ہے یا نہیں؟''

''حضرت جی تو بہت چاہتا ہے۔''

''کہاں اور کس کی طرف میلان ہے؟''

''حضرت اب تک جتنا بھی غور و فکر کیا ہے دو حضرات میں سے کسی ایک کا غلام بنوں گا یا حضرت شاہ عبدالغنی کا یا آپ کا۔''

''ہاں صاحب شاہ عبدالغنی، صاحب علم بھی ہیں اور شیخ بھی، مشہور محدث بھی۔ علما ہی کی طرف جھکتے ہیں مجھے کیوں شامل کرتے ہو۔ میں بے چارہ پڑھا نہ لکھا۔''

بات پھر آئی گئی ہوگئی۔ انہی دنوں اتفاق یہ ہوا کہ حضرت گنگوہی کسی مسئلے کے حل کے سلسلے میں قبلہ حاجی صاحب کے پاس تھانہ بھون گئے۔ اس وقت حاجی صاحب اپنی سہ دری میں بیٹھے تلاوت قرآن میں مشغول تھے۔ حضرت گنگوہی ایک طرف بیٹھ گئے اور ختم تلاوت کے بعد سلام مسنون پیش کیا۔ مسئلہ تو چٹکی بجاتے حل ہوگیا لیکن دل کی بات کہنے میں بڑی دیر لگی۔

''حضرت آپ نے دل کا حال پوچھا تھا تو دل کی حالت یہ ہے کہ میلان آپ کی جانب ہے۔ مجھے بیعت سے نوازیں۔''

حضرت حاجی صاحب نے طلب صادق کو آزمانے کے لیے انکار کر دیا۔ اب حالت یہ تھی کہ ادھر سے اصرار

ہو رہا تھا ادھر سے انکار۔ ایک طرف بے نیازی دوسری طرف احتیاج۔

اب انہیں کسی ایسے بزرگ کی تلاش ہوئی جو حاجی صاحب کو رضامند کر سکے۔ یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ حضرت گنگوہی کی ملاقات حافظ محمد ضامن سے ہوئی اور انہوں نے تھانہ بھون آنے کا سبب دریافت کیا۔

حضرت گنگوہی نے فرمایا۔ ''جدھر دل کا میلان ہے وہ قبول نہیں کرتے دوسرے اپنی طرف کھینچتے ہیں عجیب قصہ ہے۔''

جناب حافظ نے دلاسا دیا۔ ''ابھی جلدی کیا ہے۔ چند روز ٹھہرو۔ یہاں کے حالات دیکھو۔'' آخر جب آپ کی پختگی ہر طرح ظاہر ہو گئی تو جناب حافظ ضامن صاحب نے حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں سفارش کا اجر حاصل فرمایا اور تھانہ بھون کی حاضری سے دو تین روز کے بعد آپ کو سلاسل اربعہ میں حضرت حاجی صاحب کے ہاتھ پر بیعت کا شرف حاصل ہوا۔

جب بیعت کا وقت قریب آیا تو حضرت گنگوہی نے عرض کیا۔ ''حضرت، مجھ سے ذکر شغل اور محنت و مجاہدہ کچھ نہیں ہو سکتا اور نہ رات کو اٹھا جاتا ہے۔''

حضرت حاجی نے فرمایا۔ ''اچھا تو پھر کیا مضائقہ ہے؟''

اس شرط کے باوجود بھی حضرت حاجی امداد اللہ نے آپ کو بیعت سے سرفراز کر دیا اور آپ کو بارہ تسبیح تلقین فرمائیں۔

رات آئی تو حضرت گنگوہی کی چارپائی اپنی چارپائی کے قریب بچھائی۔ آخر شب میں جب حاجی صاحب حسب معمول عبادت کے لیے اٹھے تو مولانا گنگوہی کی بھی آنکھ کھل گئی لیکن چونکہ مولانا گنگوہی نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ رات کو نہیں اٹھ سکتے اس لیے حاجی صاحب نے انہیں اٹھانا مناسب نہ سمجھا اور مسجد چلے گئے۔ مولانا گنگوہی بستر پر لیٹے رہے لیکن نیند اب کہاں آنے والی تھی۔ بہت کوشش کی کہ نیند آ جائے مگر حق تعالیٰ کو تو ان سے کام ہی دوسرا لینا تھا۔ آخر بستر سے اٹھ گئے۔ وضو کیا اور مسجد تشریف لے گئے۔ ایک گوشے میں قبلہ حاجی صاحب مصروف عبادت تھے دوسرے گوشے میں وہ جا کھڑے ہوئے۔

یہ بھی حاجی صاحب کی کرامت ہی تھی کہ شرط ختم ہوئی۔ تا وصال بارہ تسبیح من جملہ دیگر مراقبہ و مشاغل ادا کرتے رہے۔ بیعت کرتے وقت حاجی صاحب سے کہا تھا کہ مجھ سے ذکر و شغل اور مجاہدات نہیں ہوں گے لیکن بالآخر پیر نے مرید کو اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ مولانا گنگوہی بھی اسی طرح مجاہدات کرنے لگے جیسے حاجی صاحب کرتے تھے۔

آنے والے وقت کے لیے قدرت کچھ لوگوں کو تیار کر رہی تھی۔ رشید احمد گنگوہی کے بعد مولانا محمد قاسم نانوتوی آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے۔ اگرچہ مولانا محمد قاسم کے تعلقات حاجی صاحب سے، مولانا گنگوہی سے پہلے کے تھے لیکن بیعت میں مولانا گنگوہی سبقت لے گئے۔ عجیب بات یہ ہے کہ مولانا نانوتوی اکثر و بیشتر مولانا گنگوہی کو قبلہ حاجی صاحب کی کرامات کے بارے میں بتاتے رہتے تھے اور شاید انہی کے شوق دلانے پر وہ حاجی صاحب کے مرید ہوئے تھے لیکن خود مولانا نانوتوی پہل نہ کر سکے۔ یہ سعادت مولانا گنگوہی کے حصے میں آئی۔ مولانا گنگوہی کے بعد مولانا قاسم نانوتوی نے بھی حاجی صاحب کے دست مبارک پر بیعت کر لی بلکہ اس بیعت میں بھی مولانا گنگوہی کا ہاتھ تھا۔ مولانا گنگوہی اکثر فرمایا کرتے تھے۔

''مولوی محمد قاسم نے حاجی صاحب کی تعریفیں کر کر کے ہمیں مرید کروایا اور بعد میں اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب) سے اصرار و کوشش کر کے مولوی محمد قاسم صاحب کو ہم نے مرید بنوایا۔''

اسی طرح مولانا عاشق الٰہی صاحب نے بھی فرمایا۔ ''مولانا نانوتوی کو اعلیٰ حضرت کے ہاتھ پر بیعت کروانے کی کوشش کا ثواب بھی حضرت گنگوہی کو حاصل ہوا۔''

☆☆☆

حاجی امداد اللہ کو موروثی جائداد کا ایک معقول حصہ ملا تھا جو ان کی شاہانہ گزر اوقات معشیت کے لیے کافی ہوتا لیکن آپ تو فقیرانہ سادگی کو شعار بنا چکے تھے۔ یہ جائداد طبیعت پر بار معلوم ہوتی تھی اس لیے ساری جائداد اپنے بھائی کے نام کر دی اور مسجد کا حجرہ مسکن بنا لیا۔

حاجی صاحب گوشہ گم نامی کو پسند فرماتے تھے۔ جہاں تک ہوتا اپنا حال لوگوں سے چھپائے رہتے مگر خوشبو کہیں کسی کے روکے رکتی ہے۔ رفتہ رفتہ آپ کی علیت اور خوارق عادات و واقعات کی شہرت پھیلتی گئی۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق نے جبہ سائی کو فخر سمجھا۔ طالب دین اور نیک بندوں کی آمد شروع ہو گئی۔ دریا دلی مجبور کر رہی تھی۔ تنگ دستی کے باوجود وسیع خوان پر مہمانوں کی ضیافت بھی فرماتے رہے۔ ان میں وہ لوگ بھی ہوتے جو دوسرے شہروں سے آتے اور کئی کئی دن آپ کے مہمان رہتے۔ آخر ایک روز آپ کی

بھاوج نے آپ کے پاس پیغام بھیجا۔

''موروثی جائداد آپ منتقل فرما چکے۔ مجھے معلوم ہے خود بڑی مشکل سے گزارہ کر رہے ہوں گے کیونکہ دوسرا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں۔ آپ کے پاس جتنے مہمان آتے ہیں یقیناً آپ پر بار معلوم ہوں گے۔ آپ اس کا اظہار نہ فرمائیں لیکن ہماری غیرت یہ گوارا نہیں کرتی کہ آپ کی جائداد کا حصہ بھی ہمارے تصرف میں ہے اور آپ تکلیف اٹھا رہے ہیں لہٰذا آج سے جتنے مہمان آئیں ان کی اطلاع مجھے پہنچا دیں۔ ان کا کھانا دونوں وقت کا میرے گھر سے آئے گا۔''

حاجی صاحب نے پہلے تو انکار کیا لیکن بھابی صاحبہ نے اتنے اخلاص سے اصرار کیا کہ آپ نے قبول فرما لیا لہٰذا مہمانوں کا کھانا وہاں سے آنے لگا۔

یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ ایک روز حاجی صاحب نے خواب دیکھا کہ آپ کی بھاوج آپ کے مہمانوں کے لیے کھانا پکا رہی ہیں اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور آپ کی بھاوج سے فرمایا۔ ''اٹھ تو اس قابل نہیں کہ امداد اللہ کے مہمانوں کے لیے کھانا پکائے۔ اس کے مہمان علما ہیں۔''

یہ خواب دیکھ کر آپ حیران ہوئے لیکن اس کی تعبیر اس وقت ظاہر ہوئی جب حضرت گنگوہی آپ کے پاس تشریف لائے اور بیعت کی۔ اس کے بعد مولانا نانوتوی نے بیعت فرمائی۔ علما میں حضرت گنگوہی پہلے عالم تھے جو آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ آپ کے بعد تو گویا علما کا تانتا بندھ گیا۔ چار دانگ عالم سے جوق در جوق علما کی آمد شروع ہوگئی اور حضرت حاجی صاحب کو علما کا شیخ اور مرید بننے میں وہ رتبہ حاصل ہوا جس کی نظیر دنیا میں شاید ایک دو مل سکے۔ اس خواب ہی کا ثمر تھا کہ قریباً سات آٹھ سو علما سے زیادہ حاجی صاحب کے مرید ہوئے اور علما بھی کوئی معمولی نہیں بلکہ بڑے جید اور ثقہ جن میں ایک ایک عالم ہزاروں شاگرد رکھتا تھا مثلاً حضرت مولانا عبدالرحمٰن کاندھلوی، حافظ محمد یوسف ابن حافظ محمد ضامن، مولانا فیض الحسن سہارن پوری اور خود مولانا قاسم نانوتوی۔

یہ تو وہ فوج تھی جو حاجی صاحب کے ذریعے تیار ہو رہی تھی جو آگے چل کر مسلمانوں کی دینی تعلیم کے فروغ، ان کی باطنی اصلاح و تربیت اور آزادی وطن کی تحریک کے لیے جانیں قربان کرنے والی تھی۔

☆☆☆

حضرت حاجی امداد اللہ صرف تارک الدنیا صوفی نہ تھے بلکہ جس سلسلے سے وابستہ ہوئے تھے اس کی رعایت سے ایک مجاہد بھی تھے۔ بچپن میں سید احمد شہید کی گود میں دیے گئے تھے۔ آپ کے مرشد اوّل سید نصیر الدین سید احمد شہید کی جماعت کے اہم رکن تھے۔ مرشد ثانی کا تعلق بھی اس مجاہدانہ تحریک سے تھا۔ اس تحریک کی جس طرح ناکامی ہوئی اس کا قلق دل کو افسردہ کیے رہتا تھا۔ ایک زخم تھا جو بھرتا نہیں تھا۔ انگریز برابر قابض ہوتے جا رہے تھے۔ مسلمانوں کو انگریزوں کی مسلمان دشمن پالیسیوں سے جو نقصان اٹھانے پڑ رہے تھے وہ آنکھوں سے نظر آ رہے تھے۔ انگریزوں کی اسلام دشمنی سے کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ آزادی کی تحریک سرد پڑ گئی تھی لیکن علما کے دلوں میں آگ کی طرح جل رہی تھی۔ ایک چنگاری بھی جو شعلہ بننے کے انتظار میں تھی۔

اس چنگاری کو شعلہ بننے کا موقع اس وقت مل گیا جب 1857ء کی تحریک شمالی ہند کے اطراف خصوصاً دہلی کے اردگرد کے علاقوں میں چلنی شروع ہوئی۔ اس تحریک نے ان حضرات میں ایک نئی حرکت پیدا کی جن کے دل میں برطانوی سامراج کی طرف سے ایک تلخ جذبہ ہمیشہ سے موجود تھا اور جن کو حریت، جہاد اور اسلام کی تعلیمات روحانیہ سے انتہائی شغف اور حسن اعتقاد تھا یہ وہی حضرات تھے جو بالاکوٹ (سرحد) کی ناکامی اور آپس کے نفاق کی وجہ سے ہمیشہ دلگیر رہتے تھے۔ ان بزرگوں نے محسوس کر لیا کہ اس انقلاب میں حصہ لینا فرض اور لازم ہے۔

اطراف و جوانب میں ان حضرات کا تقویٰ اور دین داری بھی مثال بنی ہوئی تھی۔ اسی لیے ان پر بہت زیادہ اعتماد بھی تھا۔ مریدین اور تلامذہ کے علاوہ عام مسلمان بھی بے حد معتقد تھے۔ اس لیے بہت تھوڑی مدت میں جوق در جوق لوگوں کا اجتماع ہونے لگا۔ مجاہدین ہزاروں کی تعداد میں جمع ہونے لگے۔

یہ مردان احرار معلوم نہیں کتنے سالوں سے مکمل آزادی کی تمنا اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے تھے۔ ان کے لیے یہ موقع غنیمت تھا کیونکہ یہ وہ موقع تھا جبکہ ملک کا چپہ چپہ آزادی کی صداؤں سے گونج رہا تھا۔ انگریزوں کی چیرہ دستیوں نے عوام کے دل نفرت سے بھر دیے تھے۔ اب بنے بنائے مجاہدین میسر آ سکتے تھے۔

تھانہ بھون کے ایک اجتماع میں حاجی امداد اللہ کے ہاتھ پر بیعت کر کے ان کو امیر مقرر کیا گیا۔ انہوں نے پہلا

کام تو یہ کیا کہ جماعتی نظم جواب تک ایک سیاسی اور اصلاحی پارٹی کی حیثیت رکھتا تھا اس کو ایک نظام حکومت کی شکل دے دی گئی۔

حاجی صاحب امیر، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا گنگوہی، حافظ محمد ضامن اور کئی دوسرے زعما اور اکابر امت کو فوج، ڈیفنس اور عدل و قانون کے شعبے سپرد کیے گئے۔ تھانہ بھون کے اطراف میں اسلامی حکومت قائم ہو گئی۔ انگریزی عمل دار نکال دیے گئے اور انگریزی حکومت کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا۔ حاجی صاحب نے قصبے کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور دیوانی و فوج داری کے جملہ تنازعات شرعی قوانین کے مطابق قاضی بن کر فیصل فرمانے شروع کر دیے۔

اس موقع پر ضروری تھا کہ مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کو بھی مکمل نظم و ضبط قائم کرنے اور اس نظام میں داخل ہونے کا مشورہ دیا جائے چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے نواب شیر علی مراد آبادی کو جو بادشاہ کے بے تکلف مصاحب تھے دہلی بھیجا گیا مقصد اس کا بادشاہ کو یہ باور کروانا تھا کہ بادشاہ انگریزوں کے خلاف اپنی طاقت استعمال کر کے دہلی کو ان سے پاک کرنے کی سعی کریں اور ہم تھانہ بھون سے جہاد کرتے ہوئے دہلی کی طرف بڑھیں۔ اگر یہ حکمتِ عملی صحیح طور پر اپنالی گئی تو دہلی کا آزاد ہو جانا عین ممکن ہے۔

یہ تدبیر اس وقت کی جا رہی تھی جب باغی فوجیں میرٹھ سے چل کر آ چکی تھیں اور دہلی کے دروازے پر دستک کا فرض پورا کر چکی تھیں اور بادشاہ کو اپنی مدد کے لیے پکار چکی تھیں۔ بادشاہ کے جواب بھی سب سن چکے تھے۔ بادشاہ نے باغیوں سے مخاطب ہو کر نہایت عاجزی سے کہا تھا۔

”سنو بھائی، مجھے بادشاہ کون کہتا ہے۔ میں تو فقیر ہوں ایک تکیہ بنائے اپنی اولاد کو لیے بیٹھا ہوں۔ یہ بادشاہت تو بادشاہوں کے ہمراہ گئی۔ میرے باپ دادا بادشاہ تھے جن کے قبضے میں ہندوستان تھا۔ سلطنت تو برسوں پہلے میرے گھر سے جا چکی...... میں تو گوشہ نشین آدمی ہوں۔ مجھے ستانے کیوں آئے ہو۔ میرے پاس خزانہ نہیں کہ تم کو تنخواہ دوں گا۔ میرے پاس فوج نہیں کہ تمہاری مدد کروں گا۔ میرے پاس ملک نہیں کہ تحصل کر کے تمہیں نوکر رکھوں گا۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ مجھ سے کسی طرح کی توقع مت رکھنا۔“

بادشاہ کے اس جواب کی گونج تھانہ بھون تک پہنچ چکی تھی۔ یہ خبریں بھی پہنچ چکی تھیں کہ نظم و ضبط نہ ہونے کی وجہ سے یہ بغاوت فساد میں بدل چکی ہے۔ دہلی جل رہا ہے۔ بادشاہ کی طرف سے مایوسانہ جواب سن کر باغی شہر میں پھیل گئے۔ اس بدامنی کا فائدہ اٹھا کر بدمعاش، چور اچکے اور لٹیرے بھی باغیوں میں شامل ہو کر ہاتھ صاف کر رہے ہیں۔ کوئی دکان کوئی مکان سلامت نہ رہا۔ شہر میں جتنے انگریز تھے قتل کر دیے گئے۔ سب کے سب تو قصوروار نہیں تھے۔ دشمنی تو انگریزوں سے تھی لیکن لوٹنے والے عام ہندوستانی کو بھی لوٹ رہے تھے۔ کوئی انہیں روکنے والا نہیں تھا۔ انگریز موجود نہیں تھے بادشاہ نے ہاتھ اٹھا لیا تھا۔ اس موقع پر ضروری تھا کہ فساد کو جہاد میں بدلا جائے۔ اسی غرض سے نواب شیر علی مراد آبادی کو بادشاہ کے پاس بھیجا گیا تھا لیکن یہ سفارت کامیاب نہیں رہی۔ بادشاہ اس وقت دو کشتیوں میں سوار تھا۔ باغیوں سے بھی بگاڑ نہیں چاہتا تھا اور انگریزوں سے بھی ہمدردی رکھتا تھا اسی لیے کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پا رہا تھا۔

شہر پر باغیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ چھاؤنی خالی ہو چکی تھی۔ میرٹھ سے جو انگریزوں کی کمک آئی تھی اسے پہلے ہی حملے میں باغیوں نے شکست دے دی تھی۔ کچھ مارے گئے کچھ جنگلوں میں روپوش ہو گئے۔ شہر میں صرف ایک جگہ انگریزوں کا وجود تھا میگزین انگریزوں کے ہاتھ سے نہیں نکلا تھا۔ یہ میگزین بھی اڑا دیا گیا۔

دہلی میں جو باغی پڑاؤ ڈالے بیٹھے تھے ان میں نظم و نسق کی سخت کمی تھی۔ فوجی تنظیم نام کو نہیں تھی۔ ایک بے پناہ وجود تھا جس کی بدولت انقلاب تو برپا ہو گیا تھا لیکن اس انقلاب کو برقرار رکھنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی جا رہی تھی۔

اتنے میں بخت خاں روہیلہ، روہیل کھنڈ کے باغی سپاہیوں کے ساتھ دہلی میں داخل ہوا۔ یہ ایک پرانا صوبے دار توپ خانے کا بہادر اور دانش مند شخص تھا۔ اس نے آتے ہی ایسے اقدامات کیے کہ شہر میں امن و امان قائم ہو گیا۔ بادشاہ نے بھی اس کی قدر کی اور اسے کل فوج کا کمانڈر انچیف مقرر کر دیا۔

مولانا سرفراز علی امیر جماعت کی حیثیت سے اس کے ساتھ تھے اور بخت خان کی سربراہی فرما رہے تھے۔ اس موقع پر شرعی مطالبات پورے کرنے کے لیے اور اس ہنگامے کو جہاد میں تبدیل کرنے کے لیے جامع مسجد میں علمائے کرام کا اجتماع ہوا۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ فتح ابھی دہلی تک محدود تھی۔ دیگر علاقوں پر اب بھی انگریز قابض

تھے۔ پورے ہندوستان میں انگریزوں کا مقابلہ کرنے کے لیے جوش جہاد کی ضرورت تھی۔ یہی سید احمد شہید کے خوابوں کی تعبیر ہو سکتی تھی۔

ان علما نے نہایت غور وفکر کے بعد ایک فتویٰ جہاد کا مرتب کیا اور تمام علمائے نے اس پر دستخط کر دیے۔ اس فتوے کے بعد تھانہ بھون کی جماعت کا مسئلہ حل ہو گیا۔ اس فتوے کے انتظار ہی میں وہ اب تک حکومت برطانیہ کے خلاف کوئی جہادی کارروائی نہ کر سکے تھے۔ اب جو یہ فتویٰ آ گیا کہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا جہاد ہے تو راستہ بالکل صاف تھا۔

یہ فتویٰ جیسے ہی تھانہ بھون پہنچا مجلس شوریٰ کا اجلاس طلب کر لیا گیا اس کی صدارت حضرت حاجی امداد اللہ نے فرمائی۔ تمام اراکین شوریٰ نے اس فتوے کی تصدیق وتوثیق کی اور راست اقدام کا فیصلہ کیا۔ صرف مولانا شیخ محمد تھانوی نے اس کی مخالفت کی۔ اس مخالفانہ رائے پر مولانا قاسم نانوتوی اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے۔ ”حضرت کیا وجہ ہے کہ آپ ان دشمنان دین ووطن کے خلاف جہاد کو نہ صرف فرض بلکہ جائز بھی نہیں سمجھتے؟“

حضرت مولانا نے عذر پیش کیا۔ ”اس لیے کہ ہمارے پاس آلات حرب وضرب نہیں ہیں بلکہ ہم بالکل بے سروسامان ہیں۔ جہاد کے لیے سب سے بڑی شرط امام کی ہے۔ امام کہاں ہے کہ اس کی قیادت میں جہاد کیا جائے؟“

”نصب امام میں کیا دیر لگتی ہے۔ مرشد برحق حضرت حاجی صاحب موجود ہیں۔ ان کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کی جائے۔“ مولانا قاسم نے فرمایا۔

یہ سننا تھا کہ دیگر لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

”آپ (حاجی امداد اللہ) چونکہ ہمارے دینی سردار ہیں اس لیے دنیاوی نظم حکومت کا بار بھی اپنے سر رکھیں اور امیر المومنین بن کر ہمارے باہمی قضیے چکا دیا کریں۔ اس وقت چونکہ جہاد درپیش ہے لہٰذا ہماری سربراہی فرمائیں۔“

حضرت حاجی صاحب کو ان کی درخواست پر ان کے سروں پر ہاتھ رکھنا پڑا۔ ”ہمارا کوئی اقدام اس وقت تک نامناسب ہوگا جب تک مرکز میں ایک شرعی اور صالح نظام وجود پذیر نہ ہو اور ہمارے علاقائی نظام کا رابطہ اس مرکزی صالح نظام سے منسلک نہ ہو جائے۔ قانون، دنیاوی اور شریعت کی رو سے یہی بات درست ہے۔“ حاجی صاحب نے فرمایا۔

اب حاجی امداد اللہ مرکز بیعت جہاد تھے یعنی ان کے احکامات کے مطابق لڑنا تھا۔ حافظ محمد ضامن کو علم بردار جہاد بنایا گیا۔ رشید احمد گنگوہی جامع مجاہدین تھے کہ وعظ اور ترغیب سے مجاہدین کو مختلف دیہات وقصبات سے جمع کر کے میدان میں لائیں۔ حضرت نانوتوی امیر عسکر تھے۔

یہ تنظیم ان الفاظ میں بھی دہرائی گئی ہے۔

حضرت حاجی صاحب کی حیثیت امیر المومنین کی تھی۔ حضرت حافظ ضامن امیر جہاد تھے۔ حضرت قاسم نانوتوی کو کمانڈر انچیف مقرر کیا گیا اور حضرت گنگوہی وزیر لام بندی تھے۔

چند ہی دنوں میں لوگ جوق در جوق اکٹھے ہونے شروع ہو گئے۔ اس وقت ہتھیاروں پر پابندی نہیں تھی۔ عموماً لوگوں کے پاس ہتھیار ہوا کرتے تھے لیکن یہ ہتھیار پرانی قسم کے تھے۔ توڑے دار بندوقیں ہوا کرتی تھیں۔ کارتوسی رائفلیں صرف انگریزی فوجوں کے پاس تھیں۔ توپ کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس کے باوجود تھانہ بھون اور اس کے اطراف وجوانب میں اسلامی حکومت قائم کر لی گئی اور انگریزوں کے ماتحت حکام نکال دیے گئے۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ اقدام کس جانب ہو۔ ظاہر ہے دہلی کا مرکز ہی قبلہ نما بن سکتا تھا۔ سرفروشان دین ووطن ایک بہت بڑی منظم طاقت سے ٹکرانے کے لیے اپنے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے اور تھانہ بھون سے شاملی کی طرف مارچ کرنا شروع کر دیا جس کا نصب العین دہلی تھا۔

خبر آئی کہ انگریزوں کا ایک توپ خانہ سہارن پور سے شاملی کو بھیجا گیا ہے۔ ایک پلٹن اسے کھینچ کر لا رہی ہے۔ رات کو وہ پلٹن یہاں سے گزرے گی۔ یہ خبر لوگوں کے لیے باعث تشویش تھی۔ یہ فکر لاحق ہوئی کہ توپ خانے کا مقابلہ کیسے کیا جائے گا۔ حاجی امداد اللہ نے مولانا رشید احمد گنگوہی کو تیس چالیس مجاہدوں پر افسر مقرر کر دیا تھا۔ سڑک کے کنارے ایک باغ تھا۔ مولانا گنگوہی اپنے ساتھیوں کو لے کر اس باغ میں چھپ گئے اور حکم دیا کہ میں جیسے ہی اشارہ کروں ایک دم فائر کر کے ہلہ بول دینا۔ جب انگریزی پلٹن باغ کے سامنے پہنچی تو اشارہ ملتے ہی سب نے ایک ساتھ فائر کھول دیا۔ پلٹن اس ناگہانی آفت سے گھبرا گئی کہ خدا جانے کتنے لوگ یہاں چھپے ہوئے ہیں چنانچہ وہ توپ وہیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مولانا گنگوہی نے اس توپ کو کھینچ کر حضرت حاجی صاحب کی مسجد کے سامنے ڈال دیا۔ اس

جان بل

انگریزوں کا روایتی نام، اس کا اوّلین تحریری ذکر آرتھرناٹ کی کتاب ''تاریخ جان بل'' میں ملتا ہے جو 1712ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد اس لفظ کو عام مقبولیت حاصل ہوگئی اور اس سے انگریز مراد لیے جانے لگے۔

مرسلہ: آصف محمد۔ اسکاٹ لینڈ

واقعے نے مولانا گنگوہی کی فہم و فراست کا سکہ دلوں میں بٹھا دیا اور سب میں ایک نیا جوش پیدا ہوگیا۔

شاملی مرکزی مقام تھا۔ اس کا تعلق سہارن پور سے تھا۔ وہاں تحصیل بھی تھی۔ کچھ فوجی طاقت بھی وہاں موجود رہتی تھی۔ فیصلہ ہوا کہ شاملی پر قبضہ کرلیا جائے۔ جوش میں بھرے ہوئے مجاہدین نے لبیک کہا چنانچہ چڑھائی کردی گئی۔ مقصود یہ بھی تھا کہ شاملی کے قبضے کے بعد انگریزوں پر مجاہدین کا رعب طاری ہوجائے گا پھر دہلی تک پہنچنے میں آسانی ہوجائے گی۔ حضرت حاجی صاحب نے اجازت دی اور مجاہدین شاملی پہنچ گئے۔ تھوڑی بہت فوج جو شاملی میں موجود تھی مجاہدین کا مقابلہ کرنے سے عاجز تھی۔ اس نے خود کو تحصیل میں بند کرلیا اور فائرنگ شروع کردی۔ مجاہدین کھلی جگہ پر تھے چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی لہٰذا کافی جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس گھبراہٹ کے عالم میں مولانا نانوتوی کی نظر ایک چھپر پر پڑی۔ آپ نے وہ چھپر اٹھا کر تحصیل کے دروازے پر ڈلوا دیا اور اسے آگ لگادی جس سے تحصیل کا دروازہ بھی جل گیا اور مجاہدین کے لیے راستہ بن گیا۔ اندرونی فوج میں مقابلے کی طاقت نہیں تھی۔ مجاہدین نے اندر گھستے ہی انہیں بندوقوں اور تلواروں پر رکھ لیا۔ کچھ مقتول ہوئے کچھ بھاگ گئے کچھ گرفتار کرلیے گئے اور یوں شاملی پر مجاہدین کا قبضہ ہوگیا۔ یہ خوشی کی بات تھی لیکن اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ حافظ محمد ضامن اس ہنگامے میں شہید ہوگئے۔

گولی لگتے ہی حافظ صاحب نے مجاہدین سے کہا۔

''مجھے مسجد لے چلو۔'' مولانا گنگوہی نے تکلیف سے تڑپتے ہوئے حافظ صاحب کو کندھے پر اٹھایا اور قریب کی مسجد میں لائے۔ استقامت کا یہ عالم تھا کہ حافظ صاحب کا سر زانو پر رکھ کر تلاوت قرآن حکیم کرنے لگے۔ آنکھوں میں آنسو تھے اور زبان پر کلام اللہ۔ حافظ صاحب نے آخری سانس لی اور جام شہادت نوش کرلیا۔ ان کی لاش کو چارپائی پر ڈال کر تھانہ بھون لایا گیا۔ حاجی صاحب دوسرے لوگوں کے ساتھ استقبال کے لیے تیار کھڑے تھے۔ لاش پر نظر پڑتے ہی بے اختیار منہ سے نکلا۔

''جس کے لیے سب کچھ ہوا وہ بات پوری ہوگئی۔ دیکھنا قصہ بھی ختم ہوگیا۔''

حافظ محمد ضامن کی شہادت کے ساتھ ہی دہلی کا نقشہ بدل گیا۔ شاملی پر قبضے کے بعد دہلی روانہ ہونا تھا لیکن وہاں کا تو حال ہی بدل گیا۔ جاسوس اور غداریوں نے رنگ دکھایا۔ انگریزی افواج دوبارہ شہر میں داخل ہوگئیں۔ باغیوں میں جب تک دم تھا لڑے اور پھر مایوسی ہر طرف چھا گئی۔ لاہوری دروازے جامع مسجد تک ہر جگہ انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔

بخت خان اپنی مختصر سی فوج کے ساتھ قلعے میں داخل ہوا۔

''حضور! اب جنگ جیتنے کی کوئی امید نہیں لیکن جنگ جاری رکھی جاسکتی ہے۔'' بخت خان نے عرض کیا۔

''وہ کس طرح بخت خان؟'' بادشاہ نے استفسار کیا۔

''میرے ساتھ چلیں میری فوج آپ کی حفاظت کرے گی۔ آپ ہندوستان کی مرکزیت کے طور پر میرے ساتھ ہوں گے۔ ہم جہاں ہوں گے انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کریں گے۔''

''بخت خاں، میں تمہاری بہادری اور حسن تدبیر کا دل سے قائل ہوں لیکن اب شاید وقت ہاتھ سے نکل گیا۔''

''حضور، اب بھی کچھ نہیں گیا۔ یہ وقتی شکست ہے، ہم اسے فتح میں بدل سکتے ہیں۔ آپ صرف دہلی کے بادشاہ نہیں تھے ہم نے یہ جنگ دلی میں ہاری ہے۔ پورا ہندوستان ابھی باقی ہے۔ آپ جہاں ہوں گے لوگ آپ کے نام پر جمع ہوجائیں گے۔''

''بخت خاں مجھے کچھ سوچنے کا موقع دو۔''

''حضور یہ سوچنے کا وقت نہیں۔''

بات ابھی یہاں تک پہنچی تھی کہ غداری نے زبان کھولی۔ بادشاہ کے سمدھی مرزا الٰہی بخش قریب کھڑے تھے جنہوں نے انگریزوں سے ساز باز کرلی تھی۔ انہوں نے گفتگو درمیان سے اچک لی۔

''گرمی کا موسم ہے۔ برسات آگئی ہے۔ حضور ضعیف ہیں ناتواں ہیں۔ مسافرت میں گھر کا ماحول میسر آنا مشکل ہے۔ آپ شہزادوں اور بیگمات کو لے کر کہاں پھرتے رہیں گے۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ باغیوں کے ساتھ نہ

جائیں۔ میں انگریزوں سے مل کر تمام معاملات طے کروادوں گا۔ آپ پر اور آپ کے شہزادوں پر کوئی حرف نہیں آنے دوں گا۔"

بادشاہ کو یہ سن گن مل گئی تھی کہ مرزا الٰہی بخش انگریزوں سے ملے ہوئے ہیں لیکن بادشاہ کے دل میں لالچ نے شور مچایا کہ مرزا کوئی غیر تو ہیں نہیں۔ انگریزوں سے مل کر میری جان خلاصی کروادیں گے۔ انہوں نے بخت کو انکار کردیا۔

"میں اس ضعیفی میں کہاں پھرتا پھروں گا۔ مرزا انگریزوں سے بات کریں گے۔ مجھے معافی مل جائے گی۔ باقی زندگی گوشہ نشینی میں کاٹ دوں گا۔ اب تم جاؤ اللہ نگہبان۔"

بخت خان نے بادشاہ کی قسمت پر افسوس کیا اور خاموشی سے اپنی جمعیت کے ساتھ پہلے قلعے سے نکلا پھر دلی سے نکل گیا۔

"مرزا الٰہی بخش نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ وہ قلعہ خالی کر کے مقبرہ ہمایوں میں مقیم ہو جائیں۔ وہاں رہ کر وہ انگریزوں سے بات کریں گے۔ جاں بخشی ہو جائے گی۔"

بادشاہ نے تمام مرشد زادوں اور بیگمات کو قلعے سے باہر بھیج دیا اور خود بھی قلعہ خالی کر کے مقبرہ ہمایوں پہنچ گئے۔

یہ سنتے ہی کہ بادشاہ نے قلعہ خالی کر دیا ہے شہریوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ جب بادشاہ ہی نہ رہا تو شہر میں بدامنی پھیل گئی۔ لوگ بھی اپنی جانیں بچانے کے لیے جدھر منہ اٹھا بھاگ کھڑے ہوئے۔

مرزا الٰہی بخش نے منصوبہ مکمل ہوتے ہی میجر ہڈسن کو اطلاع کردی کہ مغل تاجدار مقبرہ ہمایوں میں ہے۔ آپ اسے بہ آسانی گرفتار کر سکتے ہیں۔

میجر ہڈسن نے رسالدار مان سنگھ کو چند جوانوں کے ساتھ مقبرہ ہمایوں بھیجا۔ وہ خود عمارتوں کی آڑ میں کھڑا ہو گیا اور مان سنگھ اندر گیا۔ خبر درست تھی بادشاہ فقیری کی چادر اوڑھے وہاں موجود تھا۔

"آپ خود کو ہمارے حوالے کردیں۔ اگر آپ نے فرار ہونے کی کوشش کی تو یاد رکھیں دروازے کی کمان میجر ہڈسن کے ہاتھ میں ہے آپ اور آپ کے شہزادے خوامخواہ مارے جائیں گے۔"

نہ ہوشیار خبردار کی آوازیں نہ آداب شاہی کا لحاظ۔ ایک معمولی رسالدار نہایت گستاخی سے بات کر رہا تھا۔

"میجر ہڈسن کو میرے پاس بھیجو۔ میں اس کی زبان سے سننا چاہتا ہوں کہ میری جان بخش دی جائے گی۔"

میجر ہڈسن جہاں چھپا ہوا تھا وہاں سے نکلتے ہوئے ڈر رہا تھا بالآخر اسے آنا پڑا۔ بادشاہ کے پاس گیا اور جاں بخشی کے الفاظ اپنی زبان سے ادا کر کے بادشاہ کو مطمئن کر دیا۔

بادشاہ کو لال قلعہ لایا گیا اور زینت محل کے مکان میں قید کر کے پہرا لگا دیا گیا۔ بادشاہ گرفتار ہو گیا۔ دہلی پر انگریزوں کا مکمل قبضہ ہو گیا۔

فتح دہلی کے بعد انگریز تھانہ بھون کو کیسے بھول سکتے تھے۔ شاملی کا زخم ابھی بھولے نہیں تھے۔ وہ فتوئ بھی نہیں بھولے جو علما نے جاری کیا تھا۔

انگریزی فوج رات کی تاریکی میں تھانہ بھون پہنچی۔ اس فوج کے ساتھ ایک بھاری توپ خانہ بھی تھا۔ مجاہدین میں سے ایک بڑی تعداد حافظ ضامن کی شہادت کے بعد گھروں کو لوٹ گئی تھی۔ دہلی جانے کا مقصد بھی فوت ہو گیا تھا کیونکہ 14 ستمبر 1858ء کو حافظ صاحب شہید ہوئے اسی روز انگریزوں کا دہلی پر قبضہ ہو گیا اور 19 ستمبر کو بادشاہ کی گرفتاری عمل میں آگئی۔ بخت خان دہلی چھوڑ کر جا چکا تھا۔ مجاہدین مایوسی کے عالم میں گھروں کو لوٹ گئے تھے۔

ایک قلیل تعداد تھانہ بھون میں رہ گئی تھی۔ انگریزی فوج کے مقابلے کی صورت میں شکست یقینی تھی لیکن اس یقین کے باوجود مقابلے کی ہمت کی گئی۔ قصبے کے گرد فصیل تھی اس کے دروازے بند کر دیے گئے اور وہ توپ جو انگریزوں سے چھینی گئی تھی ایک بلند مقام پر نصب کر کے جنگ کی تیاری کر لی۔

جب جنگ شروع ہوئی تو اس توپ کو چلایا گیا۔

اتفاق یہ ہوا کہ اس کا پہلا ہی گولہ دشمن کی توپ کے دہانے پر جا کر گرا۔ انگریزوں کی یہ توپ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بے کار ہو گئی لیکن انگریزوں کے پاس کوئی ایک توپ تو تھی نہیں۔ دوسری توپ سے گولہ باری شروع ہو گئی۔ مجاہدین کے پاس جو توپیں تھیں وہ بھی ناکارہ اور پرانی تھیں۔ انگریزوں کے پاس جدید اسلحہ تھا اور پھر تربیت یافتہ فوج دو گھنٹے بھی لڑائی جاری نہ رہ سکی۔ فصیل توڑ دی گئی۔ توپ کے گولوں سے دروازے اڑا دیے گئے۔ مٹی کا تیل ڈال کر مکان نذر آتش کر دیے۔ جو ملا اسے گولی سے اڑا دیا گیا۔ تھانہ بھون سلگتا ہوا جہنم بن گیا۔

جب آتش انتقام خوب شعلے پکڑ چکی تو سرکاری فوج کو سرکردہ لوگوں کی تلاش ہوئی رئیس تھانہ بھون قاضی عنایت علی

امیر جہاد حاجی امداد اللہ صاحب اور ان کے دو ساتھی مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا قاسم نانوتوی۔

مخبروں نے اپنی رپورٹ میں یہی نام لیے تھے انہوں نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا۔

''شاملی کی تحصیل پر حملہ کرنے والا بھی یہی گروہ تھا۔ بستی کی دکانوں کے چھپر انہوں نے تحصیل کے دروازے پر جمع کیے اور اس میں آگ لگا دی۔ یہاں تک کہ جس وقت آدھے کواڑ جل گئے تو جلتی آگ میں قدم بڑھائے اور بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گھس کر خزانہ سرکار کو لوٹا تھا۔''

ان چار افراد کو تلاش کرنے کے دوران میں مخبروں نے پھر رپورٹ دی جس کے مطابق قاضی عنایت علی آدھی رات کے وقت اپنے معتمد ساتھیوں کے ہمراہ نجیب آباد کی طرف روانہ ہو گئے۔

حاجی امداد اللہ کے بارے میں بھی یہی بتایا گیا کہ وہ اپنے دونوں خلفا کو ساتھ لے کر تھانہ بھون سے کسی طرف نکل گئے ہیں۔ ان سب پر بغاوت کا الزام لگایا گیا تھا اور بغاوت کی سزا موت ہوتی ہے لیکن یہ چاروں بچ کر نکل گئے تھے۔

کسی عدالت اور گواہی کے بغیر دہلی میں بھی یہی عمل دہرایا جا رہا تھا۔ چاندنی چوک کی کوتوالی کے سامنے ایک حوض کے تین طرف پھانسی گھاٹ بنا دیے گئے۔ ایک طرف تماشائیوں کے لیے کرسیاں ڈال دی گئیں جن پر انگریز صاحبان براجمان ہو گئے تیسرے پہر سرکاری بینڈ سے مخصوص دھنیں بجائیں۔ لال قلعے سے مجرموں کی قطاریں روانہ ہوئیں۔ ان کے ہاتھ پیٹھ کے پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ یہ ایک قطار میں کھڑے کر دیے گئے اور پھر ایک ایک کر کے پھانسی کے پھندوں میں جھولنے لگے۔ جو بچ گئے انہیں کل کے لیے قلعے میں بھیج دیا گیا۔ دوسرے دن پھر یہی تماشا ہوا۔ کیسے کیسے تابناک چہرے خاک میں مل گئے۔

تھانہ بھون کے تابناک چہرے انگریز کی آنکھ سے اوجھل تھے۔ یہ تینوں (حاجی امداد اللہ، مولانا نانوتوی، رشید احمد گنگوہی) تھانہ بھون سے ایک ساتھ نکلے تھے لیکن تینوں کا ایک ساتھ رہنا خلاف مصلحت تھا۔

''ہماری تلاش ضرور کی جائے گی۔ اگر ہم ایک ساتھ رہے تو ایک ساتھ پکڑے جائیں گے اس لیے ہمیں الگ الگ ہو جانا چاہیے۔''

''آپ ہی فرمایئے، ہمیں کہاں جانا چاہیے؟''

''بھئی ہماری صلاح تو یہ ہے کہ تم لوگ بالترتیب گنگوہ اور نانوتہ چلے جاؤ خدا تمہاری مدد کرے گا۔''

''اور حضرت؟''

''میرا ارادہ تو مکہ مکرمہ ہجرت کرنے کا ہے۔ اس واسطے کہ ہندوستانی تحریک آزادی کا مرکز اب مکہ معظمہ ہی رہ گیا ہے۔ تحریک انقلاب کی ناکامی کے بعد اب وہاں رہ کر ہی اس تحریک کو تقویت پہنچائی جا سکتی ہے۔ تمہیں یاد ہو گا کہ اب سے سولہ سال قبل شاہ محمد اسحاق صاحب نے مکہ ہجرت کی تھی اور تحریک چلانے کے لیے یہاں ایک بورڈ بنا دیا تھا جس کا صدر مجھے بنایا تھا۔ وہاں پہنچ لینے دو پھر میں بھی کوئی لائحہ عمل مرتب کر کے تمہیں مطلع کروں گا۔'' رشید احمد گنگوہی آب دیدہ ہو گئے۔

''سفر کی صعوبتیں آپ اکیلے کیسے برداشت کریں گے۔ اگر آپ مجھے بھی اپنا ہمرکاب کر لیں تو ایک سے دو ہو جائیں گے۔ مجھے ہجرت کا ثواب بھی ملے گا اور آپ کی خدمت کا موقع بھی۔''

حضرت حاجی نے ان کی اس خواہش کو رد کر دیا۔

''میاں رشید احمد! تم سے حق تعالیٰ نے ابھی بہت سے کام لینے ہیں گھبراؤ نہیں۔''

یہی حکم مولانا محمد قاسم نانوتوی کے لیے بھی تھا لہٰذا یہ دونوں حضرات پیر و مرشد سے رخصت ہوئے۔ رشید احمد تو اپنے وطن گنگوہ چلے گئے اور مولانا نانوتوی نے نانوتہ کی راہ پکڑی۔

حاجی امداد اللہ صاحب تن تنہا ایک طرف کو چل دیے۔ عام شاہراہ چھوڑ کر جنگل کی راہ لی۔ ان کے نام وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے تھے۔ گرفتاری پر انعام کا اعلان بھی ہو چکا تھا۔ مخبر پیچھے لگے ہوئے تھے۔ جہاں جاتے گرفتاری کا خدشہ موجود رہتا۔ کچھ دن ایک گاؤں میں گزارتے کچھ دن دوسرے گاؤں میں تاکہ جب تک خبر ہو وہ وہاں سے نکل جائیں۔ صرف باغی کو ہی نہیں باغی کو پناہ دینے والے کی سزا بھی موت تھی۔ اس لیے پناہ دینے والا بھی ڈرتا تھا پھر بھی کچھ ایسے جاں نثار موجود تھے جو حسب دین میں جان پر کھیل کر انہیں پناہ دے رہے تھے۔ وہ اس وقت کے انتظار میں تھے کہ جب معاملہ کچھ سرد پڑ جائے اور وہ کراچی پہنچ کر مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہو جائیں۔ اس دربدری کے دوران میں بہت سے ایسے واقعات رونما ہوئے جو حاجی صاحب کی کرامات میں شمار ہوتے ہیں۔

وہ پنج لاسہ (پنجاب) پہنچے۔ وہاں کے رئیس راؤ عبداللہ سے شناسائی تھی لہٰذا ان کے گھر پہنچ گئے۔ انہیں

حالات کا پہلے ہی سے علم تھا۔ معلوم تھا کہ قبلہ حاجی صاحب کے وارنٹ جاری ہو چکے ہیں اور وہ چھپتے پھر رہے ہیں لہٰذا انہیں دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ ماجرا کیا ہے ہاتھ پکڑا اور اندر گھسیٹ لیا۔

”کسی نے آپ کو یہاں آتے دیکھا تو نہیں؟“

”دیکھا بھی ہوگا تو کیا پہچانا ہوگا۔“

”حاجی صاحب یہ میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ قدم قدم پر مخبر پھر رہے ہیں۔ میں تو خیر آپ کے مرتبے سے واقف ہوں لیکن اگر کسی نے انعام کے لالچ میں مخبری کر دی؟“

”راؤ صاحب اللہ ٹھیک ہی کرے گا۔ وہ کارساز ہے آپ کو رسوا نہیں ہونے دے گا۔“

”میرے اصطبل کے برابر ایک کوٹھری ہے۔ آپ کے شایان شان نہیں آپ وہاں چھپ جائیں۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں آپ کو سر آنکھوں پر بٹھاتا لیکن اس وقت تو آپ کی موجودگی کی اطلاع اپنے گھر والوں کو بھی نہیں دے سکتا۔“

راؤ عبداللہ نے انہیں اس کوٹھری میں بھیج دیا۔ آپ کی فرمائش پر ایک مصلا بچھا دیا گیا اور وضو کے لیے لوٹا پانی رکھ دیا گیا۔

”آپ لوگ جائیں چاشت کا وقت ہو گیا ہے میں نفلیں پڑھ لوں۔“

راؤ عبداللہ باہر آئے ہی تھے کہ سامنے سے پولیس کو آتے ہوئے دیکھا۔ راؤ صاحب اس وقت تک اصطبل کے قریب پہنچ چکے تھے۔ پولیس کو دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ معاملہ کیا ہے لیکن اپنے حواس کو قابو میں رکھا اور چہرے سے ہرگز ظاہر نہیں ہونے دیا کہ کوئی گھبراہٹ یا پریشانی ہے۔ پولیس افسر کو دیکھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

”کہیے کیسے آنا ہوا؟“

”آپ کے اصطبل میں ایک گھوڑے کی تعریف سنی تھی ادھر سے گزر رہا تھا سوچا گھوڑا ابھی دیکھتا چلوں۔“

”خدا جانے آپ کس گھوڑے کی بات کر رہے ہیں چلیے دیکھ لیتے ہیں۔“ راؤ عبداللہ نے کہا اور اصطبل کی طرف قدم بڑھا دیے۔ افسر بھی ساتھ ہو لیا۔ راؤ عبداللہ ایک ایک گھوڑا دکھاتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ افسر کی نگاہ ان کے چہرے پر تھی۔ گھبراہٹ کے کوئی آثار نہ دیکھ کر اسے تعجب ہو رہا تھا اور دل ہی دل میں مخبر کو برا بھلا کہہ رہا تھا جس نے اطلاع تو دی تھی لیکن اگر مجرم یہاں ہوتا تو راؤ صاحب اتنے اطمینان میں نہ ہوتے۔ وہ افسر گھوڑوں کو دیکھتا بھالتا اصطبل سے باہر آیا اور اس کوٹھری کی طرف گیا جہاں حاجی صاحب چھپے ہوئے تھے۔ راؤ صاحب کا دل پہلی مرتبہ بڑی تیزی سے دھڑکا۔

”اس میں کیا گھوڑوں کی گھاس بھری جاتی ہے؟“ پولیس افسر نے پوچھا۔

”ہاں ایسا ہی ہے۔“ راؤ صاحب کی آواز میں اب وہ طاقت نہیں رہی تھی۔

اس انگریز پولیس افسر نے ایک جھٹکے سے کوٹھری کا دروازہ کھول دیا۔ راؤ صاحب نے سوچا ہوگا کہ اب فیصلے کا وقت آ گیا لیکن کرشمہ قدرت دیکھیے کہ تخت پر مصلیٰ بچھا تھا، لوٹا رکھا تھا اور وضو کے پانی سے زمین گیلی ہو رہی تھی جیسے ابھی ابھی کسی نے وضو کیا ہے لیکن قبلہ حاجی صاحب وہاں نہیں تھے۔ کوٹھری اتنی بڑی بھی نہیں تھی کہ کوئی ادھر اُدھر چھپ جائے اور نظر نہ آئے۔ اب عالم یہ تھا کہ انگریز پولیس افسر حیران و متحیر تھا اور راؤ عبداللہ، حاجی صاحب کی کرامت پر دل ہی دل میں نازاں کہ اس کرامت نے عزت بھی بچائی اور جان بھی۔ پولیس افسر کو کچھ تو کہنا ہی تھا۔ تحقیق کے نام پر لوٹے کا ذکر چھیڑ دیا۔

”راؤ صاحب، یہ لوٹا یہاں کیسا رکھا ہے اور پانی کیوں پڑا ہے؟“

”جناب، ہم مسلمان نماز سے پہلے ہاتھ منہ اور پاؤں دھوتے ہیں۔ اسے وضو کہا جاتا ہے آپ کے آنے سے کچھ دیر قبل میں نے وضو کیا تھا۔ یہ پانی اسی کا ہے۔“

”اصطبل کی کوٹھری میں نماز پڑھ رہے تھے نماز کے لیے تو آپ لوگ مسجد میں جاتے ہیں؟“

”وہ تو فرض نماز کے لیے جاتے ہیں۔ ہمارے مذہب میں کچھ نمازیں ایسی ہیں جو صرف اللہ کے لیے پڑھی جاتی ہیں اور چھپ کر پڑھی جاتی ہیں۔ اسے ہم لوگ نفل نمازیں کہتے ہیں۔“

پولیس افسر نے مطمئن ہونے کے انداز میں گردن ہلائی۔ دوبارہ ایک نظر کوٹھری میں دوڑائی جیسے یقین اب بھی نہ آیا ہو اور کوٹھری سے باہر نکل آیا۔ گھوڑے پر سوار ہوا اور راؤ صاحب سے معذرت کی۔

”معاف کیجیے گا راؤ صاحب، میں نے آپ کو تکلیف دی۔ وہ گھوڑا پھر بھی دکھائی نہیں دیا جس کی شہرت سن کر میں یہاں آیا تھا۔“ وہ اپنے ساتھی پولیس والوں کو لے کر روانہ

ہو گیا۔

جب راؤ عبداللہ کو اچھی طرح اطمینان ہو گیا کہ پولیس گئی تو انہوں نے حقیقت حال جاننے کے لیے کوٹھری کا دروازہ کھولا۔ حاجی صاحب مصلے پر بیٹھے تھے۔ راؤ عبداللہ تو ایسے حیران ہوئے کہ بے ہوش ہونے کی کسر رہ گئی تھی۔

”حضور، آپ کہاں تشریف لے گئے تھے؟“

”کہیں بھی نہیں۔“

”ابھی ایک پولیس افسر یہاں آیا تھا سب طرف دیکھ بھال کر چلا گیا۔ اگر آپ اسے مل جاتے تو میں اس احساس سے ہی مر جاتا کہ غلام کے گھر سے آقا گرفتار ہو گئے۔“

”اللہ کو منظور نہیں تھا۔“ وہ مسکرا کر بولے۔ ”اچھا یہ بتاؤ وہ پولیس والے چلے گئے؟“

”چلے تو گئے ہیں لیکن انہیں شک ہو گیا ہے شاید پھر کسی وقت آئیں۔“

”آپ گھبرائیں نہیں۔ میں آج رات ہی یہاں سے نکل جاؤں گا۔“

”حضور، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں آپ کے لیے جان بھی دینے کو تیار ہوں۔ آپ یہیں رہیں۔“

”میں رہنے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ مجھے آگے جانا ہے۔ کسی طرح کراچی پہنچ جاؤں پھر مکہ مکرمہ چلا جاؤں گا۔ بس اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی حفاظت کرے جو آگے چل کر تحریک آزادی کو زندہ رکھنے والے ہیں۔“

☆☆☆

مولانا رشید گنگوہی، حاجی امداداللہ سے رخصت ہو کر گنگوہ پہنچے تو گھر والوں کو سخت پریشان دیکھا۔ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ تحریک آزادی کے متوالوں پر کیا گزری ہے۔ دہلی سے بھی خبریں برابر پہنچتی رہی تھیں۔ یہ بھی معلوم تھا کہ ان کے وارنٹ نکلے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگوں کو بھی گنگوہ کے آس پاس گھومتے دیکھا گیا تھا جن پر مخبر ہونے کا شبہ تھا۔ ان کے آنے کی خوشی تو سب کو ہوئی لیکن یہ فکر بھی دامن گیر تھی کہ کسی نے مخبری کر دی تو انہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔ آخر سب نے مل کر طے کیا کہ ان کا گنگوہ میں رہنا ٹھیک نہیں۔ مختلف ٹھکانے سامنے آئے جہاں وہ روپوشی کے دن گزار سکتے تھے۔ ان میں قصبہ رام پور سب سے مناسب تھا جہاں ان کی ددھیال تھی۔ آپ رام پور تشریف لے گئے۔

گھر والوں کا اندیشہ درست نکلا۔ مخبری ہو چکی تھی کہ مولانا گنگوہ آئے ہیں۔ چند روز نہیں گزرے تھے کہ ایک فرانسیسی کرنل ستر سواروں کے ساتھ گنگوہ پہنچ گیا اور مسجد و خانقاہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ مخبری بالکل صحیح ہوئی تھی۔ مولانا رشید واقعی گنگوہ آئے تھے لیکن مخبر کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ دوسرے ہی دن رام پور چلے گئے تھے۔ پولیس نے خانقاہ اور حجروں کی تلاشی لی اور مسجد میں آ گئے۔ حضرت مولانا کے ماموں زاد بھائی ابوالنصر مولانا گنگوہی سے بے تحاشا مشابہت رکھتے تھے کوئی دور سے دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ مولانا گنگوہی چلے آ رہے ہیں۔ ابوالنصر اس وقت مسجد کے ایک گوشے میں گردن جھکائے بیٹھے تھے کہ ایک سپاہی نے ان کی گردن پر زور کا ہاتھ مارا۔

”چل کھڑا ہو کیا گردن جھکائے بیٹھا ہے۔“

تعریف کی بات یہ ہے کہ سپاہی مسلمان تھا اور اس بے ادبی سے بات کر رہا تھا۔

بے چارے ابوالنصر کو مولانا گنگوہی کے گھر کے سامنے لایا گیا۔ مارتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ گھر کی تلاشی دلوا۔ کتنے ہتھیار ہیں اور کہاں کہاں چھپائے۔ ابوالنصر کا یہ حال کہ مار کھاتے رہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ میں مولانا رشید احمد نہیں ہیں۔ آخر گنگوہ کے ایک شخص کو ان پر رحم آ گیا۔ اس نے ان کی جان چھڑانے کے لیے بتا دیا کہ یہ شخص وہ نہیں، مولانا اس وقت شاید رام پور میں ہوں یا وہاں سے بھی کہیں نکل گئے ہوں۔ پولیس افسر نے ابوالنصر کا پیچھا پھر بھی نہیں چھوڑا۔ انہیں ساتھ لیا اور رام پور کا رخ کیا۔ پولیس پارٹی رام پور گئی اور ابوالنصر کی نشان دہی پر مولانا گنگوہی کو حکیم ضیاالدین کے گھر سے گرفتار کر لیا گیا۔

آپ نے گرفتاری کے وقت کوئی مزاحمت نہیں کی اس لیے انہیں کوئی اذیت نہیں پہنچائی گئی۔ انہیں بند بیل گاڑی میں بٹھا دیا گیا اور سخت پہرے میں سہارن پور چلتا کر دیا گیا۔

ابوالنصر بیل گاڑی کے پیچھے دوڑتے رہے کہ بھائی کو کہاں لے جاتے ہیں کچھ معلوم تو ہو لیکن کب تک بھاگتے۔ ایک جگہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ ہوش آیا تو سوار تھے نہ بیل گاڑی۔ ناچار گنگوہ واپس آ گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مولانا سہارن پور کے جیل میں ہیں۔

مولانا کو سہارن پور پہنچتے ہی جیل میں ڈال دیا گیا۔ پندرہ دن بعد عدالت اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ قصہ تھانہ بھون کا ہے اور تھانہ بھون ضلع مظفر نگر میں ہے لہٰذا اس مقدمے کو ضلع مظفر نگر منتقل کیا جائے۔

منتقلی کا سفر شروع ہوا۔ پاؤں کی بیڑیاں کھول دی

گئیں۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اب بھی تھیں۔ پاؤں کی بیڑیاں اس لیے کھول دی گئیں کہ سفر پیدل طے کرنا تھا۔ وہ ننگی تلواروں کے پہرے میں براستہ دیو بند مظفر نگر کی طرف چلے۔ سڑک کے دونوں طرف لوگوں کا ہجوم تھا جو اس قیدی کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ لوگوں کے چہرے افسردہ تھے۔ سسکیوں کی آوازیں آرہی تھیں لیکن انگریزی سپاہ کا خوف تھا کہ کوئی نعرہ بلند نہیں ہو رہا تھا۔

جب یہ قافلہ دیو بند کے قریب پہنچا تو مولانا کی نظر ایک شناسا چہرے پر پڑی۔ غور سے دیکھا تو یہ مولانا نانوتوی تھے جو انہیں ایک نظر دیکھنے کے لیے ہجوم میں شامل ہو گئے تھے۔ خود وہ بھی حکومت کو مطلوب تھے۔ کوئی دیکھ لیتا تو پکڑے جاتے لیکن شوق ملاقات نے بے خوف بنا دیا تھا۔ دونوں کی آنکھیں ملیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں سلام ہوئے مسکراہٹ کے تبادلے میں صبر و استقلال کے پیغام دیے گئے۔ کارواں آگے بڑھ گیا۔

مظفر نگر جیل میں مولانا کم و بیش چھ ماہ رہے۔ قید و بند کی صعوبت میں ان کی استقامت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ بالآخر پھانسی دی جائے گی لیکن نہ تو چہرے پر گھبراہٹ کے آثار تھے نہ معمولات میں کوئی فرق آیا تھا۔ ابتدا سے انتہا تک دوران حراست آپ کی ایک وقت کی بھی نماز قضا نہیں ہوئی۔ اللہ کے ذکر میں مشغول رہتے۔ ترجمہ قرآن لوگوں کو سناتے۔ جیل کا ماحول نہایت پاکیزہ بنا دیا تھا۔ عدالت کے سامنے پیش ہوتے تو بے خوفی دیکھنے سے تعلق رکھتی۔ جو بات پوچھی جاتی اس کا سچائی سے جواب دیتے۔ کسی مرحلے پر بھی آپ نے جھوٹ کا سہارا نہیں لیا۔

حاجی امداد اللہ صاحب ان دنوں انبالہ میں مقیم تھے۔ ایک دن آپ کے چند مریدین آپ سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ انہیں مولانا گنگوہی کا احوال جاننے کی فکر تو رہتی ہی تھی۔ ان سے پوچھا۔

''کیا مولوی رشید احمد کو پھانسی ہو گئی؟''

مریدین نے عرض کیا۔ ''کچھ پتا نہیں، ابھی تک تو کوئی خبر نہیں آئی۔''

آپ نے فرمایا۔ ''حکم ہو گیا ہے، چلو۔'' یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ مریدین بھی اٹھ گئے۔ آپ شہر سے نکلے اور ایک جگہ گھاس پر جا کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر گردن جھکا کر بیٹھے رہے پھر گردن اٹھائی اور فرمایا۔

''پھر چلو، مولوی رشید احمد کو کوئی شخص پھانسی نہیں دے سکتا۔ خدا تعالیٰ کو اس سے ابھی بہت سے کام لینے ہیں۔''

مریدین نے آپس میں سرگوشیاں کیں۔ ''حاجی صاحب نے کہہ دیا اب مولوی رشید کو پھانسی نہیں ہو گی۔''

بالکل اسی طرح ہوا۔ عدالت نے پوری تحقیق کی کچھ ثابت نہ ہو سکا۔ آخر کار فیصلہ سنا دیا گیا کہ رشید احمد کو باعزت رہا کیا جاتا ہے۔

اسے بھی حاجی صاحب کی کرامت سمجھا جاتا ہے کہ بغاوت کے ایک مجرم کو عدالت نے بے گناہ قرار دیا جبکہ کتنوں کو کالا پانی بھیج دیا گیا، کتنوں کو پھانسی پر چڑھایا گیا۔

☆☆☆

مولانا قاسم نانوتوی بھی مولانا گنگوہی کی ہی طرح یہ چاہتے تھے کہ وہ بھی حضرت حاجی صاحب کے ساتھ مکہ مکرمہ چلے جائیں لیکن جماعتی پروگرام کے مطابق آپ کا ہندوستان میں رہنا ضروری تھا۔

تھانہ بھون کی تباہی کے بعد آپ نانوتہ تشریف لائے۔ یہ سب کو معلوم تھا کہ مخبر آپ کی تلاش میں ہیں۔ عزیزوں کا مشورہ تھا کہ آپ کچھ دنوں کے لیے روپوش ہو جائیں لیکن آپ کھلے عام پھر رہے تھے اور کسی قسم کا خوف چہرے سے ظاہر نہ ہوتا تھا۔ مریدین اور اقارب فکر مند تھے لیکن آپ تو کل الا اللہ کہہ کر گھر سے نکل جاتے تھے۔ جب روپوشی کا مشورہ دینے والوں کا اصرار حد سے بڑھ گیا تو آپ اپنی سسرال کے عالی شان مکان میں بند ہو گئے۔ یہ گھر اتنا بڑا تھا کہ آسانی سے تلاشی نہیں لی جا سکتی تھی۔ کئی چور راستے تھے جن سے باہر نکلا جا سکتا تھا۔ اسی لیے اس مکان کو منتخب کیا گیا تھا۔ جب اس مکان میں تین دن پورے کر لیے تو چوتھے دن آپ بازار میں نکل آئے۔ قصبے کے لوگوں نے پھر آپ کو گھیر لیا۔

''آپ یہ کیا غضب کرتے ہیں ابھی خطرہ ٹلا نہیں ہے۔ آپ کو ابھی روپوش ہی رہنا تھا۔'' بات معقول تھی لیکن آپ نے جو جواب دیا اسے سن کر سب لاجواب ہو گئے۔

''تین دن سے زیادہ روپوش رہنا سنت سے ثابت نہیں۔ رسول اللہ ﷺ ہجرت کے موقع پر غار ثور میں تین روز ہی روپوش رہے تھے۔''

ایک روز پولیس نے آپ کی سسرال پر دھاوا بولا۔ انہوں نے مکان کی تلاشی لیکن یہ تلاشی اسی وقت لی گئی جب آپ گھر پر نہیں تھے اگر ہوتے تو گرفتار کر لیے جاتے۔

اس واقعے کے بعد انہوں نے اپنا ٹھکانا مسجد کو بنا لیا کیونکہ سسرالی مکان پولیس کی نظروں میں آ گیا تھا، مخبروں کو اس ٹھکانے کا بھی علم ہو گیا۔ پولیس نے مسجد کا محاصرہ کر لیا۔ مسجد کی حرمت کا خیال کرتے ہوئے پولیس کپتان اکیلا مسجد میں آیا۔ مولانا نانوتوی اس وقت مسجد میں موجود تھے اور صحن میں ٹہل رہے تھے۔ کپتان نے خود انہی سے پوچھ لیا۔

''مولانا محمد قاسم کہاں ہیں؟'' اب اگر وہ کہتے یہاں نہیں ہیں تو یہ جھوٹ ہوتا اور اگر کہتے میں ہی محمد قاسم ہوں تو پکڑے جاتے انہوں نے جو جواب دیا وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ انہوں نے وہ جگہ چھوڑ دی جہاں وہ کھڑے تھے۔ دو قدم پیچھے ہٹ کر اس جگہ کی طرف اشارہ کیا جہاں وہ کچھ دیر قبل کھڑے تھے اور فرمایا۔

''ابھی یہیں تھے، دیکھ لیجیے۔'' یعنی جسے تم ڈھونڈ رہے ہو اسے تم دیکھ بھی سکتے ہو۔ کپتان مسجد میں مولانا کو ڈھونڈتا رہا کیونکہ وہ کہہ چکے تھے۔

''ابھی یہیں تھے دیکھ لیجیے'' اور مولانا آرام سے مسجد سے باہر نکلے اور پولیس محاصرے میں سے گزرتے ہوئے دوسری قریب کی مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔ کپتان، مسجد سے نکلا تو اسے کچھ شک ہوا وہ چیخ کر بولا۔

''ارے پکڑو، مولانا قاسم تو یہی معلوم ہوتے ہیں جو جا رہے ہیں۔'' پولیس اس طرف دوڑی اور مسجد کا محاصرہ کر لیا۔ اللہ نے یہاں بھی آپ کی حفاظت کی۔ وہ مسجد سے نکلے اور پولیس کے جتھے سے گزرتے ہوئے کسی اور مسجد کی طرف چلے گئے۔ پولیس کی آنکھوں پر ایسے پردے پڑے کہ انہیں پہچان ہی نہ سکے۔

یہ آنکھ مچولی عرصے تک چلتی رہی۔ مخبر اطلاع دیتے پولیس انہیں ڈھونڈ بھی لیتی لیکن اللہ کی طرف سے آپ کی حفاظت ہو جاتی۔

وہ پکڑے نہیں جا رہے تھے لیکن اس بار بار کے تعاقب سے تنگ آ گئے تھے چنانچہ آپ کے برادر نسبتی شیخ نہال احمد رئیس دیوبند نے آپ کو مجبور کیا کہ وہ چند روز کے لیے ان کے گاؤں چکوالی تشریف لے جائیں۔ ان کے اصرار پر حضرت نانوتوی کو چکوالی جانا پڑا۔

یہ گاؤں دیوبند اور نانوتہ کی درمیانی سڑک پر واقع تھا۔ آپ یہاں آرام سے رہ رہے تھے کہ مخبروں نے ٹوہ لگالی اور حکومت کو اطلاع دے دی کہ مولانا چکوالی میں مقیم ہیں۔ یہ اطلاع ملتے ہی پولیس پارٹی چکوالی پہنچ گئی۔ اس صورت حال سے ان کے برادر نسبتی کچھ زیادہ ہی پریشان ہو گئے۔ بات تھی بھی پریشانی کی وہ اتنے خوف زدہ ہوئے کہ ان کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ جیسے وہ قبلہ نانوتوی کو یہاں لا کر پچھتا رہے ہوں۔ حضرت نے ان کی اس کیفیت کو بھانپ لیا۔

''بے شک یہ آپ کی غلطی تھی کہ مجھے یہاں آنے کی دعوت دی۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ پولیس میرا پیچھا کر رہی ہے۔ بہرحال اب آپ پریشان نہ ہوں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ میں اپنا بچاؤ خود کر لوں گا۔'' حضرت نانوتوی نے فرمایا اور شیخ نہال احمد کو گھر کے زنانہ حصے میں چھوڑ کر خود باہر نکل آئے۔ سامنے پولیس آفیسر کھڑا تھا۔ حضرت نانوتوی نے یہ قطعی ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہی قاسم نانوتوی ہیں اور پولیس افسر سے مخاطب ہوئے۔

''آئیے آئیے تشریف لائیے۔''

''میں جس مقصد سے آیا ہوں پہلے اسے پورا کیجیے۔''

''فرمائیے۔''

''آپ مولانا محمد قاسم سے آشنا ہیں؟''

''میں ان سے بخوبی واقف ہوں، فرمائیے؟''

''میں مکان کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔''

''شوق سے، میں نے پردہ کروا دیا ہے آپ اندر آئیے۔''

پولیس افسر اندر آیا زنان خانہ کا گوشہ گوشہ چھان مارا۔ مولانا قاسم اس کے ساتھ ساتھ تھے لیکن پولیس افسر کی آنکھوں پر ایسا پردہ پڑا تھا کہ وہ انہیں پہچان نہ سکا۔ نتیجہ یہی ہونا تھا کہ وہ نامراد ہو کر مکان سے باہر آ گیا۔ اس کے نکلتے ہی مولانا قاسم بھی چکوالی سے نکلے اور جنگل میں داخل ہو کر نانوتہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ پولیس افسر نے باہر نکلتے ہی مخبر کو ڈانٹا۔

''تو غلط اطلاع دیتا ہے اور مجھے شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔''

''آپ نے غور نہیں کیا کہیں مولانا وہی صاحب تو نہیں تھے جنہوں نے آپ کو زنانہ مکان کی تلاشی دلوائی۔''

''نہیں وہ تو رئیس دیوبند نہال احمد تھے۔''

''آپ وارنٹ گرفتاری میں ملزم کا حلیہ تو پڑھیں۔''

پولیس افسر نے وارنٹ گرفتاری نکال کر ملزم کا حلیہ پڑھا جو حضرت نانوتوی کا تھا۔ پولیس افسر ہاتھ مل رہا تھا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ گرد و نواح کے گھنے جنگل میں کسی کو گرفتار کرنا آسان کام نہیں تھا۔ پولیس افسر نے اپنی پارٹی کو حکم دیا کہ فوراً نانوتہ کی طرف چلو ملزم نانوتہ گیا ہوگا۔

اس سے پہلے کہ پولیس نانوتہ پہنچے آپ کو اشارہ غیبی ہوا کہ نانوتہ نہ جایا جائے۔ آپ راستہ بدل کر نانوتہ جانے کی بجائے دیو بند پہنچ گئے۔

ایک مرتبہ پھر آنکھ مچولی شروع ہوگئی۔ پولیس نے دیو بند کی مسجدوں میں آپ کا سراغ لگانا شروع کر دیا لیکن بے سود۔ وہ ایک مسجد سے دوسری اور دوسری سے تیسری میں منتقل ہوتے رہے۔ پولیس آپ کا سراغ لگانے میں آخر وقت تک ناکام رہی۔

غرض کہ حضرت حاجی صاحب اور ان کے رفقا دشمنوں کی مخبریوں، شکایتوں اور انتہائی جدوجہد کے باوجود محفوظ رہے اور دنیا کی کوئی طاقت ان کا بال بیکا نہ کرسکی۔ حضرت گنگوہی صرف چھ مہینے کی قید و بند کے بعد رہا کر دیے گئے اور انہوں نے گنگوہ میں خانقاہ و مسجد آباد کر کے خدمت دین کا کام شروع کر دیا۔ حضرت نانوتوی انگریزوں کے ہاتھ نہ آسکے۔ حضرت حاجی صاحب عظیم الشان ملوکیت کے سامنے ڈٹے رہے۔ ان کو گرفتار کرنے کی ہزار کوششیں کی گئیں لیکن کوئی کوشش بار آور نہ ہوسکی۔ ایسے متعدد واقعات پیش آتے رہے۔ جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرما رہا ہے۔

وہ ایک گاؤں میں مقیم تھے کہ بالکل بے خبری کے عالم میں پولیس پہنچ گئی۔ فوراً حضرت کو ایک رضائی اوڑھا کر مردانہ مکان میں لٹا دیا گیا۔ افسر کو زنانہ مکان کے بارے میں زیادہ شبہ تھا۔ اس نے مالک مکان سے کہا کہ وہ زنانہ مکان کی تلاشی دلوائے۔ مالک مکان نے خندہ پیشانی سے یہ مطالبہ منظور کیا اور اپنے لوگوں سے چیخ کر کہا۔

''اس بیمار بڈھے کو چارپائی سمیت اٹھا کر باہر کھیت میں ڈال آؤ کھانس کھانس کر ہمارا چین حرام کر دیا ہے۔''

مالک مکان، افسر کو لے کر زنانہ مکان کی طرف چلا اور اس کے ملازموں نے مردانہ مکان سے چارپائی سمیت مریض کو اٹھایا اور کھیت کی طرف چل دیے۔ یہ مریض کوئی اور نہیں خود حاجی امداد اللہ تھے جنہیں مریض بنا کر چارپائی پر لٹا دیا گیا تھا۔

تفتیش کا تقاضا یہ تھا کہ پولیس افسر اس چارپائی کو روک لیتا اور دیکھتا کہ اس پر کون ہے لیکن خدا ہر قدم پر مدد کر رہا تھا۔ اس نے اس چارپائی کو جانے دیا۔ حضرت اس چارپائی سے اٹھ کر دوسرے مکان میں منتقل ہوگئے۔ پولیس آفیسر باوجود سخت تفتیش ناکام واپس ہوگیا۔ اس قسم کے متعدد واقعات پیش آتے رہے۔

حاجی امداد اللہ نے روپوشی کے ڈیڑھ سال پنجاب کے دیہات میں گزار دیے اور بالآخر سندھ میں داخل ہوئے اور مختلف مقامات پر زیارت بزرگان سے مشرف ہوئے اور فیوض و برکات سے مالا مال ہوتے ہوئے کراچی پہنچ گئے۔ وہاں سے جہاز میں سوار ہوئے اور مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ اس دن کے بعد سے آپ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کہلائے۔

آپ مکہ مکرمہ پہنچے تو نہ زادراہ ساتھ تھا نہ آئندہ کے لیے کچھ جیب میں تھا۔ نوبت فاقوں تک پہنچ گئی۔ ایک ہفتے تک صرف زمزم کے پانی پر گزارا کرنا پڑا۔ فاقوں کا یہ عالم تھا کہ ایک مخلص دوست سے ملاقات ہوگئی۔ آپ نے اس سے کچھ قرض طلب کیا۔ اخلاص کے سارے دعوے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ اس نے ناداری کا بہانہ کر کے انکار کر دیا۔ جب ضعف و نقاہت حد سے گزر گیا تو بے اختیار زبان سے نکلا بارالٰہی مجھ میں امتحان کی طاقت نہیں۔ بے بسی کا یہ فقرہ ایسا تھا کہ فوراً مقبول بارگاہ خداوندی ہوا۔ اسی رات حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو خواب میں دیکھا۔ ارشاد فرماتے ہیں کہ ''ہم نے تم کو اپنے باورچی خانے کا ناظم و مہتمم بنا دیا ہے۔ لاکھوں کا خرچ تمہارے ہاتھوں مقرر ہوگا۔''

قبلہ حاجی صاحب نے فرمایا کہ ''میں اس مہم کی طاقت نہیں رکھتا۔''

ہنس کر فرمایا کہ ''تمہاری حاجت بند نہیں رہے گی اس وقت سے خرچ ماہانہ کم از کم سو روپے ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے خزانہ رحمت سے پہنچاتا ہے۔''

صبح آنکھ کھلی تو ایک شخص نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ حاجی صاحب نے دروازہ کھولا تو اس نے ایک تھیلی دی جس میں سو ریال تھے اور پھر چلا گیا۔ اس کے بعد پھر کبھی تنگی نہیں ہوئی۔

کچھ دن نہیں گزرے تھے کہ قبلہ حاجی صاحب کے دیرینہ ساتھی مولانا رحمت اللہ کیرانوی بھی مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ دونوں کی ملاقات نماز فجر کے بعد مطاف میں ہوئی۔ دیار غیر میں دونوں کا ملنا کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔ خوب باتیں ہوئیں۔ تحریک آزادی کا ذکر چھیڑا اور یہ طے ہوا کہ یہاں سے بیٹھ کر تحریک آزادی کے لیے کام کیا جائے گا۔ ایسے لوگ تیار کیے جائیں گے جو انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے میں معاون ثابت ہوں گے۔

مولانا کیرانوی ایک علمی آدمی تھے اس لیے انہوں

نے درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا اور مدرسۂ صولتیہ کی بنیاد رکھی۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی معروف معنوں میں عالم نہیں تھے۔ انہوں نے صرف کافیہ تک پڑھا تھا لیکن اس کے باوجود وہ علم کے بحر زخار تھے۔ مولانا قاسم جیسے عالم نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ لوگ تو حاجی صاحب کے معتقد ہوئے زہد وتقویٰ سے یا کثرت عبادت سے یا کرامات سے اور میں معتقد ہوا علم سے۔ اس پر لوگوں کو حیرت ہوئی کہ حاجی صاحب میں اتنا علم کہاں۔ ظاہر میں تو حاجی صاحب سے مولانا قاسم کا علم بڑھا ہوا تھا۔ لوگوں نے اس کا راز پوچھا تو مولانا قاسم نے فرمایا۔

''علم اور چیز ہے معلومات اور چیز ہے۔ اس کی مثال انہوں نے یہ دی کہ ایک شخص نے سیاحت تو بہت کی مگر اس کی نگاہ کمزور ہے اور ایک شخص نے سیاحت کم کی لیکن اس کی نگاہ بہت تیز ہے۔ جس کی نگاہ تیز ہے اس نے سیاحت کم کی لیکن جس چیز کو دیکھا اس کی پوری حقیقت سے مطلع ہو گیا۔ ہماری معلومات تو زیادہ ہیں لیکن بصیرت کم ہے۔ حاجی صاحب کی معلومات قلیل ہیں مگر بصیرت قلب بہت زیادہ ہے۔ اس لیے ان کے جتنے علوم ہیں وہ سب صحیح ہیں۔ وہ حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں اور ہم حقیقت تک نہیں پہنچتے۔ یہ ان کی کرامت ہی تو تھی کہ باوجود علم ظاہری کی تکمیل نہ کرنے کے برصغیر پاک و ہند کے بڑے بڑے جہاں دیدہ علم وفضل آپ کے حلقۂ ارادت میں تھے۔ اتنے صاحبان علم وفضل نے شاید ہی کسی بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کی ہو۔ جتنی تعداد حاجی صاحب کے مریدوں کی تھی۔''

حاجی صاحب ارشاد وسلوک کے آدمی تھے لیکن علمی طریقہ تبلیغ حضرت حاجی صاحب نے کبھی نہیں چھوڑا۔ مولانا رحمت اللہ صولتیہ مدرسے میں طالب علموں کو پڑھاتے تھے لیکن حاجی صاحب پڑھے ہوؤں کو پڑھاتے تھے۔ مکہ مکرمہ میں ہر روز مثنوی مولانا روم کا درس دینا آپ نے مشغلہ بنا لیا تھا جس میں ارشاد وسلوک کے مسائل اور مختلف حکایت و تشبیہات سے قرآن وحدیث کے مسائل کو حل کیا جاتا تھا چنانچہ مولانا اشرف علی تھانویؒ، حاجی صاحب کی خدمت میں صرف مثنوی پڑھنے کے لیے تشریف لائے اور چھ ماہ قیام فرمایا۔ اس چھ ماہ کے قیام نے ان کی کایا پلٹ دی اور منصب ارشاد وتلقین پر متمکن کر دیا۔

علمی مصروفیات سے قطع نظر مکہ مکرمہ میں بیٹھ کر آخر تک ہندوستانی تحریک کی قیادت فرماتے رہے۔ وہ ایک لمحے کو بھی ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت زار اور انگریزوں کے غلبے سے بے خبر نہیں رہے۔ اپنے خلفہ کے ذریعے ہر اس تدبیر پر عمل کرتے رہے جس کے ذریعے انگریزوں کو ہندوستان سے نکالا جائے اور جنگ آزادی (1857ء) کی ناکامی کا ازالہ ہو سکے۔ دارالعلوم دیوبند کا قیام بھی آپ کی اسی حکمت عملی کا نتیجہ تھا۔

یہ ممکن نہیں کہ دارالعلوم کے قیام میں حضرت حاجی امداد اللہ کی دعائیں شامل نہ ہوں۔

دارالعلوم دیوبند کے قیام کو حاجی صاحب کی دعاؤں اور کوششوں کا حاصل سمجھنا چاہیے کیونکہ انہوں نے ایسے لوگ تیار کیے جو اس عظیم درس گاہ کی تعمیر میں معاون بنے۔

حضرت حاجی صاحب کی ہندوستان میں اپنے خلفا سے برابر خط کتابت جاری تھی۔ آپ کے ارادت مند آپ کو مکہ مکرمہ میں اپنی دلی کیفیات لکھ کر بھیجتے اور آپ مرشد کامل ہونے کی حیثیت سے ان کی روحانی بیماریوں کا علاج بھیجتے۔ دارالعلوم قائم ہو چکا تھا۔ آپ چاہتے تو ہندوستان واپس آ سکتے تھے لیکن آپ کی قسمت میں شیخ العجم نہیں شیخ العرب وعجم ہونا لکھا تھا۔ آپ ایک ایسی سرزمین پر تھے جس سے جدا ہونے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ بڑی سے بڑی قیمت ٹھکرا کر بھی اس سرزمین پر رہنے کو جی چاہتا تھا۔ اگر کوئی ایسی سبیل پیدا بھی ہوئی کہ آپ کے قدموں میں دولت کے ڈھیر لگ جائیں تو آپ نے اسے ٹھکرا دیا۔ تاریخ کو وہ دن یاد ہوں گے جب ترکی کے سلطان عبدالحمید خاں نے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کو اپنے پاس بلوایا اور ان کی ایسی پذیرائی کی کہ کیا کسی بادشاہ کا استقبال کیا ہوگا۔ جب وہ لوٹ کر مکہ معظمہ آئے تو جی چاہا کہ قبلہ حاجی صاحب بھی سلطان کے دربار میں جائیں بلکہ انہیں کوئی خدمت پیش کی جائے تو ترکی ہی میں قیام اختیار کر لیں اور سلطان کی فیاضیوں کے طفیل عمر کے باقی دن آرام سے گزاریں۔ انہوں نے سلطان کی فیاضیوں کا ذکر نہایت مبالغے سے کیا بلکہ یہ بھی کہا کہ حاجی صاحب، اگر آپ فرمائیں تو خلیفہ کے حضور آپ کا ذکر کروں۔

حاجی صاحب نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ''اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ یہی کہ وہ معتقد ہو جائیں گے۔ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ بیت السلطان سے قرب اور بیت اللہ سے دوری۔ یہ گھاٹے کا سودا میں کیوں کرنے لگا۔ رہی یہ بات کہ آپ کے مطابق نہایت عادل ہیں۔ حکم ہے کہ عادل سلطان کی

دعا قبول ہوتی ہے لہٰذا اگر آپ سے ہو سکے آپ ان سے میرے لیے دعا کروا دیجیے مگر ایک بادشاہ سے یہ کہنا کہ ایک درویش کے لیے دعا کرو یہ عرفاً آداب سلطنت کے خلاف ہے۔ اس لیے میں آپ کو اس کا ایک طریقہ بتاؤں وہ یہ کہ آپ میرا ان سے سلام کہہ دیں وہ جواب میں وعلیکم السلام ضرور کہیں گے بس میرے لیے اس طرح دعا ہو جائے گی۔‘‘

☆☆☆

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی جہاں مرشد ہدایت، شیخ المشائخ، مجاہد ملت اور پیکر شریعت و طریقت تھے وہیں ادب و شعر سے بھی رغبت دلی تھی اور کیوں نہ ہوتی۔ جذبات دل اگر کسی پیمانے میں سما سکتے ہیں تو وہ شاعری ہے۔ فارسی شاعری نے تو منازل ترقی ہی تصوف کی انگلی تھام کر کی ہے۔ عشق خداوندی کا جو جوہر آپ کی طبیعت میں تھا اس کی صحیح ترجمانی شاعری ہی میں ہو سکتی تھی لہٰذا آپ نے شاعری اختیار کی۔

’’حضرت حاجی صاحب علمائے دیوبند کے قافلے میں ’’ولی دکنی‘‘ ہیں جو نظم و نثر فارسی اور اردو میں مقام اوّلیت رکھتے ہیں۔‘‘

ان کی شاعری ایک منہ زور دریا کی طرح تھی جو اپنی موج سے پیدا ہوئی اپنی موج میں آگے بڑھتی رہی۔ کسی کو استاد نہیں بنایا کسی کی رہنمائی حاصل نہیں کی۔ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ اپنا نغمہ خود گایا خود سنا۔ کبھی مالک دو جہاں کی حمد و تعریف کی۔

اے مرے معبود اے میرے اللہ
ہے تو ہی مقصود دل بے اشتباہ
یاالٰہی تو ہے خلاق جہاں
مالک دارین و شاہ انس و جاں
گرچہ دو عالم سے تو ہے بے نیاز
لیکن بے چاروں کا تو ہے چارہ ساز
دستگیر بے کساں ہے تیری ذات
مستغیث عاشقاں ہے تیری ذات

☆☆☆

نعت رسول اکرمؐ تو گویا آپ کے عشق دلی کا خاص میدان تھا۔ یہ ان کا قال نہیں حال تھا۔ اپنی شاعری میں جا بہ جا نعت گوئی کے پھول کھلائے۔

کر کے نثار آپ پہ گھر بار یارسولؐ
اب آ پڑا ہوں آپ کے دربار یارسولؐ

ماخذات

حیات حاجی امداد اللہ مہاجر مکی از حکیم محمود احمد ظفر۔
مولانا عبید اللہ سندھی، حیات افکار اور عمل از سید محمد احمد۔
بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد از رئیس احمد جعفری
بہادر شاہ ظفر از اسلم پرویز

ذات آپ کی تو رحمت و شفقت ہے سربسر
میں گرچہ ہوں تمام خطا وار یارسول
ہو آستانہ آپ کا امداد کی جبیں
اور اس سے زیادہ کچھ نہیں درکار یارسول

سرکار دو عالم کی محبت سے دامن بھر کر بارگاہ الوہیت میں مناجات کرتے ہیں۔

مجھے اپنی الفت کے قابل بنا
سوا اپنے ہر شے کو دل سے بھلا
میں دنیا میں آیا تو گریاں ہی تھا
سوا میرے ہر ایک خنداں ہی تھا
جو دنیا سے جاؤں تو خوشیاں کروں
کبھی ہو ویں گریاں میں خنداں رہوں
ملائک مرے پاس رحمت کے ہوں
یہ سامان یارب عنایت کے ہوں

اصناف شاعری میں اور خصوصاً اردو میں غزل کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ حاجی صاحب نے اس صنف کو بھی اپنایا ایک صوفی ہونے کے ناتے ان کا محبوب ذات خداوندی ہے۔ عقیدت و محبت کا اظہار اسی سے کرتے ہیں۔ اسی سے لو لگاتے ہیں۔ اس کو امیدوں کا مرکز بناتے ہیں اس کی خوشی کے لیے دکھ جھیلتے ہیں۔

عرش بریں پہ آپ ہیں زیر زمیں ہوں میں
ملنا کہاں سے ہو کہ کہیں تم کہیں ہوں میں
گر تخت حسن ناز پہ ہیں آپ جلوہ گر
اقلیم عشق میں شہ مسند نشیں ہوں میں
مثل نظر ہے آپ کا آنکھوں میں میری گھر
باوصف ایسے قرب کہ بس دور بیں ہوں میں

☆☆

نہ دیکھا داغ دل گلزار کو دیکھا تو کیا دیکھا
نہ دیکھا خار میں گل، خار کو دیکھا تو کیا دیکھا
نظر جب کھل گئی اپنی جسے دیکھا اسے دیکھا

نہ دیکھا آپ میں دلدار کو دیکھا تو کیا دیکھا

☆☆

غزل اور نعت جیسی مقبول اصناف کے علاوہ آپ مثنوی، مثلث، رباعی اور مخمس بھی کہے اور بڑی تعداد میں کہے۔ آپ کا کلام گلزار معرفت کے عنوان سے شائع ہوا۔

شاعری کے لیے جتنے وقت کی ضرورت ہوتی ہے وہ ظاہر ہے ان کے پاس نہیں تھا۔ زیادہ وقت عبادت و ریاضت میں گزرتا تھا۔ تنظیمی کام الگ تھے۔ شاعری کو انہیں اپنی منزل بھی بنانا نہیں تھا۔ اس کے باوجود جس کثرت سے ان کے اشعار ملتے ہیں انہیں دیکھ کر تعجب ضرور ہوتا ہے۔ اہل تحقیق نے ان کے اشعار کی تعداد چھ ہزار سے زیادہ بتائی ہے۔

جس طرح عطیہ خداوندی نے انہیں علما کی صنف میں لا کھڑا کیا ہے اسی طرح ان کی شاعری بھی عطیہ خداوندی ہی تھی۔

آپ نے ایک مثنوی تحفۃ العشاق بھی تحریر کی جس میں عشق حقیقی اور عشق مجازی پر بحث کی گئی ہے۔ یہ کل 1324 اشعار کی مثنوی ہے۔

ایک رسالہ غذائے روح منظوم لکھا اس میں سولہ سو اشعار ہیں۔ ایک رسالہ درد غم ناک بھی اشعار میں ہے۔

گلزار معرفت اردو، فارسی کلام کا مجموعہ ہے۔ جس میں حمد و نعت اور غزلیں شامل ہیں۔ نثر میں آپ نے بہت کم کتابیں لکھیں اور وہ بھی دس چھوٹے چھوٹے رسائل ہیں۔

دراصل ان کی تمام محنت کتابوں پر نہیں آدمیوں پر صرف ہوئی۔ انہوں نے آدمیوں کو انسان بنایا بلکہ ولی اللہ کے مدارج تک پہنچایا۔ قطب اور غوث بنائے۔ ان کی تصانیف زیادہ نہیں لیکن ان کے خلفا نے علم و ادب کے دریا بہائے۔ یہ ان کا فیض تھا جو کئی نسلوں تک جاری رہا۔ قبلہ حاجی صاحب نے دس گیارہ چھوٹے چھوٹے رسائل تصنیف کیے۔

علم تصوف میں آپ کی بہترین تصنیف ضیاء القلوب ہے۔ یہ کتاب آپ نے حضرت حافظ محمد ضامن شہید کے صاحبزادے حافظ محمد یوسف تھانوی کے اصرار پر لکھی تھی۔

یہ کتاب بھی ان کی تمام کتابوں کے مقابلے میں ضخیم ہونے کے باوجود صرف 76 صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں بیعت کرنے کا طریقہ، مراتب، ذکر کا بیان، مختلف اشغال کے طریقے، مراقبات، کشف وغیرہ کے ابواب باندھے ہیں۔

حاجی صاحب کی دوسری تصنیف فیصلہ ہفت مسئلہ ہے جس میں سات اختلافی مسائل میں مصلحت کی راہ پیش کی گئی ہے۔ اسی طرح مختلف رسائل ارشاد مرشد، نالہ امداد غریب،

چند مایہ ناز خلفا

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا اشرف علی تھانوی، شیخ الہند مولانا محمد حسن، پیر مہر علی شاہ گولڑوی، حضرت مولانا سید اصغر حسین دیوبندی، مولانا اشرف الحق دہلوی، مولانا خلیل احمد سہارن پوری، مولانا عبداللہ انصاری، مولانا حاجی محمد عابد، مولانا محمد حسین الہ آبادی، مولانا عبدالرحیم رائے پوری، مولانا یعقوب نانوتوی، مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا حکیم محمد یوسف تھانوی، مولانا ذوالفقار علی، مولانا فیض الحسن سہارنپوری، مولانا نور احمد امرتسری، مولانا فتح محمد تھانوی، حافظ عبدالرحمٰن امروہوی، شاہ بدرالدین پھلواری، مولانا سید امیر حمزہ، مولانا عبداللہ شاہ جلال آبادی، مولانا شاہ رفیع الدین دہلوی۔

جہاد اکبر (منظوم) وغیرہ ہیں۔

مرقومات امدادیہ اور مکتوبات امدادیہ بھی ہیں۔ یہ مکتوبات کے مجموعے ہیں۔ اول الذکر میں وہ خطوط ہیں جن کو آپ نے مولانا گنگوہی، مولانا نانوتوی، مولانا یعقوب نانوتوی، حاجی عابد حسین جیسے ممتاز بزرگوں کے نام تحریر کیا۔ یہ ایک سو گیارہ خطوط ہیں جو سب فارسی میں ہیں۔

مکتوبات امدادیہ میں مولانا تھانوی کے نام پچاس خطوط ہیں۔ انہیں آپ نے مکہ مکرمہ میں تحریر فرمایا۔

ان خطوط کو بھی بہ لحاظ مضمون آپ کی تصانیف ہی سمجھنا چاہیے کیونکہ ان میں ہر خط کسی نہ کسی روحانی مسئلے کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ ان مسائل کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ ایک کہے دوسرا سنے۔

آپ کی نثر سادگی کا نمونہ ہے۔ ایک ایسے زمانے میں اردو نثر، فارسی کا کہلاتی عکس تھی۔ مرصع و مسجع لکھی جاتی تھی۔ حاجی صاحب نہایت سادہ، دل نشیں پیرائے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ دقیق مسائل کو اس طرح حل کر دیتے ہیں جیسے گفتگو کر رہے ہیں۔ آپ کے مزاج کی سادگی آپ کی نثر میں اتر آئی تھی۔ نہ تشبیہات کا ہیر پھیر ہے نہ استعارات کا الجھاؤ، نہ مشکل الفاظ۔ مثلاً یہ اقتباسات دیکھے جا سکتے ہیں۔

”جو شخص مجھ سے محبت و عقیدت رکھے وہ مولوی رشید احمد صاحب سلمہ اور مولوی محمد قاسم سلمہ کو میری جگہ بلکہ مجھ سے بلند تر سمجھے۔ اگرچہ ظاہری معاملہ برعکس ہے کہ میں ان کی جگہ پر اور وہ میری جگہ پر ہیں اور ان کی صحبت کو غنیمت

سوانحی خاکہ

نام......امداد اللہ مہاجر مکی

پیدائش......22 صفر 1233ھ بمطابق 1818ء

وطن......قصبہ نانوتہ ضلع سہارن پور، بھارت

وطن ثانی......مکہ مکرمہ

مرشد اول......سید نصیر الدین دہلوی

مرشد دوم......میاں جی نور محمد

اساتذہ......سید نصیر الدین دہلوی، مولانا قلندر بخش جلال آبادی، مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ

وفات......12 جمادی الآخر 1317ھ بمطابق 1899ء

سمجھے کہ ایسے لوگ اس زمانے میں نہیں پائے جاتے ہیں اور ان کی بابرکت خدمت سے فیض حاصل کرے اور سلوک کے طریقے ان کے سامنے حاصل کرے ۔ انشاء اللہ بے بہرہ نہ ہوگا۔ خدا ان کی عمر میں برکت دے اور معرفت کی تمام نعمتوں اور اپنی قربت کے کمالات سے شرف فرمائے اور بلند رتبوں تک پہنچائے۔"

"اس تمام تحقیق کے بعد بھی فقیر (قبلہ حاجی صاحب) کی یہ وصیت ہے کہ اپنے علم و تحقیق پر وثوق نہ کریں سورۂ فاتحہ بہت خشوع سے پڑھا کریں اور اپنے اوقات معاش و معاد کے ضروری کاموں میں خصوصاً تزکیہ نفس اور تزکیہ باطن میں صرف کریں اور اہل اللہ کی صحبت و خدمت اختیار کریں۔ خصوصاً جناب مولوی رشید احمد صاحب کے وجود بابرکت کو ہندوستان میں غنیمت کبریٰ و نعمت عظمیٰ سمجھ کر ان سے فیوض و برکات حاصل کریں کہ مولوی صاحب موصوف جامع کمالات ظاہری و باطنی کے ہیں اور سب پر لازم ہے کہ مفت کی بحث و تکرار میں عمر عزیز کو تلف نہ کیا کریں کہ یہ حجاب ہے محبوب حقیقی سے۔"

☆☆☆

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے بیان کے مطابق حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نے اپنی زندگی میں تین نکاح کیے تھے۔ پہلی زوجہ کا اسم گرامی بی بی خدیجہ تھا۔ یہ بی بی مکہ معظمہ میں رہتی تھیں۔ حضرت کو جب خانگی خدمت کی ضرورت ہوئی تو ان سے نکاح کیا۔ جب ان کا انتقال ہوگیا تو خدام نے عرض کیا، حضرت ایک اور نکاح کر لیجیے تاکہ آپ کی دیکھ بھال کے لیے گھر میں کوئی عورت ہو۔ آپ نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو تھانہ بھون کی بی بی خیر النسا کا خیال آیا۔ یہ اس لیے بھی کہ ان خاتون سے، جب وہ تھانہ بھون میں تھے منگنی ہوئی تھی لیکن ذکر و اشغال کی کثرت کی وجہ سے نکاح سے انکار کر دیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد وہ بیوہ ہوگئیں۔ حاجی صاحب کو اب خیال آیا ہوگا کہ اگر اب شادی کرلیں تو اس انکار کا ازالہ ہو سکے گا۔ اتفاق سے یہ خاتون مکہ مکرمہ آگئیں اور حضرت نے ان سے عقد کرلیا۔ یہ خاتون نہایت پاکیزہ اور بہت بڑی عابدہ تھیں۔ ان کی زندگی ہی میں ایک بی بی قصبہ رام پور کے مکان میں رہتی تھیں اور حاجی صاحب سے بیعت تھیں۔ گھر کے کام کاج بھی کرتی تھیں۔ جب حضرت اپنے مکان پر تشریف لاتے تو وہ چاہتیں کہ حضرت کا ہاتھ پکڑ کر گھر میں لائیں۔ حضرت ان کا ہاتھ جھٹک دیتے کہ نامحرم کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ ایک روز انہوں نے ہمت کر کے کہہ دیا کہ حضرت کو خدمت کی حاجت ہے اور میں نامحرم ہوں۔ اس کی وجہ سے میں آپ کی خدمت سے معذور ہوں۔ مجھ سے نکاح کر لیجیے تاکہ یہ اجنبیت جاتی رہے۔ حضرت نے ان سے نکاح کرلیا۔ ان بی بی کا نام امۃ اللہ تھا۔

پہلی بیوی بی بی خدیجہ کا انتقال ہوگیا تھا دوسری اور تیسری دونوں حاجی صاحب کے انتقال کے بعد تک زندہ رہیں۔

حضرت حاجی صاحب ابتدا ہی سے ضعیف و نحیف تھے۔ بڑھاپے نے اور بھی خفیف کر دیا تھا لیکن خداوند تعالیٰ نے آپ کو روحانی قوت سے نوازا تھا۔ جسمانی کمزوری کے باوجود آپ بہت کم بیمار پڑتے تھے۔

موت کی تمہید کے طور پر بیماری نے گھر دیکھا اور چند روز کی معمولی خرابی طبیعت کے بعد 12 جمادی الآخر 1317ھ مطابق 1899ء بروز بدھ بہ عمر چوراسی سال انتقال فرمایا اور جنت المعلیٰ میں دفن کیے گئے۔

سید احمد شہید بریلوی سے شروع ہونے والا یہ سفر حاجی امداد اللہ تک پہنچ کر ختم ہوگیا۔ حاجی صاحب کا یہی کمال ہے کہ انہوں نے اسلام کے سپاہی تیار کر دیے۔ ان کی دعاؤں سے غیبی ہاتھ حضرت مولانا نانوتوی اور رشید احمد گنگوہی کو محفوظ رکھتے رہے جن کے ہزاروں مریدوں نے اسلام کا جھنڈا تھامے رکھا۔ انہی لوگوں کی کوششوں سے مولانا محمود الحسن سامنے آئے جس نے انگریزوں کے قہر مظالم کے آہنی قلعے میں زلزلہ ڈال دیا۔ سید احمد شہیدؒ کی یاد تازہ کر دی۔

شبیر بلوچ

سنگلاخ پہاڑوں سے مزین خطۂ ارض جو ہمارا فخر ہے، جہاں کے سپوت سروں پر کفن باندھے پھرتے ہیں۔ جہاں بے شمار جواں مردی کے قصوں نے جنم لیا۔ اسی سرزمین پر ایک انوکھے عشق نے بھی شہرت حاصل کی۔ ایک ایسے عشق نے جو ظاہری آنکھ کی پہنچ سے دور ہے۔

بلوچستان کے ایک صوفی شاعر کی رودادِ حیات

سورج رفتہ رفتہ ڈوب رہا تھا۔ تاریکی کی تہہ گہری ہوتی جارہی تھی۔ چرواہوں نے اپنے مویشی اکٹھا کیے اور واپسی کی راہ لی۔ کسی نے کہا۔ ''ارے، مست تو نہیں ہے۔'' تب انہیں خیال آیا کہ مست غائب ہے۔ سب اسے ڈھونڈنے پھیل گئے۔ کافی تلاش کے بعد وہ ایک پہاڑی کے قریب گم صم بیٹھا نظر آگیا۔ کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ ''مست ارے او مست۔ گھر واپس نہیں جانا ہے۔ اٹھ اپنے مال مویشی کو اکٹھا کر۔''
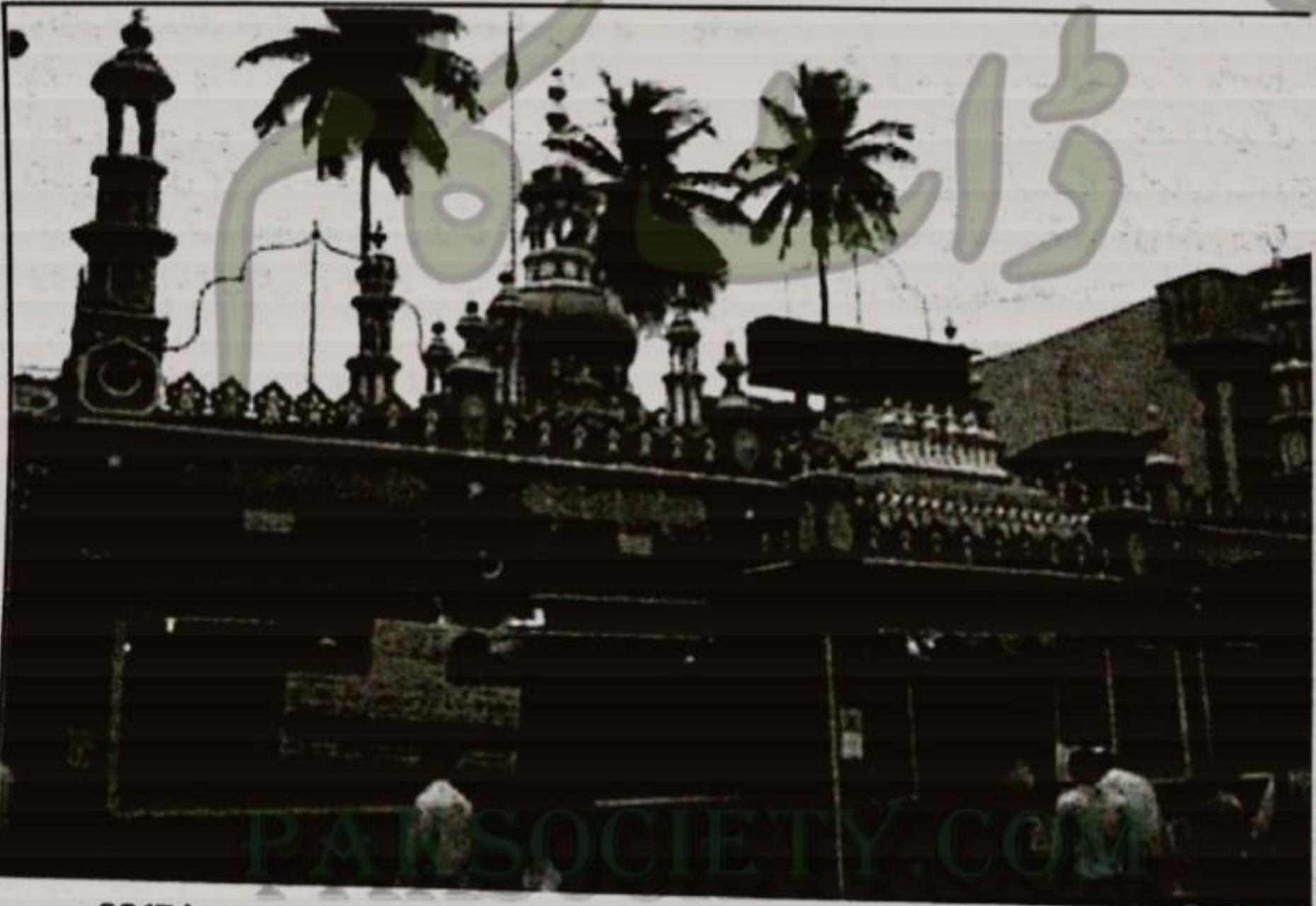
مست جیسے کسی خواب سے بیدار ہوا ہو۔ وہ تیزی سے اٹھا اور ہانکا کرتے گھر پہنچا تو مال مویشی کی گنتی شروع ہوگئی۔ باپ نے پوچھا۔ ''ارے مست آج بھی دو تین مویشی کم ہیں۔ تیرا دھیان کدھر ہوتا ہے؟''

مست کے پاس سوائے خاموشی کے کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ شروع ہی سے ایسا تھا۔ پھول، پرندے، درخت، ندی، نالے، بلند و بالا پہاڑ اسے اپنے سحر میں جکڑ لیتے تھے اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا تھا۔

مست کے والدین کا تعلق مانٹرک بند کے علاقے سے تھا۔ وہ 1825ء میں پیدا ہوا تھا۔ والدین نے اس کا نام مست توکلی رکھا تھا۔ اس کے سات بھائی تھے۔ وہ خانہ بدوش مری قبائل سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے باپ کا نام لالہان تھا۔ قبائلی روایات کے مطابق لڑکوں کو مال مویشی چرانے کی ڈیوٹی پر بھیجا جاتا تھا۔ مست بھی روزانہ ان سب کے ساتھ مال مویشی چرانے جاتا تھا مگر اس کی توجہ مال مویشی کی بجائے قدرت کے نظاروں کی طرف زیادہ ہوتی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ ندیاں، یہ نالے، یہ سربلند پہاڑ اس سے مخاطب ہوں کہ آؤ بھائی مست تم کہاں رہے تھے۔ آؤ ہم تمہاری ہی راہ تک رہے تھے۔

مست ان کے سحر میں ایسا گم ہو جاتا کہ اسے کسی بات کا ہوش ہی نہ رہتا۔ حتیٰ کہ اس کے مال مویشی میں سے کوئی جانور بھٹک کر ریوڑ سے الگ ہو جاتا تو مست کو اس کی کوئی خبر ہی نہ ہوتی۔ باپ کو یہ فکر لاحق تھی کہ اگر روزانہ اسی طرح ایک یا دو مویشی کم ہوتے رہے تو پھر اس کے پاس بچے گا کیا۔ مگر خدا کی قدرت مال مویشی میں کمی کی بجائے اضافہ ہوتا رہا۔ اسی ماحول میں پل بڑھ کر مست نے جوانی کی حدود میں قدم رکھا۔

اسے فطرت سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ وہ کسی پہاڑ پر بیٹھ جاتا اور چاروں طرف پھیلے ہوئے حسین قدرتی مناظر کو عالم دیوانگی میں تکتا رہتا۔ اسے سیر و سیاحت اور شکار کا بھی شوق تھا۔ موسیقی بھی اسے پسند تھی۔ وہ دمبیرو کو انتہائی مہارت سے بجاتا تھا۔ دمبیرو کو ساتھ لے کر وہ اس علاقے سے اس علاقے میں پھرا کرتا مگر اس کے قدم کہیں ٹکتے ہی نہ تھے۔ اس کی بے قرار روح کو کہیں چین نصیب نہ تھا۔ پہاڑیوں، ندیوں، پھولوں، بادلوں اور بارشوں نے اسے اپنے سحر میں جکڑ رکھا تھا۔

ایک شام مست ہتھیار سجائے کوہ دربھانی کی گھاٹیوں میں شکار کی تلاش میں بھٹک رہا تھا کہ اچانک تیز آندھی اور موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ دور دور تک کسی انسانی آبادی کا کوئی وجود نہیں تھا۔ کافی تلاش کے بعد اسے ایک خیمہ نظر آیا۔ وہ اسی جانب دوڑا۔ نزدیک پہنچ کر اس نے پناہ کی درخواست کی۔ خیمے میں صاحب خانہ موجود نہیں تھا۔ تاہم خاتون خانہ نے بلوچی روایات کے مطابق اجنبی مہمان کو خیمے کے اندر بلا لیا۔ خاتونِ خانہ کا نام سمو تھا جو ایک شادی شدہ خاتون تھیں اور ان کا تعلق بھی بلوچ مری قبیلے سے تھا۔ آندھی اور بارش کی جولانی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ہوا کے جھکڑ خیمے کو اڑائے جا رہے تھے۔ یہ مہمانداری کے آداب کے خلاف تھا کہ سمو مہمان کو خیمے کی طنابیں کسنے کا کہتیں۔ لہٰذا وہ خود اٹھیں اور خیمے کی طنابیں کسنے لگیں۔ تیز ہوا ان کا دوپٹا اڑا کر دور لے گئی۔ ان کے لمبے لمبے سیاہ بال ہوا میں رقص کرنے لگے۔ بارش کی وجہ سے اس کا تمام لباس بھیگ چکا تھا اور جسمانی نشیب و فراز نمایاں ہو گئے تھے۔

بجلی کی چمک میں یہ منظر دیکھ کر مست دم بخود رہ گیا۔ شکاری خود شکار ہو چکا تھا۔ وہ عالمِ دیوانگی میں اسے گھورے جا رہا تھا۔ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ بلوچی روایات کے مطابق عشق اور وہ بھی کسی شادی شدہ عورت سے کرنا اپنی موت کو آواز دینا ہے۔ مگر محبت کا تیر اس کے دل میں اتر چکا تھا۔

آندھی تھم گئی۔ بارش رک گئی۔ تاریکی رخصت ہو گئی۔ ہر طرف اجالا پھیل گیا۔ خاتون خانہ کو اُمید تھی کہ مہمان اب رخصتی کی تیاری کرے گا مگر مہمان نے وہیں ڈیرے ڈال دیے کیوں کہ اسے تو اپنا بھی ہوش نہ تھا۔ وہ بس سمو کو ایک ٹک گھورے جا رہا تھا۔

سمو کا خاوند واپس آیا اور اس نے ایک اجنبی شخص کو اپنے خیمے میں دیکھا تو اس کے بارے میں دریافت کیا۔ سمو نے ایک نظر اس اجنبی پر ڈالی اور اس کے بارے میں ایک ایک بات بتا دی۔ یہ باتیں معمولی نہ تھیں۔ ایسی باتوں پر تو سر کٹ جاتے ہیں۔ اجنبی کا حال کچھ ایسا تھا کہ وہ چاہ کر بھی اسے کچھ نہ کہہ سکا۔ کافی سوچ بچار کے بعد اس نے یہ ساری صورت حال قبیلے والوں کے سامنے رکھی۔ قبیلے والوں نے مست کی حالتِ دیوانگی دیکھ کر اسے جان سے مارنے کی بجائے اس کے قبیلے کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا اور اسے واپس کر دیا مگر وہ پھر واپس آ کر سمو کے خیمے کے سامنے پہاڑ کے دامن میں بیٹھ گیا اور اس کے خیمے پر نظریں گاڑ دیں کہ

شاید کسی طرح سے دیدار یار ہو جائے۔ آنکھوں کو ٹھنڈک اور بے قرار روح کو چین مل جائے۔ لوگ اس کی حالت دیکھ کر اس پر ہنستے۔ اس کی دیوانگی پر افسوس کرتے مگر وہ تو ان تمام باتوں سے بے نیاز تھا۔ اسے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ دنیا اس کے بارے میں کیا کہتی ہے۔ وہ پہاڑوں سے باتیں کرتا، درختوں سے خطاب کرتا، شعر کہتا اور پرندوں کو پیغام دے کر اپنی محبوبہ سمو کی طرف بھیجتا۔

ترجمہ: ''سمو پہاڑوں میں کھلنے والا ایک سرخ پھول ہے۔
وہ ایک دیا ہے
جو اندھیروں کو اجالوں میں بدل دیتا ہے
سمو ایک غزال کو ہستانی ہے
سمو ایک جام شراب کا ہے۔'' (ترجمہ: ڈاکٹر شاہ محمد مری)

مگر اس کے نصیب میں تو فراق کے کڑوے اور زہر بھرے جام تھے۔ اس کی آنکھیں رت جگوں کا عذاب سہنے کے لیے بنی تھیں۔ جب وہ بے بس ہوتا، دیدار یار کی ہر کوشش ناکام ہو جاتی تو وہ ہجر کے درد کو بھلانے کے لیے عازم سفر ہو جاتا۔ جدھر منہ اٹھتا چل پڑتا۔ جب آتشِ عشق خوب بھڑک اٹھتی تو آرزوئیں اور ناکام تمنائیں سوز بھرے اشعار کا روپ اختیار کر لیتیں۔ اس کے ان درد بھرے اشعار کے سامعین ندیاں، نالے، پھول اور پہاڑ ہوتے۔

ترجمہ: سمو تمہاری یادیں لحہ بہ لحہ نئی ہوتی جاتی ہیں
کہیر نامی لکڑی کی تیز ترین آگ کی طرح
شعلہ فشاں ہو جاتی ہیں
عشق کی طوفانی ہواؤں نے مجھے لو کی طرح جھلسا دیا ہے
میں سر سے پیر تک کیلو کی طرح جل کر سیاہ ہو چکا ہوں

ایک ایسی نہ بجھنے والی پیاس اس کے مقدر میں لکھ دی گئی تھی کہ بقول حضرت مست دریا بھی مل کر اس کی پیاس کو نہیں بجھا سکتے تھے۔ اپنی اس بے انت اور ازلی پیاس کا اظہار وہ یوں کرتا۔

ترجمہ: ''دوست تیرے غموں کی وجہ سے
میں کتنا پیاسا ہو چکا ہوں
دریا کے دریا پی جاؤں
مشک کے مشک پی جاؤں
کچھ نہیں ہوتا مگر سمو کے ہاتھوں سے
ایک چلو پی لیتا ہوں
تو ساری پیاس مٹ جاتی ہے''

اس کے جگری یار بہار خان سے اس کی یہ حالت دیکھی نہ گئی۔ اس سے رہا نہ گیا۔ وہ اپنے علاقے کے ایک وڈیرے شادی ہان خان کے پاس گیا اور توکلی کی حالت بیان کی اور مدد کی درخواست کی۔ جب سمو تک وڈیرہ شادی ہان خان کا یہ پیغام پہنچا تو وہ بلا خوف و خطر اور بلا تردد یہ بات مان گیا کیوں کہ وڈیرہ شادی ہان خان ایک معتبر آدمی تھا اور ہر کوئی اس پر اعتماد کرتا تھا۔ ملاقات کے دن بہار خان نے مست سے کہا آؤ تمہیں سمو سے ملوا دوں۔ مگر جونہی سمو مست کے قریب پہنچی تو وہ دیدار کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گیا۔ سمو نے اسے کئی آوازیں دیں۔ اس کی آنکھوں، بالوں اور چہرے کو سہلایا مگر مست ہوش میں نہ آیا۔ آخر کار سمو کو واپس جانا پڑا۔

جب مست کو ہوش آیا تو بہار خان نے پوچھا ''توکلی کیا ہو گیا تھا تمہیں؟ سمو، سمو پکارتے تھے، سمو آئیں تو تم بے ہوش ہو گئے۔ نہ اسے دیکھا، نہ اس سے ملے، نہ اس سے باتیں کیں۔''

مست نے کہا۔ ''اس نے مجھے دیکھا میں نے اسے دیکھا، بس ہو گیا وصل۔''

پہاڑوں میں رہنے والوں کی زندگی بارش اور سبزے سے جڑی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کوئی مستقل ٹھکانا نہیں ہوتا۔ جہاں پانی اور سبزہ مل گیا۔ وہی ان کا گھر وہی ان کا وطن بن جاتا ہے۔ وہ اپنے محبوب کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ

اے خدا سمو کے عروسی خیمے کو
بوندوں کی چھتری نصیب کر
وہ خیمے سے نکلے اور بارش کا نظارہ کرے۔

وہ پہاڑوں کے سخت پتھریلے راستوں پر سفر کرتا۔ اپنی محبوبہ کے حسن کے گیت گاتا۔ جو نہ تو کسی محل کی رانی تھی نہ ہی کوئی ملکہ۔ ایک عام سی عورت جو مال مویشی چراتی تھی۔ جس کے پاؤں میں جوتے شاذ ہی ہوتے تھے مگر مست اس کے حسن کے بارے میں یوں بات کرتا ہے جیسے وہ جنت کی کوئی حور ہو۔

ترجمہ: ''خوشا تیری نرم چال
خوشا تیری دلکش ہنسی
خوشا تیری خوشبوئیں
انہیں میرے جسم سے لپٹا رہنے دے

مست کی یہ باتیں جب سمو کے قبیلے والوں کی طرف پہنچیں تو اس کے عزیز، رشتے دار از حد پریشان ہوئے۔ یہ

Jazz

موسیقی کی ایک رقصی طرز، جو آج کل ناچ گھروں میں مروج ہے۔ باقاعدہ راگنی کے کچھ پردوں کو محذوف یا منقطع کر کے یہ طرز نکالی جاتی ہے۔ جاز کے بینڈ میں مختلف قسم کے باجے استعمال ہوتے ہیں لیکن تیز آواز کے باجے اور ایسے باجے جن پر چوٹ پڑتی ہے زیادہ مرغوب ہیں۔ بگل، ڈھول (جس پر کبھی کپڑا باندھ کر آواز کی تیزی کم کی جاتی ہے) وائلن، بینجو اور پیانو بینڈ میں شامل ہوتے ہیں۔ کچھ باجے ناچتے وقت تال دینے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ امریکا کے حبشیوں کے گانوں سے جاز کی طرز ایجاد ہوئی۔

جافنا Jaffna

سری لنکا کے شمالی صوبے جافنا کا صدر مقام۔ یہ ہندو تامل قوم پرستوں کا اکثریتی علاقہ ہے۔ تامل دراصل بھارتی ریاست تامل ناڈو سے ہجرت کر کے وہاں جمع ہوتے رہے۔ جب ان کی اکثریت ہو گئی تو انہوں نے بھارتی ایجنسی ''را'' کے بہکاوے میں آ کر مسلح بغاوت شروع کر دی۔ 1980ء کے عشرے میں یہیں سے ان قوم پرستوں نے آزادی حاصل کرنے کے لیے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا تھا۔ 1996ء میں سری لنکا مسلح افواج نے ان کے ٹھکانوں کو نشانہ بنایا اور انہیں یہ علاقہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

Feudal System

وہ معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی نظام جو جدید حکومتوں کے قیام سے پہلے یورپ اور ایشیا کے اکثر ممالک میں جاری تھا۔ اس نظام کی بعض خصوصیات یہ تھیں کہ بادشاہ کی طرف سے مختلف افراد کو ان کی خدمات کے صلے میں زمینوں کے وسیع رقبے جاگیر کے طور پر عطا کیے جاتے تھے۔ یہ جاگیردار اپنے لیے ٹیکس وصول کرتے تھے ان کی حیثیت مزارعین و دیگر مقامی باشندوں کے لیے حکمران سے کم نہیں تھی۔ مزارعین جاگیردار کے ظلم و ستم کی چکی میں پستے رہتے تھے۔ ان کو کسی قسم کے سیاسی حقوق حاصل نہیں تھے۔ انیسویں صدی میں یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد، جاگیردارانہ نظام کو زوال آیا اور اس کی جگہ سرمایہ دارانہ نظام نے لی۔ اب یہ نظام یورپ سے بالکل ناپید ہو چکا ہے لیکن افریقا اور ایشیا کے بعض ممالک میں کلی یا جزوی طور پر اب بھی اس کی عملداری ہے۔ پاکستان میں 1976ء میں اسے مکمل طور پر ختم کر دیا گیا۔

مرسلہ: زہیب مظفر۔ سکھر

بات ان کے لیے بڑی ندامت اور بدنامی کا باعث تھی کہ ایک غیر مرد ان کے قبیلے کی عورت سے اس طرح سرعام عشق کرتا پھرے۔ اس کا نام لے لے کر اشعار کہتا پھرے۔ بزرگوں نے سر جوڑ لیے کہ اس مسئلے سے کس طرح نمٹا جائے۔ آخر طے ہوا کہ قبائلی روایات کے مطابق اس باغی کو جان سے مار دینا چاہیے۔ اس کام کے لیے قبیلے کے ایک نوجوان گدا کو تیار کیا گیا۔ غیرت و حمیت سے بھرا گدا ہر وقت مست کی تاک میں رہنے لگا کہ کب موقع ملے اور وہ اس دشمنِ ناموس و غیرت کا کام تمام کر دے۔

ادھر مست اپنے عالمِ بے خودی میں مست تھا۔ ایک روز وہ ایک پہاڑی پر کھڑا اردگرد پھیلے قدرت کے حسین نظاروں کا نظارہ کر رہا تھا کہ اچانک ایک ہاتھ آگے بڑھا۔ مست پہاڑی سے لڑھکتے ہوئے نیچے پتھروں پر جا گرا مگر گدا یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مست کو تو خراش تک نہ آئی۔ اگر کوئی اور شخص اتنی بلند پہاڑی سے نیچے گرتا تو اس کا سرمہ بن چکا ہوتا مگر مست مسکرا مسکرا کر اپنے قاتل کو دیکھ رہا تھا۔

خوف سے گدا پر لرزہ طاری ہو گیا۔ وہ مست کے قدموں میں گر پڑا اور گڑگڑا کر معافی مانگنے لگا۔ ادھر قبیلے والے منتظر تھے کہ کب گدا مست کی موت کی خوش خبری لے کر ان کے پاس آتا ہے۔ وہ بڑی بے چینی سے اس کے منتظر تھے۔ آخر انتظار کے جاں گسل لمحات ختم ہوئے۔ گدا دور سے آتا ہوا نظر آیا۔ سرشار و بے خود۔ دیوانے مست کا پہلا مرید۔ پہلا عقیدت مند۔ قبیلے والوں نے اسے گھیر لیا۔

''ارے گدا بتا کامیابی ہوئی یا نہیں۔''

گدا نے قبیلے والوں کو انتہائی عقیدت بھرے لہجے میں تمام داستان کہہ سنائی۔ جسے سن کر تمام قبیلے والوں کو یقین ہو گیا کہ مست کا عشق ہر قسم کی جنسی خواہشات سے ماورا ہے۔ بلکہ وہ ایک عاشقِ صادق ہے۔ ان کی دشمنی عقیدت میں بدل گئی۔ وہ بھی حضرتِ مست کے عقیدت مند بن گئے۔

ترجمہ: ''میرے دل میں موجیں اٹھتی ہیں
جیسے ساون کی گھٹائیں ہوں
جیسے سمندری، سیلابی ندیوں میں اچھال آ جائے
محبوبہ میری قوسِ قزح کی طرح
سفید بادلوں پر نمودار ہوتی ہے
ایسے لشکارے مارتی ہے
جیسے ساون کے پانی بھرے بادل

بجلی چمکاتے ہیں
ایک صبح بادِ نسیم چلتی ہے
سرسبز بلندیوں پر سکون بخشتی ہے کہ
سمو کے پیغام ساتھ لا رہی ہے"

سمو کا خاوند جو دشمنِ جانِ مست بنا ہوا تھا۔ اب اس کا غلام بے دام بن چکا تھا۔ اب مست ایک دیوانے، عاشق کی بجائے حضرتِ مست کا درجہ پا چکے تھے۔ تمام لوگ انہیں اللہ کا برگزیدہ بندہ اور ولی اللہ سمجھتے تھے اور اس کی مہمانداری کو اپنے لیے باعث عزت و افتخار سمجھتے تھے۔ اب ہجر کا موسم اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا۔ وصل ہی وصل تھا۔ پاکیزہ اور معطر وصل۔ جس کی خوشبو اشعار کی صورت میں بلوچستان، سندھ اور پنجاب کے پہاڑوں، میدانوں، بستیوں اور شہروں کو معطر کرتی تھی۔ اس کے اشعار سن کر ہر چیز پر جذب و کیف اور وجد کی حالت طاری ہو جاتی تھی۔ اب مست سمو کے عشق میں تنہا نہیں تھے۔ اس کے ارد گرد ہر چیز سمو کی عقیدت مند بن چکی تھی۔

اب سمو بھی کوئی عام عورت نہیں رہی تھی۔ حضرتِ مست کے عشق اور شاعری نے انہیں ایک خاص ہستی کے درجے پر فائز کر دیا تھا۔ مست جب بھی جہاں گردی سے تھک ہار کر واپس آتے تو ان کے قدم خود بخود سمو کے خیمے کے آگے رک جاتے۔ رخِ جاناں پر دید پڑتی تو تمام غم، تمام دکھ، خوشیوں میں بدل جاتے۔ سمو اور ان کا خاوند حضرت مست کی آؤ بھگت میں جت جاتے مگر حضرتِ مست کے لیے تو دیدارِ یار سے بڑی اور کوئی نعمت دنیا میں تھی ہی نہیں۔

مست زندگی بھر سیلانی رہے۔ تمام عمر کسی جگہ پر مستقل قیام نہیں کیا۔ آتشِ عشق مست کو ہر لحہ، ہر پل بے چین و بے قرار رکھتی۔ ایک شہر سے دوسرے شہر۔ ایک منزل سے دوسری منزل۔ مست مسلسل پاپیادہ سفر میں رہتے۔ اولیائے کرام کے مزارات پر حاضری دیتے۔ حضرت سخی سرورؒ اور حضرت لال شہباز قلندرؒ سے انتہا درجہ کی عقیدت تھی۔ جن کا ذکر انہوں نے اپنی شاعری میں انتہائی ادب اور احترام سے کیا ہے۔

ایک مرتبہ حضرتِ مست ڈیرہ غازی خان اور سندھ کی سیاحت کرتے کرتے ملتان پہنچ گئے۔ پھر ملتان سے لاہور اور لاہور سے دہلی جا پہنچے۔ دہلی میں انہیں دیوانا سمجھ کر پابندِ سلاسل کر دیا گیا مگر پھر جلد ہی وہ رہا ہو گئے۔

مست چونکہ کسی دنیاوی کتب کے مرہونِ منت نہیں تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی پوری شاعری میں بمشکل ہی کسی دوسری زبان کا کوئی لفظ ملتا ہے۔ مست کی تشبیہات و استعارات ان کے اپنے علاقے کے ہیں۔ وہ اپنے محبوب کو جاندراں پہاڑ کی ارغوانی چٹانوں پر اگنے والے لیموں کا بوٹا کہتے ہیں تو کہیں اس کی زلفوں کو زامر جیسی لمبی اور گھنی قرار دیتے ہیں۔ کہیرے کے شعلوں میں بھی مقامیت کا رنگ غالب ہے اور کیلو بھی ان کے علاقے کی خاص چیز ہے۔ وہ اپنے محبوب کے چہرے کو چاند سے تشبیہہ دینے کی بجائے اس چراغ سے مماثل قرار دیتے ہیں جو ان کے جھونپڑے کو روشن کرتا ہے۔ اس کی آنکھوں کو آہوئے رمیدہ کہتا ہے۔

بلوچوں میں قبائلی لڑائی جھگڑے معمول کی باتیں ہیں۔ رند و لاشار کی قبائلی جنگ میں دونوں طرف سے ہزاروں جانیں قربان ہوئیں۔ خون کی ندیاں بہیں۔ بے شمار خواتین کے سہاگ لٹ گئے مگر محبت کے علمبردار حضرت مست کو ان قبائلی جنگوں سے شدید نفرت تھی۔ ان قبائلی

ترجمہ کلام حضرت مست توکلی

(ترجمہ: ڈاکٹر شاہ محمد مری)

یاد ہے مجھے خدا، مرشد ہر دم مدد کو تیار
شہ مرید صبح و شام میری صدا پہ
آن موجود ہوتے ہیں
سمو کو میں نے دیکھا
جو شاندار لباس پہنتی ہے
وہ درختوں میں سے لیموں کا درخت ہے
شاہی باغوں کا
اس کے پتے حسین ہیں
رنگت شکر آمیز
خدوخال متناسب
اس کے پراندے، چوٹیاں مشک، لونگ اور عطر سے معطر
سمو تمہاری چال کبوتر جیسی
توکلی مست کے اشعار قبیلوں کے سربراہوں کے پاس محفوظ ہیں۔
جو بھی ان اشعار کو دہرائے گا۔ مست کے تذکرے کرے گا اس کے سارے گناہ معاف ہوں گے خداوند کے دربار میں۔ مست اس کے لیے دعائے نیک کرے گا۔

جنگوں کے پہلے باقاعدہ باغی حضرت مست تھے۔ 1858ء میں شم کے مقام پر دو بلوچ قبائل باہم بھڑ گئے۔ چھمبڑی نامی اس جنگ میں مست بھی اپنے قبیلے کے لشکر میں شامل تھے۔ اپنے بھائی بندوں اور قبیلے کے جوانوں کی گرتی ہوئی لاشیں دیکھ کر علمبردار عشق و امن سے یہ سب ظلم برداشت نہ ہوا اور وہ میدانِ جنگ سے یہ کہتے ہوئے رخصت ہوگئے۔

ترجمہ: ''اچھی نہیں ہیں جنگوں کی واہیات باتیں۔''

اس جنگ میں جہاں اس کے قبیلے کے دوسرے نوجوان کام آئے۔ وہیں اسے اپنے پیارے بھائی علن کی موت کا صدمہ بھی سہنا پڑا جس کا غم تاعمر مست بھلائے نہ بھلا سکے۔

تاہم مست کا یہ امتیاز ہے کہ وہ حق کی خاطر جنگ کو جھٹکتے نہیں۔ تلوار واپس میان میں رکھ کر میدانِ جنگ سے رخصت نہیں ہو جاتے۔ ظلم، زور آوری اور بالادستی کے خلاف ان کا امن سراپا جنگ بن جاتا ہے۔

جب انگریز سپاہ ان کے قبیلے پر حملہ آور ہوئی تو وہ اپنے علاقے میں موجود نہ ہونے کی کمی کو محسوس کرتے ہیں اور واپس جا کر انگریز سے دودو ہاتھ کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔

حضرت مست سے بہت سی کرامات بھی وابستہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سمو کا ایک چھوٹا سا بیٹا تھا۔ ایک بار جب مست سمو کے ہاں مہمان ٹھہرے تو سمو ان سے ملنے آئیں۔ اس کا بیٹا بھی اس کے ساتھ ساتھ چلا آیا۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد جب سمو واپس جانے لگیں تو بیٹا ماں کے دوپٹے کا پلو پکڑ کر ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اچانک سمو کا دوپٹا کھنچ گیا اور ان کے سر سے گر گیا۔ مست سے اپنے محبوب کی شان میں یہ گستاخی برداشت نہ ہو سکی۔ اس نے جھٹ سے کہا۔

ترجمہ: ''ارے تیرا ہاتھ ٹوٹ جائے تو نے سمو کا دوپٹا گرادیا۔''

اس بچے کا ہاتھ سوکھ گیا اور وہ پاگل ہو کر مر گیا۔

قادر بخش کھیتران، مست کا بہت عزیز دوست تھا۔ دونوں میں اس حد تک دوستی تھی کہ اگر مست بھی روزے رکھتا تو قادر خان بھی روزے میں ہی ہوتا۔ ایک دن قادر خان نے مست سے کہا کہ آپ دعا کریں میری نیلی گھوڑی گھڑ دوڑ کے مقابلوں میں سب سے آگے نکل جائے۔

مست نے کہا۔ لاؤ میں اس پر ہاتھ پھیر دوں گا۔ اس نے ہاتھ پھیرا اور یوں کہا۔ ترجمہ: ''قادر کی کندمی (نیلی گھوڑی) تیز رفتار، سمو کا دوست مجنوں۔''

کہتے ہیں کہ پھر قادر خان کی گھوڑی ہمیشہ نمبر ون رہی۔ کوہ جاندراں پہ ''مست ءِ تل'' نامی ایک جگہ ہے۔ وہاں ایک بہت بڑا غار ہے۔ اس میں مست نے بلیاں کاٹ کر کھڑی کردیں اور کہا۔ ''اب یہ غار نہیں۔ سمو کا گھر، سمو کا خیمہ ہے۔''

ایک بار قادر خان نے مست سے کہا۔ ''دشمن میرے پیچھے پڑا ہے۔ وہ لوگ میری سرداری چھین لیں گے۔ میرے لیے دعا کریں۔''

مست نے اس سے کہا۔ ''مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ تمہاری سرداری کو خطرہ ہے۔ چلو چل کر سمو کو خبر کرتے ہیں۔ وہ ہر روز مغرب کے وقت اس خیمے میں آتی ہیں۔ تم انہیں فریاد سنا دینا۔''

مغرب کے وقت وہاں ایک خاتون آئیں۔ قادر خان نے انہیں اپنی فریاد سنائی۔ سمو نے کہا۔ ''جاؤ تمہاری سرداری جاری ہوگی۔''

اس گھرانے کی سرداری اب تک جاری ہے۔ سمو کے نام یہ خیمہ آج تک وہاں موجود ہے۔ جب بھی لکڑیاں پرانی ہو جاتی ہیں تو عوام نئی بلیاں لاکر وہاں لگا دیتے ہیں۔

ایک دفعہ دوڑ کے مقابلے جاری تھے۔ مست نے ایک لحیم شحیم اور فربہ آدمی وزیر خان کو بھی زبردستی دوڑ کے اس مقابلے میں شامل کروادیا۔ لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ یہ دوڑ کا مقابلہ چست و تیز نوجوانوں سے ایک فربہ آدمی نے جیت لیا۔ آج بھی لوگوں کا عقیدہ ہے کہ دوڑ کے مقابلے میں ہمیشہ آل وزیر ہی فاتح رہے گی۔

مست کو عوام و خواص میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ایک عام انسان سے لے کر قبیلے کے سردار تک مست کے عقیدت مند تھے۔ مزاری کے قبیلے سردار امام بخش خان مزاری، بگٹی قبیلے کے سردار مرتضیٰ خان بگٹی، مری قبیلے کے سردار گزین خان مری، سردار دودا خان مری، سردار مہر اللہ خان اوّل اور لغاری قبیلے کے سردار جمال خان لغاری بھی آپ کا بے حد احترام کیا کرتے تھے۔

ایک بار جب مست، روجھان مزاری میں نواب امام بخش خان مزاری کے ہاں تھے تو آپ نے نواب صاحب سے فرمائش کردی کہ مہمان خانے کے دروازے کے سامنے سیمنٹ کی دو کرسیاں بنادی جائیں۔ ایک کرسی سمو کی ہوگی اور دوسری ان کے لیے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

اسی طرح ایک بار حضرت مست شہباز قلندرؒ کی زیارت پر جارہے تھے۔ سفر ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ جاری تھا کہ اچانک سامنے سے ٹرین آتی نظر آئی۔ آپ کے ساتھ جو آدمی تھا اس نے آپ کو بہتیرا ہٹ جانے کو کہا مگر آپ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ وہ آدمی اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ کھڑا ہوا اور پٹڑی سے دور ہٹ گیا۔ جب ٹرین اور قریب آئی تو آپ نے با آواز بلند کہا ''ہش سمولاغ'' یعنی سمو کے گدھے رک جاؤ۔ ٹرین جھٹکے سے رک گئی۔ آپ کی یہ کرامت دیکھ کر وہ آدمی، تمام مسافر اور ٹرین کا عملہ حیران رہ گئے۔ مست نے زندگی بھر اکیلے کھانا نہیں کھایا۔ آپ کی خدمت میں ہمیشہ دو آدمیوں کا کھانا پیش کیا جاتا تھا۔ آپ فرماتے تھے ایک حصہ میرا اور ایک حصہ سمو کا ہے۔ وہ میرے بغیر کھانا نہیں کھاتی۔ ان کرامات کے بعد کسی شخص کو ان کے ولی کامل اور عاشقِ حقیقی ہونے میں شک نہیں رہا۔

اگرچہ مست کی شاعری کا مرکزی محور سمو ہے مگر چونکہ مست کی شاعری ایک صوفی کی شاعری ہے لہٰذا ان کی شاعری میں حمدِ خدا، توصیف مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، شانِ اہلِ بیت وصحابہ کرامؓ سے بھی مزین وآراستہ ہے۔ وہ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

ترجمہ: ''تعریف کرتا ہوں مولا کی قدرتوں کی۔
پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف کرتا ہوں
ان کے چہار یاروں اور ملائکہ کے ساتھ
روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
اور مالک کی تعریف کرتا ہوں
روزے رکھتا ہوں
اللہ کے فرائض ادا کرتا ہوں
کلمہ پڑھتا رہتا ہوں
سورۂ یٰسین پڑھتا رہتا ہوں۔''

ایک اور مقام پر ذکرِ خدا ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

ترجمہ: ''میں پہاڑوں میں بیٹھ کر
ششماہی روزے رکھوں گا۔
کھانا پینا بھی سود مند ہوتا ہے
(مگر) راہِ خدا میں دیا ہوا تو آخرت کے لیے توشہ ہے
میں مالک کا ذکر شب وروز کرتا ہوں
آہ وزاری اچھی ہے کہ گناہ معاف کراتی ہے۔''

مست نے حج کی سعادت بھی حاصل کی تھی۔

مست عشق کی بے خبر آوارگی میں اپنے علاقے سے

انتخاب کلام

(ترجمہ: ڈاکٹر شاہ محمد مری)

آنکھیں، جلتے چراغ جیسی روشن
زلفیں لہراتے سانپ جیسی
سمو کی آنکھیں ہیں سرخ، ہوں جیسے خمار میں
ممتاز ہے وہ انمول سہیلیوں کی قطار میں
اڑتے اژدھوں کی سی اس کی پھنکار

بہت دور کہیں تخلیق کے ذکر وفکر میں غرق ہیں۔ ان کا بے خبر دل انہیں کوہستان لے جانے اور اپنی محبوبہ سے ملنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ جب مست تھکا ہارا اپنے وطن واپس پہنچتا ہے تو ایک نامعلوم خاموشی ان کا استقبال کرتی ہے۔ ہوائیں خاموش، شجر رنجیدہ، پرند چپ اور تو اور سمو کے گھر کے پتھر بھی اس سے نگاہیں چرا رہے تھے۔ طالب سمجھ گیا کہ اس کا مطلوب اس سے چھن گیا ہے۔ شدتِ درد سے وہ سمو کے گھر کے پتھروں پر برس پڑتا ہے۔ ان سے سمو کی خیر وعافیت دریافت کرتا ہے مگر پتھر کیسے بولیں۔ جب تک مالکن اجازت نہ دے۔ مست کی تو دنیا ہی اندھیر ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کی دردناک چیخیں شعروں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

ترجمہ: ''(پتھروں سے پوچھتا ہوں)
پتھر نہیں بولتے
انہیں ڈانٹ پلاتا ہوں
پتھر نہیں بولتے
جب تک کہ ان کی مالکن
اجازت نہ دے۔''

وہ اس کے قبیلے والوں پر برس پڑتا ہے کہ تمہیں جرأت کیسے ہوئی کہ تم نے سمو کو میری اجازت کے بغیر دفن کر دیا۔ وہ کہتا ہے۔

ترجمہ: ''خنجر لا دو کہ اپنے دل کے پار اتار دوں۔
سمو کے پتھر کے بنے گھر کو
اپنے خون سے رنگین کر دوں۔''

سمو مائی کے سالِ وفات میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ کسی نے 1873ء تو کسی نے 1880ء بیان کیا ہے۔ تاہم اس بات پر سب متفق ہیں کہ اسلامی سال کا وہ مقدس مہینا رمضان تھا۔

سمو کی وفات مست کے لیے ایک سانحۂ عظیم تھی۔

سوانحی خاکہ

مکمل نام: مست توکلی
والد کا نام: لالہان خان
تاریخ پیدائش: 1825ء
تاریخ وفات: 1896ء
قوم: شیرانی مری
علاقہ: ماٹرک بند بلوچستان
ازدواجی زندگی: مجرد
مدفن: میداں گری مری ایجنسی بلوچستان

کشش کی وہ قوت ہی نہ رہی کہ جس کے گرد مست دیوانہ وار رقص کیا کرتا تھا۔ سر پر پگڑی نہ رہی۔ پاؤں میں جوتے نہ رہے۔ سارے ٹھاٹھ باٹھ ختم ہو گئے تھے۔ مست حسرت و یاس کی تصویر بن کر رہ گئے تھے۔ اب ان کی زندگی کا مقصد پہاڑوں میں گھومنا، شاعری کرنا اور مرقدِ سمو کی دیکھ بھال کرنا رہ گیا تھا۔ دن بھر پہاڑوں، ندیوں سے گھوم پھر کر خوب صورت رنگ برنگے پتھر جمع کرتے اور سمو کے مزار کی تزئین کے لیے استعمال کرتے۔ سمو کی وفات کے تقریباً پندرہ برس بعد تک حضرت مست زندہ رہے۔ وہ دیوانہ جو دیدار یار کے لیے لمبے لمبے اور طویل سفر کیا کرتا تھا اور رخِ یار کی زیارت کر کے آنکھوں کو ٹھنڈ پہنچایا کرتا تھا۔ اب ہجر کے مزید دکھ درد سہنے کی تاب اس میں ختم ہو گئی تھی۔ سمو کی یاد ہر وقت انہیں بے چین و مضطرب کیے رکھتی تھی۔ تمام عمر جہاں گردی میں ان کا ساتھ دینے والے پاؤں اب ان کا ساتھ نہیں دے پا رہے تھے۔

یوں لگتا تھا جیسے دنیا میں ایک نہ ہو سکنے والی دو روحوں کے ملاپ کا وقت قریب آ گیا تھا۔ پڑہ کے علاقے میں ایک طرف سے حضرتِ مست چلے آ رہے تھے اور دوسری طرف سے ان کے انتہائی عزیز یار وڈیرہ کوکین خان پوادی اپنا گھرانہ لیے دوسری مناسب جگہ پر ڈیرہ ڈالنے آ رہے تھے۔ ان کا اصل نام ڈیوا خان پوادی تھا۔ مگر مست پیار سے انہیں کوکین کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ یہ دونوں دوستوں میں شاید آخری ملاقات تھی۔ حال احوال ہوا تو مست نے کہا بس کوکین اب ادھر ہی ڈیرہ ڈال دو، کوکین اپنے یار کی بات کہاں ٹال سکتا تھا۔ خیمے گاڑ دیے گئے۔ چراغ روشن کر دیئے گئے مگر دونوں دوست نہ ہی ایک دوسرے کا حال احوال بانٹ سکے اور نہ ہی ایک دوسرے کو دکھ درد سنا سکے۔ اسی روز ڈیوا خان پوادی خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ایک اور عزیز ترین ہستی چھن گئی۔ آنکھوں سے اشکوں کا سیلِ رواں ابل پڑا۔ اب دل داغدار مزید داغ سہنے کی تاب کھو چکا تھا۔ مست بھی بیمار پڑ گئے۔ ان کے قبیلے والوں کو اطلاع کی گئی۔ سمو بیلی کو چارپائی پر ڈال کر کندھوں پر لیے ان کے قبیلے کے لوگ اپنے علاقے کی طرف روانہ ہوئے مگر اب مست نامی دریا اور سمو بیلی کی جولانیاں دم توڑ چکی تھیں۔ یہ قافلہ ابھی کاہان سے چودہ میل کے فاصلے پر تھا اور ندی کے قریب پہنچ گیا۔ تو مست نے انہیں چارپائی رکھ دینے کا حکم دیا۔ پھر ان سے کہا مجھے چارپائی سے اتار کر فرش پر لٹا دیں اور خود جا کر اپنے لیے کھانا وغیرہ پکائیں۔ جب تک وہ نہ بلائیں کوئی اس کے پاس نہ آئے۔ خاصی دیر کے بعد جب آ کر دیکھا تو مست توکلی طمانیت کی حالت میں لیٹے ہوئے تھے۔ ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ چنانچہ ہرکارہ بھجوا کر سردار مہر اللہ خان کو مست توکلی کے وصال کی خبر سنائی گئی۔ مست نے وصیت کی تھی کہ انہیں تکلیل پہاڑ پر دفن کیا جائے مگر جس اونٹ پر ان کی میت رکھی گئی تھی وہ میداں گری نامی ہموار جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ اونٹ کو وہاں سے اٹھانے کے تمام جتن کیے گئے مگر اونٹ وہاں سے نہ اٹھا۔ چنانچہ سمو بیلی کی تدفین وہیں عمل میں لائی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ جب مست کی قبر کھودی گئی اور اس میں میت رکھی گئی جتنی مٹی قبر میں ڈالی جاتی تھی۔ قبر بھرتی ہی نہیں تھی۔ بالآخر مجبوراً اس وقت کے مری چیف سردار مہر اللہ خان کو بلوایا گیا تو قبر خاموش ہوئی اور تدفین کا عمل مکمل ہوا۔

حضرت مست نے ایک مقام پر فرمایا تھا۔

ترجمہ: ”کاہان کا (عام) کوہستانی مری ہوں۔ راضی تو (خدا) ہوا ہے سمو کو محض بہانہ بنایا۔“

”میداں گری“ میں آپ کا مزار مرجعِ خلائق ہے۔ جہاں دور دراز سے لوگ اس عاشقِ صادق کے مزار پر حاضری دینے آتے ہیں۔ منتیں مانگتے ہیں۔ جب عقیدت مند خواتین مست کے مزار پر جاتی ہیں اور منتیں مانگتی ہیں تو اپنی زلفوں کا کچھ حصہ کاٹ کر نذرانے کے طور پر پیش کرتی ہیں تاکہ وہ اس عاشق صادق کے طفیل اپنی محبت میں کامیاب ہو جائیں۔ بوقت وفات مست کی عمر 71 برس تھی اور یہ سال 1896ء تھا۔☆

پودے

منظر امام

سائنس نے ثابت کیا ہے کہ جاندار صرف دو پائے، چوپائے یا اُڑنے، تیرنے والے کو ہی نہیں کہتے۔ پیڑ پودے بھی جاندار ہوتے ہیں۔ وہ سانس لیتے ہیں۔ پھلتے پھولتے ہیں۔ خوشی غمی بھی محسوس کرتے ہیں۔ ان پیڑ پودوں کی ایسی بے شمار اقسام ہیں جو خود میں تعجب خیز ہے۔ ایسے ہی چند پودوں کا ذکرِ خاص

معلومات کے متلاشیوں کی پسند اس ماہ کا تحفہ

درخت، پھول، پودے ہمارے لیے کتنے ضروری ہیں۔

ہم درختوں اور پودوں سے کیا کچھ نہیں حاصل کرتے۔ یہ کون نہیں جانتا۔ درخت سایہ دیتے ہیں۔ موسم خوب صورت ہو تو ان ہی درختوں پر جھولے ڈال دیے جاتے ہیں اور لڑکیاں پینگیں یعنی گیت گایا کرتی ہیں (پتا نہیں اب یہ خوب صورت روایت ہے یا نہیں)۔

درختوں کے لیے بہت کچھ کہا جاتا ہے۔

کچھ خانماں برباد تو سائے میں کھڑے ہیں
اس دور کے انسان سے یہ پیڑ بڑے ہیں

درختوں اور پودوں سے حضرت انسان نے کیا کیا کام لیے ہیں کہ جن کی تفصیل بتانے لگوں تو یہ مضمون اسی میں ختم ہو جائے۔

ہم نے اس مضمون میں ان روایات کا جائزہ لیا ہے جو پُراسرار قسم کی روایات دنیا کے مختلف حصوں میں درختوں اور پودوں سے منسوب ہیں۔

یہ اساطیری کہانیاں ہیں۔ دیو مالائی کرداروں کے قصے ہیں جو درختوں سے وابستہ ہیں آئیں سب سے پہلے ایک پودے کو دیکھتے ہیں:۔

Avocado

یہ پودا ہمارے یہاں شاید نہیں پایا جاتا۔

میکسیکو اور اس کے اطراف کے ملکوں میں اس کے پتوں سے سلاد بنائی جاتی ہے جو بہت ذائقہ دار ہوتی ہے۔ سلاد بنانے کے علاوہ اس کے پتے دوسرے کھانوں میں بھی ڈالے جاتے ہیں۔ جس طرح ہمارے یہاں کڑی پتے ہوتے ہیں۔

اس پودے کے ساتھ ایک بہت دل چسپ کہانی بھی

منسلک ہے۔

قدیم کہانی کے مطابق ایک جنگل میں ایک آدمی رہتا تھا۔ جس کا نام سیریو کانی تھا۔ سیریو کو اس سبزی کا بہت شوق تھا۔ وہ دن بھر اس سبزی کی تلاش میں جنگل میں بھٹکتا رہتا۔ جب کہ اس کی بیوی اس کے اس شوق سے عاجز آچکی تھی۔ سیریو ہر وقت یہی فرمائش کیا کرتا کہ وہ اسے اکاڈو بنا کر دے۔

ایک دن جب وہ معمول کے مطابق اپنی پسندیدہ سبزی کی تلاش میں نکلا ہوا تھا تو ایک غیر انسانی مخلوق ٹاپر اس کی بیوی کے پاس آگئی۔

ٹاپر انسان کا روپ بن کر آیا تھا اور اتنا خوب صورت تھا کہ سیریو کی بیوی اس کو دیکھتے ہی اس پر عاشق ہو گئی۔

ٹاپر نے اسے بھڑکایا کہ وہ اس کو اپنے شاندار محل میں رکھے گا۔ یہاں جنگل میں اسے کیا ملتا ہے۔ ہر وقت ایک ایسے شوہر کی خدمت کرتی رہتی جو ایک بے کار انسان ہے۔ سیریو کی بیوی اس کے بہکاوے میں آگئی۔ ٹاپر نے کہا کہ اب وہ اپنے شوہر کو اپنے ہاتھوں ہلاک کردے۔ کیوں کہ اس میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ کسی انسان کو مار سکے۔

سیریو کی بیوی پوری طرح اس کے بہکاوے میں آچکی تھی۔ دو چار دنوں کے بعد جب سیریو پھر جنگل کی طرف وہ سبزی تلاش کرنے گیا تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی اس مقام تک پہنچ گئی جہاں اس کا شوہر ایک درخت کے نیچے آرام کر رہا تھا اور برابر میں اکاڈو کی پتیوں سے بھری ہوئی ٹوکری رکھی تھی۔

سیریو کی بیوی نے ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر اپنے شوہر پر دے مارا اور وہ ٹوکری اٹھا کر ٹاپر کے ساتھ بھاگ نکلی۔

سیریو صرف زخمی ہوا تھا۔ اس کی چیخ پکار سن کر ایک پڑوسی اسے اپنے گھر لے آیا اور اس کے زخموں کا علاج کرنے لگا۔

کچھ دنوں کے بعد سیریو صحت یاب ہوا تو وہ تیر کمان لے کر اپنی بیوی اور ٹاپر کی تلاش میں چل پڑا۔

اسے پتا چل گیا کہ وہ دونوں زمین کے اندر پاتال میں رہ رہے ہیں وہ وہاں پہنچ گیا اس کی بیوی اور ٹاپر اسے دیکھ کر بھاگ نکلے۔

سیریو ان کا پیچھا کرتا ہوا زمین کے آخری کنارے تک پہنچ گیا۔ یہاں سیریو نے تیر چلایا جو سیدھا ٹاپر کی ایک آنکھ میں پیوست ہو گیا۔

اس نے بوکھلا کر زمین کے کنارے سے باہر کی طرف چھلانگ لگا دی۔ سیریو کی بیوی بھی اس کی محبت اور اپنے شوہر کے غصے کے خوف سے کنارے سے کود گئی اور آج تک یہ تینوں ایک دوسرے کے تعاقب میں رہتے ہیں۔

کیلا

دنیا کا مشہور ترین پھل۔ ہزاروں برسوں سے انسان کی غذا۔ یہ ساحلی اور استوائی علاقوں میں بہت زیادہ

استعمال ہوتا ہے۔

کیلے کے حوالے سے بھی ایک کہانی بہت مشہور ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس میں صداقت بھی ہو۔ ان کی روایت کے مطابق ہزاروں سال پہلے کا انسان اس پھل سے ناواقف تھا۔

ایک دن کچھ لوگوں نے کیلے کے درخت دیکھے۔ اب ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ پھل انسان کے لیے نقصان دہ ہے یا مفید ہے۔

پھر پرندوں کا ایک جھنڈ نمودار ہوا اور اس نے کیلا کھانا شروع کردیا۔ تب انسان کی سمجھ میں آگیا کہ یہ پھل نقصان دہ نہیں ہے۔

یہ روایت برما کے لوگوں کی ہے اور وہ کیلے کو پرندوں کا تحفہ کہتے ہیں۔

ہوائی کے رہنے والوں کا خیال ہے کہ یہ خوراک ان کے دیوتا آسمانوں سے لے کر آئے تھے۔

کھلتے ہیں۔ اس کا پودا زیادہ اونچا نہیں ہوتا۔

اس پودے کے لیے مہاتما بدھ ہی کے حوالے سے ایک کہانی منسوب ہے۔ یہ کہانی برما کے بدھ حضرات اکثر سناتے ہیں۔

روایت کے مطابق اس پودے کے پھول پہلے سفید ہوا کرتے تھے۔ ایک بار مہاتما بدھ ایک پہاڑ کے نیچے اپنے گیان میں مصروف تھے۔ ان کے آس پاس Canna کے بہت سے پودے تھے۔ مہاتما بدھ کے رشتے کا ایک بھائی تھا دادارات، جو مہاتما بدھ کی اتنی عزت اور احترام سے بہت حسد کیا کرتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ مہاتما بدھ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے گیان میں مصروف ہیں تو اس پہاڑ کی چوٹی سے اس نے ایک بڑا سا پتھر مہاتما بدھ کی طرف لڑھکا دیا۔

لیکن مہاتما بدھ تک آتے آتے وہ بڑا پتھر ہزاروں سنگ ریزوں میں بدل گیا۔ البتہ ایک ٹکڑا مہاتما بدھ کے انگوٹھے پر آ کر لگا جس سے تھوڑا سا خون جاری ہوگیا۔

بس وہ دن ہے اور آج کا دن۔ اس پودے کے پھول خون کی طرح سرخ ہونے لگے ہیں۔ برما میں اس پودے کو Buddha Tharani کہا جاتا ہے۔

Cassia

یہ بھی ایک چھوٹا پودا ہے۔ اس کو گملوں میں بھی اگایا

جاتا ہے۔ اس کی پتیاں طشتری کی طرح ہوتی ہیں۔ چینی کہاوت کے مطابق یہ پودا اس وقت اگتا ہے جب چاند آدھا ہو اور طشتری کی طرح دکھائی دیتا ہو۔

Banyan Tree

اس پودے کو ہندوستان میں ایک مقدس پودا سمجھا جاتا ہے اور اس کی بڑی اہمیت ہے۔

ہندو روایت کے مطابق یہ سورگ (جنت) کا درخت ہے اور وشنو کی پیدائش اس درخت کے نیچے ہوئی تھی۔ روایت کے مطابق وشنو آج بھی اس درخت کے سائے میں موجود ہے۔ اس درخت کو علم اور دانش کا درخت سمجھا جاتا ہے۔

ہندوستان میں دریائے نربدا کے کنارے سورت شہر کے پاس ایک قدیم اور بہت بڑا درخت پایا جاتا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ تین ہزار سال پرانا ہے اور سکندرِ اعظم بھی اسے دیکھ کر گیا تھا۔

یہ وہ درخت ہے جس کو آج تک دھات کے کسی اوزار نے نہیں چھوا ہے۔

کچھ بدھوں کے نزدیک بھی Banyan درخت کی بہت اہمیت ہے۔ ان کی روایت کے مطابق مہاتما بدھ نے اس درخت کے نیچے نروان حاصل کیا تھا۔

Canna

یہ ایک پودا ہے جس میں تیز سرخ رنگ کے پھول

لیکن پہلے اس کی پتیاں ایسی نہیں ہوتی تھیں بلکہ پوری پوری ہوتی تھیں جس طرح دوسرے پودوں کی ہوتی ہیں۔

سائی پر کے علاقے میں ایک آدمی ہوا کرتا تھا جس کا نام کانگ ودتھا۔ اس نے کسی طرح ایک جن کو اپنے قابو میں کرکے بے انتہا طاقت حاصل کرلی۔

اس نے اپنی اس طاقت کا ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کردیا۔ لوگ اس سے تنگ آگئے تھے۔ دیوتا گاؤں کو جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے کانگ ود سے اس کی طاقت چھین لی اور سزا کے طور پر اسے یہ حکم دیا گیا کہ وہ ہر مہینے کاسیا کی پتیوں کو چاند کی طشتری کی شکل میں تراشتا رہے۔ اس دن سے کاسیا کی پتیاں چاند کی طشتری جیسی ہونے لگی ہیں۔

کانگ وداس کام پر لگا دیا گیا ہے اس لیے بہت سے علاقوں میں چاند کو کاسیا کی طشتری بھی کہا جاتا ہے۔

کافی

دنیا بھر کا پسندیدہ مشروب۔ باذوق لوگوں کی پسند۔ خاص طور پر سردیوں میں اس کا رواج بہت بڑھ جاتا ہے۔ گھروں سے لے کر ہوٹلوں تک کافی کی ڈیمانڈ بڑھ جاتی

ہے۔ اس کی دریافت کے حوالے سے بھی ایک کہانی دہرائی جاتی ہے۔ یہ کہانی ایک غریب چرواہے کی ہے۔ وہ اپنی بھیڑیں چرانے لے جایا کرتا۔

ایک بار اس نے دیکھا کہ اس کی بھیڑیں بہت ترنگ میں ہیں۔ بے وجہ کی اچھل کود، جوش اور مستی کے عالم میں اِدھر سے اُدھر دوڑ رہی ہیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کی بھیڑوں کو کیا ہوا ہے۔ وہ تو بہت خاموش مزاج ہوا کرتی تھیں۔

پھر اس نے غور کیا تو پتا چلا کہ وہ بھیڑیں کسی پودے سے کچھ کھا رہی ہیں۔ اس نے بھی تجربے کے طور پر اس پودے سے کچھ لے کر کھالیا۔

اس کی بھی یہی کیفیت ہوگئی۔ اس نے بے پناہ توانائی محسوس کی۔ وہ اس پودے کے بیجوں کو اپنے گاؤں لے گیا اور وہاں سے کافی نے رواج پانا شروع کیا۔

یہ کہانی ایتھوپیا کی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کہانی میں سچائی ہو۔ کیوں کہ اس میں کوئی عجیب وغریب بات نہیں ہے۔ یہ عام سی ایک دریافت کی کہانی ہے۔

Heath

یہ بھی ایک پودا ہے۔ جو عام طور پر برطانوی جزیروں میں پایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں ایک خاندان آباد تھا۔ اس خاندان کے پاس اس پودے کے

پکانے کا نسخہ تھا۔ جو سینہ بہ سینہ چلا آرہا تھا۔

وہ یہ نسخہ کسی کو نہیں بتاتے تھے۔ اس خاندان میں دو باپ بیٹے رہ گئے۔ پھر بھی انہوں نے اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

پورا شہر ان باپ بیٹے کے پکائے ہوئے پودے کو کھانے کے لیے آیا کرتا۔ دونوں بہت امیر ہوگئے تھے۔ پھر اس جزیرے پر Sabtic نام کے ایک قبیلے نے قبضہ کرلیا۔

اس نے ان دونوں باپ بیٹے کو گرفتار کرکے اس پودے کو پکانے کا نسخہ معلوم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ان دونوں نے نہیں بتایا کیوں کہ یہ ایک مقدس راز تھا۔ قبیلے والوں نے دونوں کو موت کی سزا دے دی اور اس طرح یہ راز ان دونوں کے ساتھ ہی دنیا سے چلا گیا۔ ان جزائر کے

رہنے والے آج تک اس راز کی تلاش میں رہتے ہیں۔

Holly

یہ بہت خوب صورت پودا ہے۔

کسی زمانے میں رومن اس پودے کو اپنے گھروں کی سجاوٹ کے لیے استعمال کرتے تھے۔ پھر جب رومن نے عیسائیت قبول کرلیا تو اس کے بعد بھی اس پودے کی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ بلکہ اور اضافہ ہوگیا۔

عیسائی اسے کرسمس کے موقع پر خیر و برکت کے لیے

لگاتے ہیں۔

بہت سے علاقوں میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ پودا بدروحوں کو دور رکھتا ہے۔ اس لیے اس پودے کو اپنے گھروں میں لگاتے ہیں۔

برطانیہ کے کچھ علاقوں میں آج بھی یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ پودا لڑکیوں کو ان کے ہونے والے شوہروں کی خبر دے سکتا ہے۔ یعنی اس پودے کی برکت سے وہ اپنے ہونے والے شوہروں کے چہرے دیکھ سکتی ہیں۔

اس سلسلے میں ایک دل چسپ رسم ادا کی جاتی ہے۔

شوہروں کے بارے میں جاننے کی خواہش مند لڑکیاں اپنے شب خوابی کے لباس میں اس پودے کی تین پتیاں رکھ لیتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اپنے کمرے میں پانی سے بھرے ہوئے تین برتن رکھ کر سو جاتی ہیں۔ رات کے وقت انہیں کسی گھوڑے کی ہنہناہٹ سنائی دیتی ہے۔ وہ جلدی سے اٹھ کر پانی کے برتنوں کو دیکھتی ہیں اور ان تینوں میں سے کسی ایک برتن میں انہیں اپنے ہونے والے شوہروں کے چہرے دکھائی دے جاتے ہیں۔

IVY

یہ خوب صورت پودا پوری دنیا میں سجاوٹ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یونانی مائتھالوجی کے مطابق اس خوب صورت پودے سے ایک کہانی وابستہ ہے۔ وہ کہانی کچھ یوں ہے کہ بہت پہلے یونان میں ایک بادشاہ ہوا کرتا تھا جس کا نام تھا باچس۔ باچس کا ایک بیٹا تھا کائی ساس۔

کائی ساس سات آٹھ برس کا تھا۔ کائی ساس بہت
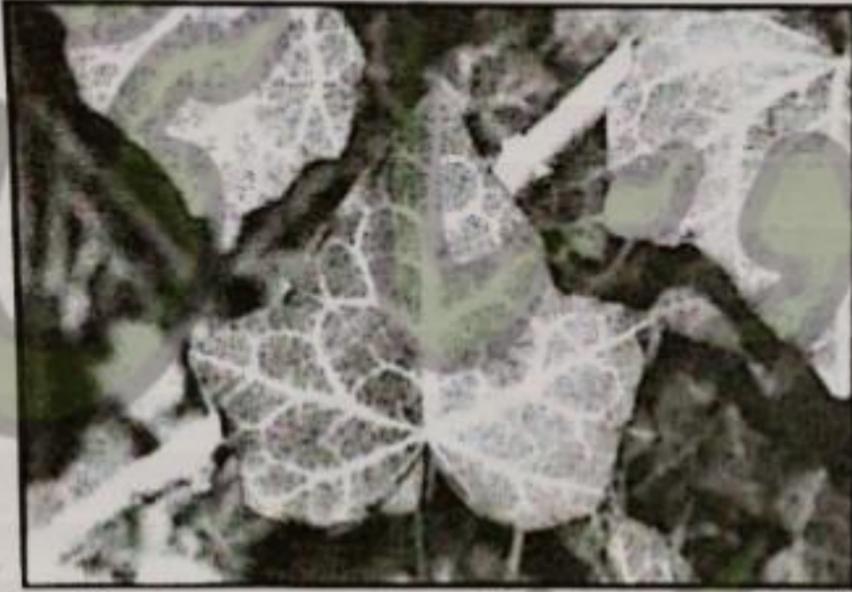
خوب صورت اور ذہین تھا۔ بادشاہ اسے بہت عزیز رکھتا۔ اس کی کوئی بھی پریشانی بادشاہ کے لیے امتحان ہو جایا کرتی۔

ایک بار شاہی باغ میں کائی ساس اپنے باپ کے سامنے کھیل کود میں لگا ہوا تھا کہ اچانک کسی چیز سے اسے ٹھوکر لگی اور وہ گر کر مر گیا۔

بادشاہ پر تو غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ وہ لاش کے پاس بیٹھ کر رونے لگا۔ اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو اس لاش پر گرتے رہے۔

اتفاق سے ادھر سے زمین کی دیوی گائیا (Gayya) کا گزر ہوا۔ اسے بادشاہ پر بہت افسوس ہوا۔ وہ اس بچے کو نئی زندگی تو نہیں دے سکتی تھی لیکن اسے کسی اور چیز میں ضرور تبدیل کر سکتی تھی۔ تب اس نے اس لاش کو IVY بنا دیا۔

اس وقت سے وہ پودا خوب صورتی کی علامت ہوگیا ہے۔

اس پودے کے حوالے سے ایک اور کہانی سنائی جاتی ہے۔

ایک لارڈ تھا اس کے یہاں ایک بہت خوب صورت

ملازمہ ہوا کرتی ۔ لارڈ کا ایک بیٹا تھا۔ بہت جوان اور خوب صورت۔

وہ بیٹا ملازمہ کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ ملازمہ بھی اس سے پیار کرنے لگی۔ لارڈ کو جب پتا چلا تو وہ سخت ناراض ہوا کیوں کہ لارڈ کا بیٹا ایک لارڈ کا بیٹا تھا اور ملازمہ ایک عام سی عورت تھی۔ چاہے وہ خوب صورت ہی کیوں نہ ہو۔

اس نے اپنے بیٹے کو سمجھایا۔ اس ملازمہ کو سمجھایا اور جب وہ دونوں نہیں مانے تو انہیں موت کی سزا دے دی۔

ان دونوں کو برابر برابر دفن کیا گیا تھا اور ایک دن لوگوں نے دیکھا کہ ان کی قبروں پر ایک خوب صورت پودا نمودار ہو گیا ہے۔ یہی پودا IVY کا تھا۔

یاسمین

مشہور و معروف پودا ہے جس کے پھولوں میں ایسی بھینی

بھینی خوشبو ہوتی ہے کہ انسان کی روح تک سرشار ہو جائے۔

یہ پودا پوری دنیا میں پایا جاتا ہے۔

1699ء میں اس پودے کو ایک ڈیوک اپنے ساتھ یورپ لے کر آیا تھا۔ اس نے اپنے محل کے باغ میں یہ پودا لگوا دیا۔

اس پودے کی دیکھ بھال کے لیے جو مالی مقرر کیا گیا اس کو سختی سے ہدایت تھی کہ وہ اس پودے کے بارے میں محل سے باہر جا کر کسی کو کچھ نہ بتائے۔

ڈیوک اس پودے کے پھولوں کی خوشبو کو اپنے آپ تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔

اس نے جس مالی کو اس پودے کی دیکھ بھال کے لیے رکھا تھا وہ ایک جوان انسان تھا۔ اس کی ایک محبوبہ ہوا کرتی تھی۔ دونوں شادی کا پروگرام بنا رہے تھے لیکن ان کے پاس پیسے نہیں ہو رہے تھے۔ اس دوران میں محبوبہ کی سالگرہ آ گئی۔

اس بے چارے مالی کے پاس اپنی محبوبہ کو تحفے میں دینے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہ تھوڑے سے پھول چپکے سے ڈیوک کے باغ سے نکال لایا۔

محبوبہ تو ان پھولوں کو دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو گئی۔ اس نے مالی کو مشورہ دیا کہ وہ اس پودے کے لگانے کا راز لے کر آ جائے۔ پھر کہیں فرار ہو جاتے ہیں جہاں ڈیوک نہ ہو۔

مالی نے ایسا ہی کیا۔ وہ اس پودے کا راز لے آیا اور دونوں اس شہر سے کہیں دور چلے گئے۔ جہاں انہوں نے یاسمین کے پھولوں کی تجارت شروع کر دی اور دیکھتے ہی دیکھتے دولت مند ہو گئے۔ اس طرح یاسمین کے پھول پورے یورپ میں پھیل گئے۔

Lily (للی)

بہت سے ملکوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ بہت خوب صورت پھول ہے۔ یورپ اور مغرب میں اسے جنازوں پر رکھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

اس کے ساتھ بھی ایک کہانی منسوب ہے۔

ایک بادشاہ ہوا کرتا تھا جو شادی سے انکار کیا کرتا۔ کیوں کہ اس کے معیار اور پسند کی لڑکی نہیں ملتی تھی۔

ایک دن وہ ایک قبرستان کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ اس نے ایک ایسی لڑکی کو دیکھا جو بے حد حسین اور اس کے معیار پر پوری اتر رہی تھی۔

بادشاہ کے دریافت کرنے پر اس لڑکی نے بتایا کہ وہ ایک بے سہارا لڑکی ہے۔ بادشاہ اس کو اپنے ساتھ محل میں لے آیا اور کچھ دنوں کے بعد اس سے شادی کر لی۔

ان دونوں میں بے انتہا محبت تھی۔ ایک شام دونوں محل کے باغ کی سیر کر رہے تھے کہ ایک پُراسرار سا آدمی نمودار ہوا۔ اس نے ان دونوں کے سامنے موت کا ایسا نقشہ باندھا کہ لڑکی خوف سے اسی وقت مر گئی۔ اس کو مردہ دیکھ کر خود بادشاہ بھی اس صدمے کو برداشت نہ کر پایا اور وہ بھی مر گیا۔ انہیں جہاں دفن کیا گیا وہاں للی کا پودا پیدا ہو گیا۔

آم

مشہور و معروف پھل۔ اسے پھلوں کا بادشاہ بھی کہا
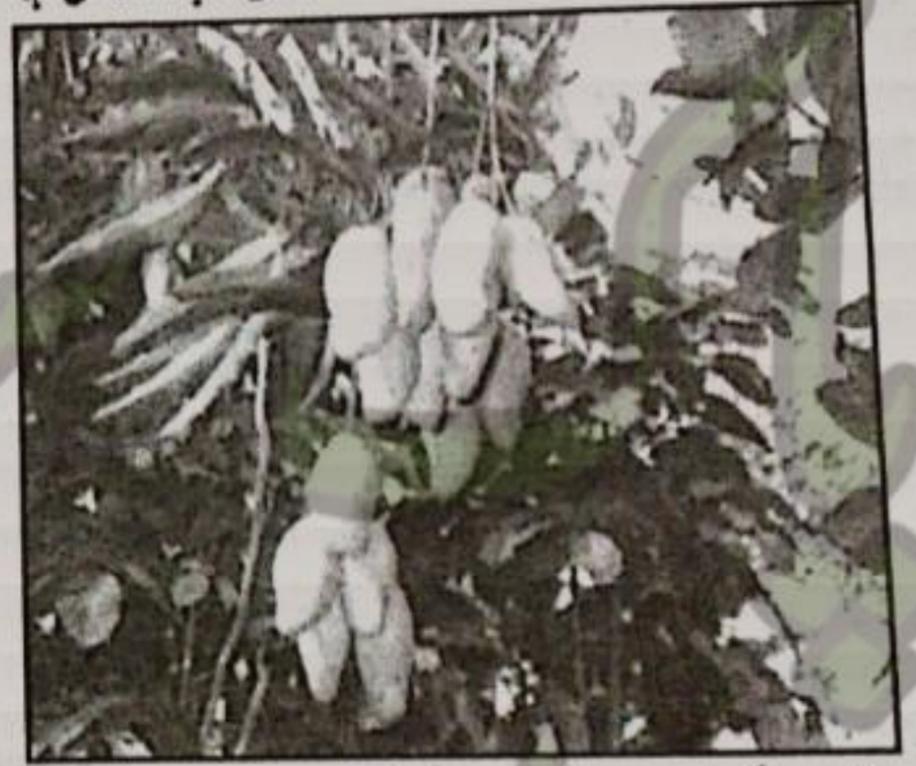
جاتا ہے۔ کون ہے جو آم کو پسند نہیں کرتا۔

ہندو مائتھیالوجی میں آم کے حوالے سے ہی ایک دل چسپ کہانی ہے۔ روایت کے مطابق سورج کی ایک بیٹی تھی۔ بہت حسین۔

ایک دن وہ اپنے باپ کی کرنوں کے ساتھ ساتھ سیر کرنے کے لیے زمین پر آ گئی۔ یہاں اس کی ملاقات زمین کے بیٹے سے ہو گئی۔ جو خود بھی بہت حسین تھا۔

دونوں میں محبت ہو گئی۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہنے لگے۔ زمین کا بیٹا سورج کی بیٹی کو اپنے ساتھ لیے لیے پھرتا۔ اسے سیر کرواتا۔

اسے آبشار، پہاڑ، وادیاں وغیرہ دکھاتا۔ ایک بار زمین کا بیٹا کچھ دیر کے لیے جب سورج کی بیٹی کو چھوڑ کر کہیں گیا ہوا تھا تو اچانک ایک ظالم جادوگرنی وہاں آ گئی۔ اس سے بچنے کے لیے سورج کی بیٹی کنول کا پھول بن گئی۔

جادوگرنی نے کنول کے پھول کی طرف آگ دراز کی۔ کنول کا پھول اس میں جل کر راکھ ہو گیا۔ اس کی راکھ سے آم کا پودا نکل آیا۔

جادوگرنی مطمئن ہو کر واپس جا چکی تھی۔ جب زمین کا بیٹا واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کی محبوبہ غائب ہے اور اس کی جگہ آم کا ایک پودا ہے۔

وہ بہت افسردہ ہوا اور پھر اس آم کے پودے کو اپنے ساتھ محل میں لے آیا اور خود اپنے ہاتھوں اس کی دیکھ بھال کرنے لگا۔

برسوں کے بعد وہ پودا ایک تناور درخت بن گیا اور اس میں آم لگ گئے۔ ایک شام زمین کا بیٹا اس درخت کے نیچے کھڑا تھا کہ اوپر سے ایک آم ٹپک پڑا اور گرتے ہی پھٹ گیا۔ اس میں سے سورج کی بیٹی باہر نکل آئی۔ پھر دونوں ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگے (خود اندازہ لگالیں کہ کیسی کیسی بے سروپا روایات مختلف حوالوں سے موجود ہیں اور کمال یہ ہے کہ بہت سے لوگ ان پر یقین بھی رکھتے ہیں۔ اس پوائنٹ آف ویو سے اگر اسلام کو دیکھیں تو کتنا جدید اور کتنا حقیقت پسند مذہب دکھائی دیتا ہے)۔

پیپل

یہ بہت بڑا درخت ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اس درخت کی بہت اہمیت ہے اس کو بہت مقدس سمجھا جاتا ہے۔

یہ درخت ہندوؤں اور بدھوں دونوں کے لیے بہت

مقدس ہے۔

مہاتما بدھ کے حوالے سے اس درخت کے ساتھ ایک کہانی وابستہ ہے۔ وہ کچھ یوں ہے کہ مہاتما بدھ کی ماں کو یہ گوارہ نہیں تھا کہ اس کا بیٹا ایک درخت کے نیچے بیٹھا رہے۔ اس نے وہ درخت کٹوا دیا۔

مہاتما بدھ کو بہت دکھ ہوا اس نے درخت کی باقیات

کے آس پاس بکری کے دودھ سے بھری ہوئی درجنوں بالٹیاں بہا دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ درخت دوبارہ نمودار ہوگیا۔

انناس

انتہائی خوش ذائقہ اور لذیذ پھل۔ پوری دنیا میں پایا

جاتا ہے۔ خاص طور پر ساحلی علاقوں میں۔

پیرو اور گوئٹے مالا کے رہنے والے رات کے وقت انناس نہیں کھاتے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ارواحیں رات کے وقت اس پھل سے لپٹ کر اس کا رس چوستی رہتی ہیں۔ اس لیے اگر کوئی رات کے وقت انناس کھائے تو وہ انناس کو چھوڑ کر کھانے والے سے چمٹ جاتی ہیں۔

روز بیری

بہت خوب صورت پودا ہے۔ سجاوٹ کے طور پر کام آتا ہے اور ہمیشہ ہرا بھرا رہتا ہے۔ اٹلی میں اس کے حوالے سے بہت دل چسپ کہانی مشہور ہے۔

کسی زمانے میں ایک ملکہ تھی۔ جو بے اولاد تھی۔ اس کے پاس اگرچہ سب کچھ تھا لیکن اولاد کے غم نے اسے نڈھال کرر کھا تھا۔

ایک بار وہ اپنے باغ کی سیر کر رہی تھی کہ اس نے روز بیری کے ایک پودے کو دیکھا وہ یہ سوچنے لگی کہ یہ پودا کتنا ہرا بھرا ہے اور میں بالکل بنجر ہوں۔

کچھ دنوں کے بعد وہ اُمید سے ہوگئی اور اس نے روز میری کے ایک پودے کو جنم دیا۔ وہ حیران اور پریشان تو ہوئی لیکن پھر خیال آیا کہ کچھ بھی ہو یہ اس کی اولاد ہے۔

ملکہ نے بکری کے دودھ سے اس کی پرورش شروع کردی۔ کچھ عرصے کے بعد وہ پودا جوان ہوگیا ملکہ اس کی بہت حفاظت کرتی تھی۔

ملکہ کا ایک رشتے دار بھائی تھا۔ وہ شرارت کے طور پر اس پودے کو اٹھا کر اپنے محل میں لے آیا۔

ملکہ بہت غمزدہ ہوئی۔ لیکن کیا کر سکتی تھی۔ رو دھو کر خاموش ہوگئی۔

جو شہزادہ اسے اٹھا کر لایا تھا۔ اسے بانسری بجانے کا بہت شوق تھا۔ ایک دن وہ بانسری بجا رہا تھا کہ روز بیری کے پودے سے ایک بہت خوب صورت لڑکی نکل کر باہر آ گئی۔

شہزادہ اسے دیکھتے ہی اس کے عشق میں گرفتار ہو گیا۔ اب صورتِ حال یہ بن گئی کہ دن کے وقت وہ لڑکی روز بیری کے پودے میں چلی جاتی اور شام کے وقت جب شہزادہ بانسری بجاتا تو وہ پودے سے نکل آتی۔

دونوں ساری رات گزارتے اور صبح ہوتے ہی لڑکی پودے میں چلی جاتی۔ ایک بار ایسا ہوا کہ شہزادے کو جنگ پر جانا پڑ گیا۔ اس نے اپنے مالی سے کہا کہ وہ اس پودے کی حفاظت کرے اور کبھی بھول کر بھی اس کے سامنے بانسری نہ بجائے ورنہ بہت سخت سزا ملے گی۔

شہزادہ جانتا تھا کہ مالی کو بھی بانسری بجانے کا شوق ہے۔

بہر حال شہزادے کے جانے کے بعد

مالی اس پودے کی حفاظت اور دیکھ بھال کرنے لگا لیکن ہوا یہ کہ ایک رات اس نے بھول کر پودے کے سامنے بانسری بجانی شروع کردی۔

وہ لڑکی پودے سے باہر نکل آئی۔

اس نے جب یہ دیکھا کہ بانسری بجانے والا شہزادہ نہیں بلکہ کوئی اور ہے تو ناراض ہو کر غائب ہوگئی اور ایسی غائب ہوئی کہ آج تک اس کا پتا نہیں چل سکا۔

وہ مالی بھی شہزادے کے خوف سے جنگل کی طرف بھاگ گیا تھا۔

منی پلانٹ Money Plant

بہت عام سا پودا ہے۔ اس کی بیلیں بڑھتی ہی جاتی ہیں۔

ہمارے یہاں بھی بہت سے گھروں میں لگایا جاتا ہے۔

اس کے بارے میں یہ روایت ہے کہ کسی گھر میں اگر یہ پودا پروان چڑھنے لگے تو سمجھ لو کہ اس گھر میں دولت آنے والی ہے۔

یہ پودا بارہ چودہ انچ کے قریب بلند ہوسکتا ہے۔ اس کی پتیوں کو سبزیوں کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے اور اس کے بیج مونگ پھلی کی طرح کھائے جاتے ہیں۔

قدیم جاپانی فلسفے Fawg shvi کے مطابق اس پودے کی پانچ پتیاں پانچ عناصر کو ظاہر کرتی ہیں۔

یعنی دھات، لکڑی، پانی، آگ اور مٹی۔

یہ تھے وہ چند پودے جن سے وابستہ کچھ روایات آپ تک پہنچا دی ہیں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ انسان کتنا توہم پرست واقع ہوا ہے۔

اس نے ہر چیز کو اپنی روایاتی اور اپنی مذہبی بصیرت کے حوالے سے دیکھا ہے اور آنکھیں بند کر کے ان پر یقین کرتا چلا آیا ہے۔

ہمارے یہاں بھی اس قسم کے واہمے موجود ہیں۔ یعنی فلاں قسم کے درختوں کے نیچے مت جانا۔ ان پر بھوتوں کا بسیرا ہوتا ہے۔ یا فلاں قسم کے پھولوں پر پریاں عاشق ہوتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

انسان ایک طرف اتنا وسیع النظر اور دوسری طرف اس قسم کی روایات۔ واقعی انسان کا کوئی جواب نہیں ہے۔

شقی القلب

امجد رئیس

ہر انسان کے دل میں درد کی ہلکی سی ہی سہی مگر رمق ضرور رہتی ہے مگر وہ ایک ایسا درندہ نما انسان تھا کہ اس کے نزدیک انسانی زندگی کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔ وہ ایک ہی کمرے میں عورتوں پر عورتیں ذبح کرتا جارہا تھا۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں اس نے سات عورتوں کے گلے پر چھری چلا دی۔

کسی آدمی نے ایسی بے رحمی کا مظاہرہ نہ کیا ہوگا

شکاگو کی وہ گرم اور مرطوب رات ایک بھیانک منظر کی گواہ بننے جارہی تھی۔ موسم گرما کی تپش سے بوکھلائے ہوئے لوگ سکون کے لیے ایئر کنڈیشنڈ سینماؤں کا رخ کررہے تھے۔

جنوبی شکاگو کمیونٹی اسپتال میں تھکا دینے والی ڈیوٹی کے بعد نو نرسیں آرام کررہی تھیں۔ بیشتر نیند کی آغوش میں تھیں۔ سناٹے میں صرف پنکھوں کی آواز تھی۔ وہ بے خبر تھیں اور باہر ایک انسان نما بھیڑیا اپنی خونی پیاس کی تسکین

کے لیے چکرا رہا تھا۔

اسپیک ایک نامناسب ماحول کی پیداوار، بگڑا ہوا بچہ تھا۔ 6 دسمبر 1941ء کو اس نے کرک ووڈ، الی نوائے میں آنکھ کھولی۔ اس کا ابتدائی بچپن شرابی باپ کے ہاتھوں تشدد سے داغ دار تھا جب کہ ماں نے اسے قطعی نظر انداز کیا ہوا تھا۔ ایسے ماحول میں اس کا ذہنی رجحان بگڑتا ہوا بھیانک روپ میں ڈھل گیا۔

20 سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ بیس مرتبہ مختلف جرائم کے تحت گرفتار ہوا جن میں نقب زنی، خراب رویہ اور ممنوعہ مقامات پر شراب نوشی وغیرہ شامل تھے۔

جب وہ چھ سال کا تھا تو اس کی فیملی ڈلاس منتقل ہو گئی تھی۔ اتنی کم سنی میں اس کی پولیس سے مڈبھیڑ ہو چکی تھی۔ بیس سال کی عمر میں اس نے 15 سالہ شرلے کلون سے شادی کر لی اور باپ بھی بن گیا مگر شادی کے بعد بھی وہ سنبھل نہ پایا۔ اس کی مے نوشی میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ تنگ آکر شرلے بیٹی کو لے کر الگ ہو گئی۔

وہ اکثر بیوی کو قتل کی دھمکیاں دیتا رہتا تھا۔ اس کی بگڑی ہوئی خطرناک نفسیات میں خون کی پیاس شامل ہونا شروع ہو گئی تھی۔

اس نے شراب کے ساتھ ڈرگز کا استعمال بھی شروع کر دیا تھا۔ ساتھ ہی اس نے اسٹرپ بارز اور سستی طوائفوں کے پاس جانا شروع کر دیا تھا۔ شرلے کے الگ ہونے کی وجہ سے عورت کے خلاف اس کی نفرت بڑھ گئی تھی۔

وہ اِدھر اُدھر مختلف کام کرتا رہا جو اجرت اسے ملتی وہ خرافات میں اڑا دیتا۔ خریداری کے معاملے میں اس کی پسند صرف چھری چاقو تھے۔

اس کے ہاتھوں پہلی ہلاکت میری پیئرس کی تھی جو مون ماؤتھ بار میں کام کرتی تھی۔ اس نے رچرڈ اسپیک کی جارحانہ دست درازیوں کے سامنے سپر ڈالنے سے انکار کر دیا تھا۔ 10 اپریل 1966ء میں وہ غائب ہو گئی۔ اس کے دوستوں نے اسے تلاش کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ ملی۔ تین دن بعد اس کی عریاں لاش دریافت ہوئی۔

18 اپریل کو اس کے ہاتھوں سے ایک 65 سالہ عورت ماری گئی۔ اسے لوٹنے کے بعد رچرڈ نے ریپ بھی کیا تھا۔ اب اس کی خونخواری نئی حدیں دریافت کر رہی تھیں۔

3 مئی کو وہ اپنڈکس آپریشن کے لیے اسپتال میں داخل ہوا۔ جہاں اس نے ایک جوان نرس سے دوستی کر لی اور اسے پیراکی کے لیے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ وہ چلی گئی۔ بعد ازاں اس نے پولیس کو بتایا کہ رچرڈ کے اندر نفرت بھری ہوئی ہے۔ وہ ہر کسی کے خلاف ہے اور سمجھتا ہے کہ ہر کوئی اس کے خلاف ہے۔

پولیس کو یقین ہو چلا تھا کہ وہ تین لڑکیاں بھی اس کے ہاتھوں قتل ہوئی ہیں جو انڈین ہاربر سے غائب ہوئی تھیں۔ تینوں سوئمنگ سوٹ میں تھیں جنہیں پھر کبھی نہیں دیکھا گیا۔ ان کے کپڑے ان کی پارک کی گئی گاڑیوں سے برآمد ہوئے تھے۔ پولیس اس واردات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش میں تھی۔

☆......☆

رچرڈ جولائی 10 کو خالی جیب شکاگو میں داخل ہوا۔ فی الوقت اسے کام چاہیے تھا۔ وہ نیشنل میری ٹائم یونین پہنچا۔ ایک درخواست فارم پُر کرنے کو دیا گیا کہ وہ اپنی بہن کا نام معہ ٹیلی فون نمبر چھوڑ جائے تا کہ مناسب وقت پر اسے نیو آرلینز روانگی کے لیے مطلع کیا جا سکے۔ اس نے قریب ہی اسٹار ہوٹل میں رہائش اختیار کی۔ جولائی کی 13 تاریخ کو آدھی رات کے وقت وہ شراب میں دھت ڈیربورن اسٹریٹ پر نکل آیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ سڑک نرسنگ ہوم تک جائے گی۔

وہ نرسوں کی رہائش گاہ میں داخل ہوا۔ پہلی نرس فلپائن کی 23 سالہ کورازون اماراؤ تھی۔ نرس کو روک کر اس نے کہا۔ ”میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ صرف تمہارے ہاتھ پیر باندھوں گا نیو آرلینز جانے کے لیے مجھے کچھ رقم کی ضرورت ہے۔“

کورازون کو باندھ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ اب اس کے ہاتھ میں پسٹل بھی دکھائی دے رہا تھا لیکن وہ فوراً ہی الٹے قدموں واپس آیا۔ اس نے نرس کا منہ بند نہیں کیا تھا۔ جب کہ وہاں تین نرسیں اور سو رہی تھیں۔ اسپیک نے ان تینوں کو بیدار کیا اور چاروں کو دوسرے کمرے میں لے آیا۔ یہاں دو نرسیں مزید سو رہی تھیں اس بات سے بے خبر کہ ایک انسان نما شیطان ان کے سر پر موجود ہے۔ اس نے ان نرسوں کو اکٹھا کر کے بے دست و پا کیا اور فرش پر لٹا دیا۔

ان کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی۔ اب وہاں دہشت نے اپنی جگہ بنالی تھی۔ رچرڈ اسپیک نامی درندہ بستر کے کنارے پر بیٹھا تھا۔ چاقو کی دھار پر اس کا انگوٹھا اوپر نیچے حرکت کر رہا تھا۔ خوف و دہشت سے سب کے چہرے فق تھے۔

بیس سالہ پامیلا پہلا شکار ہوئی۔ اسے بندشیں کھول

کر وہ دوسرے کمرے میں لے گیا اور اس کے سینے پر ضرب لگا کر اسے گرایا پھر اسے چاقو سے بے بس مرغی کی مانند ذبح کر دیا۔

رچرڈ اسپیک نے خون کے فوارے سے بچنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی تھی۔ اس کا چہرہ خون سے بھر گیا تھا۔ اب وہ کسی رخ سے انسان معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ اسی حالت میں وہ واپس آیا اور 20 سالہ میری جورڈن اور 21 سالہ سوزانے فرارے کو دوسرے کمرے میں کھینچ کر لے گیا۔ میری جورڈن کے دل، گردن اور آنکھ پر اس نے ضربیں لگائیں پھر ذبح کر ڈالا۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑتی رہ گئیں۔

جس وقت وہ جنونی خون کی ہولی کھیل رہا تھا تو دو نرسیں جان بچنے کی اُمید میں لڑھک کر بستر کے نیچے چلی گئیں لیکن صرف کورازون ہی خوش قسمت ثابت ہوئی جس نے پہلی مرتبہ رچرڈ اسپیک کا سامنا کیا تھا۔

رچرڈ اسپیک واپس آیا وہ اپنے حواس میں نہیں تھا۔ اس نے 24 سالہ نینا شمیل کو وہیں ٹھکانے پر ذبح کیا۔ اس دوران میں کورازون بستر کے نیچے انتہائی کونے میں تاریک ترین گوشے میں سمٹ چکی تھی۔

وہ مجبور تھی کہ خاموشی سے 23 سالہ ویلنٹائن پسن اور 22 سالہ مارلیٹا کا اندوہناک انجام دیکھتی رہے۔ کورازون کا جسم بری طرح لرز رہا تھا۔ مزید دیکھنے کی اس میں سکت نہیں تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

میری جورڈن کے بعد پیٹریشیا نامی نرس کا نمبر آیا۔ آخری بدقسمت نرس گلوریا ڈیوی تھی جسے نصف گھنٹے تک پامال کرنے کے بعد اس نے قتل کیا۔

☆......☆

صبح کے پانچ بجنے والے تھے۔ کورازون کو ہولناک صدمے نے تقریباً مفلوج کر دیا تھا۔ تمام دورانیے میں وہ بندشوں سے نبرد آزما رہی تھی۔ کچھ دیر واش روم سے آوازیں آتی رہیں۔ پھر سناٹا چھا گیا۔ پھر بھی وہ چپکی پڑی رہی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ خونی بھیڑیا رخصت ہو گیا ہے تو اس نے ڈھیلی کی ہوئی ہاتھوں کی بندش سے آزادی حاصل کی۔ منہ سے کپڑا نکالا۔ پھر ٹانگوں کو آزاد کیا اور ڈرتے ڈرتے باہر آئی۔

دونوں کمروں کی حالت ہیبت ناک تھی۔ اسے چکر آ گیا۔ جن سہیلیوں سے وہ ایک گھنٹا پیشتر ہنسی مذاق کر رہی تھی انہیں بے رحمی سے جانوروں کی مانند ختم کر دیا گیا تھا۔

ہر جانب خون ہی خون تھا۔ انسانی خون......

وہ لڑکھڑاتی ہوئی بالکونی کی طرف گئی اور ہسٹریا کے عالم میں چیخنے لگی۔ نیچے ایک جوڑا اپنے کتے کے ساتھ گزر رہا تھا۔ وہ سمجھے کہ نرس خودکشی کرنے والی ہے۔ وہ کورازون کو سمجھانے میں لگ گئے۔ ان میں سے ایک نے پولیس کو فون کر دیا۔

پولیس بورڈنگ ہاؤس پہنچی تو ششدر رہ گئی۔ انہیں لگا کہ وہ کسی ایسے پولٹری فارم میں آ گئے ہیں جہاں کوئی بھیڑیا داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

ایک آفیسر نے کہا۔ "It was killing for the joy of killing."

پانچ گھنٹے کے ٹریٹمنٹ کے بعد کورازون امارا ؤ گہرے شاک سے باہر آئی اور پولیس کو کچھ بتانے کے قابل ہو سکی۔ اس کا حلیہ، بازوؤں کے ٹیٹوز، شراب کی بو......کورازون نے اس مکالمے کا ذکر کیا جس میں اس نے نیو آرلینز جانے کی بات کی تھی۔

پولیس کے لیے یہ معلومات کافی سے زیادہ تھیں۔ وہ جلد ہی اس بحری جہاز تک پہنچ گئے جہاں اسپیک نے بکنگ کرائی تھی۔ وہاں سے پولیس کو شہادتیں بھی میسر آ گئیں۔ قاتل کی بہن کا پتا اور نمبر بھی مل گیا۔ قاتل اپنی دیوانگی میں یہی سمجھا کہ وہ سب نرسوں کو قتل کر چکا ہے۔ یہ ایک آسان کیس تھا۔ پھر بھی اسپیک نے ہاتھ آنے میں وقت لیا۔

☆......☆

پولیس نے اسپیک کی بہن کے گھر فون ملایا۔ جہاں سے پتا چلا کہ اسپیک کے لیے ملازمت کا بندوبست ہو گیا ہے اور وہ تین گھنٹے بعد فون کر سکتا ہے۔

درخواست فارم کے ساتھ جو فوٹو لگا تھا اسے کورازون نے شناخت کر لیا۔ بس اب قاتل کے وہاں پہنچنے کا انتظار تھا لیکن کسی طرح اسے بھنک لگ گئی اور وہ وہاں نہیں آیا۔

اب پولیس نے قریبی ہوٹلوں کو کھنگالنا شروع کیا۔ نارتھ ڈیئر بورن اسٹریٹ کے ہوٹل تک وہ پہنچ گئے مگر رچرڈ اسپیک وہاں سے تیس منٹ قبل نکل گیا تھا۔

15 جولائی کو ایک بار میں اس کی آمد کی اطلاع ملی جہاں چاقو کے بل پر اس نے بار مین سے رقم لوٹی تھی۔

پھر ایک اور سستے ہوٹل سے ایک پولیس مین کو کال آئی جو کسی طوائف نے کی تھی۔ وہ کسی پاگل کی شکایت کر رہی تھی جو پسٹل اور چاقو سے اسے دھمکا رہا تھا۔ لائنز کراس ہونے

کی وجہ سے پولیس کو دقت ہوئی اور وہ بروقت طوائف کے ٹھکانے تک پہنچنے میں ناکام رہی۔

وہ ابھی تک اسی علاقے میں تھا۔ اس سے قبل کہ وہ علاقہ چھوڑتا، پولیس نے ٹیلی ویژن پر اشتہار چلوادیا جس کا نتیجہ مثبت نکلا۔

رچرڈ اسپیک ویسٹ میڈیسن اسٹریٹ کے اسٹار ہوٹل پہنچا۔ لوٹی ہوئی رقم سے اس نے کمرا حاصل کیا لیکن اب شراب کے لیے وہ پھر خالی جیب تھا۔ اسے شراب یا ڈرگ کی ضرورت بھی۔ شدت طلب سے اس کا بدن کانپ رہا تھا۔ اس نے بے قرار ہوکر اپنی کلائیاں کاٹ لیں۔ پھر ڈرنک کے لیے ملحقہ کمرے کا دروازہ بجایا۔ پڑوسی نے دروازہ کھولا تو بوکھلا گیا۔ اجنبی مہمان دروازے پر گھٹنوں کے بل پڑا تھا۔ کلائیوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے رچرڈ اسپیک کو فوراً پہچان لیا۔ اِسپیک کے بازوؤں پر مخصوص ٹیٹوز نے شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔

بیس منٹ بعد وہ اسپتال کے ایمرجنسی روم میں تھا۔ ٹی وی براڈ کاسٹ کی وجہ سے سرجن نے بھی اسے شناخت کرلیا۔ پولیس پہنچ چکی تھی۔ اِسپیک کو حراست میں لے لیا گیا۔

☆......☆

اپریل 1967ء میں ٹرائل شروع ہوا۔ رچرڈ اِسپیک کا رویہ مقدمے کے دوران میں غیر معمولی تھا۔ پریس کے سامنے وہ پُراعتماد تھا اور ہنسی مذاق میں مشغول تھا۔

وہ خود کو زندہ دل شخص کے طور پر پیش کررہا تھا۔ خود کو معصوم کہہ رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ قتل عام کی واحد گواہ کو خوف زدہ کرنے میں کامیاب ہوجائے گا۔ اس کی مخصوص باڈی لینگویج اور چبھتی ہوئی نظریں کورازون کے لیے تھیں جب کہ وہ قاتل کے لیے بے پناہ نفرت محسوس کررہی تھی بلکہ سراپا انتقام بنی ہوئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس وحشی کا بچنا ناممکن ہے۔

رچرڈ اِسپیک نے دوسری کوشش یہ کی کہ وہ سخت نشے میں تھا اور اس نے ارادتاً کچھ نہیں کیا لیکن واقعات وشواہد اتنے زیادہ اور واضح تھے کہ اس کا بچنا محال تھا۔ اتنے کم وقت میں اتنے زیادہ اور بدترین جرائم...... جیوری نے اسے 600 سال کی سزا سنائی۔

رچرڈ اِسپیک نے جیوری کی طرف دیکھا اور کہا: "No Problem"

کچھ عرصہ بعد اس نے ذہن تبدیل کیا اور اعتراف

جالینوس Galen

(130ء۔200ء)

یونان کا طبیب اور فلسفی برگامہ (ایشیائے کوچک) میں پیدا ہوا۔ باپ ریاضی دان اور معمار تھا۔ سولہ برس کی عمر میں طب کا مطالعہ شروع کیا اور سمرنا، کورنتھ اور سکندریہ گیا۔ 158ء میں واپس آکر برگامہ کے بادشاہ کا شاہی طبیب مقرر ہوا۔ 163ء میں روم گیا اور شہنشاہ مارکس آری لیس کا شاہی طبیب ہوگیا لیکن چار سال بعد واپس برگامہ آگیا۔ تقریباً ڈیڑھ سو تصانیف طب منطق، صرف ونحو، اخلاقیات، فلسفہ اور ادب کے متنوع مضامین سے تعلق رکھتی ہیں۔ ارسطو اور افلاطون کی بعض کتابوں کی شرح بھی لکھی۔

مرسلہ: اکبر بروہی۔ لاڑکانہ

جرم کرلیا لیکن ایک نیا شوشا چھوڑ دیا کہ اس نے آٹھ نہیں سات قتل کیے تھے۔ انہوں نے میرے منہ پر تھوکا تھا، آٹھویں نرس کو زندہ ہونا چاہیے، اس نے میرے منہ پر نہیں تھوکا تھا۔ شکاگو سن لائف کو انٹرویو دیتے ہوئے اس نے کہا۔ "ہاں میں نے ان کو مارا پیٹا اور قتل کردیا۔ انہوں نے مجھ پر تھوکا ورنہ وہ آج زندہ ہوتیں۔ مگر یہ کہ اسی رات میں نے پہلی بار ہیروئن استعمال کی تھی اور آٹھ لوگ قتل ہوگئے۔"

"تم نے کہا تھا کہ آٹھ نہیں بلکہ سات؟"

"ہاں سات......"

"انہوں نے تم پر کیوں تھوکا؟"

اس سوال کا وہ کوئی معقول جواب نہ دے سکا۔ اس نے مزید کہا کہ وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ ایک ہم جنس پرست بھی تھا۔ جسے بعد میں اس نے مار کر چھپا دیا۔ اس نے اپنے ساتھی کے چہرے پر چھ گولیاں ماریں۔

جوزف ڈی لیونا رڈو، ڈیٹکٹو چیف نے کہا کہ وہ ہذیانی کیفیت میں ہے۔ وہاں اس کے ساتھ کوئی دوسرا نہیں تھا۔ یہ پاگل شخص کی ہرزہ سرائی ہے۔ مقتولین کی فیملیز اس وقت تک کرب میں مبتلا رہیں گی جب تک یہ مر نہیں جاتا۔

ماہ جون

سلیم الحق فاروقی

عیسوی سن کے اس چھٹے مہینے میں ایسے بے شمار واقعات رونما ہوئے جو کئی معنوں میں اہم ہیں۔ ان میں سے چند اہم واقعات، اس ماہ سے جڑی چند اہم شخصیات کا مختصر مختصر تعارف تاکہ معلومات جمع کرنے والے باذوق قارئین کی تشنگی مٹ سکے۔

اس ماہ کی ایک خصوصی تحریر، ہر سطر دل پذیر

تکمیل تفہیم القران

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے سیاسی نظریات اور عقائد پر لوگوں کو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اس بات سے کم ہی لوگوں کو اختلاف ہوگا کہ وہ ایک عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سلجھے ہوئے مبلغ بھی تھے۔ ان کا انداز تحریر ایسا تھا کہ ایک عام فرد بھی ان کی تحریر کو سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کرتا ہے۔ وہ گفتگو کرتے ہوئے یا کوئی تحریر لکھتے ہوئے ایک عام شہری کی ذہنی سطح کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے روزمرہ کے معمولات زندگی سے مثالیں دے کر اپنی بات پہنچایا کرتے تھے اور یوں ایک عام فرد کو ان کی بات سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوتی۔

اپنی اسی صلاحیت کا بھرپور استعمال انہوں نے اس وقت کیا جب دوران تبلیغ انہوں نے محسوس کیا کہ ہند و پاک میں مروج قران پاک کے تراجم اور تفاسیر میں جو زبان استعمال ہوئی ہے وہ اتنی زیادہ علمی ہے کہ ایک عام آدمی کی سمجھ میں آنا مشکل ہے۔ لہٰذا انہوں نے قران پاک کی عام فہم زبان میں تفسیر کا بیڑہ اٹھایا اور فروری 1942ء تفہیم القران کے نام سے قران پاک کی تفسیر مرتب کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کی یہ تفسیر ابتدائی طور پر قسط وار شائع ہوتی رہی اور یہ سلسلہ پانچ سال تک جاری رہا۔ وہ سورۃ یوسف کی تفسیر تک پہنچے تھے کہ 1947ء کا زمانہ آ گیا اور اس دوران قیام پاکستان اور دیگر سیاسی ہما ہمی کی

باعث یہ سلسلہ کچھ تھم سا گیا۔ 1948ء میں مولانا مودودی کو پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند کردیا گیا۔ دوران نظربندی ان کو تفہیم پر بھرپور توجہ دینے کا موقع ملا اور انہوں نے جیل میں اس کام کا دوبارہ آغاز کردیا۔

بعد میں ملک کے سیاسی حالات کے باعث یہ سلسلہ کبھی سست اور کبھی تیز رفتاری سے آگے بڑھتا رہا۔ بالآخر 7 جون 1972ء کو جماعت اسلامی نے ایک اعلامیہ جاری کیا کہ آج نماز ظہر کے بعد مولانا مودودی نے تفسیر تفہیم القران مکمل کرلی ہے۔ 1942ء میں شروع ہونے والا یہ کام 30 سال اور 4 ماہ میں مکمل ہوا۔ یہ تفسیر پانچ جلدوں میں چار ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہے اور آج بھی مقبول ترین تفاسیر القران میں شامل کی جاتی ہے۔

تکمیل فیصل مسجد اسلام آباد

اسلام آباد میں داخل ہونے کے بعد دور سے ہی مارگلہ کے دامن میں موجود فیصل مسجد کو بجا طور پر کسی انگوٹھی
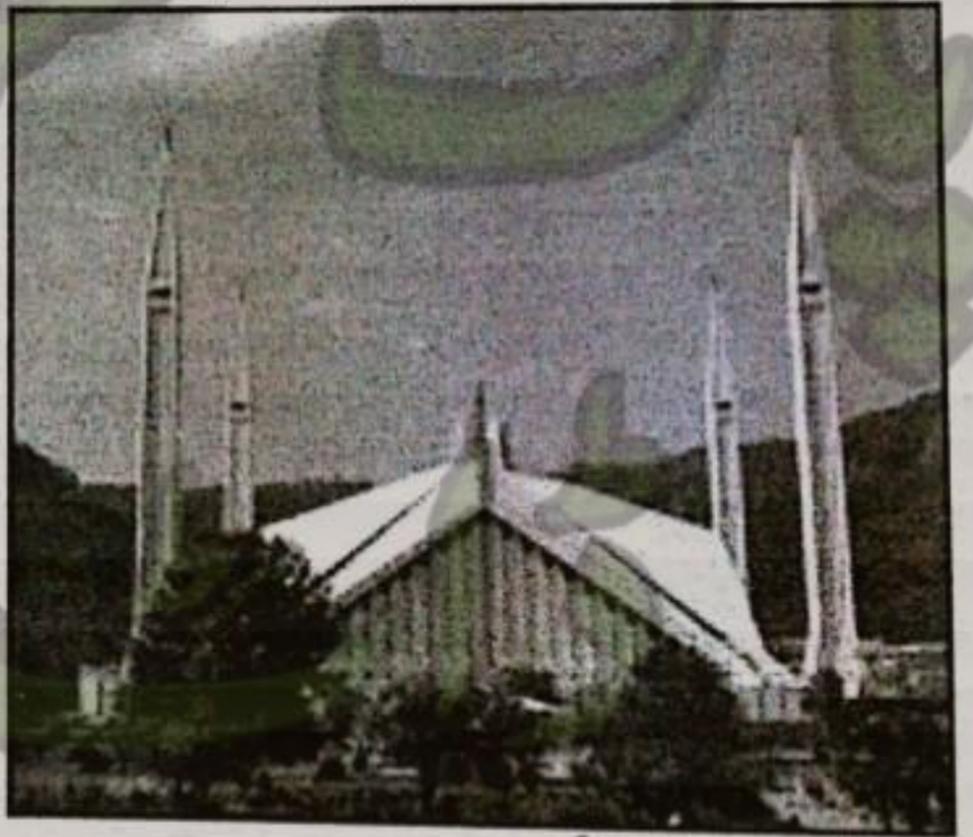
میں نگینے سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ اس مسجد کا بنیادی تعارف کچھ یوں ہے کہ ایوب دور میں جب اسلام آباد کی تعمیر کا پروگرام ترتیب دیا جارہا تھا اسی وقت اس نئے شہر کے شایان شان ایک پرشکوہ، خوبصورت اور جدید ترین شہر کی شناخت کے مطابق ایک مسجد کی ضرورت محسوس کی گئی۔ جب اسلام آباد میں آہستہ آہستہ آبادی بڑھنی شروع ہوئی تو یہ احساس اور بھی شدت سے ہونے لگا۔ اسی دوران 1966ء میں سعودی فرمانروا شاہ فیصل بن عبدالعزیز پاکستان کے دورے پر آئے تو انہوں نے اس مسجد کے تمام تعمیری اخراجات برداشت کرنے کا اعلان کیا۔ 1969ء میں اس مسجد کے ڈیزائین کے لیے ایک بین الاقوامی مقابلے کا انعقاد ہوا جس میں 17 ممالک کے 40 سے زائد ماہرین تعمیرات نے حصہ لیا۔ بالآخر ترکی سے تعلق رکھنے والے ماہر تعمیرات ویدت دلوکا پیش کردہ موجودہ ڈیزائین منظور کیا گیا۔

سن ستر کے عشرے میں اس کے تعمیراتی کام کا آغاز ہوا۔ جب 1975ء میں شاہ فیصل کو شہید کردیا گیا تو حکومت پاکستان نے اس مسجد کو انہی کے نام سے معنون کردیا۔ 12 اکتوبر 1976ء کو سعودی فرمانروا شاہ خالد بن عبدالعزیز نے اس مسجد کا باقاعدہ سنگ بنیاد رکھا۔ سوا کروڑ ڈالر کی لاگت سے تیار کردہ یہ مسجد 2 جون 1986ء کو تقریباً دس سال کے عرصے میں مکمل ہوئی۔ یوں خواب سے تعبیر تک کا یہ سفر تقریباً 20 سال میں مکمل ہوا۔

مسجد کے مرکزی ہال کا رقبہ تقریباً 52 ہزار مربع فٹ ہے۔ اس کے چاروں کونوں پر موجود میناروں کی بلندی 286 فٹ ہے۔ اس مسجد کے مرکزی ہال کا ڈیزائین چار عدد خیموں کی عکاسی کرتا ہے، اور یہ یادگار ہے دور نبوی کی اس پہلی مسجد کی جو ایک خیمے میں قائم ہوئی تھی۔ اس کے ہال کی اندرونی اونچائی 134 فٹ اور بیرونی اونچائی 150 فٹ ہے۔ اس کے مرکزی ہال کو معروف مصور صادقین اور گل جی کی آیات ربانی کی خطاطی سے مزین کیا گیا ہے۔

کل تقریباً 5 ہزار مربع میٹر پر محیط اس مسجد کے تعمیری حاطے کے اندر بیک وقت تقریباً 3 لاکھ نمازی نماز ادا کرسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اور دعوۃ اکیڈمی جیسے معروف ادارے بھی اسی مسجد کے احاطے میں موجود ہیں۔ مسجد کے صدر دروازے کے ساتھ ہی بیرونی چمن میں سابق صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کی قبر بھی موجود ہے۔

سوار محمد حسین شہید (نشان حیدر)

جہاں کہیں بھی پاک فوج کا ذکر ہوتا ہے تو دو اہم باتوں کا تذکرہ ضرور ہوتا ہے، اول اس سے منسلک جوانوں کی شجاعت و دلیری سے کوئی انکار نہیں کرسکتا ہے، کیسے بھی حالات ہوں انہوں نے اپنی جان کی پروا کیے بغیر ”آتش نمرود میں کود پڑا عشق“ کی عملی تفسیر پیش کرتے ہوئے اپنے ملک وقوم کے دفاع کی خاطر کبھی کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ دوسری قابلِ ذکر چیز پاکستان کا سطح مرتفع پوٹھوہار کا یہ

خیز خطہ جس نے تاریخی طور پر مسلح افواج کو ہمیشہ سب سے زیادہ تعداد میں جانباز فراہم کیے۔

یوں تو پوٹھوہار کی پوری عسکری تاریخ ہی متعدد جانباز سپوتوں کی دل گرما دینے والی کہانیوں سے بھری ہوئی ہے لیکن 18 جون 1949ء کو راولپنڈی کے نواحی قصبے ماتلی کے ڈھوک پیر بخش میں پیدا ہونے والے محمد حسین اپنی مثال آپ ہیں۔ محمد حسین اپنے خطے کی روایات کے مطابق 3 ستمبر 1966ء کو پاک فوج میں بطور ڈرائیور بھرتی ہوئے۔ اپنے اسی عہدے کی وجہ سے وہ تاریخ میں سوار محمد حسین کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

دسمبر 1971ء میں جب پاک بھارت معرکہ شروع ہوا تو وہ ظفروال اور شکر گڑھ کے محاذوں پر بارود کی ترسیل پر مامور ہوئے اور پُرخطر مہمات میں بھی پاک فوج کے گشتی دستوں کے ہمراہ رہے۔ اسی دوران 10 دسمبر 1971ء کو انہیں موضع ''برڑ خورد'' میں دشمن کی موجودگی کا علم ہوا تو انہوں نے اس کی اطلاع فوری طور پر اپنے افسران کو دی اور پھر خود عملی طور پر جنگ میں کود پڑے اور ایک ٹینک شکن توپ کے پاس پہنچے اور توپچی کو دشمن کے ٹھکانے کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی کرواتے ہوئے دشمن پر گولہ باری کرانے لگے۔ نتیجتاً دشمن کے 16 ٹینک تباہ کروائے۔

اسی شام ایک ''ریکائل لیس رائفل بردار'' کو دشمن کے ٹھکانوں کی نشاندہی کر رہے تھے کہ دشمن کی مشین گن کی ایک بوچھاڑ ان کے سینے میں آ لگی اور انہوں نے موقع پر ہی اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ سوار محمد حسین شہید کو پہلے شکر گڑھ میں امانتاً سپرد خاک کیا گیا بعد میں ان کا جسد خاکی ان کے آبائی گاؤں میں لا کر ان کی مستقل تدفین کر دی گئی۔ اس موقع پر ان کے آبائی گاؤں ''ڈھوک پیر بخش'' کا نام تبدیل کر کے ''ڈھوک محمد حسین'' رکھ دیا گیا۔

حکومت پاکستان نے ان کی شجاعت و بہادری کا اعتراف کیا اور 3 فروری 1977ء کو نشان حیدر کے اعلیٰ ترین اعزاز سے نوازا۔ وہ نشان حیدر حاصل کرنے والے پاک فوج کے پہلے ''جوان'' ہیں۔

صادقین

یہ جون 1962ء کی بات ہے جب پیرس کے مشہور مرکز فن ''بینیل (Biennail)'' کو ''عشائیہ اخیر (The Last Suppar)'' کے نام سے ایک تجریدی شاہکار موصول ہوا۔ اس فن پارے نے نا صرف انعام حاصل کیا بلکہ دنیا بھر کے مصوری کے مانے ہوئے نقادوں اور ماہرین کی توجہ بھی حاصل کر لی۔

پھر کیا تھا ایک دنیا اس مصور کی معترف ہو گئی جس کی یہ تخلیق تھی۔ اس مصور کی تخلیقات کو ''لی ہارو (Le-Harve)'' جیسے آرٹ کے معروف میوزیم میں سجایا جانے لگا۔

جی ہاں، یہ تھے معروف مصور سید صادق حسین نقوی جنہوں نے نا صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر میں ''صادقین'' کے نام سے اپنی شناخت بنائی۔ وہ 20 جون 1930ء کو امروہہ میں خطاطی کے حوالے سے ایک معروف گھرانے میں پیدا ہوئے۔ وہ قیام پاکستان کے ساتھ ہی اپنے گھرانے کے ہمراہ پاکستان آ گئے۔ صادقین نے اپنے اس موروثی فن کو نئی جہت دی۔ ان کی وجہ شہرت میں یہ تعین کرنا مشکل ہے کہ وہ خطاط زیادہ اچھے تھے یا مصور؟ ایک زمانہ اس بات پر متفق ہے کہ وہ مصورانہ خطاطی میں ادارے کی حیثیت رکھتے تھے۔

صادقین کو دنیا بھر میں متعارف کروانے کا سہرا پاکستان کے پانچویں وزیر اعظم حسین شہید سہروردی کے سر جاتا ہے جنہوں نے 1954ء میں کوئٹہ میں منعقد ہونے والی صادقین کی انفرادی نمائش (Solo Exhibition) سے متاثر ہو کر 1955ء میں اپنی

رہائش گاہ پر ہی صادقین کے فن پاروں کی نمائش کروائی، یوں دنیا صادقین سے متعارف ہوتی چلی گئی۔

صادقین کا صرف فن ہی نہیں ان کی شخصیت بھی ہمہ جہت تھی۔ وہ نا صرف اچھے مصور اور بہترین خطاط تھے بلکہ علمی و ادبی گھرانے سے تعلق رکھنے کی باعث غالب سے خصوصی عقیدت بھی رکھتے تھے۔ علامہ اقبال کی شاعری کو اپنی مصوری کے ذریعے جس طرح انہوں نے دنیا بھر میں پھیلایا اس کا بھی کوئی ثانی نہیں ہے۔ ان کی آیات قرانی پر مبنی خطاطی بھی رہتی دنیا تک قائم و دائم رہے گی۔ ان سب کے علاوہ وہ خود بھی ایک اچھے شاعر تھے۔ شاعری میں رباعیات ان کا پسندیدہ شعبہ تھا۔ خود اپنے ہی تعارف پر مبنی ان کی یہ رباعی کتنی جامع ہے۔

شب میری تھی، شام میری، دن تھا میرا
آیا ہوا خود مجھ پہ ہی جن تھا میرا
کتنی رباعیات تھیں، لکھ کر پھاڑ دیں
اٹھارہ برس کا جب سن تھا میرا

خود اپنے ہی فن مصوری کے حوالے سے جب ان سے ایک بار پوچھا گیا کہ آپ کو مصوری کی کون سی صنف زیادہ بھاتی ہے تو انہوں نے برجستہ جواب دیا کہ مجھ کو سب سے زیادہ الفاظ کی تصویر کشی (خطاطی) مرغوب ہے، اس کے بعد دیواری فن پارے (Murials) بھاتے ہیں۔

صادقین جب بھارت گئے تو وہاں کی حکومت نے ان کو مکمل پروٹوکول کے ساتھ ان کے آبائی شہر امروہہ لے جانے کا اہتمام کیا۔ پورا شہر ان کے استقبال کو امڈ آیا، انہیں ہاتھی پر بٹھا کر ان کے گھر لے جایا گیا، وہاں اس وقت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی کی جانب سے ان کے گھر کی چابیاں پیش کی گئیں جو انہوں نے یہ کہتے ہوئے واپس لوٹا دیں کہ میں اسے اہل امروہہ کی نذر کرتا ہوں، اُمید ہے وہ اس میں ایک کتب خانہ قائم کریں گے۔

آج تا۔۔ صرف دنیا بھر کے بڑے بڑے فن کدے صادقین کے فن پاروں سے سجے ہوئے ہیں بلکہ کئی معروف عمارات بھی ان کے فن پاروں سے مزین ہیں۔ اپنے فن کے بارے میں خود صادقین کا یہ کہنا تھا کہ میں مصوری صرف دولت کمانے یا ڈرائنگ روم میں سجانے کے لیے نہیں کرتا ہوں بلکہ یہ میری اظہار ذات کے لیے ہے۔ اسی لیے صادقین نے ہزاروں فن پارے بنائے اور اپنے دوستوں اور دیگر معروف اداروں کو تحفتاً دے دیے۔ اپنی فنی صلاحیتوں کو صادقین اپنی ایک ہی رباعی میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

پتھر پہ ہوئے کندہ حرف گہرا میں ہوں
جو وقت نے اس میں بھرا سلسلہ میں ہوں
جتنا کہ مثالی ہے یہ دنیا مجھ کو
اتنا ہی جلی ہو کے چمکا میں ہوں

دنیائے مصوری کا جلی ہو کے چمکتا یہ ستارہ صرف 57 برس کی عمر میں 10 فروری 1987ء کو قرانی طغروں اور اقبال کی شاعری پر مبنی خطاطی کا تمغہ لیے اپنے رب کے حضور پہنچ گیا کہ مغفرت کا سرمایہ اپنے ہمراہ ہر ایک کو لے کر جانا ہے۔ ان کو ان کی فنی خدمات کے اعتراف میں دو دفعہ تمغہ امتیاز، صدارتی تمغہ حسن کارکردگی اور کلچر ایوارڈ (آسٹریلیا) سے نوازا گیا۔

بے نظیر بھٹو

دختر مشرق اور مسلم دنیا کی پہلی خاتون وزیر اعظم کا لفظ سنتے ہی ذہن میں ایک ہی نام آتا ہے اور وہ ہے بینظیر بھٹو کا۔ آکسفرڈ اور

ہارورڈ سے تعلیم یافتہ بینظیر بھٹو 21 جون 1953ء کو ذوالفقار علی بھٹو کے گھر پیدا ہوئیں، اپنے والد کی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے بچپن میں ہی سیاست سے آشنا ہوئیں۔ جب ان کے والد پاکستان کے وزیر اعظم بنے تو انہوں نے خود ان کی سیاسی تربیت کا آغاز ان کو متعدد مواقع پر اپنے ہمراہ رکھ کر کیا۔

4 اپریل 1979ء کو جب ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی کی سزا ہوئی تو بینظیر بھٹو کی عمر محض 25 سال تھی۔ اسی وقت وہ پاکستان پیپلز پارٹی کی شریک چیئرپرسن بنیں اور پھر اس وقت کی حکومت نے ان کو نظر بند رکھا۔ بالآخر ان کو جلاء وطنی اختیار کرنی پڑی لیکن وہ اس دور جلاء وطنی میں بھی پارٹی کی قیادت کرتی رہیں۔ جب 1985ء میں ملک سے مارشل

لاء کا خاتمہ ہوا تو 10 اپریل 1986ء کو ملک واپس آ کر بھرپور سیاسی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ اسی دوران 18 دسمبر 1986ء کو آصف علی زرداری سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئیں۔ 17 اگست 1988ء کو ایک فضائی حادثے میں صدر ضیاء الحق کے جاں بحق ہونے کے بعد 16 نومبر 1988ء ملک میں عام انتخابات منعقد ہوئے، جس کے نتیجے میں وہ ملک کی پہلی خاتون وزیراعظم منتخب ہوئیں۔ لیکن محض 20 ماہ بعد 6 اگست 1990ء کو اس وقت کے صدر غلام اسحٰق خان نے بدعنوانی کے الزام میں ان کی حکومت برطرف کردی۔ 1990ء سے لے کر 1993ء تک قائد حزب اختلاف کے فرائض انجام دیتی رہیں اور 1993ء میں ایک بار پھر وزیراعظم منتخب ہوئیں۔ ایک مرتبہ پھر 5 نومبر 1996ء کو ان کی حکومت بدعنوانی کے الزام میں برطرف کردی گئی۔ اس دفعہ ان کی حکومت پر وار کرنے والا کوئی غیر نہیں انہی کی پارٹی کے منتخب کردہ صدر فاروق لغاری تھے۔ اور ان کو ایک بار پھر جلاء وطنی اختیار کرنی پڑی۔ اس کے بعد 1997ء کے انتخابات میں ان کی پارٹی کو تاریخی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ 1999ء میں فوجی مداخلت کی باعث نواز شریف کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ 2002ء میں پھر ملک میں عام انتخابات منعقد ہوئے، ان انتخابات میں ان کی پارٹی کو ووٹ تو سب سے زیادہ ملے لیکن وہ قومی اسمبلی میں زیادہ نشستیں حاصل نہ کر پائیں جس کے نتیجے میں حکومت مسلم لیگ (ق) کی قائم ہوئی اور ان کی پارٹی کو ایک بار پھر حزب اختلاف کا رول ادا کرنا پڑا۔

14 مئی 2006ء کو انہوں نے اپنے دیرینہ حریف نواز شریف کے ساتھ ”میثاق جمہوریت“ پر دستخط کیے۔ 2007ء میں ملک میں عدلیہ کی آزادی کی تحریک اور 2008ء میں ملک میں منعقدہ عام انتخابات کے باعث وہ 18 اکتوبر 2007ء کو وطن واپس آگئیں۔ اس موقع پر ان کے استقبالی جلوس پر کراچی میں خودکش حملہ ہوا جس میں وہ خود تو محفوظ رہیں لیکن درجنوں افراد ہلاک و زخمی ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے جنوری 2008ء میں منعقد ہونے والے عام انتخابات کے لیے بھرپور انتخابی مہم چلائی لیکن اسی مہم کے دوران 27 دسمبر 2008ء کو راولپنڈی میں ایک انتخابی جلسے کے خاتمے کے بعد ایک بار پھر ان پر خودکش حملہ اور فائرنگ ہوئی جس کے نتیجے میں وہ موقع پر ہی جاں بحق ہوگئیں۔ اگلے ہی روز ان کو گڑھی خدا بخش میں ان کے والد کے پہلو میں سپرد خاک کردیا گیا۔ یوں ایک بار پھر پاکستان کی سیاسی تاریخ کا ایک اور متحرک کردار تاریخ کے صفحات میں گم ہوگیا۔ ان کے انتقال کے باعث جنوری 2008ء میں منعقد ہونے والے انتخابات ایک ماہ کے لیے ملتوی ہوئے اور پھر وہ فروری 2008ء میں منعقد ہوئے۔

ان کے انتقال کے بعد ان کی وصیت کے مطابق ان کے فرزند بلاول زرداری پارٹی کے چیرمین اور ان کے شوہر آصف علی زرداری پارٹی کے شریک چیرمین مقرر ہوئے، جن کی سربراہی میں پیپلز پارٹی نے بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کرتے ہوئے اپنی حکومت قائم کی۔

رفیع خاور (ننھا)

گول مٹول بھاری جسم، بیوقوفی کی حد تک معصومیت سے سجا چہرہ، اداس چہروں پر مسکراہٹ بکھیر دینے والی شخصیت، فلمی دنیا میں آئے تو نگار فلم ایوارڈ تو ثانوی چیز عوام کا دل ہی جیتنے لگے۔ جب بھی کبھی ایسی کسی شخصیت کا ذکر آئے گا تو لبوں پر دوسرا لفظ رفیع خاور (ننھا) ہی آئے گا۔

1942ء میں ساہیوال میں پیدا ہونے والے ”ننھا“ نے 1964ء میں ریڈیو پاکستان سے بطور صداکار اپنے فنی کیریئر کا آغاز کیا۔ جملوں کی برجستگی، معصومیت اور شائستگی نے جلد ہی سامعین کا دل موہ لیا۔ ریڈیو میں کامیابی کے بعد ننھا نے 1965ء میں فلمی دنیا میں قدم رکھا اور فلم ”وطن کا سپاہی“ سے فلمی کیریئر کا آغاز کیا۔ وہ یہاں بھی کامیابی کے جھنڈے گاڑتے چلے گئے۔ ان کی کامیاب فلموں میں نوکر، دوبئی چلو، سالا صاحب، آخری جنگ، آس، دوستانہ، نوکر تے مالک، سونا چاندی اور چوڑیاں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ان کو فلم بھروسا، پلے بوائے اور لو اسٹوری میں بہترین مزاحیہ اداکار کی حیثیت سے نگار فلم ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ انہوں نے کل 391 فلموں میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر

دکھائے، جن میں سے 221 پنجابی، 3 پشتو اور 1 فلم سندھی زبان میں تھی۔

انہوں نے فلموں کے علاوہ ٹی وی اور متعدد اسٹیج ڈراموں میں بھی اپنے فن کے جوہر دکھائے۔ لیکن جس پروگرام کی وجہ سے ٹی وی کے ہر عمر کے ناظرین کے دلوں پر برسوں تک راج کرتے رہے وہ کمال احمد رضوی کی معروف سیریز ''الف نون'' تھی۔ اس سیریز میں کمال احمد رضوی ''الن'' کا کردار ادا کرتے تھے اور رفیع خاور ''ننھا'' کا کردار انہوں نے ننھا کا یہ کردار اتنے بھرپور طریقے سے ادا کیا کہ عوام میں رفیع خاور ہمیشہ کے لیئے ''ننھا'' کے نام سے ہی پہچانے گئے۔ الف نون نامی یہ سیریز عوام میں اتنی مقبول ہوئی کہ 1965ء سے 1982ء کے دوران مختلف وقفوں کے ساتھ چار دفعہ پیش ہوئی اور ہر دفعہ یکساں مقبول رہی۔ الف نون میں الن کا عیار و شاطر کردار اور ننھے کا معصوم اور بھولا بھالا کردار، یہ جوڑی ایسی بنی کہ ان دونوں میں ہی معاشرے کی بھرپور عکاسی ہوتی تھی۔

ننھا اپنے دور عروج میں ایک معروف فنکارہ کی زلفوں کے اسیر ہو گئے اور اس سے شادی رچالی۔ دکھی دلوں کے چہرے پر مسکراہٹ سجانے والا یہ عظیم فنکار خود اندر سے کتنا دکھی تھا اس بات کا اندازہ اس نے کبھی اپنے چاہنے والوں کو بھی نہیں ہونے دیا۔ اس کا اندازہ 2 جون 1986ء کو اس کے چاہنے والوں کو اس وقت ہوا جب ننھا نے ذہنی پریشانیوں سے تنگ آ کر اپنی زندگی خود ہی ختم کر لی۔ یوں تو وہ اپنی خودکشی کا راز وہ اپنے ہمراہ قبر میں لے گیا لیکن واقفان حال کا خیال یہ ہے کہ اس نے گھریلو پریشانیوں اور ازدواجی ناچاقیوں سے تنگ آ کر خودکشی کی۔

مجیب عالم

1960ء کے عشرے میں جب پاکستان کی فلمی دنیا کے آسمان پر مہدی حسن اور احمد رشدی کا آفتاب دمک رہا تھا ایسے میں کون یہ سوچ سکتا تھا کہ اسی آسمان پر ایک ایسا ستارہ بھی نمودار ہوگا اور ایسا دمکے گا کہ ان دو عظیم گلوکاروں کے سامنے بھی گلوکاری کے پرستاروں کی نگاہیں خیرہ کر دے گا۔

یہ مجیب عالم تھے جو 1948ء میں کان پور میں پیدا ہوئے اور تقسیم کے بعد دیگر اہل خاندان کے ہمراہ پاکستان آ گئے۔

ان کو حسن لطیف نے اپنی فلم ''نرگس'' میں پہلی بار گائیکی کا موقع دیا لیکن یہ فلم کبھی ریلیز نہ ہو سکی۔ اس کے بعد ان کی ریلیز ہونے والی فلم ''مجبور'' تھی۔ لیکن 1966ء کی فلم جلوہ میں نغمہ ''وہ نقاب رخ پلٹ کر ذرا سامنے تو آئیں'' ریکارڈ کروایا اور اس کے فوراً بعد 1967ء فلم چکوری کے لیے نغمات ریکارڈ کروائے۔ فلم چکوری کا نغمہ ''وہ میرے سامنے تصویر بنے بیٹھے ہیں'' اتنا مقبول ہوا کہ ان کو اس پر نگار فلم ایوارڈ ملا۔ پھر اس کے بعد مجیب عالم آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے۔

ان کے معروف نغمات میں ''یوں کھو گئے تیرے پیار میں ہم''، ''میں تیرے اجنبی شہر میں''، ''یہ سماں پیار کا'' اور ''میں تیرا شہر چھوڑ جاوں گا'' شامل ہیں۔ مجیب عالم نے اردو کے علاوہ پنجابی، پشتو اور بنگالی زبان میں بھی گانے گا کر بھرپور فنکار ہونے کا ثبوت دیا۔ جن فلموں کو انہوں نے اپنی آواز سے سجایا ان میں دل دیوانہ، گھر اپنا گھر، جان آرزو، ماں بیٹا، لوری، تم ملے پیار ملا، سوغات، شمع اور پروانہ، قسم اس وقت کی، آوارہ، میرے ہمسفر، انجان، حاتم طائی اور میں کہاں منزل کہاں سر فہرست ہیں۔

آخری وقتوں میں انہوں نے گلوکاری سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ وہ 2 جون 2004ء کو کراچی میں وفات پا گئے اور سخی حسن کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں۔

طاہرہ نقوی

اگر کبھی ایسے فنکاروں کی فہرست تیار ہوئی جنہوں نے جواں عمری میں اپنے کیریئر کا آغاز کیا اور مختصر وقت میں کامیابی کے جھنڈے بھی گاڑے، فن کی سلطنت پر راج بھی کیا اور اور پھر جواں عمری میں ہی اپنی یادوں کے جلتے چراغ چھوڑ کر اپنی زندگی کی شمع ہی بجھا گئے۔ ایسے فنکاروں کی فہرست میں طاہرہ نقوی کا نام موجود نہ ہو یہ ممکن ہی نہیں ہے۔

طاہرہ نقوی 20 اگست 1956ء کو سیالکوٹ کی

تحصیل ڈسکہ کے ایک نواحی گاؤں میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے ریڈیو میں صداکاری سے اپنے فنی سفر کا آغاز کیا، جلد ہی ٹی وی کے ڈراموں میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے لگیں۔ یوں تو ان کے تقریباً تمام ہی ڈرامے پسند کیے گئے لیکن طویل دورانیے کا کھیل ''زندگی بندگی'' ان کے یادگار ڈراموں میں سے ہے۔ ان کو سب سے زیادہ پذیرائی پی ٹی وی کی مشہور ٹی وی سیریز ''وارث'' کے کردار میں ملی۔ اس میں انہوں نے اپنا کردار اتنا ڈوب کر کیا کہ حقیقت کا گمان ہونے لگا۔ 1981ء میں ان کو بہترین اداکارہ کے لیے پی ٹی وی کا ایوارڈ بھی دیا گیا۔

انہوں نے دو فلموں بدلتے موسم اور میاں بیوی راضی میں بھی کام کیا لیکن ان کا مزاج فلمی دنیا سے ہم آہنگ نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے آئندہ کسی بھی فلم میں کام کرنے سے معذرت کرلی۔ ان کو بہترین اداکارہ کا ایوارڈ تو 1981ء میں ملا لیکن 1982ء میں شدید بیمار ہوگئیں۔ اسی بیماری کے علاج کی خاطر وہ سی ایم ایچ راولپنڈی میں داخل ہوئیں جہاں انہیں کینسر کا مرض تشخیص ہوا۔ بالآخر اسی موذی مرض نے 2 جون 1982ء کو ان کی جان لے لی اور وہ لاہور میں میاں میر کے مزار کے احاطے میں آسودۂ خاک ہوئیں۔

آیت اللہ خمینی

بیسویں صدی کا چھٹا اور ساتواں عشرہ ایران میں پہلوی بادشاہت کے عروج کا دور تھا۔ 1963ء میں بادشاہ کے وفادار فوجیوں نے قوم پرست مصدق کی حکومت الٹ دیا اور پھر ایران میں امریکی اثر ونفوذ بڑھتا ہی چلا گیا۔ حتیٰ کہ 1964ء کے اواخر میں شاہ ایران نے ایک ایسے قانون کی منظوری دی جس کی رو سے ایران میں مقیم امریکی فوجیوں کو وہ سفارتی استحقاق دے دیا گیا جو دنیا بھر میں

قانونی طور پر صرف سفارتی عملے کو حاصل ہوتا ہے۔ اس موقع پر ایران کے معروف مذہبی رہنما آیت اللہ روح اللہ خمینی نے ایک یادگار تاریخی تقریر کرتے ہوئے کہا ''اس شخص (شاہ ایران) نے ہمیں بیچ ڈالا ہے، ایران کی عظمت خاک میں ملا دی ہے۔ اہل ایران کا درجہ ایک امریکی کتے سے بھی کم کردیا گیا ہے، اب اگر شاہ ایران کی گاڑی سے ایک امریکی کتا بھی ٹکرا جائے تو شاہ کو تفتیش کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن اگر کوئی امریکی خانساماں بھی شاہ ایران کو اپنی گاڑی تلے روند ڈالے گا تو ہم بے بس ہوں گے، یہ صرف اس لیے ہوگا کہ ہمیں امریکی قرضے کی ضرورت ہے۔ اے مشہد، قم اور تہران کے لوگو! کیا تم یہ غلامی خاموشی سے قبول کرلو گے؟''

اس تقریر نے شاہی ایوان میں زلزلہ پیدا کیا اور آیت اللہ خمینی کو فوری طور پر ملک بدر کردیا گیا۔ پہلے وہ فرانس گئے، پھر 1965ء میں عراق منتقل ہوئے اس کے بعد 1978ء میں وہ دوبارہ فرانس منتقل ہوگئے۔

جلاوطنی کے اس دور میں بھی آیت اللہ خمینی نے اپنی قوم کو جگائے رکھنے کا فریضہ جاری رکھا۔ ان کی کوششیں اتنا رنگ لائیں کہ ایرانی قوم شاہ ایران سے اس حد تک متنفر ہوئی کہ پورا ایران اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا، عوام کی اس بیداری کا مقابلہ کرنے کے لیے شاہ ایران کی قائم کردہ ''ساوک'' جیسی بدنام زمانہ تنظیم اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ مسلسل متحرک رہی۔ بالآخر بیدار عوامی شعور کے سامنے شاہ ایران اور ساوک کی ایک نہ چلی اور 17 جنوری 1979ء کو شاہ کو ایران چھوڑ کر جلاوطن ہونا پڑا اور یکم فروری 1979ء کو جب آیت اللہ خمینی ایک نئے انقلاب کی نوید بن کر تہران ائرپورٹ پر اترے تو لاکھوں افراد کا جم غفیر ان کے استقبال کے لیے تہران ائرپورٹ موجود تھا، بعض ذرائع کے مطابق استقبال کرنے والوں کی تعداد ایک کروڑ تھی۔

یوں جدید تاریخ کا یہ آخری کامیاب انقلاب اسلام کا پرچم تھامے ایران میں برپا ہوا، اس کے بعد ایران کا نظام مملکت 360 درجے کے زاویے سے بدل گیا اور ایک شہنشاہی مملکت نے مغربیت کا چولہ اتار پھینکا اور جدید اسلامی جمہوریہ ایران کی بنیاد پڑی۔ اب ایران کا پورا نظام اس کا بالکل الٹ ہے جس کی بنیاد شہ ایران نے ڈالی تھی۔ آج اسلامی ایران پوری مغربی دنیا کی آنکھوں میں کھٹک رہا ہے۔

آیت اللہ خمینی جو 24 ستمبر 1902ء کو پیدا ہوئے تھے انقلاب ایران کے دس سال بعد تقریباً 87 سال کی عمر میں 3 جون 1989ء کو انتقال کر گئے۔

مہدی حسن

قیام پاکستان کے وقت عمر صرف 20 برس، اہل خانہ کے ہمراہ پاکستان منتقلی کے بعد معاشی جن کو قابو کرنے کی خاطر سائیکلوں کی مرمت کا کام شروع کیا، پھر ترقی کر کے موٹر مکینک بنے اور ترقی کی اگلی سیڑھی ٹریکٹر مکینک بنے۔ سائیکل، گاڑی اور پھر ٹریکٹر مکینک بننے کی طرف ترقی کی ان منازل طے کرتے شخص کو دیکھنے والے کسی بھی انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ اوزاروں کی ٹھک ٹھک میں منہمک یہ شخص آگے چل کر گائیکی کی دنیا میں اتنا بڑا نام پیدا کرے گا کہ دنیا اس کو بھگوان کا درجہ دینے لگے گی۔
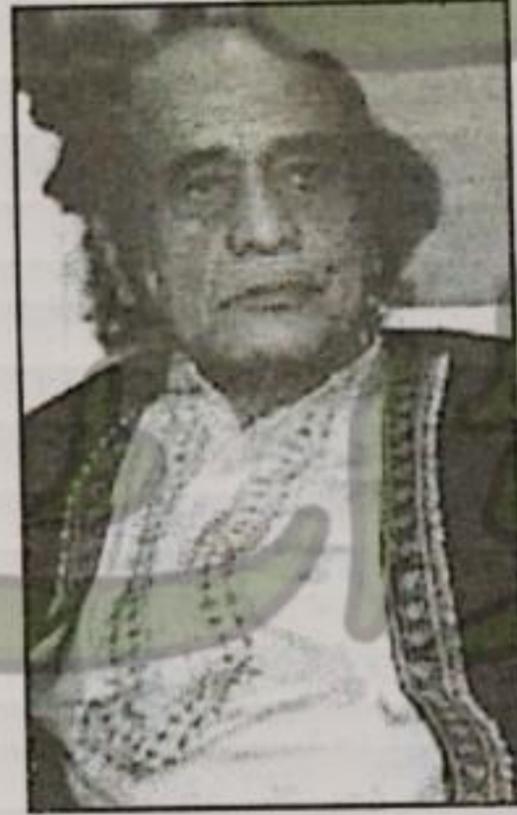
یہ تھا ابتدائی دور فن گلوکاری کے بے تاج بادشاہ اور معروف غزل گائیک مہدی حسن کا۔ وہ 1927ء کے لگ بھگ راجھستان کے ایک گاؤں ''لونا'' کے ایک گلوکار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ موسیقار اور گائیک گھرانہ ہونے کی باعث اپنے والد استاد عظیم خان اور چچا استاد اسماعیل خان سے اوائل عمری میں ہی موسیقی کی تربیت حاصل کرنا شروع کر دی۔ یوں تو آٹھ سال کی عمر میں ہی گلوکاری کا آغاز کر دیا تھا لیکن اس جانب سفر کا باقاعدہ آغاز 1952ء میں ریڈیو پاکستان میں گلوکاری سے کیا۔ اس کے بعد گائیکی کے اس سفر میں دم آخر تک تقریباً 25 ہزار سے زائد گیت، غزل اور نغموں کو اپنی آواز سے سجایا۔

مہدی حسن نے تقریباً ساڑھے چار سو فلموں کے لیے سوا چھ سو نغمات اور گانے گائے۔ انہوں نے اردو کے علاوہ پنجابی فلموں کے لیے بھی کافی گانے گائے۔ ان کے سو سے زائد گانے تو اداکار محمد علی پر فلمائے گئے، اس کے علاوہ سنتوش کمار، درپن، وحید مراد سے لے کر ندیم اور شاہد تک اپنے وقت کا کوئی بھی معروف اداکار ایسا نہ تھا جس نے مہدی حسن کی گلوکاری پر لب نہ ہلائے ہوں۔

خان صاحب نے ایک فلم ''شریک حیات'' میں بطور اداکار بھی کام کیا لیکن پھر مناسب یہی سمجھا کہ پوری توجہ گلوکاری پر ہی مرکوز رکھیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ساٹھ سے ستر کی دہائی میں اکثر نگار فلم ایوارڈ انہی کے نام رہے، اس کے علاوہ ان کو بھارت میں سہگل ایوارڈ اور نیپال میں گورکھا دکشینا ایوارڈ عطا کیا گیا۔ پاکستان کے سرکاری ایوارڈز میں ان کو تمغہ حسن کارکردگی، تمغہ امتیاز اور لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ عطا کیا گیا۔

فن گائیکی کا یہ عظیم گلوکار، دنیا کہتی تھی جس کے گلے میں بھگوان گاتا ہے، طویل علالت، کسمپرسی اور دنیا کی بے اعتنائیوں کا سامنا کرتے ہوئے 13 جون 2012ء کو تقریباً 85 سال کی عمر میں کراچی میں راہی ملک عدم ہوا اور محمد شاہ قبرستان میں منوں مٹی تلے سو گیا۔

ابن انشاء

بہت ہی کم قلمکار ایسے ہوں گے کہ جب وہ گدگدانے پر آئیں تو ہنسا ہنسا کر پیٹ میں بل ڈال دیں اور جب المیہ لکھیں تو آنکھوں سے جاری آنسوؤں کا سیل رواں تھمنے کا نام ہی نہ لے۔ جب یہ سفرنامہ لکھنے پر آئیں تو گھر میں بیٹھا قاری بھی مصنف کے ہمراہ دنیا بھر کی سیر کا لطف اٹھا رہا ہو۔ اردو ادب میں بجا طور پر ابن انشا ایک ایسے ہی قلمکار ہیں جنہوں نے نثری اور شعری دونوں اصناف ادب میں قاری کو اپنے قلم کے سحر میں جکڑ لیا۔ شاید اسی لیے معروف مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی نے انشاء کا تعارف کچھ یوں کروایا کہ ''سانپ کا کاٹا سوتا ہے، بچھو کا کاٹا روتا ہے مگر انشاء جی کا

کا نا سوتے میں مسکرا تا ہے۔"

شاعری میں جب وہ دنیا کی ناانصافیوں کا ذکر کرتے ہیں ایک بچے کو اپنا استعارہ بناتے ہوئے کتنا گلوگیر احتجاج کرتے ہیں۔

نا ہی اس کا جی بہلانے کو
کوئی لوری ہے، کوئی جھولا ہے
نا اس کی جیب میں دھیلا ہے
نا اس کے ہاتھ میں پیسا ہے
نا اس کے امی ابو ہیں
نا اس کی آیا خالہ ہے
یہ سارے جگ میں تنہا ہے
یہ بچہ کیسا بچہ ہے

اور جب "اردو کی آخری کتاب" پڑھ کر قاری کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوتے ہیں تو دیکھنے والے کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ آنسو بھرپور مزاح پر ہدیہ تہنیت ہیں یا قومی مزاج پر چھائی بے حسی پر ماتم کے آنسو؟ وہ لکھتے ہیں۔

ایران میں کون رہتا ہے؟
ایران میں ایرانی قوم رہتی ہے!
انگلستان میں کون رہتا ہے؟
انگلستان میں انگریز قوم رہتی ہے!
فرانس میں کون رہتا ہے؟
فرانسیسی قوم رہتی ہے!
یہ پاکستان ہے!
اس میں پاکستانی قوم رہتی ہوگی؟
نہیں اس میں پاکستانی قوم نہیں رہتی ہے!
اس میں سندھی قوم رہتی ہے!
اس میں پنجابی قوم رہتی ہے!
اس میں بنگالی قوم رہتی ہے!
اس میں یہ قوم رہتی ہے!
اس میں وہ قوم رہتی ہے!
لیکن پنجابی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں
سندھی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں
بنگالی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں
پھر الگ ملک کیوں بنایا تھا؟
غلطی ہوگئی، معاف کردیجیے، آئندہ نہیں بنائیں گے

اردو زبان کا یہ مایہ ناز قلمکار جس کو دنیا ابن انشا یا انشاء جی کے نام سے جانتی ہے، ان کا اصل نام شیر محمد خان تھا، اور وہ 15 جون 1927ء کو ضلع جالندھر کے موضع تھلہ میں پیدا ہوئے۔ جامعہ پنجاب سے گریجویشن کے بعد جامعہ کراچی سے اردو میں ایم اے کیا۔ انہوں نے اپنے صحافتی وادبی سفر کا آغاز 1960ء میں روزنامہ امروز کراچی میں "درویش دمشقی" کے نام سے کیا۔ وہاں سے 1965ء میں روزنامہ انجام کراچی سے وابستہ ہوئے اور پھر اگلے ہی برس یعنی 1966ء میں روزنامہ جنگ کراچی سے وابستہ ہوگئے، اور پھر یہ وابستگی دم آخر تک جاری رہی۔

ان کا پہلا شعری مجموعہ "چاند نگر" تھا۔ اس کے علاوہ "اس بستی کے اک کوچے میں" اور "دل وحشی" بھی ان کے مجموعہ ہائے کلام میں شامل ہیں۔ ان کی ایک پہچان سفرنامے بھی ہیں۔ جن میں آوارہ گرد کی ڈائری، دنیا گول ہے، چلتے ہو تو چین کو چلیے اور نگری نگری پھرا مسافر شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مزاح کے دیگر فن پاروں میں اردو کی آخری کتاب، خمار گندم، باتیں انشاء جی کی اور قصہ ایک کنوارے کا شامل ہیں۔

وہ ایک طویل عرصے تک حکومت پاکستان کے ادارے نیشنل بک کونسل سے بطور ڈائریکٹر منسلک رہے، اس کے بعد حکومت نے ان کو انگلستان میں تعینات کردیا تاکہ وہ اپنی سرطان کے موذی مرض کا علاج کرواسکیں۔ لیکن لوگوں کو سوتے میں بھی مسکرانے پر مجبور کرنے والا یہ عظیم لکھاری 11 جنوری 1978ء کو لندن میں یہ کہتا ہوا اس دنیا سے منہ موڑ گیا کہ۔

انشاجی اٹھو اب کوچ کرو، اس شہر میں جی کو لگانا کیا
وحشی کو سکون سے کیا مطلب، جوگی کا نگر میں ٹھکانہ کیا

ماہنامہ سرگزشت

مجید لاہوری

مرکز کو جس طرح ہو نیچا دکھائیں گے
ہر روز ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائیں گے

راگ اپنا اپنا اور ڈفلی اپنی اپنی بجائیں گے
ملت میں انتشار اگر ہے تو کیا ہوا
تنظیم اگر بے وقار ہے تو کیا ہوا

ان اشعار کے خالق مجید لاہوری اردو ادب کے معتبر ترین مزاح نگاروں، کالم نگاروں اور مزح گو شعراء میں سے ہیں۔ ان کا اصل نام تو عبدالمجید چوہان تھا لیکن مجید لاہوری کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ وہ 1913ء میں پنجاب کے شہر گجرات میں پیدا ہوئے، اور 1938ء میں روزنامہ انقلاب لاہور سے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ اس کے بعد وہ متعدد اخبارات کے علاوہ حکومت پاکستان کے محکمہ پبلسٹی سے بھی وابستہ رہے۔ قیام پاکستان کے بعد 1947ء میں وہ کراچی منتقل ہوگئے اور وہاں روزنامہ انصاف، انجام اور خورشید میں قلمی خدمات انجام دینے کے بعد وہ روزنامہ جنگ کراچی سے منسلک ہوئے۔ جنگ میں ان کا کالم ''حرف و حکایت'' کے نام سے چھپتا رہا، یہاں وہ اپنی زندگی کے آخری وقت تک منسلک رہے۔

انہوں نے 1957ء میں لاہور سے پندرہ روزہ ''نمکدان'' بھی جاری کیا۔ یہ فکاہیہ ادب کا نمائندہ جریدہ تھا۔ سن 50 اور 60 کی دہائی میں شائد ہی کوئی اردو اخبارات کا قاری رہا ہو جو مجید لاہوری کی تحاریر سے لطف اندوز ہونے کے لیے اخبارات ڈھونڈ کر نہ پڑھتا ہو۔

یوں تو ادبی دنیا کے بہت سارے قلمکاروں کی کئی ایسی تحاریر ہیں جو سیدھا جا کر جگر کو چھلنی کر دیتی ہیں لیکن مجید لاہوری کی دو ایسی تحاریر ہیں جو جا کر سیدھا دل میں ترازو ہو جاتی ہیں۔ ان دونوں تحاریر کا عنوان ایک ہی ہے، اور وہ ان کی زندگی کے دو آخری کالم ہیں جو ان کی زندگی کی آخری تحاریر بھی ہیں۔ دراصل 1957ء میں پاکستان بھر میں انفلوئنزا کی وباء پھیل گئی اور اس زمانے میں یہ تقریباً لاعلاج مرض تھا۔ مجید لاہوری بھی انفلوئنزا کا شکار ہو گئے، اس موقع پر ان کا ایک کالم شائع ہوا جس کا عنوان تھا ''انفلوئنزا کی نذر'' اس میں صرف چند سطریں تحریر تھیں، لکھا تھا ''میں انفلوئنزا کی لپیٹ میں آ گیا ہوں، اس لیے نہیں چاہتا ہوں کہ اس حالت میں کالم لکھ کر جراثیم آپ تک پہنچاؤں'' اور اس کے اگلے دن یعنی 26 جون 1957ء کو، جس دن ان کا انتقال ہوا، اس دن ''انفلوئنزا کی نذر'' کے عنوان سے ہی ان کا دوسرا اور زندگی کا آخری کالم شائع ہوا جس میں صرف اتنا تحریر تھا کہ ''آج دوسرا دن ہے''۔ صرف یہی نہیں مجید لاہوری نے تو اسی سلسلے میں ایک دل پہ چوٹ مارتا شعر بھی کہا تھا۔

فاتحہ خوانی میں احباب اڑائیں گے پلاؤ
اور کریں گے مری بخشش کی دعا مرے بعد

زندگی کے ماحصل کے بارے میں بھی مجید لاہوری کا ایک مسکراتا شعر ملاحظہ کیجیے۔

کیا پوچھتے ہیں آپ جوانی کا ماجرا
کمبخت چند روز میں بدنام ہوگئی

مجید امجد

منفرد لہجے اور متنوع موضوعات کا شاعر مجید امجد کا شمار فیض، میراجی اور ن م راشد کے پائے کے شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے لیکن غزل بھی کہتے تھے۔ کیا خوب کہتے ہیں۔

تم یوں کھڑے رہو کہ تمہیں علم تک نہ ہو
طوفاں میں گھر گئے ہو یا طوفاں کا جزو ہو۔
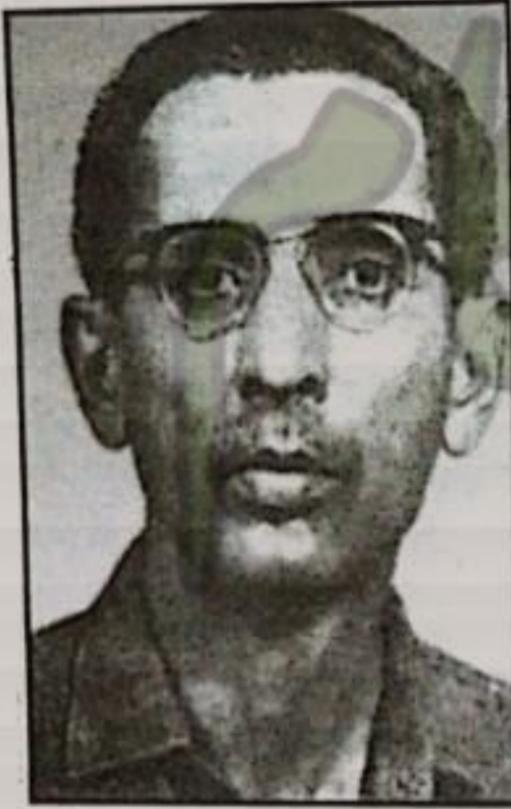
وہ 29 جون 1914ء کو جھنگ میں پیدا ہوئے اور پنجاب یونیورسٹی سے گریجویشن کے بعد صحافت کی وادی میں قدم رکھ دیا۔ بعد ازاں سرکاری ملازمت اختیار کی اور محکمہ سول سپلائیز میں بطور انسپکٹر تعینات ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد ساہیوال میں عارضی اسپیشل مجسٹریٹ غلہ منڈی کی

حیثیت سے ہندوؤں اور سکھوں کی متروکہ دکانیں مسلمان دکانداروں میں تقسیم کرنے کا کام اس ذمہ داری سے ادا کیا کہ پورے علاقے میں ان کی ایمانداری کی دھوم مچ گئی۔ مجید امجد کو ساہیوال اتنا بھایا کہ سرکاری ملازمت کے دوران مختلف شہروں میں تبادلہ بھی ہوا لیکن وہ ہر مرتبہ پلٹ کر ساہیوال ہی آجاتے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ساہیوال سے اچھا شہر پورے پاکستان میں کوئی نہیں ہے۔

کسی بھی ذمہ دار اور ایماندار افسر کی طرح ریٹائرمنٹ کے بعد کا دوران کے لیے معاشی پریشانیوں کا دور لایا۔ ایک معمولی ایماندار سرکاری افسر کی آمدنی ہوتی ہی کتنی ہے جو کچھ بچایا جا سکے اس پر مستزاد یہ کہ جھنگ میں موروثی جائیداد پر سوتیلا بھائی قابض ہوگیا، جس سے بقیہ تمام عمر مقدمہ بازی چلتی رہی، جس میں تسلسل ان کو جھنگ کے چکر لگانے پڑتے۔ ادھر دوسری طرف سرکاری پنشن بھی سرخ فیتے کا شکار رہی۔ آخری وقت تک ان کو نہ تو جائیداد میں حصہ مل سکا اور نہ ہی پنشن ملی، اوپر سے بڑھاپے کے عروج کے دور میں اہلیہ کی آنکھوں کی بینائی ختم ہوگئی۔ شاید ایسے ہی احساسات کے زیر اثر وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے۔

آخر کوئی کنارہ اس سیل بے کراں کا
آخر کوئی مداوا اس درد زندگی کا
او مسکراتے تارو، او کھلکھلاتے پھولو
کوئی علاج میری آشفتہ خاطری کا

ان کا پہلا مجموعہ کلام ''شب رفتہ'' 1958ء میں اور پھر دوسرا شعری مجموعہ ''شب رفتہ کے بعد'' 1976ء میں شائع ہوا۔ ان کے دیگر مجموعات میں چراغ طاق جہاں، طاق ابد اور مرے خدا مرے دل کے نام ہے۔ ان کا مکمل شعری مجموعہ ''کلیات مجید امجد'' 1989ء میں شائع ہوا۔ ان کا ایک اور شعر ملاحظہ فرمایئے۔

کیا روپ دوستی کا، کیا رنگ دشمنی کا
کوئی نہیں جہاں میں، کوئی نہیں کسی کا

زندگی کے آخری ایام تنگی و ترشی میں گذارنے والا یہ عظیم شاعر 11 مئی 1974ء کو ساہیوال میں ہی منوں مٹی تلے جا سویا۔

گئی ہے عمر بہاروں کے سوگ میں امجد
مری لحد پہ کھلیں جاوداں گلاب کے پھول

وطن کی آزادی کے لیے اس نے بہت اہم کام انجام دیا تھا

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

گمنام جاسوس

دوسری جنگ عظیم میں جب ہٹلر نے پوری دنیا کو آگ اور خون کے سمندر میں دھکیل دیا تھا، اس وقت اپنے وطن کی محبت میں سرشار ایسے بے شمار لوگ تھے جنھوں نے پسِ پردہ رہ کر وطن کے لیے اپنے وطن کی آزادی کے لیے جان ہتھیلی پر رکھ کر کام کیا۔ ایسے ہی آزادی کے متوالوں میں سے ایک شخص کی روداد۔

فکر معاش سے بھلا کون بچا ہوا ہے۔ ہر شخص اپنی ہمت اور اہلیت کے مطابق کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا ہے کہ "روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر"، مگر بعض اوقات حالات ایسے ہو جاتے ہیں کہ انسان کو اپنی اہلیت یا صلاحیت بلکہ اپنی مرضی اور پسند کے خلاف بھی کوئی کام کرنا پڑ جاتا ہے۔ پھر اگر زمانہ جنگ کا ہو اور آپ کو جاسوسی پر لگا دیا جائے تو وہی ہوگا جو جمی ہوشے کے ساتھ ہوا اور بالآخر وہ ایک بہت بڑے اعزاز کا بھی مستحق ٹھہرا، لیکن قسمت کو تو کچھ

اور ہی منظور تھا۔ یہی سبب تھا کہ جمی ہوشے جیسا۔ ایک ایسا شخص، جسے فکر معاش بھی لاحق ہو اور پھر اس پر مستزاد کہ وہ اپنے اوپر یہ قدغن بھی لگا بیٹھے کہ وہ ایسی جگہ پر ہرگز ملازمت نہیں کرے گا جہاں دشمنوں کا اثر ورسوخ ہو تو ایسے انسان کی زندگی قابلِ رحم حد تک مشکل ہو جاتی ہے۔

اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ یوں تو دورانِ جنگ ملازمت کا حصول ویسے ہی جوئے شیر لانے سے کم نہیں اس کے باوجود جمی ہوشے نے یہ بھی تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ ایسی جگہ کام نہیں کرے گا جہاں نازیوں کا اثر ورسوخ ہو۔

اسے جرمنوں سے شدید نفرت تھی۔ فرانس کی شکست کے بعد اس نفرت میں اور بھی اضافہ ہوا تھا، لہٰذا وہ نازیوں کے حامی اداروں میں کام کر کے ان کے ہاتھ مضبوط نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اسے ملازمت تلاش کرتے ہوئے کئی مہینے گزر گئے۔ ساری جمع پونجی خرچ ہونے لگی لیکن وہ اپنے فیصلے پر اٹل رہا۔

اوائل اگست میں وہ حسب معمول اخبار بینی میں مشغول تھا کہ اچانک اس کی نظر ''دیجان'' کے ایک اشتہار پر پڑی۔

''دیجان'' کی ایک موٹر ساز فرم کو پیرس میں کسی موزوں نمائندے کی ضرورت تھی جو اس کے تیار کردہ نئے موٹر انجن کو مارکیٹ میں متعارف کروا سکے۔

چونکہ یہ ایک خالصتاً فرانسیسی فرم تھی، اس لیے اس نے سوچا کہ کیوں نہ قسمت کی دیوی کو آزمایا جائے۔

امیدواروں سے بذریعہ ڈاک درخواستیں طلب کی گئی تھیں۔ لیکن اس نے اس جھنجھٹ میں پڑنے کی بجائے بالمشافہ گفتگو کرنے کا فیصلہ کیا اور اگلے دن ہی پہلی گاڑی سے دیجان روانہ ہو گیا۔

کمپنی نے عارضی طور پر آدھے پیرس کی ایجنسی اسے دے دی۔ ملک میں پیٹرول کی قلت تھی۔ اس لیے لوگ گیس سے چلنے والے انجن کو ترجیح دینے لگے۔ جمی ہوشے کا کام چل نکلا تو فرم نے اسے پیرس میں ہی اپنا چیف ایجنٹ مقرر کر دیا۔

اب اسے کمپنی کے ایما پر مختلف اداروں سے لین دین کرنے اور اپنے کارندے مقرر کرنے کے مکمل اختیارات حاصل ہو چکے تھے۔

کاروبار تیزی سے ترقی کرتا چلا گیا اور اسے مالی پریشانیوں سے نجات مل گئی۔ اب جو فراغت اور اطمینان نصیب ہوا تو پھر اس کے دل میں جرمنوں کے خلاف نفرت کی دبی چنگاری بھڑک اٹھی۔ وہ فرانس کے دشمنوں سے بدلہ لینے کی تدبیریں سوچنے لگا۔

ان دنوں بی بی سی سے فرانسیسی تحریک مزاحمت کا زور وشور سے پروپیگنڈا ہو رہا تھا۔

جمی نے اس تحریک کا کھوج لگانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

درحقیقت تحریک کا ابھی تک کوئی وجود ہی نہ تھا، یہ ''شیر آیا...... شیر آیا'' والا معاملہ تھا۔ اور یہ سارا پروپیگنڈہ خود اتحادی کر رہے تھے۔ چنانچہ اس نے ان سے براہ راست ''رابطہ'' کرنے کا فیصلہ کیا۔

41-1940ء کا موسم سرما اس فیصلے کے مختلف پہلوؤں پر سوچ وبچار میں گزر گیا۔

ان دنوں رودبار انگلستان پہنچنا خارج از بحث تھا کیونکہ ساحل کے چپے چپے پر نازی پہرے دار موجود تھے... اسپین کی سرحد نہ صرف پیرس سے دور تھی بلکہ اسے اس علاقے کے حالات کا بھی صحیح علم نہ تھا۔ لے دے کے سوئٹزر لینڈ رہ جاتا تھا۔ اس کی سرحد نسبتاً قریب تھی اور وہ اس کے راستوں سے اچھی طرح واقف بھی تھا۔ پھر سفر کرنے کا ایک بنا بنایا بہانہ بھی موجود تھا۔ یہاں جنگلات تھے جن کی لکڑی سے کوئلہ بنتا تھا۔ جمی ہوشے ایک ایسی کمپنی کا نمائندہ تھا جو گیس سے چلنے والے موٹر انجن تیار کرتی تھی اور گیس پیدا کرنے کے لیے کوئلہ درکار تھا۔ اس طرح جنگلات اور کوئلے میں اس کی توجہ اور دلچسپی، پیشہ ورانہ ضرورت کا حصہ قرار دی جا سکتی تھی۔

نازی سپاہی اسے اِدھر اُدھر چکر لگاتے ہوئے پکڑ بھی لیتے تو وہ باآسانی اس بہانے سے چھٹکارا پا سکتا تھا۔

اس طرف سے سرحد پار کرنے میں صرف ایک رکاوٹ تھی اور وہ یہ کہ ''زون روج'' میں سے ہو کر گزرنا پڑتا۔ یہ ممنوع علاقے کی ایک طویل پٹی تھی جو فرانس کی مشرقی سرحد کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی تھی۔ یہ خطہ پچاس سے ساٹھ میل تک چوڑا تھا اور اس میں داخل ہونے کے لیے جرمن حکام سے خصوصی پاس حاصل کرنا ضروری تھا۔ یہ پاس بہت کم لوگوں کو جاری کیے جاتے تھے۔ جمی کو پاس ملنے کی امید نہ تھی۔ اگر درخواست دیتا بھی تو اندیشہ تھا کہ جرمن پیچھے پڑ جائیں گے اور اس کی نقل وحرکت پر کڑی نظر رکھیں

گے۔ چنانچہ اس نے پاس کے بغیر ہی ''زون روج'' سے گزرنے کا فیصلہ کیا۔

15 مئی کی رات۔ وہ دیجان جانے والی گاڑی میں سوار ہوا۔

یہ قصبہ سرحد کے قریب تھا۔ اس نے اپنی سیکریٹری کو بتایا کہ وہ ایک پروجیکٹ کے سلسلے میں ڈائریکٹر سے تفصیلی بات چیت کرنے جارہا ہے، اور وہاں سے فارغ ہونے کے بعد سرحدی علاقے میں کوئلہ دستیاب ہونے کے امکانات کا جائزہ بھی لے گا۔

سرحد تک پہنچنے اور دیجان تک کسی سواری کا بندوبست ممکن نہ تھا۔ اس نے اپنی سائیکل ساتھ رکھ لی۔ صبح سویرے وہ دیجان پہنچا۔ دن بھر ڈائریکٹر اور دوسرے افسروں سے پروجیکٹ کے متعلق گفتگو اور بحث و مباحثہ کرتا رہا۔ کاروبار کو ترقی دینے کے لیے کوئلے کے نئے وسائل اور ذخیرے تلاش کرنا ضروری تھا۔

سب نے اس کا منصوبہ پسند کیا اور یوں اس طرح اس نے آسانی سے سرحدی علاقے میں جانے کا جواز پیدا کرلیا۔

شام کے وقت وہ دفتر سے نکلا اور اپنی ''مہم'' پر نکل پڑا۔ جمی نے جان بوجھ کر نہر کے ساتھ ساتھ بہت اجاڑ اور ویران راستہ اختیار کیا۔ ادھر نازیوں سے مڈبھیڑ کا خطرہ نہ تھا۔

''زون روج'' تک کا سفر تو بہ خیر و عافیت طے پاگیا لیکن ممنوعہ علاقے کی سرحد کے پاس مجبوراً رک جانا پڑا۔ پل کا راستہ خار دار باڑ سے بند کردیا گیا تھا اور ایک بورڈ پر موٹے حروف میں لکھا تھا۔

''خبردار! باڑھ سے دور رہیے، بارودی سرنگیں بچھی ہیں۔''

بات اگر صرف خار دار باڑھ کی ہوتی تو جمی شاید کوئی نہ کوئی ترکیب نکال ہی لیتا لیکن بارودی سرنگوں کی موجودگی میں کسی قسم کا خطرہ مول لینے کا وہ ہرگز متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔

نہر زیادہ چوڑی نہ تھی اور سائیکل کے ساتھ بھی تیر کر پار کی جاسکتی تھی۔ لیکن اس میں وقت صرف ہوتا اور شور سے دشمن کے متوجہ ہونے کا خطرہ بھی تھا۔

وہ گنجان جھاڑیوں اور درختوں کی اوٹ میں دبکا ہوا ابھی سوچ و بچار میں گم تھا کہ اچانک دور سے تین موٹر سائیکل سوار آتے نظر آئے۔

وہ قریب پہنچے تو اس نے دیکھا، یہ ایک جرمن گشتی دستہ ہے، سب سے آگے سارجنٹ تھا اور اس کے پیچھے دو سپاہی، خار دار باڑھ کے قریب پہنچ کر وہ رک گئے۔

سارجنٹ نے اپنی سائیکل ایک سپاہی کے حوالے کی اور خود ادھر ادھر دیکھتا ہوا آگے بڑھا، پھر ایک جگہ ہاتھ بڑھا کر خار دار تار کو اپنی طرف کھینچا، جمی سانس روکے یہ منظر دیکھ رہا تھا، اسے پوری توقع تھی کہ بارودی سرنگیں ایک لرزہ خیز دھماکے سے اب پھٹیں کہ تب پھٹیں، اور جرمن سپاہیوں کے پرخچے اڑ جائیں گے۔ مگر کسی دھماکے کی آواز تک سنائی نہ دی۔ اس کے برعکس دیکھتے ہی دیکھتے باڑھ میں ایک آدمی کے گزرنے کا راستہ بن گیا۔

پل عبور کرنے کے بعد سارجنٹ نے اس ''خلا'' کو دوبارہ بند کردیا، اور پھر وہ تینوں سائیکلوں پر سوار ہو کر چل دیئے۔

جب وہ تینوں نظروں سے اوجھل ہوگئے تو جمی اپنی کمین گاہ سے نکلا۔ دور دور تک کوئی شخص نظر نہ آتا تھا۔ بڑی احتیاط سے قدم رکھتا ہوا وہ باڑھ کے قریب پہنچا۔ اس پر اب نوٹس بورڈ کی حقیقت کھل چکی تھی۔ یہ محض لوگوں کو خوف زدہ کرنے کے لیے تھا۔ اس نے بلا تعویق و تامل جرمن سارجنٹ کی طرح باڑھ کا خفیہ تالا کھولا اور سائیکل سمیت دوسری طرف پہنچ گیا۔ پھر باڑھ کو پہلے کی طرح آپس میں جوڑ دیا اور اپنی راہ پر ہولیا۔

شام ہو چلی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کرفیو کے اوقات شروع ہوتے سے پہلے ''لی سرنیواس'' تک تو کم از کم پہنچ ہی جائے۔ اس نے اپنی رفتار تیز کردی۔

پیرس کے ایک دوست نے اسے لی سرنیواس کے ایک کسٹم گارڈ کا پتا دیتے ہوئے کہا تھا کہ اسے اعتماد میں لیا جاسکتا ہے۔ وہ اس کے لیے بہت مددگار ثابت ہوگا۔ لٰہذا ایک گھنٹے بعد جمی اس کے پاس بیٹھا اپنی رام کہانی سنا رہا تھا۔ کسٹم گارڈ نے بڑے غور سے اس کی باتیں سنیں پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر دیوار کے پاس لے گیا، جہاں علاقے کا ایک بڑا سا نقشہ دیوار پر ٹنگا ہوا تھا۔

انگلی کے اشارے سے سرحد تک پہنچنے کا نسبتاً محفوظ اور چھوٹا راستہ دکھایا۔

کسٹم ہاؤس کے ایک حصے میں جرمن پولیس نے اپنا دفتر قائم کر رکھا تھا۔ کبھی کبھار کوئی جرمن سپاہی ان کے کمرے میں بھی آدھمکتا۔ لیکن وہ گرد و پیش سے بے نیاز اپنی

باتوں میں ہی مصروف رہے، تھوڑی دیر بعد جمی نے اپنی سائیکل گارڈ کے پاس ہی چھوڑ دی اور خود پیدل اپنی منزل کی جانب روانہ ہوگیا۔

اس دوران ہلکی ہلکی بارش بھی شروع ہوگئی تھی......وہ بارش میں بھیگتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔

ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ سامنے سے تین جرمن بوبی (سپاہی) آتے نظر آئے۔ جمی نے گھبرا کر اپنے اردگرد نظریں دوڑائیں، مگر اسے چھپنے کی کوئی جگہ یا آڑ نظر نہ آئی... اثنائے راہ، سپاہیوں نے بھی اسے دیکھ لیا۔ اب جمی ہوشے کے پاس، بہ دستور اسی طرح چلتے رہنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

قریب پہنچا تو انہوں نے اسے روک لیا۔ بارش میں بھیگنے سے اس کے کپڑے خراب ہوگئے تھے۔ پھر کئی گھنٹوں کے مسلسل سفر سے حالت بھی ناگفتہ بہ ہورہی تھی۔ پھر سپاہیوں کو اس کی بات پر یقین کیوں کر آتا کہ وہ ایک موٹر ساز فرم کا نمائندہ ہے، اور جنگلات میں کوئلے کے لئے مناسب لکڑی تلاش کررہا ہے۔

جرمن سپاہی اسے ساتھ لے کر واپس کسٹم ہاؤس پہنچے۔ ساری عمارت خالی تھی۔ کسٹم گارڈ کا بھی کہیں پتا نہ تھا۔ دروازے پر ایک فوجی ٹرک کھڑا تھا۔ سپاہیوں نے اسے اس میں سوار کیا اور خود بھی ساتھ بیٹھ گئے۔

اب تک سارا معاملہ ایک دلچسپ مہم معلوم ہورہا تھا۔ لیکن جب ٹرک روانہ ہوا تو جمی کو پہلی بار حالات کی نزاکت اور سنگینی کا احساس ہوا۔

''زون روج'' میں پرمٹ کے بغیر قدم رکھنا بہت بڑا جرم ہے۔ جرمن اب آسانی سے نہیں چھوڑیں گے۔ اسے اپنی موت یقینی نظر آنے لگی، لیکن وہ خوف زدہ نہیں تھا۔ وطن عزیز کی خاطر وہ ایک بار نہیں سو بار قربان ہونے کو تیار تھا۔

☆☆☆

ٹرک مقامی ہیڈ کوارٹر میں داخل ہوا تو خاصی رات گزر چکی تھی۔ جمی کو ایک تاریک کوٹھری میں بند کردیا گیا۔ صبح سویرے ایک نازی لیفٹیننٹ کے سامنے اس کی پیشی ہوئی۔

جمی نے ٹوٹی پھوٹی جرمن زبان میں بتایا کہ وہ ایک فرم کی طرف سے اس علاقے میں کوئلے کی لکڑی کا جائزہ لینے آیا ہے۔ اتفاق سے اس کے پاس وزارت صنعت و حرفت کی ایک مستند دستاویز بھی تھی۔ اس میں فرانسیسی کارخانوں میں جرمنوں کے لیے ماہانہ تیار ہونے والی فوجی گاڑیوں کے اعداد و شمار درج تھے۔ جمی نے یہ دستاویز پیرس میں وزارت صنعت و حرفت کے دفتر سے حاصل کی تھی۔ اس پر متعلقہ افسر کی مہر اور دستخط ثبت تھے۔ اسے دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ شاید یہ دستاویز خود حکومت نے اس کے حوالے کی ہے۔

اس طرح اس کی داستان میں کچھ وزن پیدا ہوگیا۔

تحقیقات اور پوچھ گچھ کا سلسلہ ایک گھنٹے تک جاری رہا۔ جرمن افسر نے اس سے کئی اور بھی سوالات کیے اور جمی کو ہر لحہ یہی دھڑکا لگا رہا کہ اب تب میں وہ پوچھے گا کہ ''زون روج میں داخلے کا پرمٹ کہاں ہے؟'' لیکن قسمت اچھی تھی کہ نہ لیفٹیننٹ نے یہ سوال کیا نہ کسی سپاہی نے۔

بہرطور لیفٹیننٹ دیر تک جمی کے کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا، پھر سپاہیوں کو حکم دیا۔ ''اسے پیرس جانے والی پہلی گاڑی میں بٹھا دو۔''

حکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔ سپاہی اسے ساتھ لے کر اسٹیشن پہنچے۔ گاڑی چلنے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ انہوں نے انتظار کرنے کی بجائے، جمی کو ایک ڈبے میں بٹھایا اور واپس چلے گئے۔

ڈبے میں صرف چند سواریاں تھیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی کسی کام سے ایک ایک کرکے نیچے اتر گئیں۔ جمی موقع پا کر چپکے سے نیچے اترا اور اسٹیشن کی عمارت سے باہر آگیا اور جب پیرس ایکسپریس روانہ ہوگئی تو سامنے سڑک پر کھڑی ہوئی ایک بس میں بیٹھ گیا۔

بس مورتیو جارہی تھی۔

جرمنوں سے پہلی مڈبھیڑ ہونے کے بعد یوں صاف بچ نکل آنے سے، اس کا حوصلہ خاصا بلند ہوچکا تھا۔

دوپہر کے قریب بس منزل مقصود تک پہنچی۔ مورتیو ایک چھوٹا سا پہاڑی قصبہ تھا۔ جمی نے قریبی ہوٹل میں کھانا کھایا اور ایک نقشہ خرید کر اس کے مطالعے میں مصروف ہوگیا۔

سوئٹزرلینڈ کی سرحد وہاں سے صرف چار میل دور تھی۔

اس نے رات وہیں گزاری۔ صبح ہوئی تو پھرتا پھراتا لکڑیاں چیرنے والے ایک چھوٹے سے کارخانے میں داخل ہوا، اور اس کے مالک سے اپنا تعارف کرایا پھر اس علاقے کے جنگلات دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، کارخانے دار نے ایک نوکر ساتھ بھیج دیا۔ اس کا نام پال کینانٹ تھا اور وہ

سارے علاقے سے اچھی طرح واقف تھا۔

دونوں کچھ دیر تک خاموشی سے پہاڑی راستہ طے کرتے رہے، چاروں طرف گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا۔جمی اپنے مطلب کی بات دریافت کرنے کے لیے بے تاب تھا۔ مگر ہمت نہیں پڑتی تھی۔ چلتے چلتے وہ ایک دوراہے پر پہنچ گئے۔

پال کنیاٹ نے ایک ذیلی راستہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔''چوٹی تک جانے کے لیے یہ راستہ زیادہ محفوظ ہے، پھر ادھر جرمن پہرے داروں کا بھی کوئی خطرہ نہیں ہے۔خوامخواہ کون ان کے الٹے سیدھے سوالوں کے جواب دیتا پھرے گا''۔

جمی کے چہرے پر مسکراہٹ رقصاں ہوگئی۔اب پال کینیاٹ کو شریک راز بنانے میں کوئی حرج نہ تھا۔چنانچہ جمی نے اسے اپنے دل کی بات بتا دی۔پال کینیاٹ نے ایک زور کا قہقہہ بلند کیا اور بولا۔''میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ کوئلے کا محض چکر ہے، اصل بات کچھ اور ہے۔''

وہ دونوں باتیں کرتے کرتے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ یہاں جنگل ختم ہوگیا تھا۔نیچے وادی میں چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی۔اس کے پار چند گز تک زمین خالی تھی۔آگے گھنا جنگل شروع ہوگیا تھا۔پال کینیاٹ نے سامنے ایک ڈھلوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''اس جگہ ایک چھوٹی سی دیوار ہے، اس کے دوسری طرف سوئٹزر لینڈ کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔دیوار آسانی سے پار کی جاسکتی ہے...... فاصلہ آدھ میل سے زیادہ نہیں، لیکن احتیاط لازمی ہے۔جرمن سپاہی اس علاقے میں اجنبیوں کو دیکھتے ہی گولی مار دیتے ہیں۔پوچھ گچھ کی بھی زحمت گوارا نہیں کرتے، پھر ان کے ساتھ خونخوار کتے بھی ہیں جو انسان کو ایک قدم بھی آگے نہیں جانے دیتے۔''

پال کینیاٹ کی یہ باتیں سن کر جمی گھبرا سا گیا۔تھوڑی دیر تک دونوں خاموش رہے۔پھر پال نے داہنی طرف اشارہ کیا اور بولا۔''وہ سامنے میری جھونپڑی ہے...... میں کبھی کبھی اپنی گائیں ادھر چرانے آجاتا ہوں، کل جب واپس آؤ تو وادی میں داخل ہونے سے پہلے جھونپڑی کا دروازہ دیکھ لینا، وہ سامنے صاف نظر آتا ہے۔دروازہ کھلا ہو تو بے دھڑک چلے آنا اور اگر بند ہو تو خبردار اپنی کمین گاہ سے باہر مت نکلنا، بند دروازہ اس بات کا اشارہ ہوگا کہ جرمن سپاہی آس پاس موجود ہیں۔''

اتنا کہنے کے بعد پال کینیاٹ تو رخصت ہوگیا اور جمی آہستہ آہستہ وادی کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

چہار سو گہرا اور اسرار بھرا سکوت طاری تھا۔چند گایوں کے سوا جو ایک طرف گھاس چر رہی تھیں، دور دور تک زندگی کی کوئی علامت نظر نہیں آتی تھی۔ذرا دیر بعد جب وہ ایک کھلی جگہ پہنچا تو جانے کیوں خوف سے اس کا دم خشک ہونے لگا۔تاہم جی کڑا کر کے چلتا رہا۔ندی پار کی، رکڑ آیا، اس کے بعد جھنگر میں داخل ہوگیا، یہاں سے آگے وہ گھنے درختوں کے جھنڈ کی محفوظ آڑ لیے آگے بڑھتا رہا۔

آدھے گھنٹے تک چلنے کے بعد سرحد کی نشاندہی کرنے والی دیوار نظر آگئی۔وہ اسے پھاند کر دوسری جانب پہنچا۔ اب وہ سوئٹزر لینڈ کی آزاد سرزمین پر کھڑا تھا۔دور ایک مکان نظر آرہا تھا۔قریب پہنچنے پر معلوم ہوا کہ وہ کسٹم چوکی ہے۔

کسٹم افسر نے مختصری لیت ولعل کے بعد اس کا شناختی کارڈ رکھ لیا اور اسے آگے جانے کی اجازت دے دی۔

وہ تین گھنٹے تک چلتا رہا۔آخر ایک قصبے میں پہنچا، یہاں سے دارالحکومت کی طرف گاڑی جاتی تھی۔وہ چند منٹ دیر سے پہنچا تھا۔گاڑی جاچکی تھی۔وہ اسٹیشن سے باہر آرہا تھا کہ راستے میں پولیس کے ایک سپاہی نے روک لیا اور شناختی کارڈ طلب کیا۔جمی نے اسے بتایا کہ وہ تو سرحد پر کسٹم افسر نے رکھ لیا ہے۔

سپاہی اسے ساتھ لے کر پولیس اسٹیشن آیا اور کسٹم آفیسر کو فون کر کے اس کے بیان کی تصدیق کی، اسی دوران ایک مقامی انٹیلی جینس افسر بھی آگیا۔وہ اس سے کرید کرید کر فرانس اور جرمنوں کے حالات دریافت کرنے لگا۔جمی پریشان ہوگیا۔وہ اتحادیوں کو اپنی خدمات پیش کرنے آیا تھا۔ لیکن سوئٹزر لینڈ والے پیچھے پڑ گئے تھے۔انٹیلی جینس افسر کی ناراضی بہت سی دشواریاں پیش کرسکتی تھیں۔اسے خوش کرنے کے لیے اس نے جرمن سپاہیوں سے ملاقات کا واقعہ خوب مرچ مسالا لگا کر سنایا، جن سے راستے میں اس کی مڈبھیڑ ہوچکی تھی۔آخر میں وزارت صنعت وحرفت کا اعداد وشمار والی دستاویز بھی دکھا دی۔

سوئس انٹیلی جینس افسر خوشی سے جھوم اٹھا۔یہ سب اس کی توقعات سے کہیں زیادہ تھا۔اس نے خوشی خوشی جمی کو کھانے کی دعوت دے ڈالی اور پھر اسے اگلے قصبے تک

پہنچانے کے لیے بھی تیار ہوگیا۔اس چکر میں جمی کے تین قیمتی گھنٹے ضائع ہوگئے۔مگر اس نے اسے کوئی اہمیت نہ دی کیوں کہ آئندہ بلا روک ٹوک سرحد پار کرنے کے لیے سوئس افسر سے دوستانہ تعلقات استوار کرنے انتہائی ضروری تھے۔

جمی اتوار کے دن دارالحکومت برن پہنچا۔تمام کاروباری ادارے اور دفاتر بند تھے۔وہ پچھلے چار دنوں سے مسلسل سفر کر رہا تھا۔کپڑے میلے چیکٹ ہو رہے تھے۔داڑھی بڑھ گئی تھی اور ایک بوٹ کا تلوا بھی غائب تھا۔اس حلیے میں جب وہ برطانوی سفارت خانے کی عمارت میں داخل ہونے لگا تو، دربان نے اٹھائی گیرہ سمجھ کر اسے بھگانے کی کوشش کی مگر جب جمی نے سفیر سے ملاقات پر اصرار کیا تھا تو دربان تذبذب کا شکار ہوگیا اور اسے کلرک کے پاس لے گیا۔کلرک نے انتظار گاہ میں بٹھانے کی ہدایت کی۔اسے ابھی وہاں بیٹھے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک لمبا تڑنگا خوش پوش انگریز اندر داخل ہوا۔جمی پر ایک سرسری نظر ڈالی اور نہایت بے دلی سے اس کا مقصد دریافت کیا۔اس نے جمی سے نہ تو اپنا تعارف کروایا اور نہ اسے اخلاقاً کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دی۔دونوں کھڑے کھڑے باتیں کرنے لگے۔

جمی کو بعد میں پتا چلا کہ وہ اسسٹنٹ ملٹری اتاشی میجر بی ہے۔

جمی ہوشے نے رضا کارانہ جاسوسی کی پیش کش کردی تو میجر نے برا سا منہ بنایا، جیسے کوئی کڑوی گولی نگل لی ہو، پھر روکھے لہجے میں معذرت کرتے ہوئے بولا۔"افسوس، آپ کی خدمات سے فائدہ اٹھانا ہمارے لیے ممکن نہیں۔"

جمی غصے اور بے بسی سے تلملا کر رہ گیا۔ذرا دیر سوچتا رہا، پھر کاغذ کے پرزے پر کچھ لکھا اور اسے میجر بی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔"یہ دو انگریز معززین کے نام ہیں، یہ دونوں معاشرے میں عزت کا مقام رکھتے ہیں، میرے چال چلن اور کردار کی تصدیق ان سے کرائی جاسکتی ہے۔"

میجر بی نے لاتعلقی کے انداز میں کاغذ پر اچٹتی سی نظر ڈالی اور اسے میز پر رکھ دیا۔چند ثانیے خاموشی طاری رہی جسے جمی نے ہی توڑا۔"میں ایک ماہ بعد پھر آؤں گا۔میں نہیں چاہتا کہ میری تگ و دو ضائع جائے۔یہ لیجیے، فرانس کی ایک سرکاری دستاویز، شاید آپ کے لئے مفید ثابت ہو۔"اس نے ایک کاغذ دیتے ہوئے کہا۔

یہ وزارت صنعت و حرفت والی دستاویز تھی، جو برطانوی حکومت کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی۔میجر بی نے جب اسے لندن بھیجا تو وہاں بی بی سی نے فرانس کی پٹھو حکومت کے خلاف پروپیگنڈے میں اس سے خوب کام لیا اور اس کے چیدہ چیدہ حصے نشر بھی کیے۔لیکن اس وقت میجر بی نے اس میں کوئی زیادہ دلچسپی نہ لی۔ایک بے کار سا کاغذ سمجھ کے بے دلی سے رکھ لیا۔گفتگو کو طول دینا لاحاصل تھا۔جمی دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا ہوا سفارت خانے سے باہر آیا۔

واپس سرحد پر پہنچا تو پال کینانٹ کی جھونپڑی کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

جمی نے بڑی احتیاط سے ندی پار کی اور گھنی جھاڑیوں میں چھپتا چھپاتا ہوا چوٹی تک پہنچ گیا۔پھر جس راستے سے وہ پال کینانٹ کے ساتھ آیا تھا، اس سے ہوتا ہوا پال کے گھر آگیا۔وہ پہلے ہی اس کا منتظر تھا۔دونوں نے مل کر کھانا کھایا جمی تھوڑی دیر ستانے کے بعد لی سرینو اس کی طرف چل پڑا۔وہاں کسٹم ہاؤس میں اس کی سائیکل پڑی ہوئی تھی۔اگرچہ جرمنوں سے مڈبھیڑ کا خطرہ موجود تھا، لیکن وہ سائیکل کے بغیر پیرس واپس جانے کے لیے تیار نہ تھا۔ان دنوں سائیکل بہت قیمتی اور نایاب تھی۔پھر زون روج میں سے تیزی کے ساتھ گزرنے کے لیے بھی وہ نہایت ضروری تھی۔

وہ دوپہر کے قریب لی سرینو اس پہنچا۔کسٹم ہاؤس سے وہ ابھی پانچ، چھ سو گز دور تھا کہ سامنے سے اچانک ایک جرمن سپاہی نکل آیا، دونوں قریب پہنچے تو ایک دوسرے کو دیکھ کر ٹھٹک سے گئے۔جمی کو سپاہی کی صورت شناسا نظر آئی۔معاً اس کا حافظہ تازہ ہوگیا۔یہ اس گشتی دستے کا سپاہی تھا جس نے چند دن پہلے اسے گرفتار کیا تھا۔اس نے اپنے حواس قائم رکھے اور کسی قسم کی پریشانی کا مظاہر کیے بغیر نہایت بے تکلفانہ انداز میں بولا۔"ہیلو، دیکھا مجھے فرانسیسی حکام نے دوبارہ واپس آنے کی اجازت دے دی۔لیفٹیننٹ کہاں ہے؟ میں اپنی سائیکل لینے آیا ہوں۔"

جرمن سپاہی نے نفرت سے اپنے ہونٹ سکیڑے اور شانے اچکاتے ہوئے بڑی رعونت سے کہا۔"سیدھے چلے جاؤ، وہ کسٹم ہاؤس میں بیٹھا ہوگا۔"یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

جمی سوچنے لگا، برے پھنسے، واپس جانے کا موقع بھی نہ رہا تھا، بادل نخواستہ آگے بڑھا۔کسٹم ہاؤس کے قریب پہنچا تو عمارت خالی نظر آئی۔سب لوگ دوپہر کا کھانا کھانے

یا آرام کرنے جا چکے تھے۔ کسٹم گارڈ کا بھی کہیں نام و نشان نہ تھا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ باری باری تمام کمروں میں جھانک کر دیکھا۔ آخر گودام میں اپنی سائیکل کھڑی نظر آ گئی۔ اسے جلدی سے باہر نکالا۔ اس پر سوار ہوا، اور 'زون روج' جانے والے راستے کی طرف ہو لیا۔

شام ہونے سے پہلے پہلے وہ باڑھ تک پہنچ گیا۔ جرمن سپاہی کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس نے اطمینان سے پہلے کی طرح باڑھ پار کی، اور چند گھنٹے بعد وہ دیجان پہنچ گیا۔

یہاں اس نے ڈائریکٹر کو رپورٹ پیش کی اور لکھا۔ ''مورتیو کے گردونواح سے عمدہ کوئلہ بنانے کے لیے مناسب لکڑی باآسانی مل سکتی ہے۔''

دوبارہ سرحد پار کرنے کے ٹھیک بہتر گھنٹے بعد وہ پیرس میں تھا۔

☆☆☆

اتحادیوں سے پہلی ملاقات خاصی حوصلہ شکن تھی لیکن جمی نے ہمت نہیں ہاری، وقت مقررہ پر وہ چھپتا چھپاتا دوبارہ سوئٹزر لینڈ کی سرحد میں داخل ہوا۔ کسٹم گارڈ اسے اچھی طرح پہچانتا تھا۔ مگر اس نے جمی کو آگے جانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ جمی نے چال چلی اور بتایا کہ وہ سوئس حکومت کے لیے سرحد پار سے نہایت اہم فوجی راز اور معلومات لے کر آیا ہے۔ پھر اس نے ایک ماہ پہلے سوئس انٹیلی جینس افسر سے اپنے انٹرویو کا قصہ سنایا۔ اس پر گارڈ قدرے نرم پڑ گیا۔ اس نے ہیڈ کوارٹر فون کیا تو وہاں سے جمی کو روکے رکھنے کا حکم صادر ہوا۔ دو گھنٹے بعد ایک افسر آیا۔ اس نے جمی سے انٹیلی جینس افسر کا نام اور پتا دریافت کر کے فون کیا۔ انٹیلی جینس افسر نے نہ صرف جمی کے بیان کی تصدیق کی بلکہ اس سے مسلسل رابطہ کرنے کی پُرزور سفارش بھی کی۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ سوئس حکام جمی کے ساتھ یوں پیش آنے لگے، جیسے وہ کوئی ٹھنک اہم اور بڑی شخصیت ہو۔ سوئس ملٹری انٹیلی جینس نے اسے آیندہ کے لیے ملک کی سرحد بلا روک ٹوک پار کرنے کی خصوصی اجازت دے دی۔

اگلی صبح وہ میجر بی سے ملا۔ وہ اگرچہ گرم جوشی سے پیش نہ آیا، تاہم اس کے انداز میں پہلے جیسی اجنبیت اور بے اعتنائی نہیں تھی۔ بلکہ وہ خاصی خوش اخلاقی سے کام لے رہا تھا۔

دونوں کمرے میں بیٹھ گئے۔

میجر بی نے اس سے خاندان کے بارے میں چند سوالات پوچھے۔ اس کے سامنے میز پر ٹائپ شدہ کاغذ رکھا تھا۔

جمی جواب دیتا تو وہ اس کاغذ پر اچٹتی سی نظر ڈال لیتا۔ تھوڑی دیر بعد پہلی مرتبہ اس کے سنجیدہ چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ جمی کے جوابات سے مطمئن ہے۔ اس نے ٹائپ شدہ کاغذ جمی کے آگے رکھ دیا اور کہا۔

''یہ معلومات ہمیں لندن سے موصول ہوئی ہیں۔ آپ نے جن عزیزوں کے پتے دیے تھے، انہوں نے تفصیل سے آپ کے حالات لکھ بھیجے ہیں۔'' تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر میجر بی گلا صاف کر کے بولا۔ ''اب ذرا کام کی باتیں ہو جائیں، کیا آپ کی پیشکش بدستور قائم ہے؟''

''یقیناً'' جمی نے بڑی تیزی سے جواب دیا۔ ''میری دوبارہ آمد اس بات کا واضح ثبوت ہے۔''

''ٹھیک ہے، آپ آسانی سے کتنے کتنے عرصے بعد میرے پاس آ سکتے ہیں؟''

جمی سوچنے لگا۔ کوئلے کی فروخت کی کہانی اب فرسودہ ہوتی جا رہی ہے، اس لیے جلد جلد آنے کے امکانات بہت کم تھے۔ اس نے لمحے بھر کی ہچکچاہٹ کے بعد ہر تین ہفتے بعد ایک چکر لگانے کی ہامی بھر لی۔

میجر بی بہت خوش ہوا۔ پھر ابتدائی مشن کے طور پر مقبوضہ علاقے میں دشمن فوج کے یونٹوں کے صحیح نام اور پڑاؤ معلوم کرنے، ہوائی اڈوں، پیٹرول اور اسلحے کے ذخیروں کی نشاندہی اور نازیوں کے دفاعی انتظامات سے آگاہ کرنے کا کام اس کے سپرد کر دیا۔

جمی کا خیال تھا کہ یہ معمولی کام ہیں، انہیں انجام دینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ لیکن جب عمل شروع کیا تو قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

پیرس، جرمن فوجیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو دوسرے علاقوں سے چھٹیاں گزارنے آئے تھے۔ ان کی یونٹوں کے نام اور پتے معلوم کرنا آسان نہ تھا۔ پھر جرمن کیمپ ہمیشہ آبادی سے باہر ہوتے۔ اس علاقے میں جانا ہی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

جمی کئی دنوں تک پیرس اور اس کے مضافات میں چکر لگاتا رہا۔ لیکن کوئی نئی اور مفید بات معلوم نہ ہوئی۔ تھک ہار کر اس نے ایسے موزوں افراد کی تلاش شروع کر دی جو اس کا ہاتھ بٹا

سکیں۔ یہ بڑا خطرناک کام تھا۔ گسٹاپو کو خبر ہو جاتی تو اس کی موت یقینی تھی۔ لیکن خوش قسمتی سے اس نے جس فرانسیسی سے بھی بات کی وہ محبِ وطن نکلا اور تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد ساتھ دینے پر آمادہ ہو گیا۔ اس طرح اس نے اپنے ارد گرد ایسے افراد جمع کر لیے جنہیں نازیوں سے دلی نفرت تھی۔ یہ لوگ زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے تھے۔ کوئی بس ڈرائیور تھا اور کوئی ریلوے کا ملازم، کسی کا اپنا ہوٹل تھا اور کوئی ٹیکسی چلاتا تھا۔ انہیں اپنے فرائض انجام دینے کے سلسلے میں اکثر ممنوعہ فوجی علاقوں میں جانے کا موقع ملتا اور وہ جمی کے لیے مفید اور ضروری معلومات اکٹھی کرتے رہتے، جمی انہیں مرتب کر کے سرحد پار میجر بی کو پہنچا دیتا۔

یہ سلسلہ نہایت کامیابی سے چلتا رہا، لیکن جمی مطمئن نہ تھا، کام کی رفتار تیز کرنے کے لیے اس نے ہمہ وقتی ایجنٹ مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔ سب سے پہلے اس نے اپنے ایک دوست کے بیٹے آلیور کو ساتھ ملایا۔ وہ نوجوان کام کرنے کے جذبے سے سرشار تھا۔ اس کا بچپن سوئٹزرلینڈ کے سرحدی علاقوں میں گزرا تھا اور تمام علاقے اس کے جانے پہچانے تھے۔ جمی نے اسے میجر بی کو پیغامات پہنچانے اور لانے کا کام سونپ دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دیجان اور مضافاتی علاقے سے معلومات اکٹھی کرنے کا فرض بھی انجام دیتا۔

آلیور کے آنے سے جمی کو ہر تین ہفتے بعد سرحد پار کرنے کی زحمت سے نجات مل گئی۔ اس طرح جو وقت بچتا وہ کاروباری معاملات نمٹانے اور خفیہ تنظیم جس کا نام اس نے ''آغیر'' رکھ دیا تھا کو پھیلانے کے منصوبے سوچنے میں صرف ہونے لگا۔

1942ء کے اوائل میں اس نے چار ایجنٹ اور بھرتی کیے۔ یہ، مارگٹ، جان، وکٹر اور جوزف تھے۔

ابتداء میں ان لوگوں کے اخراجات جمی اپنی جیب سے ادا کرتا رہا لیکن رفتہ رفتہ جب تعداد بڑھ گئی اور اخراجات میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تو مجبوراً میجر بی سے ذکر کرنا پڑا۔ اس نے فوراً معقول رقم کا بندوبست کر دیا۔

جمی کی خفیہ تنظیم ''آغیر'' بڑی کامیابی سے کام کر رہی تھی کہ جون میں اسے پہلے صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔

آلیور طبعاً مہم جو تھا۔ ''ہرکارے'' کے خشک کام سے جلد اکتا گیا۔ ایک مرتبہ کسی دوست سے پتا چلا، چند ولندیزی فرار ہو کر سوئٹزرلینڈ جانا چاہتے ہیں۔ آلیور فوراً ان کی مدد کرنے کو تیار ہو گیا۔ جمی پر اس حرکت کا انکشاف دیر سے ہوا۔ آلیور پہلی پارٹی کے بعد ایک اور گروپ کو اسمگل کرنے کی تیاری کر رہا تھا کہ جمی نے اسے خواہ مخواہ خطرات مول لینے سے روکا...... آلیور نے وعدہ کیا کہ وہ ان لوگوں کو پار پہنچانے کے بعد دوبارہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا، جمی چپ ہو گیا۔

آلیور چند دن بعد اپنے ایک ساتھی جان کے ساتھ اسٹیشن پہنچا۔ ولندیزی پیرس سے دیجان آ رہے تھے۔ گاڑی رکی مگر اسے کوئی ولندیزی نظر نہ آیا۔ اس نے جان کو باہر چھوڑا، اور خود صورتِ حال کا جائزہ لینے پلیٹ فارم کی طرف چل پڑا۔ کئی منٹ گزر گئے، جان بے چینی سے انتظار کرتا رہا، مگر آلیور کی صورت نظر نہ آئی۔ وہ تقریباً مایوس ہو چلا تھا کہ اچانک بھاری بھرکم بوٹوں کی دھمک سنائی دی۔ ذرا دیر بعد ایک جرمن سپاہی نظر آیا، اس کے پیچھے دس بارہ ولندیزیوں کے درمیان آلیور سر جھکائے چلا آ رہا تھا۔ ان سب کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور مسلح فوجیوں کے ایک دستے نے انہیں اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔

جمی تین دن بعد کاروباری سفر سے لوٹا تو اس نے آلیور کے گرفتار ہونے کی خبر سنی۔ وہ بہت پریشان ہوا۔ اسے خطرہ تھا آلیور تنظیم کے متعلق نازیوں کو کچھ نہ بتا دے...... آلیور کو دیجان کی جیل میں رکھا گیا تھا۔ ایک نرم اور مہربان آسٹرین پہرے دار کی وساطت سے جمی نے رابطہ قائم کیا تو اس نے پیغام بھجوایا کہ میں نے اسمگلنگ کے جرم کا اقرار کر لیا ہے لیکن تنظیم کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں نکالا اور نہ آئندہ نکالوں گا۔''

جمی کا سر فخر سے تن گیا۔ اسمگلنگ جرمنوں کے نزدیک سنگین جرم نہ تھا، اس لیے امید تھی کہ آلیور جلد رہا ہو کر آ جائے گا، لیکن اسی دوران کسی نے مخبری کر دی کہ آلیور باقاعدگی سے سرحد پار جا کر برطانوی سفیر سے ملتا جلتا رہتا ہے۔ اس پر از سرِ نو پوچھ گچھ شروع ہو گئی۔ آلیور کو خوفناک مظالم کا نشانہ بنایا گیا۔ لیکن اس نے چپ سادھ لی۔ نازی جب کچھ اگلوانے میں ناکام رہے تو اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

آلیور مر گیا، تو جمی نے دوبارہ سرحد پار آنا جانا شروع کر دیا۔

ابتداء میں وہ ایک ہی راستے سے آتا جاتا رہا مگر اس طرح پکڑے جانے کا زیادہ امکان تھا۔ اس نے جلد ہی دو

نئے راستے ڈھونڈ لیے، پال کیناٹ کی طرح نئے مقامات پر بھی چند مقامی افراد کا تعاون حاصل ہوگیا۔ وہ ہمیشہ کسانوں کا بھیس بدل کر سفر کرتا۔ ہاتھ میں بیلچہ اور کلہاڑا ہوتا اور پیٹھ پر بوری جس میں آلوؤں کے ڈھیر میں خفیہ کاغذات رکھے ہوتے۔ سرحد سے واپسی کے بعد وہ قریبی اسٹیشن پہنچتا، چپکے سے لباس تبدیل کر کے سارا سامان آلوؤں کی بوری میں بند کر دیتا اور اسے اسٹیشن کے امانت خانے میں رکھوا دیتا۔

تین سال میں اس نے اٹھانوے بار سرحد پار کی لیکن کبھی جرمنوں کے ہتھے نہ چڑھا۔

بڑی وجہ صحیح منصوبہ بندی اور اپنے پروگرام کے مطابق عمل کرنے کے لیے ان تھک محنت تھی۔ وہ اپنے طے شدہ پروگرام کی سختی سے پابندی کرتا، اور کبھی ایک دن سے زیادہ لیٹ نہ ہوتا، بارش، طوفان، اندھیرا، کوئی شے اس کا راستہ نہ روک سکتی۔

چنانچہ وقت مقررہ پر وہ سرحد کے قریب پہنچتا تو وہاں مقامی دوست پہلے سے اس کے منتظر کھڑے ہوتے۔ ان سے پتا چل جاتا کہ علاقے میں جرمن موجود ہیں یا نہیں؟

دوستوں کی مدد اور تعاون کے علاوہ خوش قسمتی اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ کئی نازک موقعوں پر گرفتار ہوتے ہوتے بھی بچا۔

ایک بار پال کیناٹ کی طرف سے ''اوکے'' کا سگنل ملا۔ وہ اپنی کمین گاہ سے نکلا اور آگے بڑھا۔

جرمنوں نے کچھ عرصے سے سرحد پر خاردار باڑھ بھی لگا دی تھی۔ جمی نے قریب پہنچ کر آلوؤں کی بوری اور کلہاڑا دوسری طرف پھینکے۔ پھر تار کاٹ کر گزرنے کا راستہ بنا رہا تھا کہ پیچھے سے جرمن پولیس کے کتے نے اچانک جھپٹ کر اس کی ٹانگ دبوچ لی۔

جمی اس غیر متوقع حملے سے بوکھلا گیا۔ لیکن جلد ہی اس نے اپنے حواس مجتمع کیے۔ پولیس کا کتا خاموشی سے اس کی ٹانگ دبوچے کھڑا تھا۔ جمی نے اس کی گرفت سے خود کو آزاد کرانے کی بہت کوشش کی، مگر بے سود خالی ہاتھوں سے خونخوار کتے کا مقابلہ کرنا ناممکن ہی تھا۔ پھر یہ خطرہ بھی تھا کہ جرمن گشتی دستہ کتے کی تلاش میں اس طرف نہ آنکلے۔ اس نے بے بسی کے عالم میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔

اتفاق سے چند قدموں کے فاصلے پر ایک ٹوٹی ہوئی شاخ کا ٹکڑا پڑا دکھائی دیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر لکڑی اٹھائی اور کتے کے منہ میں ٹھونس دی، لکڑی کتے کے پیٹ میں گھستی چلی گئی۔ وہ بری طرح تلملایا، مگر ٹانگ پھر بھی اس نے نہ چھوڑی۔ جمی نے اور زور لگایا۔ کتے کا منہ کھل گیا اور جمی کی ٹانگ آزاد ہوگئی۔ کتا ایک دو بار تڑپا اور ٹھنڈا ہوگیا۔

جمی نے اس کی لاش ایک طرف کی اور تیزی سے سرحد پار پہنچ گیا۔ لیکن ابھی پوری طرح سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ درخت کی اوٹ سے سوئس پہرے دار بندوق تانے نمودار ہوا۔ بندوق کا رخ اس کی طرف تھا، جمی پریشان ہوگیا۔

معاً پہرے دار جرمن زبان میں چلّایا۔ ''خبردار''

جمی نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ دو جرمن سپاہی اس کی طرف نشانہ باندھے کھڑے تھے۔ سوئس پہرے دار نے للکارا تو انہوں نے بندوقیں نیچی کرلیں اور زیرلب بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔

ایک مرتبہ دیر سے واپسی ہوئی۔ وہ سگریٹ کے کش لگاتا ہوا تیزی سے چلا جارہا تھا۔ رات بے حد تاریک تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ معاً کسی نے جرمن زبان میں زور سے رک جانے کا حکم دیا۔ آواز بالکل قریب سے آئی تھی۔ اس کے قدم خود بخود رک گئے۔ چند لمحے تک خاموشی رہی، پھر وہی آواز بلند ہوئی۔

''ہالٹ'' اور اس کے ساتھ ہی گھوڑا چڑھانے کی مخصوص آواز آئی۔ جمی نے ڈرتے ڈرتے مڑ کر دیکھا، لیکن تاریکی میں کچھ نظر نہ آیا۔ سوچنے لگا، اس تاریکی میں مجھے تو چند قدم دور کے درخت بھی نظر نہیں آرہے، پھر میں کیسے دکھائی دے رہا ہوں؟

اچانک اس کی نظر اپنے سلگتے ہوئے سگریٹ پر پڑی جو تاریکی میں انگارے کی طرح روشن تھا۔ پل بھر میں سارا معمہ حل ہوگیا۔ چغلی سلگتے ہوئے سگریٹ نے کھائی تھی۔ جمی کا تو اس طرف دھیان بھی نہ گیا تھا۔ اب جو گیا تو اس نے فوراً کوٹ کے کالر میں سے پن نکالی سگریٹ کو اس میں پرو دیا، اسے قریبی درخت کے تنے میں گاڑا اور خود دبے پاؤں دوسری طرف نکل گیا۔

''تڑ...... تڑ...... تڑ...... تڑ'' کی دھماکے دار آواز سے جلد ہی سارا جنگل فائر کی آواز سے گونج اٹھا۔ جرمن سپاہی اس کے دھوکے میں سلگتے سگریٹ پر دیر تک گولیاں برساتے رہے اور وہ دور محفوظ مقام پر کھڑا دل ہی دل میں ان کی بے وقوفی پر مسکراتا رہا۔

☆☆☆

اتحادی فوجیں تیونس میں داخل ہوئیں تو فرانس میں جرمن فوج اور گولہ بارود کی وسیع پیمانے پر نقل وحرکت شروع ہوگئی اور دن رات خصوصی ٹرینیں آنے جانے لگیں۔ میجر بی نے جمی سے اس نقل وحرکت پر کڑی نظر رکھنے کی درخواست کی۔ جمی نے اپنے ایجنٹوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے والے ڈویژنوں، ان کے کمانڈروں کے نام اور منزل مقصود معلوم کرنے پر مامور کر دیا۔ سارا کام ریل کے ذریعے انجام پا رہا تھا۔ اس لیے اہم اور بڑے جنکشنوں پر متعین ریلوے ملازم بہت مفید ثابت ہوئے۔ جمی کو فوجی نقل وحرکت کی جو رپورٹیں اور سامان حرب کی تفصیلات ملیں، وہ اس نے فوراً سرحد پار پہنچا دیں۔ 1942ء کے آخر تک جمی کے ایجنٹوں کی تعداد ساٹھ ہوگئی۔ ان سے رپورٹیں اکٹھی کرنے اور میجر بی تک پہنچانے کا کام بے حد صبر آزما اور تھکا دینے والا تھا۔ جمی ہو شیئے وطن عزیز کی خاطر تمام مصائب اور تکالیف خندہ پیشانی سے برداشت کر رہا تھا۔ اس کا بیشتر وقت ریل گاڑیوں کے سفر میں کٹتا، ان دنوں ریل کا سفر خطرے سے خالی نہ تھا۔ جرمن اچانک گاڑی روک کر سواریوں کے شناختی کارڈ اور کاغذات چیک کرنے لگتے تھے۔

جمی نے جرمنوں کے خوف سے پہلا دفتر بند کر کے پیرس کے مضافات میں ایک نئی فرم کھول لی تھی۔

شناختی کارڈ میں اسے فرم کا ایجنٹ اور سیلز مین ظاہر کیا گیا تھا۔

ریل گاڑی میں چیکنگ کے خطرے سے بچنے کے لئے وہ ہمیشہ دیجان کے ریلوے اسٹیشن پر اترتا اور وہاں سے سرحد تک کا فاصلہ سائیکل پر طے کرتا۔

کچھ عرصے بعد جرمنوں نے گاڑیوں کی چیکنگ میں کسی قدر نرمی برتنا شروع کر دی تو جمی سرحد کے آخری اسٹیشن تک ریل گاڑی میں سفر کرنے لگا۔

اب اچانک چھاپے مارنے کی بجائے ہر مہینے کے چند مخصوص دنوں میں مختلف گاڑیوں کے سامان اور کاغذات کی جانچ پڑتال کی جاتی۔ جمی کو اس کے دوست پہلے سے مطلع کر دیتے تھے کہ چھاپہ کس روز پڑ رہا ہے، وہ اس دن سفر نہیں کرتا۔

ایک مرتبہ دوست اطلاع نہ دے سکے۔ وہ سوئٹزر لینڈ سے واپس آ رہا تھا۔ اس کے پاس نہ صرف خفیہ دستاویز تھیں بلکہ جرمن ہائی کمان کے فوٹو بھی تھے۔ ٹھیک پانچ منٹ پہلے اچانک معلوم ہوا کہ اگلے اسٹیشن پر چھاپہ پڑنے والا ہے

فرار کی.... صرف ایک ہی صورت تھی، فوراً کہیں چھپ جائے۔ وہ اٹھا اور تیزی سے گاڑی کے پچھلے حصے کی طرف بھاگا، مگر چھپنے کی کوئی جگہ نہ ملی۔ آخر دروازے سے لٹک کر گارڈ کے ڈبے میں داخل ہوگیا۔ وہ ایک بوڑھا فرانسیسی تھا۔

جمی بولا۔ ”خدا کے لیے، مجھے کہیں چھپا دو، میں سخت مصیبت میں ہوں“۔ گارڈ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

جمی نے دوبارہ کہا۔ مجھے اگر جلد ہی چھپنے کی جگہ نہ ملی تو میں چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دوں گا۔“ یہ کہہ کر جمی دروازے کی طرف بڑھا۔ گارڈ نے لمحہ بھر سوچنے کے بعد سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”آؤ...... میرے ساتھ آؤ......“

گارڈ کے ڈبے میں ایک طرف کتوں کا چھوٹا سا پنجرہ بنا ہوا تھا۔ وہ اس وقت خالی تھا۔ گارڈ نے جمی کو اس میں بند کر کے تالا لگا دیا۔ پنجرے میں سخت ناگوار بو اور گھٹن تھی۔ لیکن جمی جان کے خوف سے سکڑ سمٹ کر خاموشی سے بیٹھا رہا۔ پندرہ، بیس منٹ بعد اسٹیشن آ گیا اور گاڑی رک گئی۔

پلیٹ فارم پر بھاری فوجی بوٹوں کی دھمک اور جرمن زبان میں اونچی اونچی آوازوں سے باتیں کرنے کا شور سنائی دیا۔ اس کے بعد فوجی تمام ڈبوں میں پھیل گئے۔ دو فوجی گارڈ کے ڈبے میں داخل ہوئے۔ جمی سانس روکے اکڑوں بیٹھا تھا۔ پنجرے کی جالی میں سے چمکتے ہوئے جرمنی فوجی بوٹ صاف نظر آ رہے تھے۔ ایک نے آگے بڑھ کر پنجرے کو ٹھوکر لگائی۔ گارڈ سے کچھ پوچھا۔ جمی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ تاہم قسمت ساتھ دے رہی تھی۔ اگلے ہی لمحے فوجی ڈبے سے اتر گئے اور گاڑی دوبارہ چل دی۔

گارڈ نے تالا کھول کر جمی کو باہر نکالا تو اس کا حلیہ دیکھ کر اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ مدت سے پنجرے کی صفائی نہیں ہوئی تھی۔ جمی کا منہ اور کپڑے سب اٹ گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، ابھی ابھی کوئلے کی کان سے برآمد ہوا ہے۔ گارڈ نے اسے بتایا...... اس قسم کے پنجرے اب گاڑیوں میں نہیں بنائے جاتے، یہ تو پہلی جنگ عظیم کا ایک پرانا پنجرہ ہے۔

☆☆☆

1943ء کے موسم گرما میں جمی سے ایک ہوائی کے بارے میں تفصیلات مہیا کرنے کے لیے کہا گیا۔ یہ اڈہ پیرس کے نواح میں تھا۔ اتحادیوں کو خبر ملی تھی کہ جرمن فضائیہ کے طیارے یہاں سے پرواز کر کے لندن پر بمباری کرتے ہیں۔

اس کا رن وے بیس میل لمبا اور تین حصوں میں منقسم تھا۔ ایک حصہ پروازوں کے لیے مخصوص تھا، اسے بڑی مہارت سے کیموفلاج کیا گیا تھا۔ دوسرے حصے میں سرچ لائٹس اور طیارہ شکن توپیں نصب تھیں۔ تیسرا حصہ ویران اور اجاڑ تھا۔

جمی کو ہر حصے کی الگ الگ نشان دہی کرنا تھی۔ اس نے سوچ بچار کے بعد یہ کام مارگٹ کے سپرد کیا جو آلیور کے بعد اس کا سب سے زیادہ قابل اعتماد اور ذہین ایجنٹ تھا۔

ہوائی اڈے پر اگرچہ پہرے کا نہایت کڑا انتظام تھا لیکن رقبے کی غیر معمولی وسعت کی وجہ سے زیادہ موثر نہ تھا۔ مارگٹ آسانی سے ممنوعہ علاقے میں داخل ہوگیا۔ اس کے پاس ایک بڑا نقشہ اور دوربین تھی اڈے کے ایک طرف گرجا اور چند گھرے نظر آرہے تھے۔ وہ چھپتا چھپاتا قریب پہنچا تو بڑا دلچسپ منظر تھا۔

دشمن طیاروں کو دھوکا دینے کے لیے مصنوعی عمارتیں کھڑی کی گئی تھیں۔ رہائشی کمرے نظر آنے والی عمارت ورکشاپ تھی۔ چند گز پرے ایک بھاری بھرکم ٹریکٹر کھڑا دکھائی دیا۔ مارگٹ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا، اچانک پیچھے سے ''ہینڈزاپ'' کی تیز اور غصیلی آواز سن کر چونک گیا۔ پلٹ کر دیکھا، چند قدم کے فاصلے پر ایک جرمن سپاہی بندوق تانے کھڑا تھا۔ راہ فرار اختیار کرنا ممکن نہ تھا۔ اس نے خاموشی سے ہاتھ اٹھا دیے۔ سپاہی اسے گارڈ روم میں لے آیا، جہاں فضائیہ کا ایک افسر بیٹھا تھا۔

مارگٹ نے اپنی کہانی پہلے ہی سوچ رکھی تھی۔ اس نے بتایا، ہوائی اڈے کے قریب گزرتے ہوئے گرجے اور دوسری عمارتوں پر نظر پڑی تو اسے بڑا تعجب ہوا۔ کچھ عرصے پہلے جب اس علاقے میں رہائش پذیر تھا، تو یہاں کوئی عمارت نہ تھی۔ بس، یہی تجسس ادھر لے آیا۔

دوربین اور نقشے کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا۔

''یہاں سے چند میل دور ایک قصبے میں میرا ایک دوست رہتا ہے۔ میں نے یہ دوربین اس سے لی تھی، اب واپس کرنے جارہا ہوں۔'' یہ بات کچھ غلط بھی نہ تھی۔ اس نے فی الحقیقت دوربین چند دن پہلے ایک دوست سے حاصل کرلی تھی۔ نقشے کے متعلق بتایا۔ ''یہ اسٹیشن کے ایک بینچ پر پڑا تھا اور اس پر جو نشان نظر آتے ہیں، وہ اس نے نہیں لگائے۔''

سپاہیوں نے گھنٹا بھر اس کی خوب مرمت کی، مگر وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ آخر اسے جرمن خفیہ پولیس ''گستاپو'' کے حوالے کردیا گیا۔

گستاپو نے اس پر تشدد کے مختلف طریقے آزمائے۔ پھر تحریر کا نمونہ لے کر ایک تحریر شناس کو بھجوایا، اور کہا۔

''اگر نقشے کے مندرجات سے اس تحریر کی مشابہت ثابت ہوگئی تو تمہیں جاسوس قرار دے کر فوراً گولی ماردی جائے گی''۔ مارگٹ خاموش رہا۔

اس کی کوٹھری تیسری منزل پر تھی۔ مار پیٹ سے اس کا انگ انگ دکھ رہا تھا۔ پھر بھی اس کی ہمت پست نہ ہوئی، وہ رہ رہ کر فرار ہونے کی سوچتا رہا۔ اس نے اگرچہ تحریر کا نمونہ دیتے وقت طرز تحریر بدلنے کی کوشش چاہی تھی مگر کامیاب نہ ہوسکا تھا۔ اسے سو فیصد یقین تھا کہ گستاپو کی تحریر شناس ونگ کے ماہرین کی رپورٹ اس کے لیے موت کا پیغام لے کر آئے گی۔

موت اور زندگی کے درمیان صرف ایک ہی رات تھی۔ اس نے روشندان کا تختہ اکھیڑنے اور جالی کاٹنے کی سرتوڑ کوشش شروع کردی۔ خالی ہاتھ یہ کام کرنا آسان نہ تھا۔ ہاتھوں کے ناخن اکھڑ گئے، اور انگلیاں لہولہان ہوگئیں مگر آدھی رات کے قریب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو ہی گیا۔ اب کھڑکی سے کودنے کا مسئلہ تھا۔ کھڑکی زمین سے کم از کم پچاس فٹ اونچی تھی۔ اتنی بلندی سے کودنا، ہڈی پسلی تڑانے کے ہی مترادف تھا۔ لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

''گولی کھا کے کتے کی موت مرنے سے بہتر ہے کہ کچھ نہ کچھ کرکے مرا جائے۔''

اس نے سوچا۔ پھر بستر کی چادریں اور کمبل، جسم پر خوب اچھی طرح لپیٹ لئے، تاکہ زمین پر گرتے وقت کم سے کم چوٹ آئے۔ اور پھر اس نے چھلانگ لگادی......

اتنی بلندی سے کود کر زندہ بچ جانا فی الواقع ایک معجزہ ہی تھا۔ وہ نہ تو بے ہوش ہوا نہ کسی قسم کی چوٹ لگی، لیکن جونہی اٹھ کر کھڑا ہوا، جسم میں شدید درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں، اور وہ چکرا کر گر پڑا۔ پھر کہنیوں اور ہاتھوں کے بل، رینگتا ہوا قید خانے کی عمارت سے دور نکل آیا۔

فرلانگ بھر کے فاصلے پر چند مکانوں کے دھندلے دھندلے نقوش نظر آرہے تھے۔ وہ چوپایوں کی طرح ہاتھ

پاؤں پر چلتے ہوئے ایک مکان کے دروازے پر پہنچا۔ دستک دینے کی کوشش کرنا چاہی، مگر طاقت جواب دے گئی اور بے ہوش ہو کر وہیں دہلیز پر اوندھے منہ گر پڑا۔

ہوش آیا تو ایک آرام دہ بستر پر خود کو پڑے پایا۔ سرہانے ایک بوڑھی عورت شفقت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ مارگت نے اپنی داستان، اس کو سنائی اور درخواست کی کہ اسے شہر پہنچا دیا جائے۔ بڑھیا نے بڑی مشکل سے اس کو شہر کے ایک ہوٹل تک پہنچایا۔ جمی نے یہاں ایک کمرا مستقل طور پر کرائے پر لے رکھا تھا۔ مارگت اسی کمرے میں آکر لیٹ گیا۔

تیسرے دن جمی آیا تو وہ بے ہوش تھا۔ جمی نے بھاگ دوڑ کر کے اسے ایک پرائیوٹ نرسنگ ہوم میں داخل کرایا ایکسرے رپورٹ سے پتا چلا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی تین جگہ سے ٹوٹ چکی تھی۔ اس کی جلد ٹھیک ہونے کی توقع نہ تھی پھر جرمنوں کے خوف سے پیرس میں اس کا علاج بھی نہیں کرایا جا سکتا تھا۔ چنانچہ جمی ایک ہفتے بعد اسے کسی نہ کسی طرح سوئٹزرلینڈ چھوڑ آیا۔

سرحد پار سے واپسی پر پولیٹی نے خبر دی کہ جرمن مختلف مقامات پر کچھ نئی اور عجیب عجیب عمارتیں بنوا رہے ہیں۔ ان میں استعمال ہونے والا میٹریل بہت قیمتی اور عمدہ قسم کا ہے۔ جرمن اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ان عمارتوں کا محل وقوع بالکل درست ہونا چاہیے۔

جمی نے ایک پادری کا بھیس بدل کر حقیقت معلوم کرنے کی کوشش چاہی تھی، مگر ناکام رہا۔ جرمن واقعتاً عجیب اور پُراسرار عمارتیں بنوا رہے تھے۔ لیکن وہ ان کا مصرف معلوم نہ کر سکا۔ ایک جگہ مشہور تھا کہ یہ گیراج تعمیر کیے جا رہے ہیں۔ لیکن آبادی سے باہر گیراج تعمیر کرنے کی وجہ جمی کی سمجھ میں نہیں آسکی۔ پھر یہ عمارتیں نہ تو زیادہ اونچی تھیں اور نہ طویل۔ ان میں آخر کس قسم کی گاڑیاں رکھی جاتیں؟ ایک عجیب چیز جو ہر جگہ مشترک نظر آئی، وہ کنکریٹ کے چبوترے تھے۔ ان سب کا ڈیزائن ایک تھا۔ جمی نے قطب نما کی مدد سے ان کا رخ معلوم کیا تو یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ سب کا رخ ایک ہی سمت یعنی شمال مغرب کی طرف تھا۔ اسے کچھ شک سا ہوا اور خیال کا کوندا برق کی طرح لپکا۔ جرمن ضرور کسی نئے ہتھیار کی تیاریوں میں مصروف ہیں جس کا سب سے بڑا نشانہ برطانوی دارالحکومت لندن ہوگا۔ اس نے اپنی رپورٹ مرتب کر کے میجر بی کو پہنچا دی۔

برطانوی حکومت کو خبر تھی کہ جرمنی ایک نیا اور خفیہ ہتھیار تیار کر رہا ہے، لیکن یہ علم نہ تھا کہ یہ ہتھیار خود برطانیہ کے خلاف استعمال ہوگا۔ اس ہتھیار کی ہلاکت خیزی کا بھی کوئی اندازہ نہیں تھا۔

جمی کے پیغام سے وزارت دفاع کے اعلیٰ حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ فوراً جوابی پیغام بھیجا گیا۔ تمام معلومات اکٹھی کی جائیں، اور عمارتوں کا ماسٹر پلان حاصل کیا جائے۔

جمی اور اس کے ساتھیوں نے دن رات ایک کر کے ضروری معلومات حاصل کیں۔ تین ہفتوں کے اندر اندر ساٹھ سے زیادہ نئی بننے والی عمارتوں کا سراغ لگایا گیا ہتھیار کے بارے میں وقتی طور پر کچھ پتا نہ چل سکا۔ ابھی تک کوئی ہتھیار فرانس نہیں لایا گیا تھا۔ جمی نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔

جلد ہی ایک دوست کی وساطت سے اینڈرے نامی ایک شخص سے ملاقات ہوئی۔ اینڈرے انجینئر تھا اور ایک جرمن انجینئر کی نگرانی میں چبوترے تعمیر کرنے میں مامور تھا۔ جمی نے اسے وطن کی آزادی کا واسطہ دے کر ماسٹر پلان کا بلیو پرنٹ اڑانے کی ترغیب دی۔ اینڈرے پس و پیش کرنے لگا۔ یہ کام خطرے سے خالی نہ تھا۔ بلیو پرنٹ، جرمن انجینئر ہر وقت اپنے اوورکوٹ کی جیب میں رکھتا تھا، جسے وہ صرف صبح کے وقت ٹائلٹ جاتے وقت اتارتا تھا۔

اتحادیوں کی طرف سے ماسٹر پلان حاصل کرنے کا اصرار برابر جاری تھا۔

جمی نے بھی اینڈرے کا پیچھا نہ چھوڑا اور آخر کار اسے منانے میں کامیاب ہو گیا۔

ایک صبح جرمن انجینئر حسب معمول اوورکوٹ اتار کر واش روم گیا تو اینڈرے نے موقع غنیمت جان کر اس کی جیب سے بلیو پرنٹ نکالا اور جلدی جلدی ٹریس کر کے واپس رکھ دیا۔ تین منٹ بعد جرمن انجینئر باہر نکلا تو اینڈرے پورے انہماک سے اپنی میز پر بیٹھا کام کر رہا تھا۔

اگلے دن اس نے طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کر کے رخصت لے لی اور سیدھا جمی ہوشے کے پاس پہنچا۔ وہاں ان دونوں نے رات بھر بیٹھ کر ٹریس شدہ خاکے کی مدد سے ٹھیک اور صاف نقشہ تیار کیا۔ صبح ہوئی تو جمی نقشہ لے کر سوئٹزرلینڈ روانہ ہو گیا اور اینڈرے نے اپنے کیمپ کی راہ لی۔

کچھ عرصے بعد اینڈرے نے جمی کو نیا ہتھیار پہنچ

جانے کی اطلاع دی۔ یہ وی-ون (v-1) تھا، ہواباز کے بغیر چلنے والا طیارہ نما بم۔

میجر بی کی وساطت سے یہ خبر لندن پہنچی تو فضائیہ فوراً حرکت میں آگئی۔ اور چند دن بعد بمباری کر کے اینٹ سے اینٹ بجادی۔

وی ون کے دوسرے مستقروں پر بھی فضائی حملوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کئی مستقر بالکل تباہ و برباد ہوگئے اور باقی ماندہ کو شدید نقصان پہنچا۔ ہٹلر، ان مرکزوں سے لندن پر وی ون کی بارش کر کے اسے صفحہ ہستی سے مٹا دینے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ لیکن جمی اور اس کے ساتھیوں نے اسے پورا نہ ہونے دیا۔ یہ بلاشبہ ان کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ جمی کو اس کی خدمت کے صلے میں برطانیہ کا سب سے بڑا اعزاز (D.S.O) دینے کی سفارش کی گئی۔

یہ برطانیہ کا سب سے بڑا اعزاز تھا، جو کسی غیر ملکی کو دیا جا سکتا تھا۔

☆☆☆

جمی کی زندگی خطرات سے عبارت تھی۔ وہ کسی وقت بھی گستاپو کے ہتھے چڑھ سکتا تھا۔ خود اسے کوئی خوش فہمی نہ تھی۔ وی ون کے مراکز کی تباہی سے جرمن ہکا بکا رہ گئے تھے۔ گستاپو ''تخریب کاروں'' کا سراغ لگانے کے لیے پوری تندہی سے سرگرم ہوگئی۔ جمی نے اس کے چنگل سے نکلنے کے لیے ہر ممکن احتیاطی تدابیر اختیار کرلیں۔ وہ کسی جگہ ایک رات سے زیادہ نہیں ٹھہرتا تھا۔ جیب میں ہر وقت شناخت کے کاغذات ہوتے۔ اگرچہ ان میں سے اس کا نام اور پتا سب جعلی ہوتا تھا۔ حتی الامکان اجنبیوں سے اغراض برتنے کی کوشش کرتا، مبادا ان میں کوئی گستاپو کا ایجنٹ نہ ہو۔

انسان خطا کا پتلا ہے۔ جمی سے بھی آخر ایک روز فاش غلطی ہوگئی۔ ایک ایجنٹ نے کسی خاتون سے تعارف کرایا۔ اس کے شوہر نے طیاروں کی رفتار کنٹرول کرنے والا آلہ ایجاد کیا تھا اور وہ اسے اتحادیوں کے ہاتھ فروخت کرنے کا خواہش مند تھا۔ جمی نے اسے اپنے دفتر کا پتا دیا اور دوبارہ ملنے کا وعدہ کیا۔ دفتر میں وہ بہت کم بیٹھتا تھا۔ خاتون روزانہ چکر لگاتی مگر ملاقات نہ ہوتی۔ جمی کو شک تھا کہ خاتون گستاپو کی آلہ کار ہے۔ وہ اسی لئے ملاقات سے گریزاں رہا، اور اپنی سیکریٹری کو بھی سختی سے منع کر دیا کہ وہ اسے کوئی اتہ پتا نہ دے۔ چنانچہ جب وہ آتی تو، سیکریٹری، یہ کہہ کر اسے ٹال دیتی کہ جمی فرانس سے باہر گیا ہوا ہے۔

ایک دن خاتون آئی تو بڑی اداس اور غمگین تھی۔ اس نے نہایت افسردہ لہجے میں سیکریٹری کو بتایا کہ، ''میرے ایک عزیز کی جان خطرے میں ہے، اسے فرانس سے نکالنا ہے اور یہ کام جمی ہی کرسکتا ہے۔'' سیکریٹری کا دل پسیج گیا۔ اس نے اسے ہوٹل پیلس کا پتا دے دیا۔ جہاں اگلے دن صبح نو بجے جمی کو اپنے چند ایجنٹ ساتھیوں سے ملاقات کرنا تھی۔

جمی وقت مقررہ سے چند منٹ پہلے ہوٹل پیلس پہنچا۔ یہاں وہ پہلے بھی کئی مرتبہ آچکا تھا، اور کوئی بھی خطرہ محسوس نہ کیا تھا۔ لیکن آج خلاف معمول کچھ عجیب سی وحشت اور بے چینی کا احساس ہوا۔ کوئی غیبی آواز اندر جانے سے بار بار منع کر رہی تھی۔ وہ توہمات کا قائل نہ تھا۔ چنانچہ اس قدرتی وارننگ کو نظر انداز کر کے ہوٹل میں داخل ہوا۔

ویلٹی اور رابرٹ اس کے منتظر تھے۔ جمی کے بیٹھتے ہی باتیں چھڑ گئیں۔ معاً پیچھے سے کسی کی تیز اور کرخت آواز سنائی دی۔

''خبردار! کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے، ہاتھ اوپر اٹھالو، جرمن پولیس......''

جمی نے مڑ کر دیکھا۔ وہ چاروں طرف سے سفید کپڑوں میں ملبوس جرمن سپاہیوں کے نرغے میں گھرے ہوئے تھے۔ انہیں فوراً ہتھکڑیاں پہنادی گئیں۔

تحقیقاتی کمیشن کے سامنے پیشی ہوئی تو کمیشن کے صدر گڈی نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ ''تم برطانیہ کے جاسوس ہو؟''

جواب ملا۔ ''نہیں، میں ایک محب وطن فرانسیسی ہوں۔ وطن کی آزادی کے لیے جدوجہد کرتا ہوں۔''

تنظیم کے ارکان کا نام معلوم کرنے کے لیے انہوں نے بڑے سبز باغ دکھائے۔ پھر مایوس ہو کر تشدد پر اتر آئے لیکن جمی نے کچھ مان کر نہیں دیا۔ اس کا ایک ہی جواب تھا۔

''میرے ساتھ کوئی نہیں، میں تنہا ہوں۔''

ایک دن چار پانچ لحیم شحیم سپاہی اسے برفیلے پانی میں غوطے دے رہے تھے کہ گڈی آگیا۔

ہاتھ میں جمی کی ڈائری تھی جو جامہ تلاشی کے وقت برآمد ہوئی تھی۔ اس میں ایک دن بعد کی تاریخ میں جمی نے سی جی نامی کسی شخص سے اسٹیشن پر ملاقات کا وقت مقرر کر رکھا تھا۔

گڈی نے سی جی کے بارے میں پوچھا۔ یہ جمی کے ایک نئے ایجنٹ چارلس جیلارڈ کا مخفف تھا۔ جمی کو اس سے اسٹیشن کے قریب ایک ہوٹل میں ملاقات کرنا تھی۔ وہ خاموش رہا۔

گھونسوں سے اس کی خوب تواضع کی گئی۔

صبح دو سپاہیوں نے اسے ساتھ لیا اور اسٹیشن پہنچ گئے۔ گاڑی آنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ صدر دروازے پر انہوں نے موٹر کھڑی کی اور انتظار کرنے لگے۔ جمی سے کہا گیا کہ اگر تم نے سی جی کی نشاندہی نہ کی تو فوراً گولی ماردی جائے گی۔ جمی چپ رہا، لیکن دل میں پختہ ارادہ کرلیا تھا کہ خواہ کچھ ہوجائے وہ چارلس جیلارڈ کو دشمنوں کے ہاتھوں میں جانے نہیں دے گا۔ گاڑی آگئی تو پولیس کے سپاہی چوکس ہوگئے۔

تھوڑی دیر بعد مسافر اسٹیشن سے باہر نکلنا شروع ہوئے۔ جمی نے دیکھا کہ باہر آنے والا پہلا شخص چارلس جیلارڈ تھا۔ جمی بے اختیار پریشان ہوگیا۔ یہ پریشانی اس قدر واضح اور نمایاں تھی کہ سپاہیوں کی اگر نظر اس پر پڑجاتی تو فوراً بھانپ لیتے اور چارلس جیلارڈ کو دھر لیتے۔ لیکن خوش قسمتی سے وہ دوسرے مسافروں کی طرف متوجہ تھے۔

چارلس جیلارڈ بریف کیس ہاتھ میں لیے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا، فوراً نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ ایک ایک کرکے سب مسافر چلے گئے۔ اب وہاں ریلوے کے عملے کے سوا کوئی آدمی نہ تھا۔ گاڑی بھی جا چکی تھی۔ سپاہیوں نے جمی کو برا بھلا کہا اور پھر دونوں اس پر پل پڑے۔ پستول کے دستے مار مار کر اس کا سر اور چہرہ لہولہان کردیا۔

ہفتے بھر کی مسلسل پوچھ گچھ اور مار پیٹ کے بعد اسے سینٹرل جیل منتقل کردیا گیا۔ دس دن بعد تحقیقاتی کمیشن نے جمی کو سزائے موت سنادی۔

ویلٹی اور رابرٹ کو عدم ثبوت کی بناء پر رہا کردیا گیا۔

جمی موت کا منتظر تھا کہ ایک دن اسے اطلاع ملی کہ اس کی سزائے موت، عمر قید میں بدل گئی ہے۔ جیلر نے بتایا۔ ”اب تم بیگار کیمپوں میں مشقت کروگے۔“

بیگار کے لیے منتخب کیے جانے والے لوگ الگ کیمپوں میں رکھے جاتے تھے۔ اسے بھی ایک ایسے ہی کیمپ میں پہنچا دیا گیا۔ پھر اسے جرمنی جانے کا حکم ملا۔ جمی دوسرے قیدیوں کے ساتھ اسٹیشن پر پہنچا تو سیکیورٹی پولیس نے انہیں اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔

قیدی مال گاڑی کے ایک ڈبے میں سوار ہونے لگے۔ جگہ کم تھی اور آدمی بہت زیادہ۔ ڈبے میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی اور ابھی آدھے سے زیادہ قیدی پلیٹ فارم پر کھڑے تھے۔ وہ قطار باندھے منتظر تھے کہ جگہ ملے تو اندر جائیں۔ اچانک سیکیورٹی پولیس ان پر اندھا دھند کوڑے برسانے لگی۔ پلیٹ فارم پر بھگدڑ مچ گئی۔ قیدی کوڑے کی مار سے بچنے کی خاطر دھکم پیل کرکے ڈبے میں سوار ہوگئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے پلیٹ فارم خالی ہوگیا۔

تین دن اور دو راتوں کے مسلسل اور پرتکان سفر کے بعد گاڑی منزل مقصود پر پہنچی۔ ڈبہ ٹھسا ٹھس بھرا ہوا تھا۔ بھوک پیاس اور نقاہت کے مارے کئی قیدی راستے میں ہی چل بسے تھے۔ زندوں کی حالت مردوں سے بدتر تھی بصد مشکل گرتے پڑتے گاڑی سے اترے اور تقریباً گھسٹتے ہوئے کیمپ تک پہنچے۔ جہاں انہیں مختلف بیرکوں میں بند کردیا گیا۔

صبح کیمپ کمانڈر نے معائنہ کیا۔ اور ہر شخص کو اس کے پیشے اور استعداد کے مطابق کام سونپ دیا گیا۔ جمی کے حصے میں اسلحے کا شعبہ آیا جہاں بندوق کے چھوٹے چھوٹے پرزے تیار ہوتے تھے۔

کیمپ کی زندگی عذاب سے کم نہ تھی۔ قیدیوں سے لگاتار بارہ گھنٹے سخت مشقت لی جاتی تھی۔ خوراک بے حد ناقص اور برائے نام دی جاتی تھی۔ پہرے دار معمولی قصور پر ٹھوکریں مار مار کر ہڈی پسلی ایک کردیتے۔ لوگوں کی صحت تیزی سے گرنے لگی اور چند ماہ کے اندر اندر وہ ہڈیوں کے ڈھانچے بن کر رہ گئے۔ جمی کی حالت بھی دوسروں سے مختلف نہ تھی۔ البتہ اس نے حوصلہ نہ ہارا۔ جرمنوں سے نفرت کا جذبہ اور شدید تر ہونے لگا اور اس نے اس کی تسکین کا راستہ بھی ڈھونڈ لیا۔

اسے روز شام تک دو سو پرزے پالش کرنے ہوتے تھے۔ مگر وہ کبھی ایک سو سے زیادہ پالش نہ کرتا۔ کچھ عرصے بعد اس نے پرزے چرانا شروع کردیے۔ ہر روز تین چار اچھے خاصے پرزے اڑاتا اور کیمپ کے ٹوائلٹ میں پھینک دیتا۔ یہ حرکت صریحاً سبوتاژ تھی۔ پکڑے جانے کی صورت میں سزائے موت یقینی تھی لیکن قسمت اس کا ساتھ دے رہی تھی۔

ورکشاپ سے واپسی پر ہمیشہ ہر ایک کی تلاشی لی جاتی تھی۔ طریقہ یہ تھا کہ سپاہی اپنی مرضی سے جن قیدیوں کو چاہتے، روک لیتے تھے۔ کیمپ میں ملنے والی چیزوں کے علاوہ جو شے بھی برآمد ہوتی، چاہے وہ سگریٹ ہوتا یا معمولی ٹوتھ برش، قیدی کو چوری کا ملزم قرار دے کر اس کی خوب پٹائی کرتے۔

اکثر جمی کے ساتھ قطار میں آگے پیچھے کھڑے ہوئے قیدیوں کی تلاشی لی گئی، لیکن وہ ہر بار صاف بچ گیا۔ البتہ وہ ایک بار کیمپ سے چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ دراصل ایک ساتھی بیمار تھا۔ جمی اس کے لیے لنگر سے بچا کھچا کھانا لا رہا تھا کہ سپاہی نے دیکھ لیا۔

فوراً پچیس کوڑوں کی اسے سزا ملی۔ بیس کوڑے تو اس نے صبر اور استقلال سے کھائے، پھر قوت برداشت جواب دے گئی، اور وہ نڈھال ہو کر اوندھے منہ گر پڑا۔ کوڑے مارنے والا سپاہی غصے سے آگ بگولا ہو گیا۔ اسے ٹھوکریں مارنا شروع کر دیں جمی جانتا تھا، جب تک وہ کھڑا نہیں ہوگا...... جرمن سپاہی برابر اسی طرح اسے ٹھوکریں مارتا رہے گا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس طرح کئی قیدی مر چکے تھے۔

اٹھنے کی اس نے کوشش کی، مگر جسم میں طاقت ہوتی تو وہ اٹھتا، آخر منڈیر کے سہارے آہستہ آہستہ اٹھا اور باقی کے پانچ کوڑے کھائے۔

☆☆☆

جون کے وسط میں خبر پھیلی کہ اتحادی نارمنڈی پہنچ گئے ہیں لیکن یہ پتا نہ چل سکا کہ جرمن ابھی تک فرانس میں برسرپیکار ہیں یا لڑائی بند ہو گئی ہے۔ فتح کی خبر سننے کی آس میں کئی مہینے بیت گئے۔

1944ء کا موسم خزاں شروع ہوا تو سیکڑوں قیدی مایوسی اور نقاہت کا شکار ہو کر دم توڑ گئے۔

جمی اور اس کے ساتھی تازہ جنگی صورت حال سے بے خبر تھے کہ اپریل 1945ء میں کیمپ کے گرد و نواح سے توپوں کی گھن گرج سنائی دینے لگی جنگ کا دائرہ پھیل کر جرمنی تک آ پہنچا تھا۔ انہوں نے دھیان نہ دیا۔ کیمپ سے زندہ بچ نکلنے کی کسی کو امید نہ تھی۔

ایک دن صبح سویرے کیمپ کے بیس ہزار قیدیوں کو صحن میں جمع ہونے کا حکم ملا۔ اعلان کیا گیا کہ انہیں دوسرے بیگار کیمپ میں بھیجا جا رہا ہے۔ چند منٹ بعد انہیں ٹرکوں میں ٹھونس کر لیوبک کی بندرگاہ پر پہنچا دیا گیا۔ وہاں کئی بحری جہاز لنگر انداز تھے۔ قیدیوں کو ان کے تہ خانوں میں بھر کر کھڑکیاں اور دروازے بند کر دیے گئے۔

جمی نے اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے کونے میں بہ مشکل جگہ بنائی۔ قیدی یہاں کئی دن تک بند رہے۔ گاہے گاہے غذا اور پانی دینے کے لیے کھڑکی کھولی جاتی تو وہ باہر کی جھلک دیکھ لیتے، ورنہ تاریکی میں پڑے اونگھتے رہتے۔ کچھ اندازہ نہ ہوتا تھا کہ رات کب شروع ہوئی اور دن کب نکلا؟

جمی کے ذہن میں طرح طرح کے اندیشے کلبلاتے اور وہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگتا، کئی قیدیوں نے تو یہاں تک مشہور کر دیا کہ اب بس ان کا آخری وقت آن پہنچا ہے، جرمن انہیں سمندر میں غرق کرنے جا رہے ہیں۔

ایک دن جہاز چلتے چلتے رک گیا۔ بھاری بھرکم بوٹوں سے عرشہ لرزنے لگا۔ اونچی اونچی آوازوں کا شور صاف سنائی دینے لگا۔ قیدی دم سادھے، چپ چاپ بیٹھے تھے۔ پھر فائروں کی آواز گونجی اور خاموشی چھا گئی۔

تھوڑی دیر بعد جہاز دوبارہ چل پڑا۔ ساتھ ہی تہ خانے کے دروازے اور کھڑکیاں کھل گئیں۔ چند سپاہی اندر داخل ہوئے۔ جمی کی نظر ان کی وردی پر پڑی تو فرط حیرت سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ برطانوی بحریہ کے سپاہی تھے۔ اسے اپنی آنکھوں پہ یقین نہ آیا۔ سمجھا کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ لیکن یہ حقیقت تھی۔

ایک برطانوی جہاز نے ان کا جہاز نرغے میں لے کر جرمنوں سے ہتھیار رکھوا لیے تھے۔ جنگ کا پانسہ پلٹ چکا تھا اور جرمنی کو شکست ہو گئی تھی۔

آخر ان کا جہاز سویڈن کی ایک چھوٹی سی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ ساحل پر ریڈ کراس کے نمائندے ان کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ جمی چند ہفتے تک اسپتال میں زیر علاج رہا۔ تب کہیں جا کر کھوئی ہوئی صحت کسی قدر بحال ہوئی۔

18 جون 1945ء کو شہنشاہ کے حکم سے برطانوی فضائیہ کا ایک طیارہ اسے لینے کے لیے سویڈن پہنچا۔

اس عظیم الشان خدمت کے صلے میں اسے ''ڈی۔ ایس۔ او'' کا اعلیٰ جنگی اعزاز دینے کے لیے لندن میں خصوصی تقریب منعقد کی جا رہی تھی، لیکن ہوا باز کو خالی ہاتھ واپس لوٹنا پڑا۔ کیونکہ جمی صرف چند گھنٹے پہلے قیدیوں کے ایک گروپ کے ساتھ ریڈ کراس کے طیارے میں فرانس روانہ ہو چکا تھا۔ فرانس، جس کی خاطر اس نے اپنی جان جوکھوں میں ڈالی اور بے پناہ مصائب برداشت کیے۔ اب وہ آزاد فرانس کا آزاد شہری تھا۔

زندگی کا مقصد حصول مسرت نہیں، بلکہ تکمیل انسانیت ہے۔

سفرنامہ پڑھنے کے شوقینوں کی مدارات

برما کے دارالحکومت رنگون جہاں کبھی برصغیر کے لوگ قسمت آزمائی کے لیے جاتے تھے اور تھیلیاں بھر بھر کر رقم لاتے تھے۔ اسی رنگون کا ذکر، جہاں آخری تاجدار سلطنتِ مغلیہ بہادر شاہ ظفر کو قید کیا گیا اور وہ ایام اسیری میں ہی وہاں کی خاک اوڑھ کر سوگئے۔

رنگون کی سیر

ابن عنقا

ترکمانستان سے واپس آنے کے بعد ہمارے کئی چکر ملائشیا کے اور ایک چکر سوڈان کا لگا لیکن طبیعت لکھنے پر مائل نہیں ہوئی کیونکہ ان ملکوں کے سفرنامے پہلے ہی لکھے جا چکے تھے لیکن اس بار برما، جسے اب میانمار کہا جاتا ہے، جانے کا اتفاق ہوا تو ہم نے سوچا کہ اس نئے ملک کے بارے میں کچھ لکھا جائے تاکہ ہمارے قارئین کے علم میں اس ملک کے حوالے سے کچھ اضافہ ہو۔ میانمار جانے کا ایک دفعہ پہلے بھی امکان بنا تھا اور اس سلسلے میں ہم نے ویزا

بھی حاصل کرلیا تھا لیکن بعد میں ایک اور کام میں الجھنے کی وجہ سے ہمارا وہاں جانا ملتوی ہوگیا جس کا ہمیں بڑا افسوس تھا۔ افسوس تو ہمیں اس بات کا بھی بہت ہوا کہ برما کے مقام پر جانے سے پہلے ہمیں ایک اجلاس میں شرکت کے لیے سنگاپور مدعو کیا گیا لیکن ہم سوڈان میں اپنی مصروفیت کی وجہ سے وقت نہیں نکال سکے اور اس طرح ہم سنگاپور کی سیر کرنے اور سفرنامہ لکھنے سے محروم رہ گئے۔

میانمار، جسے انگریزوں کے دور میں برما کہا جاتا تھا، کا دارالحکومت رنگون ہے جسے اب ینگون کہا جاتا ہے۔ وہاں کی حکومت مغربی استعمار سے سخت متنفر ہے اس لیے تمام نقوشِ کہن مٹانے کے درپے ہے۔ جب ہم میانمار کے لیے عازمِ سفر ہوئے تو ہمارے نہایت عزیز دوست چودھری الیاس صاحب نے ہمیں خاص تاکید کی کہ ہم آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے مزار پر ضرور جائیں جو ینگون میں مدفون ہیں۔

میانمار بنگلہ دیش کے اس پار واقع ہے اور ہمارا خیال تھا کہ کسی دن جہاز میں بیٹھیں گے اور چند گھنٹوں میں وہاں پہنچ جائیں گے لیکن جب جہازوں کے نظام الاوقات دیکھے تو پتا چلا کہ وہاں کوئی جہاز سیدھا نہیں جاتا۔ ہمیں بنکاک یا کوالالمپور کے راستے جانا تھا اور ان جگہوں پر قیام بھی کرنا تھا۔ ہمارے پاس ملائشیا کا ویزا موجود تھا اس لیے ہم نے کوالالمپور کے راستے جانا پسند کیا لیکن واپسی پر اتنی دقت ہوئی کہ ہم نے توبہ کی اور آئندہ بنکاک کے راستے آنے جانے پر تیار ہو گئے۔ بنکاک سے جہاز کوالالمپور کی نسبت زیادہ تعداد میں اڑتے ہیں اس لیے وطن واپس آنے کے لیے کئی کئی دن انتظار نہیں کرنا پڑتا۔

میانمار اور تھائی لینڈ پڑوسی ملک ہیں۔ میانمار کی ایک طرف بنگلہ دیش اور ہندوستان جبکہ دوسری طرف تھائی لینڈ اور لاؤس واقع ہیں۔ میانمار اور ملکِ سیام میں کچھ اقدار مشترک ہیں جن میں سے ایک پرانی دشمنی بھی ہے۔ اس دشمنی کا احوال آپ لوگوں نے ہمارے تھائی لینڈ کے دوسرے سفرنامے میں، جو ایودھیا کی سیر کے باب میں تھا، پڑھا ہوگا۔ ایک قدر مشترک بدھ مذہب ہے۔ یہاں کے پگوڈا تھائی لینڈ کے مندروں سے بہت ملتے جلتے ہیں لیکن زبان بالکل مختلف ہے۔ یہاں ایک چیز نے ہمیں بہت حیران کیا اور وہ یہ کہ یہاں کے اکثر مرد سیاہ رنگ کے ہیں جبکہ اکثر عورتیں سفید ہیں۔ یہ فرق انہوں نے کیونکر رکھا ہوا ہے یہ چیز ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اس الجھن کو رفع کرنے کے لیے ہم نے اپنے دفتر کی سیکریٹری سے بھی پوچھا لیکن وہ اس سوال کا جواب نہ دے سکیں۔

ینگون پہنچنے کے بعد ہمیں دو دن وہاں رک کر آگے جانے کا انتظار کرنا تھا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارے میانمار جانے کی غرض و غایت سیر و تفریح نہیں بلکہ وہاں کے سمندر میں نصب ایک کھدائی کے جہاز پر جا کر خدمات ادا کرنا تھیں۔ جہاز جاپان والوں کا تھا اور کام کوریا والوں کے لیے کرنا تھا۔ ان جہاز والوں نے ایک نظام الاوقات بنایا ہوا تھا کہ فلاں دن فلاں ادارے کے لوگ ہیلی کوپٹر کے ذریعے ایک ساحلی شہر سے جہاز پر جائیں گے۔ پہلے ینگون سے اس ساحلی شہر ستوا جانا پڑتا تھا۔ اس نظام الاوقات کے مطابق ہمیں دو دن کے بعد جانا تھا۔ یعنی گھر سے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے ہمیں چار مختلف جہاز... بدل کر پہنچنا تھا اور اس سارے سفر میں بعض اوقات تین سے چار دن لگ جاتے ہیں اور یہی تین یا چار دن ہماری سیاحت کے ہوتے ہیں۔

ینگون میں ہمیں ہمارے ادارے نے پارک رائل ہوٹل میں ٹھہرایا۔ اسی ہوٹل میں ہمارے ادارے کا دفتر بھی تھا۔ تیسری منزل پر دفتر تھا اور ساتویں منزل پر ہمیں کمرا دیا گیا۔ ہوائی اڈے پر ادارے کی گاڑی ہمیں لینے پہنچی ہوئی تھی۔ ہوائی اڈے سے ہوٹل کا فاصلہ کافی تھا۔ ہوٹل اندرونِ شہر کے قریب ہی تھا۔ جب ہم پہنچے تو بارش ہو رہی تھی۔

جب تک ہم وہاں رہے، بارش مسلسل ہوتی رہی۔ موسم خاصا خوشگوار تھا۔ یہ مارچ کا مہینا تھا۔ مقامی لوگوں نے بتایا کہ یہ گرمی کا موسم ہے بارشوں کا نہیں لیکن موسم چونکہ بین الاقوامی طور پر تبدیل ہو رہا ہے اس لیے بے موسم برسات ہو رہی ہے۔ البتہ مون سون میں بہت بارشیں ہوتی ہیں اور موسم اتنا خراب ہو جاتا ہے کہ سمندروں میں کھدائی کا کام بند کرنا پڑتا ہے۔

کمرے میں سامان رکھنے کے بعد ہم تیسری منزل پر واقع اپنے ادارے کے دفتر میں گئے۔ دفتر ایک کمرے پر مشتمل تھا جس میں اس وقت ادارے کی واحد سیکریٹری 'تھنڈر بو' براجمان تھیں۔ ان کا نام جتنا خطرناک ہے اس کے برعکس وہ اتنی ہی دھان پان اور نرم و نازک تھیں۔ تمام دوسری برمی عورتوں کی طرح تھنڈر بو بھی سفید رنگت رکھتی تھیں۔ چہرہ ان کا چینیوں کی طرح

چوڑا، لیکن چھپا نہیں تھا، اور نقش و نگار دل کش تھے۔ انگریزی بھی وہ اپنے لہجے میں بولتی تھیں اس لیے ہمیں سمجھنے میں دقت ہوتی تھی لہٰذا ہمیں اپنا کان ان کے ہونٹوں کے بہت قریب لے جانا پڑتا تھا۔ تھنڈر بو نے علیک سلیک کے بعد دس ہزار روپے سکہ رائج الوقت ہمارے حوالے کیا۔ بعد میں ہمیں پتا چلا کہ اس میں صرف ایک وقت کا کھانا کھایا جاسکتا ہے۔ یہ ساری رقم دس امریکی روپوں کے برابر تھی۔ ہم نے فوراً سو ڈالر کا ایک نوٹ نکالا اور ان کے حوالے کرتے ہوئے کہا ”اسے مقامی کرنسی میں تبدیل کرا کے رکھ لیجیے، ہم تھوڑی دیر میں آکر لے لیں گے۔“ تھنڈر بو سے پوچھا ”یہ اس قدر مختصر سا دفتر اور اوپر سے تم۔ یہ سارا کام کیسے چلتا ہے؟“

اس نے جواب دیا ”یہ میرے داہنے طرف جو میز ہے اس پر اس دفتر کے منتظم بیٹھتے ہیں۔ یہ دفتر ایک ڈاک خانے کی طرح ہے اور تھائی لینڈ کے دفتر کے زیرِ نگیں ہے۔ سارا کام وہیں ہوتا ہے۔ ہم سارے کاغذات وہاں بھیج دیتے ہیں۔ کوئی خاص منصوبہ ہو جیسا کہ آپ والا ہے تو اس کے لیے کمک تھائی لینڈ یا ملائشیا سے آجاتی ہے۔ ایک صاحب ملائشیا سے اس منصوبے کے لیے خاص طور پر آج کل آئے ہوئے ہیں لیکن اس وقت چھٹی پر ہیں۔ بعض اوقات وہ اپنے کمرے ہی میں بیٹھ کر کام کرتے ہیں، یہاں آنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔“

اس گفتگو کے بعد ہم اپنے کمرے میں واپس آگئے اور ینگون کی سیر کے منصوبے بنانے لگے۔ کل کا دن ہمیں مفت میں مل گیا تھا کیونکہ ہمیں اس کے اگلے دن جانا تھا۔ اس دن ہم ینگون کی سیر خوب تفصیل سے کرسکتے تھے۔ سب سے پہلے تو ہم نے پگوڈا جانے کی ٹھانی جس کا نظارہ ہم ہوائی اڈے سے آتے ہوئے کرتے آئے تھے۔ ایک بہت بڑی رنگین عمارت ہمارے ذہن میں سمائی ہوئی تھی جس کے سامنے دو بہت بڑے شیر بنے ہوئے تھے۔ یہ پگوڈا کا صدر دروازہ تھا۔ اس کے پیچھے پگوڈا کا سنہرا مینار تھا جو دور.... سے نظر آتا تھا۔ اس کے علاوہ الیاس چودھری صاحب کی بتائی ہوئی جگہ یعنی بہادر شاہ ظفر کے مزار کی زیارت۔ یہ دو مقامات تو ہمارے ذہن میں بالکل واضح تھے لیکن اس کے علاوہ باقی جگہوں کی معلومات کرنا باقی تھا۔

کچھ دیر آرام کے بعد ہم دوبارہ تھنڈر بو کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ سیر و سیاحت کے لیے سکہ رائج الوقت حاصل کرسکیں۔ دفتر پہنچے تو دفتر کے ناظم بھی موجود تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی اور دفتر کے ضروری امور پر تبادلۂ خیال ہوا۔ ان سے ہم نے بہادر شاہ ظفر کے مزار کے بارے میں پوچھا تو انہیں اس بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ ابھی ہم زیادہ مایوس نہیں ہوئے تھے کہ تھنڈر بو نے ایک گولہ داغ دیا۔ کہنے لگیں ”آپ کا دیا ہوا نوٹ ہمارے ملک میں قابلِ قبول نہیں۔ ہمارے ملک میں پرانے، میلے اور داغی نوٹ نہیں چلتے۔“

ہم نے حیرت سے کہا ”ہمارے دیئے ہوئے نوٹ میں ان عیبوں میں سے ایک عیب بھی نہیں پایا جاتا۔“

اس پر انہوں نے وہ سو ڈالر کا نوٹ نکالا اور روشن بلب کی طرف رخ کرکے اس میں موجود ان سوراخوں کی نشان دہی کی جو ان نوٹوں کو ایک ساتھ اسٹیپل کرنے سے بن جاتے ہیں۔ ہمیں سخت جھٹکا لگا۔ اس عیب پر اس سے پہلے کبھی کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا۔

آپ لوگوں نے پرانی داستانوں میں پڑھا ہوگا کہ ایک مسافر سفر کرتا ہوا کسی اور شہر میں داخل ہوا تو وہاں کے مقامی قانون کے مطابق یا تو اسے بادشاہ بنا دیا گیا اور یا سولی چڑھا دیا گیا۔ اس کے علاوہ بھی مسافر دوسرے عجیب و غریب واقعات سے دوچار ہوجاتے تھے۔ ہم پہلے سمجھتے تھے کہ یہ سب زیبِ داستان ہے اور ایسا ممکن نہیں لیکن ہمارے ساتھ پچھلے دنوں کچھ واقعات ایسے ہوئے کہ ہمیں ان داستانوں پر یقین آنے لگا۔ پچھلے سال جب ہم ملائشیا کے دورے پر گئے تو مغربی ملائشیا میں ہمیں ڈالر تڑوانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ یہی نوٹ لے کر جب ہم مشرقی ملائشیا پہنچے تو صاف انکار ہوگیا۔ وہاں پر موجود چینی خواتین نے اعتراض کیا تھا کہ ڈالر کے نوٹ پرانے ہیں۔ یہاں پر صرف 2000ء کے بعد والے نوٹ چلتے ہیں جبکہ آپ والا نوٹ 1996ء کا چھپا ہوا ہے۔ اس وقت ہماری جیب میں صرف دس روپے سکہ رائج الوقت تھے اور ہمیں مشرقی ملائشیا سے واپس مغربی ملائشیا جانا تھا۔ یہ انتہائی پریشانی کی بات تھی۔ رہنے کی جگہ تو دفتر والوں کی طرف سے مفت تھی لیکن کھانے، گاڑی اور دیگر اخراجات کے لیے مقامی روپوں کی ضرورت تھی۔ ہمارا ATM Card بھی ملائشیا میں نہیں چلتا جبکہ یہی کارڈ ہم نے استنبول اور تھائی لینڈ میں مقامی روپے حاصل کرنے کے لیے بارہا استعمال کرچکے تھے۔

میانمار والے مشرقی ملائشیا والوں سے بھی دو ہاتھ آگے نکلے۔ ملائشیا کے تجربے کے بعد ہم ہمیشہ اپنے ساتھ

نئے نوٹ لے کر نکلتے تھے لیکن آج میانمار والوں نے ہمیں ایک نیا سبق سکھا دیا تھا کہ نوٹ خواہ نئے ہوں لیکن ان میں باریک سوراخ بھی نہیں ہونے چاہئیں۔ ہم نے بے بس ہو کر اپنا بٹوا کھولا اور سارے سو روپے والے نوٹ دیکھ ڈالے۔ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے یعنی سب میں ایک ہی سوئی کے سوراخ تھے۔ پھر ہم نے دیکھا کہ کچھ نوٹ کم مالیت والے یعنی پچاس، بیس اور دس ڈالر والے بھی تھے۔ یہ سب ہم اسی لیے رکھتے تھے کہ کسی بھی وقت کسی بھی مالیت کے نوٹ کی ضرورت پڑ جائے تو کوئی دقت نہ ہو۔ اتفاق سے چھوٹی مالیت کے کچھ نوٹ سلامت تھے۔ وہی ہم نے تھنڈر بو کے حوالے کیے اور دل میں دعائیں مانگتے اپنے کمرے میں واپس آ گئے کہ خدا کرے کہ یہ نوٹ چل جائیں ورنہ ہم اپنے کمرے ہی میں قید ہو کر رہ جائیں گے، بہادر شاہ ظفر کے اس مصرع کی مصداق: ''قسمت میں قید تھی لکھی فصلِ بہار میں''۔

ہماری خوش قسمتی کہ وہ نوٹ چل گئے اور ہمیں اتنے روپے مل گئے کہ ہم ینگون کی سیر کے لیے نکل سکیں۔ دن تو ڈھل چکا تھا اس لیے ہم نے اپنے دفتر کے منتظم سے شام کی سیر اور رات کے کھانے کے لیے کسی مناسب جگہ جانے کی راہنمائی کی درخواست کی۔ انہوں نے بتایا کہ اس ہوٹل سے نکلتے ہی سیدھے ہاتھ کو پیدل مسافت پر یہاں کا اندرون شہر کا علاقہ ہے۔ وہاں آپ کو کھانے پینے کی دکانیں بھی مل جائیں گی۔

ہم نے پوچھا ''رات کو اکیلے پیدل پھرنے میں کوئی خدشہ تو نہیں۔''

انہوں نے جواب دیا ''اس ملک میں لاکھ برائیاں سہی لیکن امن و امان کی صورتِ حال بہت اچھی ہے۔ آپ کو اکیلے پیدل چلنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔''

بارش وقفوں وقفوں سے ہو رہی تھی اس لیے چھتری ہم نے ساتھ لے لی۔ ہوٹل کے ہر کمرے کی الماری میں ایک عدد چھتری لٹکی رہتی تھی جس کا ہمیں علم نہیں تھا۔ جب ہم نے ہوٹل سے باہر نکلتے ہوئے پیش تختہ پر متمکن خاتون سے چھتری کا مطالبہ کیا تو انہوں نے ہمیں بتایا کہ ہر کمرے میں ایک عدد چھتری الماری میں لٹکی رہتی ہے، وہاں سے لے لیجیے۔

بازار تک چلنا ہمارے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا کیونکہ پیدل چلنے کی ہمیں خوب مشق ہے لیکن وہاں کا بازار دیکھ کر ہمیں سخت مایوسی ہوئی۔ صفائی، روشنی اور سڑکوں کا اچھا انتظام نہیں تھا، اچھی طعام گاہیں بھی نہیں تھیں، یا پھر ہماری عادت ملائشیا اور بنکاک کے بازار دیکھ کر خراب ہو گئی ہے۔ بازار کے اختتام پر سامنے ایک مندر بنا ہوا تھا۔ دائیں ہاتھ ایک مسجد ہے اور بائیں ہاتھ بلدیہ کی عمارت جو ''ٹاؤن ہال'' کے نام سے مشہور ہے۔ بازار کی سیر ختم ہو چکی تھی اس لیے ہم نے کھانے کی ٹھانی۔ مندر کے سامنے دو رویہ سڑکوں کے اوپر ایک پل بنا ہوا تھا تا کہ لوگ بلا روک ٹوک اِدھر اُدھر جا سکیں۔ اس پل کے نیچے اور اس کے علاوہ قدم رو پر بھی کھانے کے ٹھیلے جگہ جگہ لگے ہوئے تھے۔ بالکل وہی منظر جو یہاں بھی پلوں کے نیچے نظر آتا ہے۔ سڑک کے کنارے کچھ طعام گاہیں باقاعدہ دکانوں کے اندر بھی بنی ہوئی تھیں۔

بہت احتیاط کے بعد ہم نے ایک طعام گاہ میں قدم رکھا تو یہ جان کر قدرے خوشی ہوئی کہ وہاں چپاتی مل سکتی تھی لیکن وہاں اسے چپاپاتی لکھا ہوا تھا۔ ہمیں تھوڑا تردد تو ہوا لیکن وہاں قسمت آزمائی کے سوا چارہ نہیں تھا۔ جب تازہ بنی ہوئی گرم گرم چپاتی کے ساتھ دال اور سبزی آئی جو بہت اچھی بنی ہوئی تھی تو ہماری ساری کوفت دور ہو گئی۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ یہاں ہندوستانی اثرات کافی پائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ایک خاندان آیا جنہوں نے ابلے چاول اور ساتھ دال، سبزی وغیرہ منگائی۔ ابلے چاول بہت اچھے بنے ہوئے تھے۔ ہمیں یہ طعام گاہ کھانے کے معیار کے اعتبار سے بہت پسند آئی۔ خدمت انجام دینے والے لڑکے تو انگریزی سے نابلد تھے لیکن ان کا مالک اچھی انگریزی جانتا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ دیر تبادلۂ خیال ہوا۔ معلوم ہوا کہ یہ لوگ ہندوستان سے آ کر یہاں آباد ہوئے تھے اور اپنے ساتھ وہاں کی روایات بھی لائے تھے جنہیں ابھی تک زندہ رکھا ہوا ہے۔ کھانے کے بعد وہاں دیکھنے کے لیے کچھ نہیں تھا اس لیے ہم نے واپس اپنے ہوٹل کی راہ لی۔

دوسرے دن گیارہ بجے تک ہم بارش رکنے کا انتظار کرتے رہے اور اس کے بعد چھتری تان کر سیر کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ بارش کی وجہ سے ہم اپنا قیمتی دن تو ضائع کر نہیں سکتے تھے۔ اس دن کے لیے ہم نے جانے کتنا انتظار کیا تھا۔ نیچے جا کر ہم نے ایک گاڑی بان کو روکا جو بہت زیادہ پیسے مانگ رہا تھا۔ ہم نے اپنے منتظم سے پہلے ہی پوچھ لیا تھا کہ کس جگہ جانے کے کتنے پیسے بنیں گے۔ بات نہیں بنی تو ہم نے ایک اور گاڑی بان سے بات کی۔ وہ

بہت معقول انسان تھا۔ اس نے کرایہ بھی مناسب بتایا اور اس کے علاوہ وہ بہادر شاہ ظفر کے مزار کے بارے میں بھی جانتا تھا۔ وہ گاڑی بان دراصل مسلمان تھا۔ ہم نے اسے اس کے حلیے سے پہچانا اور اس کی تصدیق بھی کی۔ اس گاڑی بان کے مطابق بہادر شاہ ظفر رنگون میں ظفر شاہ کے نام سے مشہور ہیں۔ ہم نے یہ بات پلے سے باندھ لی۔ ناموں کے ذرا سے فرق سے بہت فرق پڑتا ہے۔ اسی طرح ترکی میں حضرت ایوب انصاری ایوپ (Ayup) کے نام سے مشہور ہیں اور ایوب کے نام سے انہیں کوئی نہیں جانتا۔

لائحہ وقت کے مطابق پہلے ہم نے پگوڈا کا قصد کیا۔ گاڑی سے اتر کر ہم نے دیکھا کہ وہ پگوڈا ایک بلند چبوترے پر بنا ہوا تھا جس کے لیے بہت سی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانا پڑتا ہے۔ سیڑھیاں بے شمار تھیں اور چڑھتے ہوئے ہم نے گنی بھی نہیں۔ بعد میں جب ہم لوگوں سے اس پگوڈا کی سیر کا ذکر کرتے تو وہ پوچھتے ''کتنی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئے تھے؟'' اور ہم حیرت سے ان کا منہ دیکھنے لگتے کہ بھلا سیڑھیاں گننے کا کیا مطلب ہوا۔ پھر ہمیں خیال آتا کہ شاید اس میں ان لوگوں کے لیے ثواب کا کوئی پہلو ہو۔ ہم تو سیر کے لیے گئے تھے لیکن مقامی لوگ تو وہاں عبادت کے لیے جاتے ہیں۔ کوالالمپور میں بھی ایسا ہی ایک مندر ایک بلند پہاڑ پر بنا ہوا تھا جس پر سیڑھیوں کا شمار لکھا ہوا تھا۔ وہاں دو سو سے زائد سیڑھیاں چڑھنا پڑتی ہیں۔ یہاں اندازاً کوئی پچاس سیڑھیاں ہوں گی۔

بارش مسلسل ہو رہی تھی لیکن اچھی بات یہ تھی کہ سیڑھیاں ڈھکی ہوئی تھیں اور سیڑھیوں کے دونوں جانب تحائف فروشوں کی دکانیں تھیں جہاں اسی مندر کی مناسبت سے بتوں کے مجسمے اور ملتی جلتی چیزیں فروخت کے لیے سجی ہوئی تھیں۔ سیڑھیاں چڑھنے سے پہلے ہی ہمیں جوتے اتارنے کی ہدایت کی گئی۔ چند سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ایک جگہ جوتے رکھنے کی جگہ بنی ہوئی تھی۔ جوتے رکھنے کا کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا تھا لیکن سیاحوں سے یہ توقع ضرور کی جاتی تھی کہ وہ کچھ رقم اپنی مرضی سے چندے کے طور پر وہاں رکھے ہوئے ایک ڈبے میں ڈالتے جائیں۔ ہم نے بھی کچھ رقم اس ڈبے میں ڈال دی۔ اس مرحلے کے بعد جب ہم سیڑھیاں چڑھ کر چبوترے پر پہنچ گئے تو وہاں ایک لڑکا میز کرسی ڈالے بیٹھا تھا۔ ہم سمجھے کہ دفتر معلومات ہے لیکن پتا چلا کہ یہ ٹکٹ گھر ہے۔ اس لڑکے نے ہم سے پگوڈا میں داخل ہونے کے پانچ ڈالر طلب کیے۔ یہ جرمانہ صرف غیر ملکیوں پر عائد کیا جاتا ہے۔ مقامی لوگ مفت یا بہت معمولی رقم ادا کر کے داخل ہو سکتے ہیں۔

چھوٹی مالیت کے ڈالر تو ہم نے کل تھنڈر بو کی مدد سے مقامی روپوں میں تبدیل کر لیے تھے جنہیں یہاں ''کیاٹ (KYAT)'' کہا جاتا ہے۔ ہم نے ٹکٹ بابو سے کہا ''ہمارے پاس پانچ ڈالر کھلے تو نہیں ہیں البتہ کیاٹس ہیں۔ کتنے کیاٹس چلیں گے۔'' اس نے کہا: ''پانچ ہزار کیاٹس عنایت کر دیجیے۔''

اس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ایک امریکی ڈالر ایک ہزار کیاٹس کے برابر بنتا ہے۔ اس کارروائی کے بعد ہمیں شیو ڈاگون پگوڈا (Shwedagon Pagoda) میں داخل ہونے کی اجازت مل گئی۔ یہ پگوڈا ایک بہت بڑے چبوترے پر کئی چھوٹے مندروں کا ایک مجموعہ تھا۔ اس چبوترے کے بیچ میں ایک بلند مینار سا تھا جو نیچے سے چوڑا تھا اور اوپر جا کر بتدریج باریک ہوتا چلا گیا۔ اس مینار کا رنگ سنہرا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ گویا سونے کے پتھروں سے بنایا گیا ہو۔ مینار کی بلندی سو گز ہے۔ اس مینار کے اردگرد بہت سے مندر بنے ہوئے تھے جن میں اکثر مہاتما بدھ کے مجسمے تھے۔ اس مینار ہی کو پگوڈا کہا جاتا ہے۔

بارش ہو رہی تھی اور چبوترہ گیلا اور پھسلواں تھا۔ ہم چھتری تانے سنبھل سنبھل کر چل رہے تھے۔ بہت سنبھل سنبھل کر چلنے کے باوجود ہمارا پاؤں پھسلا اور ہم چبوترے پر گر گئے۔ خدا کا شکر ہے کہ کوئی چوٹ نہیں آئی اور نہ ہی ہمارے کپڑے خراب ہوئے کیونکہ چبوترہ آئینے کی طرح صاف تھا۔ بہت سے لوگ ہماری طرف دوڑے تاکہ ہمیں سہارا دے کر اٹھائیں لیکن ہم ان کی مدد سے پہلے ہی سنبھل کر کھڑے ہو چکے تھے۔ اس کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ دائیں طرف سے مختلف مندر دیکھتے ہوئے مینار کے گرد اپنا چکر مکمل کریں۔

ہم نے دیکھا کہ مختلف مندروں میں لوگ مختلف سرگرمیوں میں مشغول تھے۔ کچھ لوگ اپنے خاندانوں کے ساتھ سیر و تفریح کی غرض سے آئے تھے اور پکوان بھی ساتھ باندھ کر لائے تھے۔ وہ یہاں صاف ستھرے فرش پر بیٹھ کر کھانے پینے میں مشغول تھے۔ کچھ نوجوان جوڑے کونوں کھدروں میں بیٹھے سرگوشیوں میں معروف تھے۔ اِکّا دُکّا لوگ مجسموں کے آگے سر جھکائے نہایت ادب و احترام کے

ساتھ بیٹھے ہوئے اپنے من کی مرادیں مانگ رہے تھے۔

ایک جگہ ہم نے تین بچوں کو دیکھا جو جوگیوں سا گیروا لباس پہنے چلے آ رہے تھے۔ یہ شاید یہاں کے مدرسے کے طلبا تھے۔ ایک جگہ مندر میں کمرہ جماعت کا منظر تھا۔ بہت سے لوگ طالب علموں کی طرح صفوں میں بیٹھے پجاری کا وعظ سن رہے تھے۔

زیادہ تر مندر بتوں سے آراستہ لیکن پجاریوں سے خالی پڑے ہوئے تھے۔ ایسے ہی ایک مندر میں ایک خاتون اپنے خاندان کے ساتھ آئیں اور ایک بت کے سامنے احتراماً جھک گئیں۔ ہم نے چاہا کہ اس حالت میں اس کی ایک تصویر بنائیں لیکن وہ جلد ہی وہاں سے ہٹ گئیں۔ ہم نے ان سے درخواست کی کہ وہ اس بت کے ساتھ کھڑی ہو جائیں تاکہ ہم ان کی تصویر بنا سکیں۔ انہوں نے ہماری اس خواہش کا احترام کیا اور بت کے پاس کھڑے ہو کر ہمیں تصویر کشی کا موقع دیا۔ ایک مندر کے سامنے شیر کے مجسمے بنے ہوئے تھے۔ بدھ مذہب میں شیروں کا بہت دخل ہے۔ ہم نے سنا ہے کہ تھائی لینڈ کے ایک مندر میں پجاریوں کے پالے شیر آزادانہ گھومتے پھرتے ہیں جو سیاحوں کے لیے خطرناک نہیں ہوتے۔ یہ مندر ہم وقت کی کمی کی وجہ سے نہیں دیکھ سکے۔ سیاح یہاں بھی موجود تھے لیکن اتنی تعداد میں نہیں تھے جیسا کہ تھائی لینڈ کے مندروں میں ہوتے ہیں۔ شاید یہاں کی حکومت کے سخت رویے کی وجہ سے لوگ یہاں آنے سے کتراتے ہیں۔

ایک مندر پگوڈا کے درمیانی ستون کے ساتھ سنگِ سفید سے تراش کر بنایا گیا تھا جو سب سے الگ لگ رہا تھا۔ سب مندر بہت صاف ستھرے اور زیادہ تر سنہرے رنگ سے مزین تھے۔ یہ چمک دمک قدرتی طور پر لوگوں کو اپنی طرف راغب کرتی ہوگی۔ بارش مسلسل ہو رہی تھی اس لیے ہمیں ایک ہاتھ میں چھتری تھامے رکھنا تھی اور ساتھ ہی قدم جما کر چلنا تھا تاکہ پھر نہ پھسل جائیں، اس لیے تصویر کشی میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ ایک جگہ ہم نے ایک پیشہ ور فوٹو گرافر سے اپنی تصویر بنوائی لیکن موسم کی خرابی کی وجہ سے اچھی نہ بن سکی۔ اس پگوڈا میں داخل ہونے کے کئی راستے تھے۔ اس دوران ہم یہ بھول گئے کہ ہم کس راستے سے پگوڈا میں داخل ہوئے تھے۔ اگر ہم جوتے پہنے ہوئے ہوتے تو کسی بھی دروازے سے نکل سکتے تھے لیکن ہمیں اپنے جوتوں کے حصول کے لیے اسی دروازے سے واپس جانا ضروری تھا۔ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد ہم نے اپنا دروازہ پہچان لیا۔ جوتوں کے حصول کے بعد ہم سیڑھیاں اترے اور سڑک پر آ کر ٹیکسی کا انتظار کرنے لگے۔

اب ہماری اگلی منزل تھی بہادر شاہ ظفر کا مزار۔ ہر گاڑی بان ظفر شاہ کے مزار سے واقف نہیں تھا۔ اب ہمیں افسوس ہوا کہ ہمیں اس مسلمان گاڑی بان کے ساتھ پہلے بہادر شاہ ظفر کے مزار پر جانا چاہیے تھا کیونکہ اس پگوڈا کو تو ہر کوئی جانتا تھا۔ بہرکیف، تھوڑی سی جدوجہد کے بعد ایک گاڑی بان ایسا مل گیا جو ہمیں بہادر شاہ ظفر کے مزار پر لے جانے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ گاڑی بان راستے میں بتانے لگا۔

''یہ ایک غیر معروف سی جگہ ہے لیکن کبھی کبھار بیرونی ملکوں کے سفیر بھی یہاں حاضری دینے آتے ہیں۔'' ہم نے اس گاڑی بان کو اس جگہ کی تاریخ بتائی تو کہنے لگا۔

''انگریزوں نے ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی کیا تھا۔ ہمارے بادشاہ کو معزول کر کے ہندوستان لے گئے تھے اور وہاں قید میں ڈال دیا تھا۔''

مزار کے باہر گاڑی رکنے کے بعد ہم نے گاڑی بان سے کہا ''اگر آپ کچھ دیر انتظار کر لیں تو ہم آپ کے ساتھ واپس ہوٹل تک جانا چاہیں گے۔''

وہ انتظار کرنے پر آمادہ ہو گیا اور یہ اچھا ہوا کیونکہ اس جگہ کسی ٹیکسی کے گزرنے کا امکان کم تھا۔

مزار کی عمارت ایک عام سی عمارت تھی۔ کوئی شان و شوکت یا آرائش وغیرہ نہیں تھی کہ باہر سے پتا چل سکے۔ بارش ابھی تک ہو رہی تھی۔ ہم چھتری کی مدد سے بھیگنے سے بچتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ پھاٹک سے اندر داخل ہوتے ہی چند قدم پر ایک عمارت تھی۔ یہاں پر ایک نوجوان باریش شخص نے ہمارا استقبال کیا جو دیکھنے میں بنگالی لگتا تھا۔ اس کی داڑھی سیاہ سی اور اس نے چارخانہ دھوتی باندھ رکھی تھی۔ وہ اچھی اردو بول رہا تھا اور یہاں پر کئی نسلوں سے آباد تھا۔ اس نے اپنا نام حافظ کمال الدین بتایا۔ حافظ کمال الدین صاحب نے ہمیں برآمدے میں جوتے اتارنے کو کہا۔ اس کے بعد ہمارے جوتے اور چھتری وہاں پر موجود ایک چھوٹی سی لڑکی کے حوالے کیے۔ برآمدے کے بعد ایک بڑا سا کمرا تھا جسے آپ دالان کہہ سکتے ہیں۔ اس دالان کی بائیں جانب ایک دروازہ تھا اور اس دروازے کے باہر ایک کتبہ لگا ہوا تھا۔ اس کتبے کی

عبارت کو ہم یہاں من وعن پیش کرتے ہیں تاکہ آپ محسوس کر سکیں کہ گویا آپ خود وہاں موجود ہیں اور کتبہ پڑھ رہے ہیں۔

خاندانِ مغلیہ کا آخری چراغ

حضرت ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر رحمتہ اللہ علیہ

1837ء جلوس تا 1858ء

آج تاریخ 7 نومبر 1862ء بمطابق تاریخ 14 جمادی الاولیٰ 1279ھ دن جمعہ کو وہ روح جو نواسی سال بہادر شاہ کے جسم میں موجود رہی زندگی کے تمام تماشے دکھا کر وداع کی تیاریاں کر رہی ہے۔ دن ڈھل چکا اور دن کے ساتھ ہی بادشاہ کا پیمانۂ عمر بھی لبریز ہو گیا۔

رنگون کی خاک اس کو آغوش میں لیتی ہے جو خاندانِ تیموریہ کا آخری چراغ تھا، جس نے جہاں آباد میں جنم لیا۔ وہ وطن سے ہزار کوس دور ایک معمولی پلنگ پر دم توڑ رہا ہے۔ سکرات طاری ہے، سانس اکھڑ چکا جس کی زندگی چیچ کا میلا تھی، جس نے زندگی کا ہر لمحہ جھمگھٹوں میں گزارا آج صرف تین آدمی، ایک بیوی اور دو بچے اس کے دمِ واپسیں میں ساتھ ہیں۔ آفتاب ابھی غروب نہ ہوا تھا کہ اس بادشاہ نے فانی دنیا کو اپنی عسرت کی تصویر دکھا کر دنیا سے کوچ کیا اور شاہ جہاں آباد کا یہ گوہرِ آبدار رنگون کی خاک میں ابدی نیند سو گیا۔

تاریخ وفات:

چودہ جمادی الاولین، جمعہ کا روز وقتِ عصر
حالتِ قید و بے کسی تھی یہ گھڑی بہت کٹھن
موت نے شاہ ہند سے، عرض کیا وطن سے دور
خلد ہے آپ کا وطن اے ظفر جلا وطن

Bahadur Shah. Ex-King of Delhi,

Died at Rangoon, November 7th 1862

and was buried near this spot.

....

Zinath Mahal wife of Bahadur Shah

Who Died on the 17th July 1886

was also buried near this spot.

....

ملکہ نواب زینت محل اعلیٰ مقامہٗ تاریخ وفات 14 شوال المکرم 1303ھ بمطابق 17 جولائی 1886ء

رونق زمانی بیگم شہزادی اعلیٰ مقامہٗ تاریخ وفات ۳۰ ذیقعدہ 1349ھ بمطابق 30 اپریل 1930ء

یہ کتبہ پڑھنے کے بعد جب ہم کمرے میں داخل ہوئے تو وہاں تین قبریں بنی ہوئی تھیں جو مندرجہ بالا شخصیات کی ہونی چاہئے تھیں لیکن حافظ کمال الدین صاحب نے بتایا کہ پہلی قبر خالی ہے، جو کہ ہمارے اندازے کے مطابق بہادر شاہ ظفر کی ہونی چاہئے تھی۔ باقی دو قبروں کے بارے میں بتایا گیا بالترتیب ملکہ زینت محل اور رونق زمانی بیگم ہی کی ہیں۔ حافظ کمال الدین صاحب نے بتایا کہ بہادر شاہ ظفر کی اصل قبر نیچے تہہ خانے میں ہے۔ یہ جگہ جہاں بظاہر قبر بنی ہوئی ہے وہ مقام ہے جہاں بہادر شاہ ظفر کو قید رکھا گیا تھا۔

اس کمرے میں تین قبروں کے علاوہ کچھ تصویریں دیواروں پر لگی ہوئی تھیں جن میں بہادر شاہ ظفر کی زندگی کے مختلف مدارج دکھائے گئے تھے۔ ایک تصویر میں بادشاہ کا شاندار جلوس ہاتھیوں پر دہلی کی ایک سڑک پر رواں دواں ہے۔ کچھ تصویریں شاہی لباس میں تاج پہنے ہوئے۔ ایک تصویر میں وہ منظر ہے جب انگریز بادشاہ کو قیدی بنا رہے تھے۔ آخری ایام کی حقہ پیتے ہوئے ایک تصویر بھی لگی ہوئی تھی۔ ایک تصویر میں بہادر شاہ ظفر کو صوفی بتایا گیا ہے جو اپنے مریدوں کو روحانی تعلیم دے رہے ہیں۔ دو شہزادوں مرزا جواں بخت اور مرزا شاہ عباس کی ایک تصویر بھی وہاں لگی ہوئی تھی۔ ملکہ زینت محل کی جوانی اور بڑھاپے کی تصویریں بھی تھیں۔ ہم نے حافظ کمال الدین صاحب سے درخواست کی کہ ہماری ایک تصویر اس تاریخی مقام پر بنائیں۔

اس کے بعد حافظ کمال الدین صاحب ہمیں بہادر شاہ ظفر کی اصل قبر پر لے گئے جو ایک منزل نیچے یعنی تہہ خانے میں بنی ہوئی تھی۔ یہ قبر بھی بالکل ویسی ہی بنی ہوئی تھی جیسی کہ اوپر تین قبریں بنی ہوئی تھیں۔ قبریں سرخ رنگ کی روغنی اینٹوں ... کی بنی ہوئی تھیں۔ سب قبریں ریشمی رنگ

کے سبز غلافوں سے ڈھکی ہوئی تھیں جن کے حاشیئے زرد رنگ کے تھے۔ قبروں کے گرد سفید چمکدار لوہے کی جالیاں لگی ہوئی تھیں۔

یہاں پر بادشاہ کی شاعری سے دیواروں کی زینت بنائی گئی تھی۔

ان کی مشہور غزل 'نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں' بھی ایک دیوار پر کندہ تھی۔ یہ غزل محمد رفیع نے فلم لال قلعہ کے لیے گائی تھی۔ اس میں ایک جگہ رفیع صاحب نے "پے فاتحہ کوئی آئے کیوں" گایا ہے جبکہ یہاں "پڑھے فاتحہ کوئی آئے کیوں" لکھا ہے۔ رفیع صاحب کے علاوہ حبیب ولی محمد، اقبال بانو اور دوسرے تمام گانے والوں نے بھی "پے فاتحہ" ہی گایا ہے۔ ایک اور غزل "لگتا نہیں ہے دل میرا" میں آخری مصرعہ یوں لکھا ہے "دو گز زمیں بھی مل نہ سکی کوئے یار میں" جبکہ عام طور پر یہ "دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں" گایا اور لکھا جاتا ہے۔

اسی کمرے میں ایک دیوار پر ان لوگوں کی تصویریں لگی ہوئی ہیں جنہوں نے اس مزار پر حاضری دی تھی۔ زیادہ تر لوگ ہندوستان کے تھے۔ ہمارے ملک کی نمائندگی جناب پرویز مشرف صاحب نے کی تھی۔ حافظ کمال الدین صاحب نے بتایا کہ یہاں ایک مسجد بھی ہے جہاں پانچوں وقت جماعت کے ساتھ نماز ادا کی جاتی ہے۔ حافظ کمال الدین صاحب مؤذن کے فرائض انجام دیتے ہیں اور مولوی نذیر صاحب امامت کرتے ہیں۔ انہوں نے مجھے مولوی نذیر صاحب سے بھی ملوایا۔ پہلے تو انہیں دیکھ کر مجھے یقین نہیں آیا لیکن جب حافظ کمال الدین صاحب نے دوبارہ دہرایا تو میں نے ان سے علیحدگی میں پوچھا "امام صاحب نے داڑھی کیوں نہیں رکھی؟"

حافظ کمال الدین صاحب نے جواب دیا "ان کی مرضی رکھیں یا نہ رکھیں۔"

حافظ کمال الدین صاحب کی باتوں سے ہمیں یوں لگا گویا ہم کسی بادشاہ کی قبر پر نہیں بلکہ کسی ولی اللہ کے مزار پر حاضری کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ حافظ کمال الدین صاحب بادشاہ کا ذکر نہایت عقیدت اور احترام سے کر رہے تھے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ یہاں کا انتظام چلانے کے لیے حکومت کی طرف سے کوئی مدد نہیں کی جاتی۔ تمام کام مزار پر حاضری دینے والوں کے عطیات سے چلتا ہے، لہٰذا ہم نے بھی حسب توفیق کچھ عطیہ کیا۔ اس کے بعد حافظ کمال

الدین صاحب ہمیں برآمدے میں اسی جگہ تک لے آئے
جہاں انہوں نے ہمارا استقبال کیا تھا اور جہاں ہمارے
جوتے اور چھتری پڑی تھی۔ بارش مسلسل برس رہی تھی۔ یہ
اچھا تھا کہ گاڑی بان ابھی تک ہمارا انتظار کر رہا تھا ورنہ بڑی
مشکل ہو جاتی۔ ہم نے حافظ کمال الدین صاحب سے
اجازت چاہی، چھتری تانی اور جوتے پہن کر گاڑی میں جا
بیٹھے۔

ہوٹل واپس پہنچے تو دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا
تھا۔ ہم عام طور پر بڑے ہوٹلوں میں کھانا کھانے سے گریز
کرتے ہیں اور اس کی وجہ ہے اونچی دکان پھیکا پکوان۔
ایک تو مہنگا ہوتا ہے جو کہ ہمارے ادارے کے ذمے ہوتا ہے
اس لیے ہمیں ادائیگی کی فکر نہیں ہوتی لیکن اس کے بدذائقہ
ہونے کو ہم اپنے ادارے کے کھاتے میں نہیں ڈال سکتے،
کھانا تو ہمیں ہی پڑتا ہے اس لیے ہم کسی ایسی طعام گاہ کا
انتخاب کرتے ہیں جہاں ہماری پسند کے کھانے مل سکیں۔
پچھلی رات اندرونِ شہر ہم نے ایک ایسی طعام گاہ تلاش تو کر
لی تھی لیکن اس برستی بارش میں وہاں جانا مشکل تھا۔ دوسرے
آج صبح ناشتے کے دوران ہم نے دریافت کیا کہ اس ہوٹل
کی طعام گاہ میں ہندوستانی کھانوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔
ناشتے میں پوریوں اور سبزی کی ایک الگ میز لگی ہوئی تھی
جس پر "انڈین اسپیشلٹیز" کی تختی لگی ہوئی تھی۔ پوریاں
بہت اچھی بنی ہوئی تھیں۔ سبزی اور دال بھی اچھی تھی۔

یہ سوچ کر ہم نے دوپہر کا کھانا پارک رائل ہوٹل کی
طعام گاہ ہی میں کھانے کا فیصلہ کیا۔ دوپہر کے کھانے پر بھی
"انڈین اسپیشلٹیز" کا میز الگ لگا ہوا تھا۔ اس میں تندوری
نان، چکن تکہ، گوشت کا سالن اور سبزی پیش کیے گئے تھے۔
یہ ہمارے لیے ایک ایسی خوشخبری تھی کہ پھر اس کے بعد ہم
نے کھانے کے لیے باہر جانے سے ہمیشہ گریز کیا۔ ایسا
اہتمام بہت کم ہوٹلوں میں کیا جاتا ہے۔ شاید برما (میانمار)
اور ہندوستان کی تہذیبیں بہت قریب قریب ہیں۔ تھائی
لینڈ چلے جائیں تو یہ اہتمام نظر نہیں آتا جبکہ تھائی لینڈ اور برما
میں بہت سی اقدار مشترک ہیں۔ ایک اور چیز جو ہمیں اس
طعام گاہ میں بہت پسند آئی وہ ابلے ہوئے سفید چاول جن کی
چمک آنکھوں کو واقعی خیرہ کیے دیتی تھی۔ اتنے اچھے چاول
ہم نے کسی اور ملک میں نہیں کھائے تھے سوائے اپنے وطن
پاکستان کے۔ ہندوستانی کھانا بنانے والے خانساماں نے
جب ہماری دلچسپی ان دیسی کھانوں میں دیکھی تو سلام اور داد
حاصل کرنے کو حاضر ہوا۔ ہم نے اسے دل کھول کر داد
دی۔ وہ بہت اچھا کھانا بناتا تھا۔ ہم نے خاص طور پر ابلے
چاولوں کے بارے میں پوچھا کہ کس ملک کے ہیں۔ ہمیں
بتایا گیا کہ یہ چاول برما میں کاشت کیے جاتے ہیں۔

شام کو دفتر کا چکر لگایا تو ہمیں کل کا پروگرام دے دیا
گیا۔ ہمیں اگلے دن مقامی ہوائی اڈے سے ایک چھوٹے
"بیچ کرافٹ" طیارے کے ذریعے ایک ساحلی شہر ستوا جانا
تھا جہاں سے ہیلی کوپٹر کے ذریعے کھدائی کے جہاز پر پہنچنا
تھا۔ طیارے کا سفر ڈیڑھ گھنٹے کا تھا جبکہ ہیلی کوپٹر کا سفر صرف
بیس منٹ کا تھا۔ کھدائی کا جہاز ایک جاپانی کمپنی کا تھا جبکہ
کھدائی کروانے والی کمپنی، ڈے وو، کا تعلق کوریا سے تھا۔
یہاں پر ہمیں کل چار گیس کے کنویں کھودنے تھے جن کی
گیس ایک چینی کمپنی کو فروخت کی جانی تھی۔ جہاز کا زیادہ تر
عملہ فلپائن سے تھا لیکن چوٹی کے لوگ جاپانی تھے۔ سروس
کمپنی کے لوگ مختلف ملکوں مثلاً پاکستان، ملائشیا،
انڈونیشیا، انگلستان، امریکا وغیرہ سے بلائے گئے تھے۔ برما
کے مقامی لوگ اس کے علاوہ تھے۔ اس سے آپ کو اندازہ
ہو گیا ہوگا کہ اس جگہ کس قسم کا ماحول تھا۔ یہ ایک سیمی سب
مرسبل خاصا پرانا جہاز تھا لیکن اس کی دیکھ بھال اچھی کی گئی
تھی۔ کھانے اور رہنے کا انتظام اچھا تھا۔

موسم شروع میں اچھا تھا لیکن بتدریج خراب ہوتا
گیا۔ ایک دھڑکا اور بھی لگا رہتا تھا کہ کبھی طوفان نہ آجائے
جو مون سون کے موسم میں آسکتا تھا۔ اس کے لیے پہلے سے
منصوبہ بندی کر لی گئی تھی۔ ایک نقشہ دفتر میں آویزاں رہتا
تھا جس میں طوفان کا تین سو کلومیٹر کے دائرے میں آتے ہی
کام بند کر کے جہاز کو چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا تھا۔ طوفان تو
اس سارے وقفے میں نہیں آیا لیکن بارشیں برستی رہتی تھیں
اور جہاز ہلکا ہلکا ڈولتا رہتا تھا جس کی وجہ سے جی متلاتا رہتا
تھا۔ اس کے علاوہ کشتیوں سے سامان اتارنے چڑھانے
میں کافی دقت ہوتی تھی۔ جو کشتیاں سامان لانے لے جانے
پر مامور تھیں وہ اس موسم میں بہت بری طرح ڈولتی رہتی تھیں
لیکن کام جاری رکھنا پڑتا تھا جو خطرناک ہو سکتا تھا۔ اللہ کے
فضل اور احتیاطی تدابیر کی وجہ سے کبھی کوئی ناخوشگوار واقعہ
پیش نہیں آیا۔

پروگرام کے مطابق ساڑھے تین ہزار سے چار ہزار
میٹر تک کھدائی کے بعد اس ریتیلی فارمیشن تک پہنچنا تھا جہاں
گیس کا ذخیرہ موجود تھا۔ گیس کا ذخیرہ صرف پچاس سے

ساٹھ میٹر دبیز تھا۔ مذکورہ کمپنی نے گیس کے ذخیرے تک پہنچنے اور پھر اس ذخیرے کو کھودنے کے لیے بہترین ڈرلنگ فلوئڈز کا اہتمام کیا تھا جو بہت مہنگا سودا تھا۔ لیکن وقت ضائع کیے بغیر ذخیرے تک پہنچنے اور پھر ذخیرے کو خراب کیے بغیر اس کو ایک شفاف فلوئڈ کے ذریعے کھودنے کے سلسلے میں کمپنی نے بخل سے کام نہیں لیا۔ یہ کام کرنے کا ٹھیکا ہماری کمپنی کو ملا تھا اور اپنی کمپنی کی طرف سے یہ ذمہ داری ہمارے حصے میں آئی تھی۔

کمپنی نے یہ فیصلہ کیا کہ ذخیرے تک پہنچنے کے لیے پانی کی بجائے سنتھیٹک آئل بیسڈ مڈ استعمال کی جائے جو مہنگی ہے لیکن سمندری مخلوق کے لیے کم ضرر رساں ہے اور اس کے علاوہ کھدائی میں بھی مشکلات نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں۔ اس مقصد کے لیے ایک بحری جہاز میں چار ہزار بیرل سنتھیٹک آئل بیسڈ مڈ ذخیرہ کر کے سمندر میں کچھ فاصلے پر لنگر انداز کر دیا گیا کہ جب جب ہم چاہیں وہاں سے ''ایس بی ایم'' منگوا لیا کریں۔ سنتھیٹک بیسڈ مڈ کو اختصار کے طور پر ''ایس بی ایم'' کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ چار بڑی کشتیاں جو مثل چھوٹے بحری جہاز کے تھیں، ہر وقت سامان لانے لے جانے کے لیے سمندر میں موجود رہتی تھیں۔ ان کشتیوں کے ذریعے سنتھیٹک آئل اور دوسرے کیمیکل ہمیں مہیا کیے جاتے تھے تاکہ ہم اپنی مرضی کے مطابق ''ایس بی ایم'' کی خصوصیات کو ڈھال سکیں۔ ان کشتیوں میں کھانے پینے کا سامان اور اس کے علاوہ بے شمار چیزیں آتی رہتی تھیں اور بے کار چیزیں بھی انہی کشتیوں کے ذریعے واپس کی جاتی تھیں۔

سمندر میں کوئی چیز پھینکنے کی سخت ممانعت تھی سوائے کھانے پینے کی ان چیزوں کے جو کھانے کے کمرے میں بچ جاتی تھیں۔ یہ بچا ہوا کھانا بھی ایک خاص ترکیب سے سمندر برد کیا جاتا تھا۔ ایک مشین میں یہ کھانا باریک کتر کر سمندر میں ڈال دیا جاتا تھا تاکہ مچھلیاں لطف اندوز ہو سکیں۔ جب مچھلیاں ان کھانوں سے لطف اندوز ہو رہی ہوتی تھیں تو اس دوران ہم ان مچھلیوں کے دیدار سے لطف اندوز ہوتے۔ برما کے اس سمندر میں نیلے رنگ کی پتلی کمر والی چمک دار مچھلیاں بکثرت تھیں۔ فارغ اوقات میں ہمارے دو ہی کام تھے۔ ایک تو سمندر میں مچھلیوں کو دیکھنا اور دوسرے آسمان پر بادلوں کو دیکھنا۔ شہروں سے دور ایسے مقامات پر قدرت کو اپنے اصلی رنگوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتے دیکھنا ہمارا پسندیدہ مشغلہ ہوتا ہے۔

شام کو چھ بجے اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد ہمارا پہلا کام کھانے سے نبٹنا ہوتا تھا۔ کھانے کے لیے نبٹنے کا فعل ہم نے اس لیے لکھا ہے کہ شام سات بجے کھانے کا کمرا بند کر دیا جاتا تھا۔ اس لیے کھانے کی خواہش ہو یا نہ ہو سات بجے سے پہلے پہلے کھانا کھانا ضروری ہوتا تھا۔ کھانے کے بعد ہم ہیلی پیڈ پر چلے جاتے اور کچھ دیر ٹہلتے۔ اس دوران آسمان ایک بڑے سے کینوس کی طرح ہمارے سامنے پھیلا ہوتا جس پر مصورِ اعظم بادلوں سے مختلف نقش و نگار بناتا رہتا۔ یہ مناظر اس قدر دل کش ہوتے کہ ہماری سارے دن کی تھکن دور ہو جاتی۔ اس کے بعد کچھ دیر تک ہم کسی کتاب کا مطالعہ کرتے اور جلد ہی سو جاتے تاکہ صبح سویرے چار بجے بیدار ہو سکیں اور چھ بجے سے پہلے پہلے کام پر حاضر ہو سکیں۔ یہ ہمارا ایک لگا بندھا معمول ہوتا تھا جو ایک مہینے تک گھڑی کی سوئیوں کی طرح چلتا رہتا تھا۔ گھر آ کر ہم بہت کوشش کرتے ہیں کہ یہ معمول برقرار رہے لیکن چند دن کے اندر اندر یہ معمول درہم برہم ہو جاتا ہے۔

اب کچھ ذکر کھانے کا ہو جائے۔ ہم پر اپنی پہلی کتاب کی تقریبِ اجراء کے موقع پر بہت تنقید کی گئی کہ ہم اپنے سفرناموں میں کھانے کا ذکر بہت کرتے ہیں۔ اچھا ہوا یہ نہیں کہا گیا کہ ہم اپنے سفرناموں میں خواتین کا ذکر بہت کرتے ہیں جیسا کہ اکثر سفرنامہ نگاروں کے متعلق کہا جاتا ہے۔ کھانے کا زیادہ ذکر کرنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہم بہت پیٹو یا چٹورے ہیں اور خواتین کا ذکر کم کرنے کی یہ وجہ نہیں کہ ہم میں رومانیت نہیں پائی جاتی۔ اصل وجہ یہ ہے کہ دورانِ سفر ہمارا سب سے بڑا مسئلہ کھانا رہتا ہے اور کھانا دن میں تین بار کھایا جاتا ہے۔ کھانے میں دو باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ حلال ہو اور دوسرے یہ کہ ہمارے ذائقے کے مطابق ہو۔ کھانے میں یہ دونوں صفات وطنِ عزیز میں بغیر کسی تگ و دو کے آسانی سے مل جاتی ہیں جبکہ بیرونِ ملک ان کے لیے بہت تحقیق کرنا پڑتی ہے۔ اس کو تفصیل سے اس لیے لکھ دیا جاتا ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو سکے کہ جو چیز اپنے ملک میں معمول کے مطابق سمجھی جاتی ہیں بیرونِ ملک اس کے لیے کتنی تکلیف سہنی پڑتی ہے۔

کھانوں کی طرح عورتوں کے بارے میں بھی انھی

دو باتوں کا خیال ضروری ہے جو اوپر لکھ دی گئی ہیں یعنی ایک تو یہ کہ حلال ہو اور دوسرے یہ کہ ہمارے ذائقے کے مطابق ہو۔ چونکہ بیرونِ ملک مختصر قیام کی وجہ سے ہم ان دونوں باتوں کا اہتمام بھی نہ کر سکے اس لیے ان کا ذکر بھی نہیں کیا۔ عطاالحق قاسمی صاحب جب ہماری کتاب کی تقریب اجراء کے موقع پر کراچی تشریف لائے تو فرمایا ''میں تھائی لینڈ میں پاکستان کا سفیر رہ چکا ہوں۔ وہاں گوشت کا سارا کاروبار پٹھانوں کے ہاتھ میں ہے اس لیے سارے تھائی لینڈ میں حلال گوشت ملتا ہے۔'' عورتوں کے بارے میں انہوں نے کچھ نہیں فرمایا اور نہ ہم نے پوچھا۔ اب آپ لوگ تھائی لینڈ جا کر بلا جھجک گوشت کھا سکتے ہیں اور بقول قاسمی صاحب، تھائی لینڈ میں گوشت کے لیے تجل ہونے کی ضرورت نہیں۔

کھانے کے کمرے میں ایک دن ہم نے ہندوستان کے ایک ساتھی کو دہی کھاتے دیکھا تو پوچھا ''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

کہنے لگا کہ ''طبیعت تو ٹھیک ہے لیکن میں ویجی ٹیرین ہوں اور آج تو سبھی پکوان گوشت کے ہیں اس لیے دہی کھا کر گزارہ کر رہا ہوں۔'' اسی طرح ایک اور ہندوستانی نے کہا ''اپنے ملک میں تو ٹھیک ہے لیکن باہر آ کر یہ سب نہیں چل سکتا اس لیے میں تو سب کچھ کھا لیتا ہوں۔'' ہم نے کئی مواقع پر محسوس کیا کہ کھانے پینے کے مسئلے پر ہندو ہم سے زیادہ مشکل میں رہتے ہیں۔ برہمن ذات کے ہندو کھانے کے معاملے میں زیادہ احتیاط کرتے ہیں۔

کھانے کا ذکر چل نکلا ہے تو برما کے پھلوں کی بھی بات ہو جائے۔ برما کے پھل ہمیں پسند نہیں آئے۔ اناس کھٹے اور خربوزے پھیکے۔ تربوز دیکھنے میں سرخ لیکن بد مزہ۔ سیب ٹھیک تھے لیکن نہ جانے کیوں سیب ہمیں پھل نہیں لگتا۔ کھدائی کے جہاز پر دنیا میں ہر جگہ سیب ہمیشہ ملتا ہے اور ہم نے اسے کھانے سے ہمیشہ گریز کیا ہے۔ سیب ہم ہمیشہ اپنے دفتر اور کمرے میں ناگہانی بھوک کے لیے رکھتے ہیں۔ جب بھوک لگی کبھی کبھار کھا لیا لیکن کھانے کے بعد پھل کے طور پر سیب کھانا ہمارے لیے ممکن نہیں۔ اسی طرح ایک دن جب ہم نے ہرے رنگ کے میلے سے کیلے دیکھے تو کھانے سے گریز کیا۔

ایک دن ہمیں خیال آیا کہ ان کیلوں کو چکھنا چاہئے۔ جب چکھا تو اس کیلے کے ذائقے نے ہمیں یکا یک اپنے بچپن میں پہنچا دیا۔ یہ ذائقہ ہمارے دماغ میں کہیں محفوظ تھا۔ یہ 1960ء کی دہائی کا ذکر ہے اور مقام فیصل آباد ہے جو اس وقت لائل پور کہلاتا تھا۔ ہمارے تایا کسی کام سے ہندوستان گئے اور واپسی پر وہاں سے کیلے لے کر آئے۔ یہ کیلے ''ہری چھال کے کیلے'' کہلاتے تھے اور اس زمانے میں نایاب سمجھے جاتے تھے۔ ہندوستان سے برآمد کئے جاتے تھے اور بہت مہنگے تھے۔ ان کیلوں کا ذائقہ ہمارے دماغ میں محفوظ تھا۔ برما کا یہ کیلا کھاتے ہی ہمیں ہندوستان کے ہری چھال کے وہ کیلے یاد آ گئے جو ہم نے بچپن میں کھائے تھے۔ اور پھر ان کیلوں کی رنگت کا راز بھی کھلا۔ دیکھنے میں ہرے لیکن ذائقے میں بہت اچھے۔ ہم نے یہ کیلے بہت رغبت سے کھائے۔

فیصل آباد سے کراچی آنے کے بعد کیلے نایاب نہیں رہے۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ کراچی آنے سے پہلے ہی ریل گاڑی میں کیلے بیچنے والے خوانچہ فروش در آتے تھے اور سستے داموں کیلے بیچتے تھے جس سے پہلا تاثر یہ ابھرتا تھا کہ کراچی میں کیلے بہت سستے ملتے ہیں۔ اب تو کیلے سارے پاکستان میں کثرت سے ملتے ہیں اور سستے ہیں۔ کراچی آنے کے بعد ہری چھال کے کیلوں کی بازگشت پھر بھی سنائی نہیں دی اور یہ ذکر ہے 1970ء کی دہائی کا۔ اس کے بعد یہ اصطلاح ذہن کے کسی گوشے میں دفن ہو گئی اور اب اتنے عرصے کے بعد برما میں یہ کیلا کھانے کے بعد ذہن کے کباڑ خانے سے خود بخود برآمد ہو گئی۔

جب آموں کا موسم آیا تو آم بھی پیش کئے گئے۔ ہمارے ایک برمی دوست خاص طور پر ہمارے پاس آئے اور ہمیں آگاہ کیا کہ برما کے آم بہت اچھے ہوتے ہیں اور ہمیں ضرور چکھنے چاہئیں۔ انہوں نے اس چیز کی ضرورت اس لیے محسوس کی کہ ہم ان سے اکثر برمی پھلوں کی شکایت کرتے رہتے تھے۔ برما کے آم واقعی اچھے تھے۔ اس کے علاوہ یہاں کے مینگوسٹن بھی اچھے تھے بشرطیکہ وہ برما کے ہوں اور تھائی لینڈ سے برآمد کئے ہوئے نہ ہوں۔ مینگوسٹن سب سے اچھے تھائی لینڈ میں پائے جاتے ہیں اور پھر ملائشیا میں بھی۔

اب کچھ ذکر کھانے کے علاوہ دوسری چیزوں کا ہو جائے۔ ایک دن ہم ''پٹ روم'' (جہاں بہت سی ٹنکیوں میں مختلف قسم کے ڈرلنگ فلوئڈز رکھے جاتے ہیں) میں گئے تو دیکھا کہ ایک فلپائنی ''پمپ مین'' (جو ان تمام ٹنکیوں کا

حساب کتاب رکھتا ہے) اپنے بٹوے سے اپنی خاندان کی تصویر نکالے بیٹھا تھا اور حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ ہمیں آتا دیکھ کر اس نے وہ تصویر ہمارے سامنے کر دی اور اپنے خاندان کا تعارف کروانے لگا ''یہ میری بیوی ہے۔ یہ میری بڑی بیٹی ہے جس نے میری مرضی کے خلاف شادی کر لی ہے۔ یہ دو ابھی غیر شادی شدہ ہیں۔'' پھر اس نے ہماری طرف مڑ کر کہا ''آپ ان دونوں میں سے کس کے ساتھ شادی کرنا پسند کریں گے؟''

یہ سوال بہت ہی غیر متوقع تھا۔ میں لاجواب ہو کر ہنسنے لگا۔ اس نے مزید کہا ''آپ مجھے بہت معقول انسان لگے اس لیے میں نے آپ کو یہ پیشکش کی۔''

ہم نے دل میں سوچا کہ خدا شکر خورے کو شکر ہی کھانے کو دیتا ہے۔ اس نے ہمارے لیے حلال چیز کا انتظام خود بخود کر دیا۔

پہلے تو ہمیں اس کی یہ جسارت بہت عجیب لگی اور سوچا کہ یہ شخص چونکہ ایک اخلاق باختہ قوم سے تعلق رکھتا ہے اس لیے یہ بات کہہ گیا لیکن پھر خیال آیا کہ ایسا دوسری جگہوں پر بھی ہوتا ہے۔ ایک بار اسی طرح ایک مصری ''پمپ مین'' نے جس کے ساتھ مجھے ابوظہبی میں کام کا اتفاق ہوا ایسی ہی ایک بات کی تھی جو مجھے بہت ناگوار گزری تھی۔ اس نے کہا تھا ''آپ اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کرنا پسند کریں گے۔'' مجھے سخت برا لگا لیکن میں خاموش رہا۔

میں نے ایک بار اس کا تذکرہ اپنے بھائی سے کیا جو مستقل جدّہ میں رہتے ہیں تو انہوں نے کہا ''اس میں برا منانے کی کوئی بات نہیں۔ عربوں میں یہ عام دستور ہے۔ لوگ ایک دوسرے سے یہ بات کہتے ہیں اور کوئی برا نہیں مناتا۔''

اس جہاز پر ایک سہولت بہت اچھی تھی۔ ایک کمرے میں ایک ٹیلی فون لگا ہوا تھا جہاں سے دنیا بھر میں جہاں چاہیں اور جتنی دیر چاہیں بات کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ہمارے کمرے میں انٹرنیٹ کی سہولت بھی موجود تھی۔ ایسا انتظام ہر جہاز پر نہیں ہوتا۔ یہ جہاز کافی بڑا تھا اس لیے خراب موسم میں بھی کم ڈولتا تھا۔ کمرے بہت صاف ستھرے اور آرامدہ تھے البتہ غسل خانے بہت اچھے نہیں تھے۔ ایک چھوٹا سا سینما گھر بھی تھا جہاں فارغ وقت میں لوگ جا کر فلمیں دیکھ سکتے تھے۔ کھانے کا کمرا مناسب تھا اور کھانے بھی اچھے بنتے تھے۔ اس جہاز کا نام ''ہاکوریو۔5'' تھا جس کا مطلب تھا ''وہائٹ ڈریگون''۔ جب ہیلی کوپٹر آتا تو اس کی آمد کا اعلان انگریزی کے علاوہ جاپانی زبان میں بھی کیا جاتا تھا۔ جاپانی اعلان سن کر ہمیں مرحوم معین اختر بہت یاد آتے۔ ایک بار ایک پروگرام میں انہوں نے جاپانی لہجے کی نقل کی تھی اور کمال کیا تھا۔ اس جاپانی جہاز پر ہمارا وقت بہت آرام سے گزرا۔

تین ہفتے پلک جھپکتے گزر گئے اور ہمیں واپسی کی فکر ہوئی۔ نشست ایک ہفتہ پہلے ہی سے مخصوص کرا لینی چاہیے ورنہ بعد میں کئی کئی دن انتظار کرنا پڑتا ہے۔ ہماری لاکھ کوششوں کے باوجود بروقت کارروائی نہ ہو سکی اور ہمیں بتایا گیا کہ ہمیں پانچ دن کوالالمپور میں انتظار کرنے کے بعد کراچی کے لیے جہاز مل سکے گا۔ دراصل پورے ملک میں ''پانی کا تہوار'' منایا جا رہا تھا اور لوگ دس دن کے لیے چھٹیوں پر چلے گئے تھے۔ ہمیں جب ہمارے سفر کی تفصیلات بتائی گئیں تو ہم نے بہت ہنگامہ کیا۔ کوالالمپور میں پانچ دن جہاز کا انتظار کرنا اگرچہ ہمارے لیے مشکل نہیں تھا۔ ہمارے پاس ملائشیا کا ویزا تھا اور ادارے کے خرچ پر پانچ دن ٹھہرنا تھا لیکن پھر بھی ہمیں نامناسب لگا۔ دوسری طرف ہم بنکاک کے راستے کوئی دن ضائع کیے بغیر واپس جا سکتے تھے لیکن اس کے لیے ملائشین ایر لائن کا ٹکٹ ضائع کرنا پڑتا جو ناقابلِ واپسی تھا اور تھائی ائرویز کا نیا ٹکٹ خریدنا پڑتا۔ بہرحال ہمارے اصرار پر ہمارے ادارے نے نیا ٹکٹ خرید کر ہمیں اطلاع کر دی۔

جب ہم واپسی کے سفر پر ینگون پہنچے تو پانی کا تہوار (Water Festival) اپنے عروج پر تھا۔ لوگ ایک دوسرے پر پانی پھینک رہے تھے۔ یہ ایک مذہبی تہوار ہے اس لیے کسی قسم کی مزاحمت کرنا بدتہذیبی سمجھا جاتا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ ینگون کی گلیوں میں ایک لڑکا بستہ لیے جا رہا تھا۔ اچانک ایک گھر سے ایک لڑکی پانی کی بالٹی لیے ہوئے برآمد ہوئی اور اس نوجوان کو جا لیا۔ اس بے چارے نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور اپنا بستہ کاندھے سے اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا تاکہ بھیگنے سے بچ جائے اور چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ اس لڑکی نے بالٹی کے پانی سے اسے شرابور کر دیا۔ کارروائی مکمل ہونے کے بعد لڑکی واپس اپنے گھر میں گھس گئی اور لڑکا چپ چاپ اپنے رستے ہو لیا۔ ہم گاڑی میں بیٹھے یہ منظر دیکھ رہے تھے اور پریشان ہو رہے تھے۔ ہم نے فوراً اپنا پاسپورٹ اور دوسرے ضروری کاغذات اپنی جیب سے

اپنے تھیلے میں منتقل کیے اور منتظر رہے کہ شاید کوئی لڑکی پانی کی بالٹی لیے ہماری گاڑی کے سامنے کھڑی ہو جائے، ہمیں گاڑی سے باہر نکالے اور ہمارے ساتھ وہی سلوک کرے جو ہم نے ابھی ابھی دیکھا تھا لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔

مین روڈ پر اس سے بھی زیادہ خطرناک انتظام تھا۔ جگہ جگہ تھڑے بنے ہوئے تھے جس پر لوگ پانی کے ڈرم لیے کھڑے تھے اور ہر گزرتی گاڑی پر پانی کی بوچھاڑ ڈال رہے تھے۔ ہم نے شیشے چڑھا رکھے تھے لیکن اکثر لوگ کھلی گاڑیوں میں پانی کا لطف لے رہے تھے۔ یہ اچھا تھا کہ شیشے کھلوا کر پانی نہیں ڈال رہے تھے ورنہ مشکل ہو جاتی۔ ان تھڑوں کے سامنے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں سے بھری گاڑیاں خود ہی رک کر پانی ڈلوا رہی تھیں جس کی وجہ سے پیچھے آنے والی گاڑیاں بھی رک جاتی تھیں۔ ہم دل میں یہ سوچ سوچ کر ڈر رہے تھے کہ کہیں ان حالات میں گاڑی کے شیشے چڑھائے رکھنا بد تہذیبی کے زمرے میں نہ آتا ہو، مبادا کوئی ہماری گاڑی کے شیشے توڑ دے لیکن ایسا نہیں تھا۔ ہم نے محسوس کیا کہ پانی وہیں ڈالا جاتا تھا جہاں آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی تھی۔ غیر ملکیوں سے تعرض نہیں کیا جاتا تھا۔

دفتر پہنچ کر ہم نے تھنڈر بو پر اس تہوار کے حوالے سے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ جب وہ تمام سوالوں کے جواب دے چکیں تو ہم نے اتمام حجت کے طور پر سامنے رکھی ہوئی پانی کی بوتل کی طرف اشارہ کر کے کہا "اگر ہم یہ بوتل اٹھا کر آپ کے سر پر انڈیل دیں تو آپ کا کیا ردِ عمل ہوگا؟"

انہوں نے نہایت سکون سے مسکراتے ہوئے کہا: "میں آپ سے کچھ بھی نہیں کہوں گی۔" ہم نے پوچھا۔ "اس کی وجہ کیا ہے؟ لوگ کیوں اعتراض نہیں کرتے؟"

انہوں نے بتایا "اس بات پر اعتراض کرنا بد تہذیبی اور غیر مذہبی تصور کیا جائے گا۔"

ہم نے کچھ سوچ کر تھنڈر بو پر پانی ڈالنے کا ارادہ ترک کر دیا اگرچہ "رسمِ دنیا بھی تھی، موقع بھی تھا، دستور بھی تھا"۔ ہو سکتا ہے انہوں نے دل ہی دل میں ہمیں بد تہذیب جانا ہو۔ لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ انہوں نے بھی ہم پر پانی ڈالنا مناسب نہیں سمجھا شاید ہمیں بد مذہب سمجھتی ہوں۔

ایک رات ہوٹل رائل پارک میں گذارنے کے بعد دوسرے دن جب ہم ہوائی اڈے جانے لگے تو تھنڈر بو ہمارے ساتھ ہی گاڑی میں سوار ہو گئیں۔ گاڑی کا انتظام کرنا ان کے ذمے تھا اس لیے وقتِ رخصت وہ گاڑی بان کے ساتھ ہمیشہ حاضر رہا کرتی تھیں اور ہمیں ہوٹل کے لاؤنج سے الوداع کہا کرتی تھیں اس لیے ہم نے حیرت سے پوچھا "آج کیا ارادہ ہے؟ کیا ہوائی اڈے پر الوداعی تقریب ہوگی؟"

انہوں نے کہا "آج کل پانی کا تہوار چل رہا ہے۔ دفتر میں چھٹیاں ہیں۔ میں خاص طور پر آپ کے لیے آئی تھی۔ میرے بھائی کا گھر ہوائی اڈے کے قریب ہی واقع ہے۔ سوچا آپ کو رخصت کرنے کے بعد اس کے گھر چلی جاؤں۔"

ہم نے کہا "یہ بہت اچھا ہے۔ آپ سے پانی کے تہوار پر کچھ اور باتیں ہو جائیں گی۔"

راستے میں ایک جگہ کچھ بچوں اور بچیوں نے ہماری گاڑی کو روک لیا اور کچھ کہنے لگے۔ وہ سب بہت خوش تھے۔ بارش ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ بھیگنے بھگونے کا انتظام بھی ان لوگوں نے کر رکھا تھا۔ ہماری گاڑی کے شیشے بند تھے اس لیے ہم بھیگنے سے بچ رہے۔ ہم نے تھنڈر بو سے پوچھا "یہ بچے کیا کہہ رہے ہیں؟"

انہوں نے کہا "کوئی خاص بات نہیں۔ بس خوش ہو رہے ہیں اور آپ کو اپنی خوشی میں شریک کرنا چاہ رہے ہیں۔"

ہم نے ان بچوں کی تصویریں بند شیشے میں سے اتاریں اور آگے بڑھ گئے۔ انہوں نے زبردستی ہمیں بھگونے پر اصرار نہیں کیا۔ ہم لوگ خیریت سے ہوائی اڈے پہنچ گئے۔

جہاز میں بیٹھنے کے بعد ہمارا خیال تھا کہ ہم خیریت سے بغیر بھیگے برما سے واپس لوٹنے میں کامیاب ہو گئے ہیں لیکن یہ ہمارا خام خیال تھا۔ پاکستان پہنچتے ہی جب ہم نے برما کے سفارت خانے سے اپنے اگلے ماہ کے ویزے کے لیے رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ سفارت خانہ پانی کے تہوار کے سلسلے میں بند ہے۔ ایک ہفتے بعد کھلے گا۔ ایک ہفتے کے بعد درخواست تو قبول کر لی لیکن ویزا لگانے میں بہت دیر کر دی جس کی وجہ سے ہم اگلی بار اپنے کام پر بروقت نہیں پہنچ سکے۔ یہ سب تاخیر غالباً پانی کے تہوار کی وجہ سے تھی۔

ایور گرین

انور فرہاد

اس لاہوری کڑنے دم آخر تک بولی ووڈ کے پردۂ سیمیں پر راج کیا۔ بڑھاپے میں قدم رکھنے کے بعد بھی مرکزی کردار ادا کر کے ثابت کیا کہ فلم بین اداکاری دیکھتے ہیں عمر نہیں۔ اس کی ہیروئنیں عمر میں اس سے 25 سال چھوٹی ہوتیں مگر وہ اپنی اداکاری کے ایسے جوہر آزماتا کہ یہ بدنمائی کہیں سے بھی بری نہ لگتی اور فلم بین اس کی تعریف کرتے ہوئے ہال سے باہر آتے، فلم سپرہٹ ثابت ہوتی۔

اپنے دور کے ایک سپر اسٹار کی حالات زندگی

کچھ لوگوں کی یہ سوچ ہے کہ فلم دیکھنا اور فلم والوں کے بارے میں باتیں کرنا وقت کا زیاں ہے۔ ایسے لوگوں میں ہمارے دوست علی سید بھی شامل تھے مگر اب نہیں ہیں۔ ان کی سوچ اور فکر میں اب نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے۔ ایک دن کہنے لگے۔

”یار! میرا یہ سوچنا شاید درست نہیں تھا کہ فلم دیکھنے والے اور فلم والوں کے بارے میں باتیں کرنے والے یا پڑھنے والے نرے جاہل اور بے کار لوگ ہوتے ہیں جن کے

پاس کوئی کام نہیں ہوتا۔ یہ انہی کا مشغلہ ہوتا ہے۔"

"شاید نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "یہ صد فیصد حقیقت ہے کہ نہ ہی تمام فلم دیکھنے والے بے کار ہوتے ہیں نہ ہی ناخواندہ۔ بلکہ یہ کہا جائے تو زیادہ درست ہوگا کہ پڑھے لوگ ہی زیادہ فلم دیکھتے ہیں۔ کیوں کہ فلم بنانے والے لوگ بھی پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی فلم انڈسٹری میں خاصے پڑھے لکھے لوگ تھے اور اب بھی ہیں۔ وحید مراد اور حبیب کی طرح کئی ایم اے پاس فنکار اور تکنیک کار تھے اور ہیں۔ دوسری طرف بھارتی فلمی صنعت سے بھی وابستہ بہت سے افراد اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور اب بھی ہیں۔ تم نے دیو آنند کا نام تو سنا ہوگا نا؟"

"ہاں سنا ہے بلکہ اسکول کے زمانے میں ان کی چند فلمیں بھی دیکھی ہیں۔"

"تو بالی ووڈ کا یہ ایور گرین اسٹار ایم اے ان انگلش لٹریچر تھا۔ وہ تو سوچتا بھی انگریزی میں تھا اور لکھتا بھی انگریزی میں تھا۔ اس کے لکھے ہوئے انگریزی اسکرپٹ کو ہندی میں ترجمہ کیا جاتا تھا۔ بے پناہ فلمی مصروفیات کے باوجود وہ مطالعہ کا دلدادہ تھا اور فرصت ملتے ہی بڑے بڑے ادیبوں کی کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ اس کا دفتر کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔"

"میں نے اسکول کے زمانے میں ان کی جو فلمیں دیکھی تھیں۔ ان میں "سولہواں سال" اور "ٹیکسی ڈرائیور" مجھے اب بھی یاد ہیں۔" اتنا کہہ کر وہ مسکرائے اور گویا دل ہی دل میں مزہ لیتے ہوئے بولے۔ "ٹیکسی ڈرائیور" میں ان کی ہیروئن کلپنا کارتک تھیں۔ فلم کی ابتدا میں انہیں ایک لڑکے کے روپ میں دکھایا گیا تھا۔ حالات سے مجبور ہو کر انہیں کلینر کی ملازمت کرنی پڑی تھی۔ ایک دن ٹیکسی ڈرائیور صاحب یعنی دیو آنند ان سے کہتے ہیں۔

"ابے! یہ تو لڑکیوں کی طرح شرماتا لجاتا رہتا ہے۔ مرد بن، گالیاں نکال۔" کلپنا کے لیے مرد بننا اور گالیاں نکالنا بڑا مشکل کام تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے کہا۔ "تم......پا......پی......ہو۔"

"اس لڑکے نما لڑکی کا اس طرح "تم پاپی ہو" کہنا اتنا بھلا لگا تھا کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں درد ہو گیا تھا۔ آج بھی جب کبھی وہ منظر یاد آتا ہے مسکرائے بغیر نہیں رہتا۔"

"ہاں، وہ منظر واقعی ایسا تھا کہ ہر تماشائی ہنسنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ اس دور کے ڈائریکٹر اور اسکرپٹ رائٹر انسانی نفسیات پر ایسی گہری نظر رکھتے تھے کہ اس کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔ دیکھو اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد آج بھی اس منظر کی شگفتگی تمہارے ذہن پر برقرار ہے۔ کیا ایسی فلمیں بنانے والے جاہل تھے؟"

"نہیں، ہرگز نہیں۔ یہ تو بہت روشن دماغ لوگ ہی ہو سکتے ہیں۔ مجھے تو یاد ہی نہیں کہ اس فلم کا ڈائریکٹر کون تھا؟"

"ٹیکسی ڈرائیور" کے ہدایت کار چیتن آنند تھے جو دیو آنند کے بھائی تھے جب کہ اس میں کلپنا کارتک کے علاوہ شیلا رامانی اور جانی واکر نے بھی اہم کردار ادا کیے تھے۔ یہ فلم 1954ء میں ریلیز ہوئی تھی جب کہ "سولہواں سال" کے ڈائریکٹر راج کھوسلہ تھے۔ اس فلم میں وحیدہ رحمان دیو آنند کی ہیروئن تھیں۔ یہ بھی ایک صاف ستھری دلچسپ فلم تھی۔ آج بھی خوب صورت فلموں میں اس کی مثال دی جاتی ہے۔ یہ فلم 1958ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔"

"ارے واہ! اتنی پرانی باتیں تمہیں اب بھی یاد ہیں۔" سید صاحب پُرجوش انداز میں بولے۔ "میں تو یہی سمجھتا تھا کہ ان فلموں کی چند ایک باتیں جو مجھے یاد ہیں یہ میرا کمال ہے۔"

"سید صاحب! اس میں کمال تمہارا یا ہمارا نہیں، کمال تو ان باکمال لوگوں کا ہے کہ جنہوں نے ایسی فلمیں بنائیں جن پر گزرتے ہوئے وقت کی دھول نہیں جم سکی۔"

"ہاں۔" کہہ کر وہ رکے۔ پھر ذرا توقف کے بعد بولے۔ "کتنے دن ہو گئے، تم ہماری طرف نہیں آئے۔ دادا ابو بھی تمہیں پوچھ رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ کیا تمہاری ان سے کچھ اَن بن ہو گئی ہے کہ انہوں نے اِدھر کا رخ کرنا چھوڑ دیا ہے؟"

"پھر تو یار! مجھے ان کا نیاز حاصل کرنے کے لیے وقت نکالنا ہی پڑے گا۔" اور چند روز بعد ہی میں سید صاحب کے ساتھ دادا جی کے سامنے موجود تھا۔ پہلے تو پیار بھرے انداز میں ڈانٹ ڈپٹ کی کہ تم ایک دم کہاں غائب ہو گئے تھے۔ تم ان کا۔ انہوں نے سید کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ انتظار نہ کیا کرو کہ وہ لائیں گے تو تم آؤ گے۔ ارے میاں! خود ہی چلے آیا کرو۔ تم سے مل کر باتیں کر کے بڑا سکون ملتا ہے۔ یہ تو۔ انہوں نے پھر سید صاحب کی طرف دیکھ کر کہا۔ بے چارے لنڈورے ہیں۔ ادب اور ثقافت پہ بات نہیں کرتے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اب ان میں بھی

آرٹ اور کلچر سے دلچسپی کی کونپلیں پھوٹنے لگی ہیں۔“

”اچھا۔“

”جی ہاں۔ ابھی چند روز پہلے کی بات ہے۔ دیو آنند کی فلموں کی باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے اسکول کے زمانے میں دیو کی کچھ فلمیں دیکھی تھیں۔ ان کی کچھ باتیں انہیں آج بھی یاد ہیں۔“

”یہ تو تمہاری بری صحبت کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔“ دادا جی نے شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”ورنہ یہ مولانا تو فلم دیکھنے والوں کو گناہ گار ہونے کا فتویٰ دیا کرتے تھے۔“

میں نے موقع مناسب دیکھ کر ان سے پوچھا۔ دادا جی! ایک گانا ہے۔

یہ رات یہ چاندنی پھر کہاں، سن جا دل کی داستاں

شاید ہیمنت کمار کا گایا ہوا ہے۔ آپ کے خیال میں کس کا ہے؟

”ہاں، ہیمنت کمار ہی کا ہے اور اس کے یادگار گیتوں میں سے ایک ہے۔ اس گیت کے موسیقار ایس ڈی برمن اور نغمہ نگار ساحر لدھیانوی تھے اور فلم تھی ’جال‘ یہ گانا دیو آنند پر پکچرائز ہوا تھا۔ یہ گیت جتنا خوب صورت ہے دیو آنند نے اس کی پکچرائزیشن میں اتنی ہی پُراثر اداکاری کی تھی۔“

”دیو آنند کیسا اداکار تھا؟“ سید صاحب ایک دم پوچھ بیٹھے۔

”میاں! تم نے تو اپنے لڑکپن ہی میں سہی، اس کی کچھ فلمیں دیکھی ہیں۔ پہلے تم بتاؤ وہ تمہیں ان میں کیسا لگا تھا۔ پھر میں بتاؤں گا۔“

”دادا ابو! بات بہت پرانی ہے۔ اس کے باوجود اس کی بہت سی باتوں کی شگفتگی اب تک برقرار ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ مسکرائے پھر بولے۔ ”ٹیکسی ڈرائیور“ میں جب وہ کلپنا کارتک سے کہتے ہیں۔ ”ابے مرد بن۔ کیا لونڈیوں کی طرح شرماتا رہتا ہے۔ چل مردوں کی طرح گالیاں نکال۔“ اس موقع پر کلپنا کارتک جولڑکے کے روپ میں ہوتی ہے۔ بڑی دقت کے ساتھ گالی نکالتی ہے۔ ”تم...... پاپی...... ہو۔“ اس پر دیو جی نے جو ری ایکٹ کیا وہ دیکھنے کے قابل تھا۔ تماشائیوں کے لیے تو یہ لوٹ پوٹ کر دینے والا منظر تھا مگر دیو آنند سر پیٹ رہے تھے۔ ان کی اداکاری دیدنی تھی۔“

”یہ اس کے اچھے اور بڑے اداکار ہونے کا ثبوت ہے کہ اس کی اداکاری اتنے دنوں بعد بھی تمہیں متاثر کر رہی ہے۔ حقیقتاً وہ بہت بڑا پرفارمر تھا۔“ وہ ذرا رک کے پھر ہم دونوں کی طرف دیکھ کر بولے۔ ”اس کے بڑے فنکار ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے اس وقت کے دو ٹاپ کے اداکاروں دلیپ کمار اور راج کپور کی موجودگی میں اپنے آپ کو منوایا۔ اس کی مثال ہمارے ندیم بیگ جیسی ہے جس نے وحید مراد اور محمد علی کے عروج کے دور میں فلم انڈسٹری میں قدم رکھا اور جلد ہی ان کی ٹکر کا اداکار بن گیا۔“

”اپنے آپ کو منوانا کوئی آسان کام نہیں ہوتا اور وہ بھی سپر اسٹارز کی موجودگی میں۔ دیو آنند کی خوش نصیبی تھی کہ اسے ہاؤس نمبر 44، پاکٹ مار، فنٹوش، اور سی آئی ڈی جیسی باکس آفس سپر ہٹ فلمیں اس دور میں ملیں جن میں اسے اپنی فنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کرنے کا موقع ملا اور ناظرین اور ناقدین نے اس کی اداکارانہ خوبیوں کا دل کھول کر اعتراف کیا اور انہوں نے ہی اسے ٹاپ کے فنکاروں کا ہم پلہ قرار دیا۔“

”اداکاری تو ہر اداکار کو کہانی کی ڈیمانڈ کے مطابق کرنی پڑتی ہے۔“ میں پوچھ بیٹھا۔ ”مگر دیو جی میں کون سی ایسی بات تھی جس نے ان کو نمایاں کیا؟“

”ظاہر ہے، ہر اداکار میں کوئی خاص بات ہوتی ہے جو اس کی شخصیت کو نئے انداز میں ابھارتی ہے۔ دیو آنند کی خصوصیت اس کی ڈائیلاگ ڈلیوری تھی۔ وہ ایک خاص انداز میں اور کسی قدر انگریزی زدہ رومانی لہجے میں مکالمے ادا کرتا تھا۔ جو اس دور کے فلم بینوں کے لیے ایک نئی چیز تھی اس لیے وہ اس کے اس انداز سے متاثر ہوئے۔“

”دادا ابو! آپ نے ابھی دلیپ کمار اور راج کپور کی بات کی ہے، دیو جی چھلانگ لگا کر جن کے ہم پلہ بن گئے۔ ان تینوں کو کس چیز نے بھارتی فلم انڈسٹری میں انوکھا بنایا تھا؟“ سید نے بڑا فکر انگیز سوال کر دیا تھا۔

”اس مقصد کے لیے مجھے ان تینوں کی شخصیت کے تضادات اور مشابہت کا جائزہ لینا ہوگا۔“ دادا جی بولے۔ ”تینوں نے اپنے کیریئر کا آغاز تقریباً اس دور میں کیا جب متحدہ ہندوستان تقسیم ہونے والا تھا۔ راج کپور 1935ء میں چائلڈ اسٹار کی حیثیت سے فلموں میں آئے مگر اپنی عمر کی بڑھوتی کے ساتھ بہت جلد ایک انقلابی اداکار کے طور پر مشہور ہو گئے۔

دلیپ کمار نے 1944ء میں بومبے ٹاکیز کی فلم ”جوار بھاٹا“ سے اپنے فلمی کیریئر کا آغاز کیا جب کہ دیو آنند 1946ء میں ”ہم ایک ہیں“ نامی فلم کے ذریعے متعارف

ہوئے۔

"اس وقت کے فیشن کے مطابق ان تینوں نے اپنے اصل نام تبدیل کر دیے۔ یوسف خان دلیپ کمار بن گئے۔ رن ویر راج کپور نے اپنا نام مختصر کر کے راج کپور پر اکتفا کیا تو دھرم دیو پشوری مل آنند نے بھی اپنے طول طویل نام کو مختصر کر دیا اور صرف دیو آنند کہلائے۔ تینوں اداکاروں میں بہت یکسانیت تھی مگر ہر ایک کو سینما پر اس کے تعاون اور اچیومنٹ کے حوالے سے تسلیم کیا گیا۔ تینوں کو پدم بھوشن اور دادا بھائی پھالکے جیسے غیر معمولی ایوارڈز سے سرفراز کیا گیا۔ ان تینوں نے اپنے اپنے طور پر ہندوستانی سینما کے لیے نئے راستے کھولنے کی کوشش کی۔ راج کپور نے 24 سال کی عمر میں "آوارہ" جیسی فلم بنائی۔ جس کو ایشیا بھر میں بھرپور پذیرائی ملی۔ اس کے بعد وہ اپنی فلم کے عملے کو لے کر پہلی رنگین فلم کی یورپی ممالک میں شوٹنگ کے لیے گئے۔ دوسرے فلمسازوں نے اس ٹرینڈ کو بعد میں فالو کیا اور غیر ملکی لوکیشن پر زیر شوٹنگ کرنا شروع کی۔ دلیپ کمار نے "گنگا جمنا" پروڈیوس کی تو ایسا ڈراما پیش کیا جو نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود آج بھی اپنے انداز میں نیا پن لیے ہوئے ہے۔ ان دونوں کی طرح دیو آنند بھی تخلیقی ذہن کے مالک تھے۔ انہوں نے سرحدوں سے پار اٹھ کر ایسی تھیم اپنائیں جنہیں دوسرے فلم سازوں نے بعد میں اپنایا۔ "ہرے راما ہرے کرشنا" میں انہوں نے نوجوانوں میں منشیات کے بلا روک ٹوک استعمال کا ایشو اٹھایا تو دوسری طرف ہندوستان میں جنگ کی مخالفت میں "پریم پجاری" بنائی جس پر انہیں اعتراضات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ جہاں تک نئے اداکاروں اور تکنیک کاروں کو سینما پر متعارف کرانے کی بات ہے تو اس کام میں تینوں مختلف نظر آتے ہیں۔ دلیپ کمار کسی قابلِ ذکر ٹیلنٹ کو متعارف کرانے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ راج کپور نے شنکر جے کشن جیسی موسیقار جوڑی دی۔ اپنے بیٹوں رندھیر اور رشی کو متعاف کرایا۔ ڈمپل کپاڈیا اور مندا کنی کو لائے۔ تاہم دیو آنند اس معاملے میں اپنے دونوں ہم عصروں سے سبقت لے گئے۔ انہوں نے اپنی تقریباً ہر فلم میں نئے چہروں کو پیش کیا۔ جیکی شیروف، ریچا شرما، زینت امان، ٹینا منیم، گوتم سرین، ستیش کول وغیرہ ایسے نام ہیں جنہیں دیو آنند نے فلموں کی زینت بنایا اور جو آگے چل کر مشہور ہوئے۔ اپنی نجی زندگی میں ان تینوں اداکاروں نے اپنی ہیروئنوں سے پیار کیا لیکن یا تو ان کا دل توڑا گیا یا انہوں نے دل توڑنے کا کام کیا۔ راج کپور نے پدمنی، وجنتی مالا اور نرگس سے محبت کی لیکن انہیں اپنا بنانے کی بجائے شادی کسی اور سے کی۔ دلیپ کمار نے مدھو بالا سے عشق کیا مگر شادی کے بندھن میں نہیں باندھا۔ دیو آنند نے ثریا، وحیدہ رحمان اور زینت امان سے محبت کی پینگیں بڑھائیں لیکن شادی کلپنا کارتک سے رچائی۔"

"دادا جی!" میں نے انہیں مخاطب کیا۔ "ان تینوں کے فلمی کرداروں سے متعلق کچھ بتائیں۔"

"اس سلسلے میں دیو آنند نے زیادہ تر تعمیری اور سنجیدہ کردار کیے۔ ان کی ابتدائی فلموں کا اختتام دردناک ہوتا تھا جو زیادہ تر ان کے چاہنے والوں کی طرف سے مسترد کر دیا گیا مگر جب ان کو ہلکی موسیقی کے ساتھ رومینٹک فلموں میں آزمایا گیا تو ناظرین کی طرف سے بھرپور پذیرائی ملی۔ "گائیڈ" ان کی واحد فلم تھی جس میں وہ مر جاتے ہیں لیکن تماشائیوں نے اسے سراہا۔ اس پذیرائی کے باوجود انہوں نے کوئی ایسا کردار قبول نہیں کیا جس میں انہیں مرتا ہوا دکھایا جائے۔ اس ضمن میں راج کپور نے اپنے کیریئر کے ابتدائی دور میں لیفٹسٹ خیالات رکھنے والے کہانی کاروں کو اہمیت دی۔ انہوں نے اشتراکی تھیم کو فلمی کہانیوں سے جوڑا اور اسے اس وقت تک اختیار کیے رکھا جب تک کہ لوگوں نے اس کام کو قبول نہیں کر لیا۔ اس سلسلے میں دلیپ کمار کے بارے میں یہ کہوں گا کہ انہوں نے زیادہ تر ٹریجڈی رولز کیے۔ ان کی موت کے مناظر لوگوں کو رلا دیا کرتے تھے۔ اپنے پرستاروں کے ساتھ تینوں ٹاپ ایکٹرز کا سلوک الگ طرح کا رہا۔ دلیپ نے مداحوں سے اپنے آپ کو دور رکھا۔ وہ عوام میں کم لیکن خواص سے زیادہ گھلتے ملتے تھے۔ ٹاپ کے شاعر اور ادیب ان کے دوست ہوتے تھے اور زیادہ سے زیادہ ان کے ملاقاتی ہوتے تھے۔ ان سے مل کر وہ خوش ہوتے تھے۔ جب کہ راج کپور کے حلقۂ احباب میں روسی نظریات رکھنے والے انقلابی نمایاں تھے۔ خواجہ احمد عباس جیسے لوگوں سے ان کی قرابت داری رہی۔ عوام میں جاتے تو یوں ظاہر ہوتا جیسے کوئی انقلابی لیڈر آ گیا ہو۔"

ان دونوں کے مقابلے میں دیو آنند لوگوں کے دلوں کے زیادہ قریب رہے۔ جب وہ پبلک میں جاتے تو لوگ ان کے مشہور گانے گاتے اور دیو جی پبلک کے ساتھ ہی انجوائے کرتے۔

اتنا کچھ کہنے کے بعد دادا جی تھک گئے تھے۔ انہوں

نے رک کر پانی کا گلاس اٹھایا اور دو چار گھونٹ پی کر گلاس رکھا تو سید صاحب بول اٹھے۔ ”دادا ابو! آپ نے دیو جی کی فلم ”پریم پجاری“ کا ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ یہ فلم جنگ کی مخالفت میں اور امن کی آشا کے لیے بنائی گئی تھی مگر اس کو اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا اور اسی لیے یہ فلم کامیاب نہ ہو سکی۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اس فلم پر اعتراض کی کیا وجہ تھی؟ پوری دنیا امن کی خواہاں ہے۔ اس لحاظ سے تو اس فلم کی زبردست پذیرائی ملنی چاہیے تھی۔“

دادا جی پانی پی کر تازہ دم ہو چکے تھے۔ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے بولے۔ ”مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم دلچسپی کے ساتھ ہماری باتیں سن رہے ہو۔ تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ بے شک یہ ایک زبردست تھیم ہے جس پر ”پریم پجاری“ جیسی فلم بنائی گئی مگر ہر کام کا ایک مناسب وقت ہوتا ہے۔ یہ فلم ایسے وقت ریلیز کی گئی جب بھارت اور چین کی سرحدوں پر سخت کشیدگی تھی۔ سرکار کی طرف سے چین مخالف پروپیگنڈہ عروج پر تھا اور بھارت کو بچانے کے لیے قوم کے بچے بچے سے چین کے خلاف جنگ کی اپیل کی جا رہی تھی۔ اب تم ہی سوچو ایسے وقت میں دیو آنند کی اپیل کیسے پُراثر ہوتی؟ ان کا پیغام محبت اور جنگ سے نفرت کسی پر کیونکر اثر انگیز ہوتا؟ اگر یہ فلم اس موقع پر نمائش پذیر نہ ہوتی امن اور شانتی کے زمانے میں دکھائی جاتی تو اس کی زبردست پذیرائی ہوتی۔ اس وقت جب بھارت میں جنگی ترانے بجائے جا رہے تھے اور قوم کو جنگ کے جنون میں مائل کیا جا رہا تھا۔ اس فلم کو اس کے برخلاف سمجھ کر مسترد کر دیا گیا۔

دادا جی نے ابھی اپنا جواب مکمل ہی کیا تھا کہ میں نے ایک اور سوال پوچھ لیا۔ ”دادا جی ان تینوں سپر اسٹارز کی نجی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے کہا ہے کہ تینوں نے اپنی ہیروئنوں سے پیار کیا لیکن ان سے بے وفائی کی۔ شادی کسی اور سے کی۔ اس ضمن میں ثریا کا ذکر بھی آیا۔ یہ کیا قصہ تھا کچھ ہمیں بھی بتائیے۔“

میرا خیال ہے کہ شاید خالد علی کو علم نہ ہو مگر تمہیں تو اس بارے میں معلوم ہوگا مگر شاید تم مجھ سے سننا چاہتے ہو تو سنو۔ قصہ یہ ہے کہ دیو آنند اپنی صحت، تندرستی اور پُرکشش شخصیت کی وجہ سے فلم کا ہیرو بننے سے پہلے ہی ہیرو سمجھے جاتے تھے۔ کالج کے زمانے میں ان کے دوست انہیں ”ہیرو“ کہہ کر ہی پکارتے تھے۔ ایسے میں لڑکیاں ان سے

کیونکر متاثر نہ ہوتیں؟ جب کہ اپنی انہی خصوصیات کی وجہ سے وہ خود بھی دل پھینک واقع ہوئے تھے۔ اگرچہ وہ کہتے ہیں کہ ثریا ان کی پہلی محبت تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ لاہور سے ممبئی آنے سے پہلے وہ اپنے کالج کے پرنسپل کی بیٹی اوشا چوپڑا کو دل دے بیٹھے تھے مگر جب اپنے بہتر مستقبل کے لیے وہ ممبئی گئے تو اوشا کو یاد نہ رکھا۔ تم نے ثریا کے بارے میں پوچھا ہے تو یہ قصہ یوں ہے کہ 40ء کی دہائی میں جب ثریا اپنے عروج پر تھی اور بڑی اور معیاری فلمیں ہی کیا کرتی تھی۔ جب کہ دیو آنند نے بالی ووڈ میں اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا ابھرتے ہوئے آرٹسٹوں کی خواہش ہوتی ہے کہ انہیں ٹاپ اسٹارز کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملے تاکہ انہیں بڑی کامیابی حاصل ہو۔ یہ دیو کی خوش قسمتی تھی کہ 1948ء میں انہیں فلم ”ودیا“ میں ثریا کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ اس فلم کے لیے ایک گانے کی شوٹنگ کشتی پر ہو رہی تھی۔ جس کے بول تھے

کنارے کنارے چلے جائیں گے

مگر کشتی کنارے سے دور تھی تو اس کا توازن بگڑا اور ثریا پانی میں جا گری اور ڈوبنے لگی تھی کہ دیو آنند نے حقیقی ہیرو کا کردار ادا کرتے ہوئے پانی میں چھلانگ لگائی اور منہ زور موجوں سے لڑتے ہوئے بڑی بہادری کے ساتھ اپنی ہیروئن کو بچا لیا۔ ثریا کو موت کے منہ سے چھین کر کنارے لائے تو یونٹ کے تمام لوگوں نے ان کی پیٹھ تھپتھپائی، ان کی تعریف کی جب کہ ثریا لاہوری بابو کی اس ادا پر دل و جان سے فدا ہو گئی کہ اس نے اپنی جان کی پروا کیے بغیر اس کی جان بچا لی۔“ دادا جی ذرا رکے۔ پھر ہماری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔ ”وہ جو کہتے ہیں کہ عشق اول در دل معشوق پیدا می شود۔ تو کچھ یہی کیفیت وہاں بھی تھی۔ دیو آنند ان دنوں بڑا چھیل چھبیلا ہوا کرتا تھا۔ ثریا کے دل کی دھڑکنیں پہلے تو کسی نے محسوس نہیں کیں۔ پھر اس کی حرکات و سکنات سے آہستہ آہستہ یہ بھید کھلتا گیا تو نہ صرف ان کے قریب کے فلمی لوگوں نے بلکہ خود دیو آنند نے بھی محسوس کر لیا کہ فلموں کی یہ بڑی ہیروئن اسے اپنی نجی زندگی کا ہیرو سمجھنے لگی ہے۔“

”ودیا“ کے بعد چھ فلموں میں کیے بعد دیگرے ثریا کے ساتھ دیو آنند کو بھی کاسٹ کیا گیا۔ یہ فلمیں جیت، شاعر، افسر، نیلی، دو ستارے اور صنم تھیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ثریا کی وجہ سے اس نئے ہیرو... کو ان فلموں میں کاسٹ کیا گیا۔ ان فلموں میں ثریا جیسی ٹاپ اداکارہ کے ساتھ کام کرنا ہی دیو جی کی کچھ کم خوش نصیبی تھی کہ سونے پر سہاگہ یہ ساری

فلمیں باکس آفس پر ہٹ ہوگئیں۔ برصغیر میں یہ ریت ہے کہ فلم ہٹ ہو تو اس میں کام کرنے والے بھی ہٹ ہو گئے۔ ایک طرف نیا نویلا ہیرو اس بات پر خوش تھا دوسری طرف اسے جب اس بات کا یقین ہوگیا کہ ثریا جیسی سپر اسٹار اس کو چاہنے لگی ہے تو اس کی خوشیوں کی انتہا نہیں تھی مگر ایک دم کچھ گڑ بڑ گھوٹالا ہوگیا۔ کچھ فلمی ساتھیوں نے جن میں درگا کھوٹے اور کامنی کوشل نمایاں تھیں۔ اس خفیہ عشق کا راز فاش کردیا۔ اخبار والوں کو تو اللہ دے اور بندہ لے۔ اس خبر کو جانے کس کس انداز سے شائع کیا گیا۔ ایک عالم کو پتا چل گیا کہ ثریا اور دیو آنند گوڈے گوڈے تک عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

دریں اثنا یہ ہوا کہ فلم ''جیت'' کے سیٹ پر دیو آنند نے ہمت کر کے ثریا کو شادی کی پیش کش کردی۔ اس کی طرف سے انکار نہیں ہوا تو تین ہزار مالیت کی ڈائمنڈ رنگ ثریا کو پہنا دی۔ دونوں راضی تھے تو شادی ہو جانی چاہیے تھی مگر ایسا نہیں ہوا۔ فلموں میں جس طرح ایک ولن ہوتا ہے اسی طرح ان کی نجی زندگی میں بھی ایک ولن نے نمودار ہو کر کہا۔ ''یہ شادی نہیں ہو سکتی۔'' یہ ولن ثریا کی نانی تھیں۔ دونوں کے لو افیئر کی کہانی اخباروں میں پڑھ کر ثریا کے گھر پر پہلے ہی سخت کشیدگی کا ماحول تھا۔ ثریا نے جب انگیجمنٹ کی انگوٹھی دکھا کر کہا۔ ''ہم نے شادی کا فیصلہ کرلیا ہے۔'' تو اس کے گھر میں بھونچال آگیا۔

نانی نے آسمان سر پر اٹھا لیا کہ یہ شادی کسی صورت نہیں ہو سکتی۔

''کیوں نہیں ہو سکتی؟'' ثریا نے پوچھا تو جواب ملا۔

''تم مسلمان ہو اور وہ ہندو۔ کیا یہ وجہ کافی نہیں؟ ہم ہرگز یہ رشتہ قبول نہیں کریں گے۔''

''تعجب ہے، ان دونوں پریمیوں نے ظالم سماج کے خلاف آواز بلند نہیں کی۔ احتجاج نہیں کیا!'' سید صاحب ٹوکے بغیر نہیں رہے۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔'' دادا جی بولے۔۔۔ انہوں نے بھی کوشش کی اور ثریا کی ماں نے بھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ دو چاہنے والے ایک ہو جائیں مگر ان کی ماں یعنی ثریا کی نانی کی گرفت پورے خاندان پر بہت مضبوط تھی۔ تم نے احتجاج کے بارے میں پوچھا ہے نا۔ تو دیو آنند نے اس کی کوشش کی تھی اور اپنی ہیروئن سے کہا تھا۔

تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کردو۔

ایک بار فون پر وہ اپنی محبوبہ کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ''محبت کی خاطر تمہیں جنگ کرنی چاہیے۔'' اسے شومئی قسمت کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس موقع پر نانی صاحبہ ٹپک پڑیں اور انہوں نے ثریا کے ہاتھ سے ریسیور چھین کر دیوجی کی اچھی طرح خبر لی اور دھمکی دی کہ اگر ہماری بچی کو بہکانے کی کوشش کی تو تمہیں ہم کہیں کا نہ چھوڑیں گے۔ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوگا اس کے ذمہ دار تم خود ہوگے۔ دیو آنند کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ نانی جو کچھ کہہ رہی ہیں اس پر عمل بھی کر سکتی ہیں۔ اس دھمکی سے پہلے ہی وہ ثریا کے ساتھ اس کے کام کرنے پر پابندی لگا چکی تھیں۔ اس ضمن میں ''دو ستارے'' ان دونوں کی آخری مشترکہ فلم تھی۔ ان حالات میں دیو آنند کافی عرصہ تک ثریا سے مل نہیں سکے مگر دونوں جدائی کی آگ میں جھلسے جا رہے تھے۔ ماں پھر ماں ہوتی ہے ثریا کی ماں نے ثریا کو اس عذاب سے بچانے کے لیے ایک کوشش کی۔ ثریا کے ذریعے ہی دیو آنند کو ایک خفیہ ملاقات پر آمادہ کیا۔ ان دنوں ثریا ایک چھ منزلہ عمارت کی نچلی منزل میں رہا کرتی تھی۔ جب آنند جی وہاں پہنچے تو ثریا کی ماں نے ان سے کہا۔ ''ثریا عمارت کی چھت پر ہے جاؤ وہاں اس سے ملاقات کرلو۔''

''محبت کا مارا جب چھت پر پہنچا تو اسے یہ توقع تھی کہ آج قیامت کی اس جدائی کا آخری دن ہوگا۔ ثریا نے یقیناً کوئی ایسا ارادہ کر کے ہی اسے بلایا ہے۔ ثریا جو کہے گی میں مان جاؤں گا۔ چاہے اس کے لیے اپنے فلمی کیریئر کو قربان کرنا ہی کیوں نہ پڑے۔ وہ یہ سوچتے ہوئے چھت پر پہنچے تھے کہ ثریا انہیں دیکھتے ہی دوڑ کر ان سے لپٹ جائے گی اور اس سے کہے گی۔ ''دیو! میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، جس طرح بھی ہو سکے مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا بنا لو۔'' مگر ایسا کچھ نہیں ہوا ثریا بے حد سنجیدہ تھی۔ اس نے بڑے ضبط و تحمل کے ساتھ کہا۔

''میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ تمہیں بتادوں کہ میرا خیال ترک کردو۔ میں تمہاری نہیں بن سکتی۔ کبھی نہیں بن سکتی۔ میں یہ جنگ کبھی نہیں جیت سکتی۔ مجھ میں پہاڑوں سے ٹکرانے کی ہمت نہیں۔''

''مگر تمہاری والدہ نے تو.....''

''ہاں وہ تو یہی چاہتی ہیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے ہو جائیں مگر ان کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ ان کی کب چلتی ہے؟ وہ بھی تو میری طرح کمزور اور بے بس ہیں اس لیے.....''

اتنا کہہ کر اس نے اپنی لڑکھڑاتی ہوئی آواز پر قابو پانے کی کوشش کی پھر بڑے تحمل کے ساتھ کہا۔ ''مجھے بھول جاؤ اور اس ملاقات کو آخری ملاقات سمجھو۔ اس کے بعد وہ وہاں رکی نہیں تھی۔ بھاگتی ہوئی نیچے چلی گئی تھی۔ دیو آنند کچھ دیر تک تو گم صم کھڑا رہا پھر اپنا شکستہ دل لے کر واپس آ گیا۔''

''اس کے بعد کیا ہوا؟'' سید جھٹ بول پڑے۔

''ہو گا کیا۔'' دادا جی نے جواب دیا۔ ''کچھ دنوں کے بعد دیو آنند نے اپنی نئی ہیروئن کلپنا کارتک سے شادی رچا لی مگر......مگر ثریا نے زندگی بھر شادی نہیں کی۔''

''اس نے ایسا کیوں کیا؟''

''شاید خود سے انتقام لینے کے لیے جس کی وجہ سے اسے اپنی پسند کی شادی کرنے کا موقع نہ ملا۔''

کمرے کی فضا بڑی گمبھیر ہو گئی تھی۔ ہم دونوں اداس ہو گئے تھے۔ دادا جی بھی بڑے سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا۔ یہ بھی وقت کی کیسی ستم ظریفی ہے کہ اتنی بڑی اداکارہ جو لاکھوں دلوں کی دھڑکن تھی۔ جسے کتنے بڑے بڑے لوگ اپنا بنانے کی تمنا کرتے تھے۔ اس نے زندگی بھر کسی کو اپنا نہیں بنایا ساری عمر تنہائی کی آگ میں جلتی رہی۔ وہ جو کسی نے کہا ہے دل مگر دیتی ہے عورت ایک بار۔ تو غلط نہیں کہا ہے۔

''ثریا بہت بڑی اداکارہ و گلوکارہ تھی۔'' دادا جی نے آج کی گفتگو کا خود ہی آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''اس نے اپنے مستقبل کا جو فیصلہ کیا تھا اس پر آخری دم تک ثابت قدم رہی۔''

ذرا دیر تک خاموشی رہی پھر سید صاحب نے دادا جی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دیو آنند کے بارے میں بات کرتے ہوئے آپ نے کہا تھا۔ ''لاہور سے ممبئی آنے سے پہلے......'' اور دوسری بار بولے تھے۔ ''لاہوری بابو۔'' یہ لاہور کا ذکر دیو جی کے ساتھ کیوں؟''

دادا جی نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ''میاں! تم ہی اس بے خبر کو خبردار کرو۔ آنند جی کے ساتھ لاہور کا ذکر کیوں ہوا۔''

میں نے سید کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''ارے یار! لاہوری بابو سے کیا یہ بات ظاہر نہیں ہوتی کہ دیو آنند لاہوری تھے۔ لاہور سے ممبئی آنے سے بھی اس بات کی جانکاری ہوتی ہے کہ وہ لاہور کے رہائشی تھے۔ انہوں نے اپنی تعلیم لاہور ہی میں مکمل کی تھی۔''

''اچھا......تو یہ قصہ ہے۔''

''لاہور ہمیشہ سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔'' دادا جی بولے۔ ''یہاں بڑے بڑے لوگ رہے اور علم، ادب اور ثقافت کے میدان میں کارنامے انجام دیئے اور یہاں سے پورے متحدہ ہندوستان میں جا کر اپنی فکر و دانش کی روشنی بکھیری۔ بولی ووڈ میں بھی یہاں کے کئی باصلاحیت فنکار اور تکنیک کار پہنچے۔ دیو آنند سے پہلے ان کے بھائی چیتن آنند ممبئی گئے تھے۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ دیو آنند جی کی پیدائش لاہور کی تھی۔'' سید صاحب بولے۔

''نہیں، لاہور ان کا جنم بھومی نہیں تھا۔ وہ پیدا تو ہوئے تھے پنجاب کے ضلع گرداس پور میں۔ ان کا برتھ ڈے 26 ستمبر 1923ء ہے۔ میٹرک کے بعد انہوں نے مزید تعلیم کے لیے لاہور کا رخ کیا اور یہاں کے مشہور گورنمنٹ کالج سے انگلش لٹریچر میں ایم اے کیا اور یہیں سے برصغیر کے میگا سٹی ممبئی چلے گئے۔ چونکہ وہ لاہور سے ممبئی آئے تھے اس لیے بمبئی میں لاہوری بابو کہلائے گئے مگر یہ ان کے ابتدائی دور کی بات ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہیں کئی طرح کے خطابات سے پکارا گیا۔ جیسے کبھی ان کو ڈسکوری چینل کہا گیا کیوں کہ انہوں نے بولی ووڈ کو درجنوں نئے چہرے دیئے۔ جن میں اداکاروں، اداکاراؤں کے علاوہ ڈائریکٹرز اور میوزک میکرز شامل ہیں۔ کبھی انہیں ہندوستانی گریگری پیک کہا گیا۔ کیوں کہ وہ اس دور کے مشہور اور مقبول ہالی ووڈ ایکٹر گریگری پیک سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے تھے اور کبھی انہیں بھارتی فلمی صنعت کا ایور گرین اسٹار کے نام سے یاد کیا گیا کیوں کہ ان کے کیریئر میں کبھی خزاں نہیں آئی۔ تقسیم ہند کے وقت سے اداکاری کے شعبے سے وابستہ ہوئے تو اپنی موت تک فلم انڈسٹری سے جڑے رہے۔''

''یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے۔'' دادا جی ذرا رکے تو میں بول پڑا۔ ''دیو جی کسی ہما شما گھرانے سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ ان کے والد اور ان کے بھائی سب اعلیٰ تعلیم یافتہ اور معزز لوگ تھے۔ میری خواہش ہے کہ آپ اس سلسلے میں بھی سید صاحب کی معلومات میں اضافہ کریں۔''

''ہاں یہ بات تم نے درست کہی ہے کہ دیو آنند کی تعلیم و تربیت اس لیے بہتر ہوئی کہ ان کا گھرانا پڑھا لکھا اور باعزت تھا۔ ان کے والد دھرم دیو پشوری لال آنند جو شکر گڑھ سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنے زمانے کے نامور وکیل تھے۔ انہیں اردو، عربی اور فارسی پر عبور حاصل تھا۔ اس لیے اپنے تمام

بیٹوں کو ان زبانوں کی تعلیم دلوائی۔ بعد میں دیو جی کو انگریزی زبان سے کچھ ایسی محبت ہوئی کہ وہ بس اسی کے ہو کر رہ گئے۔''
اتنا کہہ کر دادا جی نے گلاس اٹھا کر پانی پیا پھر بولے۔
''دیو آنند جن کا اصل اور پورا نام دھرم دیو پشوری مل آنند تھا۔ وہ اپنے چار بھائیوں میں تیسرے نمبر پر تھے۔ ان کی ایک بہن شیلا کانتا کپور بھی ہیں جو ٹاپ ڈائریکٹر شیکھر کپور کی ماں ہیں۔ دیو آنند کے بڑے بھائی من موہن آنند گورداس پور ڈسٹرکٹ کورٹ میں وکیل تھے جب کہ بعد کے چیتن آنند اپنے زمانے کے نامور پروڈیوسر اور ڈائریکٹر رہے۔ چھوٹے بھائی وجے آنند نے بھی فلم انڈسٹری سے وابستگی رکھی اور گائیڈ جیسی یادگار فلم سمیت کئی کامیاب فلمیں بنائیں۔''
''آپ کو گر یاد ہو۔'' سید صاحب بولے۔ ''ان کے دونوں بھائیوں نے کون کون سی فلمیں بنائیں۔ تو اس کے متعلق بھی کچھ بتائیں۔''
دادا جی میری طرف دیکھ کر بولے۔ میاں تمہارے دوست کو تو فلم اور فلم والوں سے بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ دراصل یہ ہے ہی چھوت کی بیماری، جلد ہی لگ جاتی ہے اور لگتی ہے تو جلدی چھوٹتی نہیں۔ خیر...... ان کی دلچسپی کے لیے بتانا ضروری ہے۔
چیتن آنند کی ڈائریکٹ کی ہوئی چند فلمیں اور ان کی مختصر تفصیل یہ ہے۔
افسر۔ 1950ء میں ریلیز ہوئی۔ اس کی کاسٹ میں دیو آنند، ثریا، مایا دیوی، زہرا سہگل، کنہیا لال، کرشن دھونی اور آنند پال تھے۔
آندھیاں۔ 1952ء میں ریلیز ہوئی۔ کاسٹ میں دیو آنند، نمی، کلپنا کارتک، درگا کھوٹے، کے این سنگھ، جانی واکر، لیلا مشرا اور پرتھا دیوی شامل تھے۔
ٹیکسی ڈرائیور۔ 1954ء میں نمائش پذیر ہوئی۔ دیو آنند، کلپنا کارتک، شیلا رامانی، جانی واکر وغیرہ نے اہم کردار کیے۔
فنٹوش۔ 1956ء میں ریلیز ہوئی۔ لیلا چٹنس، دیو آنند، شیلا کرمانی، کے این سنگھ، کم کم اور کرشن دھون کاسٹ میں شامل تھے۔
کنارے کنارے۔ 1964ء میں ریلیز ہونے والی فلم میں دیو آنند، مینا کماری، سندر، چیتن آنند، کمو، روی کانت، مدھو اور سکھ دیو نے کلیدی کردار ادا کیے۔
جانِ من۔ 1976ء میں ریلیز ہوئی۔ اس میں دیو آنند کے ساتھ ہیما مالنی، پریم ناتھ، درگا کھوٹے اور جگدیش راج نے نمایاں کردار کیے۔
صاحب بہادر۔ نمائش 1980ء کاسٹ میں دیو آنند، پریا راج ونشی، اوم پرکاش، آئی ایس جوہر، آغا، مکری اور اسرانی شامل۔
دیو آنند کے چھوٹے بھائی وجے آنند نے ان فلموں کی ہدایت کاری کی۔
نو دو گیارہ۔ ریلیز 1957ء کاسٹ، دیو آنند، کلپنا کارتک، جیون، ششی کلا، راشد خان اور مدن پوری۔
کالا بازار۔ ریلیز 1960ء دیو آنند، وحیدہ رحمان، نندہ، وجے آنند، کشور ساہو، لیلا چٹنس اور چیتن آنند کلیدی کردار ادا کیے۔
میرے گھر کے سامنے۔ ریلیز 1963ء دیو آنند، نوتن، اوم پرکاش، راشد خان، جانکی داس اور پروین چودھری اہم کردار تھے۔
گائیڈ۔ ریلیز 1965ء دیو آنند، وحیدہ رحمان، انور حسین، کشور ساہو، الیاس، جاگیردار، لیلا چٹنس نے کلیدی کردار ادا کیے۔
جیول تھیف۔ ریلیز 1967ء کاسٹ دیو آنند، اشوک کمار، تنوجہ، ہیلن، من موہن، ناصر حسین، سپرو۔
کہیں اور چل۔ ریلیز 1968ء کاسٹ۔ دیو آنند، آشا پاریکھ، شوبھا کھوٹے، مدن پوری، جگدیش راج۔
جونی میرا نام۔ ریلیز 1970ء دیو آنند، ہیما مالنی، پران، پریم ناتھ۔ آئی ایس جوہر، ساجن، جیون، شیام کمار نے کلیدی کردار ادا کیے۔
تیرے میرے سپنے۔ ریلیز 1971ء۔ دیو آنند، ممتاز، ہیما مالنی۔ وجے آنند، تبسم، آغا سپرو، تلبش، جے شری ٹی۔ دلاری کاسٹ میں شامل۔
بلٹ ٹرین۔ ریلیز 1977ء۔ کاسٹ میں دیو آنند، پروین بابی، جیوتی، بخشی، کبیر بیدی، راکیش روشن، مراد، رنجن، شیلا شامل ہیں۔
چھپا رستم۔ ریلیز 1973ء۔ دیو آنند، ہیما مالنی، اجیت، پریم چوپڑا، اے کے ہنگل، دینا، پریم ناتھ، وجے آنند نے اہم کردار ادا کیے۔
''عجیب بات ہے۔'' دادا جی کے خاموش ہوتے ہی سید بولے۔ ''دونوں بھائیوں نے ہدایت کاری کے ساتھ ساتھ اداکاری بھی کی مگر دیو آنند کی طرح ایکٹنگ میں کوئی مقام حاصل نہیں کر سکا۔''

''جب کہ......'' میں بول پڑا۔ ''دیو آنند نے اداکاری سے اپنا کیریئر شروع کیا اور اداکاری پر ہی ختم کیا۔ اس کے ساتھ فلمیں بھی پروڈیوس اور ڈائریکٹ کیں۔ جن کی تعداد ان کے دونوں بھائیوں کی فلموں سے زیادہ ہیں۔ ان میں کچھ فلمیں بہت اچھی بھی ہیں اس کے باوجود انہیں ڈائریکٹر کے مقابلے میں ایکٹر کی حیثیت سے زیادہ شہرت ملی۔''

''ہاں۔'' دادا جی بولے۔ ''یہ اہم بات ہے۔ جس کی طرف تم نے اشارہ کیا ہے۔''

وہ ذرا رک کر بولے۔ ''دیو آنند نے پریم پجاری سے اپنی ہدایت کاری کا آغاز کیا جو 1970ء کی فلم ہے۔ اس کے بعد انہوں نے ہرے راما ہرے کرشنا، ہیرا پنا، عشق عشق عشق، دیس پردیس، لوٹ مار، آنند اور آنند، ہم نوجوان، سچے کا بول بالا، اوّل نمبر، سو کروڑ، گینگسٹر، میں سولہ برس کی، سنسر، لو ایٹ ٹائم اسکوائر، مسٹر پرائم منسٹر، پیار کا ترانہ اور چارج شیٹ کی ڈائریکشن دی۔ ان میں اداکاری بھی کی۔ نئے چہروں کو بڑی فراخ دلی سے پیش کیا۔ نئے اچھوتے اور سماج سدھار موضوعات پر کہانیاں لکھوا کر انہیں فلموں کا روپ دیا۔''

''شاید میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ دیو آنند کے مدمقابل ان کے دو ہمعصر راج کپور اور دلیپ کمار کو سمجھا جاتا ہے۔ راج کپور نے 1971ء میں اپنی بڑھتی ہوئی عمر کے پیش نظر ''کل آج، اور کل'' میں باپ کا کردار نبھایا۔ 1974ء میں بھی دھرم کرم میں میچور رول ادا کیا۔ اس دور میں دلیپ کمار بھی بطور ہیرو ناکام ہو رہے تھے۔ کچھ فلموں کی ناکامی کے بعد دلیپ کمار اور پھر دیو آنند پر بھی زور دیا جانے لگا کہ ہیرو شپ سے ہٹ جائیں اور راج کپور کی طرح باپ کے کردار ادا کریں لیکن راج کپور نے اپنا وزن بہت زیادہ بڑھا لیا تھا اس لیے اپنی عمر سے زیادہ کے نظر آنے لگے تھے جب کہ دلیپ اور دیو آنند سکم اور اسمارٹ تھے لہٰذا چند فلموں کی ناکامی کے باوجود دونوں ہیرو شپ سے ریٹائر نہیں ہوئے۔ جب راج کپور نے میچور کیریکٹرز شروع کیے تو دیو آنند مزید فریش ہیروئنز کے ساتھ آنے لگے۔ ہیما مالنی، زینت امان اور شرمیلا ٹیگور کے ساتھ ان کی فلمیں کامیاب نہ ہو سکیں مگر یوگیتا بالی اور راکھی کے ساتھ ''بناری بابو'' کے ذریعے وہ پھر ہٹ ہو گئے۔ جس کے بعد ہیما مالنی کے ساتھ چھپا رستم اور امیر غریب جب کہ زینت امان کے ساتھ ہیرا پنا، وارنٹ اور ڈارلنگ ڈارلنگ ہٹ ہو گئیں۔ اسی دوران پروین بوبی کے ساتھ بلٹ ٹرین میں پیش ہو کر دیو آنند ایک بار پھر اس دور کے نوجوان ایکٹرز کے ساتھ ریٹ ریس میں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد دیو آنند نے طے کر لیا کہ ہر فلم میں نئی ہیروئن متعارف کروائیں گے۔ 1978ء میں اپنی لکھی پہلی فلم ''دیس پردیس'' جس کی انہوں نے ڈائریکشن بھی دی۔ اس فلم کے لیے انہوں نے گجراتی اداکارہ ٹینا منیم کو سائن کیا جو عمر میں ان سے 27 سال چھوٹی تھی لیکن اسکرین پر ان کا پیرا اتنا جما کہ اس فلم کی کامیابی کے بعد انہیں تین مزید فلموں میں ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ ایک عرصے تک دیو آنند آدھی سے بھی کم عمر ہیروئن کے ساتھ پرفیکٹ میچ بنانے میں کامیاب رہے۔ خاص طور پر ان کی ڈائریکشن میں بننے والی بعد کے دور کی سب ہی فلموں میں انتہائی فریش، ینگ اور بالکل نئی ہیروئنز متعارف کرائی گئیں۔''

''عام طور پر فلم والے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں اور قریبی رشتے داروں کو اپنی فلموں میں پیش کرتے ہیں۔'' سید صاحب بولے۔ ''دیو آنند نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی؟ جب کہ وہ نئے چہرے پیش کرنے میں پیش پیش ہوتے تھے۔''

''بھلا کیسے نہیں کرتے وہ اپنے اکلوتے بیٹے سنیل آنند کو انہوں نے اپنی ڈائریکشن میں بننے والی فلم ''آنند اور آنند'' راکھی کے مقابل بطور ہیرو کاسٹ کیا۔ اس کی موسیقی اپنے پسندیدہ موسیقار آر ڈی برمن سے کمپوز کروائی۔ یہ فلم ہر طرح سے معیاری اور بہتر ہونے کے باوجود باکس آفس پر فلاپ ہو گئی۔ سنیل آنند نے اس ناکامی کا اتنا اثر لیا کہ ہمیشہ کے لیے فلموں میں کام کرنے سے توبہ کر لی۔ ''آنند اور آنند'' 1984ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس ضمن میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ 80ء کی دہائی میں انہوں نے خود اپنی مرضی سے میچور رولز کرنے کا موڈ بنایا اگرچہ ان دنوں بھی ان پر ہیرو شپ چھوڑنے کا کوئی دباؤ نہیں تھا۔ یہ دیو آنند کی اپنی مرضی تھی کہ وہ خود ہیرو کی بجائے لیڈ مین کی حیثیت سے پیش ہونے لگے۔

1985ء کی فلم ''ہم نوجوان'' اور 1989ء کی ''لشکر'' میں لیڈ مین کے طور پر بھی انہیں کامیابی نہ مل سکی۔ ہاں ناقدین اور مبصرین نے مختلف جمیکنکس کی وجہ سے دیو جی کی بڑی واہ واہ کی۔ 1990ء میں ''اوّل نمبر'' بنائی جو عامر خان کے ساتھ ان کی اکلوتی فلم ہے۔ یہ فلم باکس آفس پر اوسط درجے کی رہی مگر اس فلم کے بعد انہوں نے جو آٹھ فلمیں بنائیں وہ سب کی سب باکس آفس پر فلاپ ثابت ہوئیں۔''

''باپ اور بیٹے میں یہ بڑا دلچسپ تضاد ہے۔'' میں

بول پڑا۔ ”بیٹا تو ایک فلم کی ناکامی سے اتنا دل برداشتہ ہوا کہ ہمیشہ کے لیے اداکاری سے توبہ کرلی جب کہ باپ تواتر کے ساتھ ناکام ہونے کے باوجود فلموں سے جڑا رہا۔“

”ہاں یہ تضاد عجیب ہے۔“ دادا جی نے ہامی بھری۔

”میرا خیال ہے کہ سنیل آنند کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہمارے سامنے ایسی کئی مثالیں ہیں کہ ابتدائی فلموں میں ناکامی کے بعد، بعد کی فلموں میں کامیابی ملی۔ ایسوں میں امیتابھ بچن بھی شامل ہیں اور سلمان خان بھی۔ سنجے دت اور شاہ رخ خان بھی ایک دم ہٹ نہیں ہوئے۔ یہ تو عامر خان ہی تھے جو اپنی پہلی فلم ”قیامت سے قیامت تک“ کے ہٹ ہونے کے ساتھ ہی ہٹ ہو گئے۔“

”شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ......“ علی سید نے کہا۔ ”سنیل آنند کی طبیعت فلموں کی طرف زیادہ مائل نہ ہو۔ وہ لوگ جو فلموں میں اپنی قسمت آزمانے کا عزم لے کر آتے ہیں وہ پہلی دوسری ناکامی پر ہار نہیں مانتے۔“

کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ کسی نے کچھ نہیں کہا۔ شاید سب دیو آنند کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ اپنے بڑھاپے کے دور... میں بھی اپنی شکست پر دل برداشتہ نہیں ہوتا تھا۔

”یہ بھی بڑی عجیب بات ہے۔“ ذرا دیر بعد دادا جی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے دوست نے تقریباً پوری کہانی سن لی مگر یہ نہیں پوچھا کہ اس ایور گرین اسٹار کی فلم انڈسٹری میں انٹری کیسے ہوئی۔“

”ہاں، یہ تو میں پوچھنا ہی بھول گیا۔“ سید صاحب نے اظہار تاسف کرتے ہوئے کہا۔

”اب تم ہی بتاؤ اپنے دوست کو یہ قصہ۔“ دادا جی مجھ سے بولے۔ ”کب اور کیسے یہ ٹیلنٹ فلم انڈسٹری کو ملا۔“

ذرا دیر بعد میں نے کہنا شروع کیا۔ ”یہ بات تو غالباً پہلے بتائی جا چکی ہے کہ دیو آنند سے پہلے ان سے بڑے بھائی چیتن آنند لاہور سے بمبئی جا چکے تھے۔“

”درست۔ یہ بات بتائی جا چکی ہے۔“ سید صاحب نے تائید کی۔

”مگر یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ چیتن آنند نے بمبئی جا کر کیا کرنا شروع کیا۔“

”نہیں۔“

”تو عرض یہ ہے کہ انہوں نے بمبئی جا کر ایک تھیٹر کی بنیاد رکھی۔ جسے انڈین پیپل تھیٹر کا نام دیا اور اس تھیٹر کے ذریعے ڈرامے اسٹیج کرنے لگے جس کے ذریعے ابھرتی ہوئی صلاحیتوں کو سامنے آنے کا بہتر موقع ملنے لگا۔ دیو آنند اس وقت لاہور میں تھے۔ جب وہ لاہور میں ایم اے پاس کر چکے تو ان کے پتا جی نے ان سے کہا۔ ”پتر! تم نے اتنی اعلیٰ تعلیم حاصل کرلی ہے۔ اب کچھ کرو۔“

”کیا کروں؟“

”میری مانو تو بینک میں نوکری کرلو۔“

”ٹھیک ہے سوچ کر بتاؤں گا۔“

مگر جب انہوں نے اس بارے میں سوچا تو انہیں اتنا پڑھ لکھ کر بینک کا بابو بننا کچھ اچھا نہیں لگا۔

کرنا تو وہ بھی کچھ نہ کچھ چاہتے تھے بلکہ بہت کچھ کرنے کا عزم وارادہ تھا۔ انہیں اس بات کی بھی جانکاری تھی کہ گھر کی حالت کچھ زیادہ اچھی نہیں۔ ایسے میں انہیں گھر کے لیے بھی کچھ کرنا چاہیے مگر ان کی سوچ اور فکر بہت بلند تھی۔ ان کی پرکشش شخصیت کی وجہ سے ان کے دوست احباب تعلیم حاصل کرنے کے دوران اور بعد میں بھی انہیں ہیرو کہا کرتے تھے۔ انہوں نے سوچا اگر میں ہیرو لگتا ہوں تو کیا سچ مچ کا ہیرو نہیں بن سکتا؟ انہی دنوں کی بات ہے۔ انہوں نے اشوک کمار کی فلمیں اچھوت کنیا اور قسمت دیکھیں۔ ان دونوں فلموں نے انہیں بہت متاثر کیا۔ ان فلموں کے ساتھ ساتھ اس کے ہیرو نے بھی دیو آنند کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ اب وہ ہر وقت ہیرو بننے کا خواب دیکھنے لگے اور ایک دن انہوں نے اس خواب کو تعبیر دینے کا پختہ ارادہ کرلیا۔ پتا جی سے بولے۔

”میں جا رہا ہوں۔“

”کہاں؟“

”بمبئی۔ آپ نے کہا تھا نا۔ کچھ کرو۔ تو بہت کچھ کرنے کے ارادے سے ہی میں بمبئی جا رہا ہوں۔“

دھرم دیو پشوری لال آنند جی تعلیم یافتہ اور روشن خیال آدمی تھے اس لیے بیٹے کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنے۔ انہیں اس بات کا بھی یقین تھا کہ ان کا پتر پڑھا لکھا اور سمجھ دار نوجوان ہے۔ اپنی منزل کی تلاش میں ناکام نہیں ہوگا۔ ماتا پتا کا آشیرباد لے کر گھر سے روانہ ہوئے تو جیب میں صرف تیس روپے تھے۔ ٹرین کا سفر کیسے کٹا انہیں ٹھیک سے یاد نہیں، کیوں کہ وہ بمبئی جیسے میگا سٹی میں اپنے روشن مستقبل کے خواب سجائے جا رہے تھے۔ اسٹیشن سے سیدھے بڑے بھائی چیتن آنند کے پاس پہنچے۔

”ارے دھرم دیو! تم......!“

"ہاں بھیا! میں بھی آپ کے پیچھے پیچھے یہاں تک چلا آیا۔"

"یہاں کیوں آئے ہو۔ کیا کرو گے؟"

"آپ کے تھیٹر میں کام کروں گا۔ ہیرو بنوں گا۔"

چیتن جی نے بھائی کو مایوس نہیں کیا۔ دیو نے بھی بھائی کی توقعات سے بڑھ کر اپنی فنی خوبیوں کا مظاہرہ کیا مگر ان کی منزل تھیٹر نہیں تھی وہ سلور اسکرین کا ہیرو بننا چاہتے تھے۔ یہ 1946ء کی بات ہے ایک دن وہ اپنے شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر پربھات فلم اسٹوڈیو جا پہنچے۔ جہاں ان کی ملاقات بابو راؤ پائی سے ہوئی۔ ان دنوں وہ ہندو مسلم اتحاد کے موضوع پر ایک فلم "ہم ایک ہیں" کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ انہیں نئے چہروں کی ضرورت تھی۔ دیو کو دیکھا تو ان کی خوب صورت مسکراہٹ اور دل نواز چہرے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے اور کہا۔

"ینگ مین تم ہماری فلم میں کام کرو گے؟"

یہ تو اللہ دے اور بندہ لے والا معاملہ تھا۔ وہ انکار کیسے کر سکتے تھے۔ اس طرح انہیں "ہم ایک ہیں" کے لیے ایک ہندو لڑکے کے کردار کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ کملا کوٹنس نے ان کے مقابل ہیروئن کا کردار کیا۔"

سید صاحب نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "وہ جو کہتے ہیں کہ نیت اچھی ہو تو منزل آسان ہو جاتی ہے۔ تو کچھ ایسا ہی دیو آنند جی کے بھی ساتھ ہوا۔"

"ہاں!" میں نے ان کی تائید کی پھر بولا۔ "ان کے ساتھ ساتھ اپنے وقت کے کامیاب ڈائریکٹر گرو دت کی بھی بطور اداکار یہ پہلی فلم تھی۔ پونا میں اس فلم کی شوٹنگ کے دوران دونوں کی دوستی ہو گئی اور دونوں میں یہ عہد و پیمان ہوا کہ جو بھی کامیاب ہو گا وہ آنے والے دنوں میں دوسرے ساتھی کی مدد کرے گا۔ یہ فلم کامیاب ہوئی تو دونوں ہی کامیاب ہو گئے اور پھر دونوں کی کامیابی کا سفر ساتھ ساتھ شروع ہوا۔ پھر ایسا وقت بھی آیا جب گرو دت نے دیو آنند کی فلموں کی ڈائریکشن بھی دی۔"

"واہ واہ۔" میں ابھی رکا ہی تھا کہ دادا جی بول پڑے۔ "واہ شاباش میاں! تم نے تو بڑی خوب صورتی کے ساتھ اور پُراثر انداز میں یہ قصہ بیان کیا۔ جی خوش کر دیا میرا۔"

"دادا جی! اتنی تعریف کر کے مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آپ جیسوں کی صحبت میں بیٹھ کر ہی یہ سب کچھ سیکھا ہے۔ چونکہ میرا پیشہ ہی لکھنا ہے اس لیے مجھے پڑھنا اور آپ جیسے جید حضرات سے سیکھنا پڑتا ہے۔"

دادا جی کے چہرے پر ایک شوخ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "جس طرح بقول تمہارے تم میری صحبت میں بگڑے، اسی طرح تمہارے صحبت میں یہ منڈا بھی (سید صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) بڑی تیزی سے بگڑتا جا رہا ہے۔"

دادا جی کے تبصرے پر سید صاحب کچھ جھینپے کچھ شرمائے پھر غالباً اس کیفیت کو چھپانے کی خاطر ایک سوال داغ دیا۔ "جس طرح راج کپور کے باپ کا کردار کرنے کے دور میں دلیپ کمار اور دیو آنند نے اپنی بڑھتی ہوئی عمر کے باوجود اپنی ہٹ دھرمی جاری رکھی اور ہیرو کے رولز کرتے رہے۔ کیا ایسا ہی آج کے دور میں نہیں ہو رہا ہے؟ شاہ رخ خان، عامر خان اور سلمان خان چالیس پینتالیس کے ہونے کے باوجود ہیرو کی حیثیت سے فلموں میں آ کر زیادتی نہیں کر رہے ہیں؟"

میں نے سوالیہ نگاہوں سے دادا جی کی طرف دیکھا کہ اس کا جواب وہی دیں۔ تو دادا جی بولے۔ "میاں! اس سلسلے میں، میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ جسے پیا چاہے وہی سہاگن۔ جب تک انہیں اور اکشے کمار کو تماشائی اپنی پذیرائی سے نوازتے رہیں گے یہ لوگ بھی دلیپ کمار اور دیو آنند کی طرح اس ہٹ دھرمی یا زیادتی کا ارتکاب کرتے رہیں گے۔" انہوں نے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ اگرچہ ان کی عمر کے لگ بھگ یا کچھ زیادہ کے انیل کپور، سنیل سیٹھی، اجے دیوگن اور سنجے دت نے میچور رولز کرنا شروع کر دیے ہیں۔" اب انہوں نے سید کو مخاطب کرتے ہوئے مزید کہا۔ "اس سے زیادہ بھی اگر کچھ باتیں معلوم کرنی ہے تو اپنے دوست سے رجوع کرو۔"

سید صاحب نے میری طرف دیکھا جس پر میں نے کہا۔ "میں بھی دادا جی کی اس بات سے متفق ہوں کہ جب تک فلم بین انہیں بطور ہیرو پسند کرتے رہیں گے وہ ہیرو کے کردار کرتے رہیں گے۔ ان کی مقبولیت کا تو یہ عالم ہے کہ اداکارائیں بھی ان کے ساتھ کام کرنا پسند کرتی ہیں۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ فلمسازوں اور ہدایت کاروں کو اس بات کا احساس ہے کہ فلموں کا اصل گلیمر نئے اور تر و تازہ چہرے ہوتے ہیں۔ شاید ان کی اس سوچ کا ہی نتیجہ ہے کہ بولی ووڈ میں بڑی تیزی کے ساتھ نئے چہرے متعارف کرائے جا رہے ہیں۔ اگرچہ بھارت بہت بڑا ملک ہے اور وہاں ٹیلنٹس کی کمی نہیں، اس کے باوجود پاکستان سے بھی باصلاحیت اور تر و تازہ لڑکے لڑکیوں کو بڑی فراخ دلی کے

دیو آنند کی فلمیں

نمبر	سن	ٹائٹل	ڈائریکٹر	اسٹیٹس
1۔	1946ء	ہم ایک ہیں	پی ایل سنتوشی	ایوریج
2۔	1947ء	موہن	آنند ناتھ بنرجی	فلاپ
3۔	1948ء	ودیا	گریش تری ویدی	ہٹ
4۔	1948ء	آگے بڑھو	یشونت، پیٹھکر	فلاپ
5۔	1948ء	ضدی	شاہد لطیف	ایوریج
6۔	1948ء	ہم بھی انسان ہیں	فانی مجومدار	ہٹ
7۔	1949ء	جیت	موہن سنہا	ہٹ
8۔	1949ء	نمونہ	ہیرا سنگھ	ایوریج
9۔	1949ء	ادھار	ایس ایس کلکرنی	فلاپ
10۔	1949ء	شاعر	چاؤلہ	ایوریج
11۔	1950ء	مدھوبالا	پرہلاد دت	ایوریج
12۔	1950ء	برہا کی رات	گجانن جاگیردار	ایوریج
13۔	1950ء	ہندوستان ہمارا	پاؤل زلس	ایوریج
14۔	1950ء	دل رُبا	دوارکا کھوسلہ	فلاپ
15۔	1950ء	نرالہ	دیپان مکرجی	ایوریج
16۔	1950ء	نیلی	رتی لال ہیم چند	ایوریج
17۔	1950ء	کھیل	ایس ایم نواب	فلاپ
18۔	1950ء	افسر	چیتن آنند	ہٹ
19۔	1951ء	اسٹیج	وجے مہاترے	فلاپ
20۔	1951ء	سزا	فلی مستری	ایوریج
21۔	1951ء	صنم	نند لال جسونت لال	ہٹ
22۔	1951ء	نادان	ہیرا سنگھ	ایوریج
23۔	1951ء	دو ستارے	ڈی ڈی کیشپ	ہٹ
24۔	1951ء	بازی	گرو دت	ہٹ
25۔	1951ء	آرام	ڈی ڈی کیشپ	ایوریج
26۔	1952ء	زلزلہ	پاؤل زلس	ایوریج
27۔	1952ء	تماشا	فانی مجومدار	فلاپ
28۔	1952ء	جال	گرو دت	ہٹ
29۔	1952ء	آندھیاں	چیتن آنند	ہٹ

ساتھ اپنی فلموں میں پیش کر رہے ہیں۔''

''بہت شکریہ میرے بھائی کہ آپ نے بڑی تفصیل سے جواب دے کر مطمئن کیا۔'' سید صاحب بولے۔ ''ہم لوگ بات دیو جی کی کر رہے تھے ان کی ایور گرین پرفارمنس کے بارے میں بھی کچھ بتائیں۔''

''یہ تو آپ نے سنا ہوگا کہ عمل سے زندگی بنتی ہے۔''

''جی ہاں سنا ہے۔''

تو دیو آنند جی کو ان کے کیریئر میں اتنی کامیابیاں جو ملیں اس کی بنیادی وجہ ان کا ہر حال میں باعمل ہونا ہے۔ وہ جس طرح اپنی نوجوانی اور جوانی کے دنوں میں متحرک ہوتے تھے اسی طرح اپنے بڑھاپے تک 88 سال کی عمر ہونے تک تندہی، محنت، لگن اور دلچسپی کے ساتھ اپنا کام کرتے رہے۔ 1945ء میں جب دوسری جنگ عظیم جاری تھی۔ انہیں ملٹری میں ایک جاب مل گئی۔ ان کا کام فوجیوں کے خطوط سنسر کرنا تھا۔ انہیں 165 روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ جنگ ختم ہونے کے بعد یہ نوکری بھی ختم ہوگئی۔ جس کے بعد انہوں نے ایک اکاؤنٹ فرم میں صرف 85 روپے ماہوار پر کام کرنا شروع کر دیا مگر اپنے کام میں انہوں نے کبھی بھی کوتاہی نہیں کی۔ نہایت ذمہ داری اور دیانت داری سے اپنے فرائض ادا کیے۔ پھر جب بھائی کی ڈراما کمپنی میں کام کیا تو یہاں بھی محنت اور جانفشانی سے کام کیا۔ پھر جب انہوں نے بطور ایکٹر فلموں میں اپنا قدم جما لیا تو خود فلمیں بنانے کا پروگرام بنایا۔ اس مقصد کے لیے اپنا پروڈکشن ہاؤس ''نوکیتن بینر'' قائم کیا۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ یہ ادارہ انہوں نے 1949ء میں شروع کیا۔ اس وقت سے لے کر 2011ء تک جب تک وہ زندہ رہے۔ اپنے اس پروڈکشن ہاؤس کو انتہائی کامیابی کے ساتھ جاری و ساری رکھا۔ فلم سازی کی دنیا میں یہ ایک ریکارڈ ہے کہ کسی فاؤنڈر نے اتنے عرصے تک انتہائی کامیابی کے ساتھ خود اسے برقرار رکھا۔ ان کا آفس روز کھلتا تھا۔ اگر وہ ممبئی میں ہوتے تو روزانہ دفتر آتے تھے۔ وہ ہمیشہ اپنا آفس فون خود ہی ریسیو کرتے تھے۔ ان کا آفس 42 پالی ہل باندرہ میں تھا۔ اس کے اوپری منزل پر آنند ریکارڈنگ اینڈ ڈبنگ اسٹوڈیو تھا۔ ان کا آفس اسکرپٹس اور کتابوں سے بھرا رہتا تھا۔ وہ اپنی ہر نئی فلم کا پریمیئر بڑے پیمانے پر منعقد کرتے تھے۔ اس میں اپنے فلمی ساتھیوں کی شرکت یقینی چاہتے تھے۔ اپنے تمام مہمانوں کو بذریعہ فون خود مدعو کرتے تھے جس کے بعد باقاعدہ دعوت

نامہ بھیجا جاتا تھا۔ اپنی فلموں میں مطالعے سے حاصل شدہ معلومات کا استعمال ضرور کرتے تھے۔ ان سے اگر کوئی کہتا کہ فلاں آپ کے بارے میں بکواس کرتا ہے تو کہتے تھے۔ اسے اپنا کام کرنے دو مجھے میرا۔ وہ فلم میکنگ کے لیے ہمیشہ نئی سے نئی تیکنیک سوچتے تھے۔ وہ پریکٹیکل آدمی تھے۔ ابتداء سے انتہا تک سرگرم عمل رہے۔ 88 سال کی عمر میں بھی جوانوں سے زیادہ تیز اور متحرک تھے۔ ایک بار انہوں نے ایک صحافی کو جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔

”میں اب بھی 16 سال کی لڑکی کے مقابل ہیرو آ سکتا ہوں۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ دوسروں کو بھی موقع ملے۔ اس لیے اب پیچھے ہٹ گیا ہوں۔“

عمر کے آخری دور میں بھی وہ اس قدر خوش وخرم رہتے تھے کہ عامر خان اور سلمان خان نے کہا تھا۔ ”جینا کوئی دیو آنند سے سیکھے۔“

دیو آنند نے رومانوی فلموں میں کام ہی نہیں کیا بلکہ اپنی زندگی بھی خوب رنگین اور رومان سے بھرپور گزاری۔ سچ تو یہ ہے کہ دیو آنند جیسے غیر معمولی انسان صدیوں میں جنم لیتے ہیں۔

”میرا خیال ہے۔“ دادا جی نے خالد علی سید کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے دوست نے دیو جی کی ایور گرین کامیابی کی وجہ بڑی تفصیل سے تمہیں بتا دی ہے۔ وہ چونکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ اس لیے انہیں بخوبی جانکاری تھی کہ زندگی میں کچھ کرنے، کچھ بننے اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے محنت، لگن اور دیانتداری سے مسلسل کام کرنا ضروری ہوتا ہے، یہ ایک آفاقی حقیقت ہے اس فارمولے پر جو بھی عمل کرے گا کامیابیاں اس کے قدم چومیں گی۔ اس کی زندہ مثال دیو آنند کی زندگی ہے۔“

”بے شک۔“ ہم دونوں نے ان کی تائید کی۔

ذرا دیر خاموشی رہی پھر دادا جی مسکراتے ہوئے بولے۔ ”بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ دیو جی ایک بار پاکستان بھی آئے تھے۔“

”اچھا!“ سید صاحب نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”پھر تو اس کے بارے میں بھی بتائیے کہ کب آئے تھے اور......“

”ارے میاں! بتانے کے لیے ہی تو یہ ذکر چھیڑا ہے۔“ دادا جی نے ان کا جملہ پورا ہونے سے پہلے انہیں ٹوکا۔ وہ ذرا رک کے پھر بولنا شروع کیا۔ ”دیو جی کی بہت سی سنہری یادیں لاہور سے وابستہ تھیں۔ جب وہ 1943ء میں

30۔	1953ء	پتیا	امیا چکرورتی	ایوریج
31۔	1953ء	ہم سفر	اے این بزجی	ہٹ
32۔	1953ء	ارمان	فلی مستری	ایوریج
33۔	1953ء	راہی	کے اے عباس	ایوریج
34۔	1954ء	فیری / کشتی	ہیمن گپتا	فلاپ
35۔	1954ء	بادبان	فانی مجومدار	فلاپ
36۔	1954ء	ٹیکسی ڈرائیور	چیتن آنند	ہٹ
37۔	1955ء	انسانیت	ایس ایس وسان	ہٹ
38۔	1955ء	منیم جی	سبودھ مکرجی	ہٹ
39۔	1955ء	ملاپ	راج کھوسلہ	ایوریج
40۔	1955ء	ہاؤس نمبر 44	ایم کے برمن	ہٹ
41۔	1955ء	فرار	فانی مجومدار	ہٹ
42۔	1956ء	فنٹوش	چیتن آنند	ایوریج
43۔	1956ء	سی آئی ڈی	راج کھوسلہ	ہٹ
44۔	1956ء	پاکٹ مار	ایچ ایس رویل	ہٹ
45۔	1957ء	بارش	شنکر مکرجی	ایوریج
46۔	1957ء	نو دو گیارہ	وجے آنند	ہٹ
47۔	1957ء	دشمن	راج رشی	ایوریج
48۔	1957ء	پیئنگ گیسٹ	سبودھ مکرجی	ہٹ
49۔	1958ء	سولہواں سال	راج کھوسلہ	ایوریج
50۔	1958ء	امر دیپ	ٹی پرکاش راؤ	ہٹ
51۔	1958ء	کالا پانی	راج کھوسلہ	ہٹ
52۔	1959ء	لو میرج	سبودھ مکرجی	ہٹ
53۔	1960ء	منزل	مندی برمن	ایوریج
54۔	1960ء	جعلی نوٹ	شکتی سامنتا	ہٹ
55۔	1960ء	بمبئی کا بابو	راج کھوسلہ	ہٹ
56۔	1960ء	کالا بازار	وجے آنند	ہٹ
57۔	1960ء	سرحد	شنکر مکرجی	فلاپ
58۔	1960ء	ایک کے بعد ایک	راج رشی	ایوریج
59۔	1961ء	جب پیار کسی سے ہوتا ہے	ناصر حسین	ہٹ
60۔	1961ء	ہم دونوں	امر جیت	ہٹ
61۔	1962ء	مایا	ڈی ڈی کیشپ	ایوریج

فرنٹیئر میل میں بیٹھ کر لاہور سے بمبئی روانہ ہوئے تھے تو ان کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ اس سرزمین اس شہر سے ان کا رشتہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جائے گا۔ اس وقت ان کی عمر ساڑھے انیس سال تھی۔ وہ اس وقت بالکل نہیں جانتے تھے کہ وہ جس خطے سے جا رہے ہیں۔ وہ ایک الگ ملک بن جائے گا۔ جہاں واپس آنے کے لیے پاسپورٹ اور ویزا کی ضرورت ہوگی۔ پاکستان بننے کے بعد دیو آنند اپنی جنم بھومی اور اپنی مادرِ علمی کے درشن کے لیے تڑپتے رہے۔ انہیں کوئی ایسا موقع ہی نہیں ملا کہ سرحد کے اس پار جا کر اپنے بے تاب دل کو سکون پہنچاتے۔ بھلا ہو بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کا کہ انہوں نے پاکستان کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور واہگہ بارڈر کے راستے دوستی بس کے ذریعے لاہور کے تاریخی سفر پر روانہ ہوئے تو اپنے ساتھ کچھ ادیبوں، صحافیوں اور فنکاروں کو بھی ساتھ لائے جن میں دیو آنند بھی تھے۔ اس طرح 55 سال کے بعد دیو جی کو اپنے خوابوں کے شہر لاہور میں سانس لینے کی سعادت نصیب ہوئی۔ یہاں خواص نے ہی نہیں عوام نے بھی ان کا پُرجوش استقبال کیا۔ یہاں آکر انہیں معلوم ہوا کہ وہ اور ان کی فلمیں اسی طرح مقبول ہیں جس طرح بھارت میں ہیں۔ اس دورے میں انہیں گورنمنٹ کالج لاہور کی بھی سیر کرائی گئی۔ جہاں انہوں نے تعلیم حاصل کی تھی اور اس سے ان کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ اپنی مادرِ علمی سے مل کر ان کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ وہ اس کے در و دیوار کو غور سے دیکھتے رہے۔ وہی راستے، وہی چوبارے۔ عمارت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اسی طرح کیمبرج اور آکسفورڈ کی کتابیں پڑھائی جا رہی تھیں۔ وہی ہاکی گراؤنڈ، وہی آب وہوا۔ اتنے برسوں میں تو کچھ بھی نہیں بدلا۔ اگر کچھ بدلا ہے تو یہ کہ ہم اس سرزمین کے لیے اجنبی ہو گئے ہیں۔ وہ ادارہ جس نے مجھے تعلیم کی دولت سے مالا مال کیا۔ اب ہم اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے بھی یہاں بار بار نہیں آسکتے۔ متعلقہ اداروں کی اجازت نہ ملے تو وہ سرزمین جس نے مجھے زندگی دی میں وہاں ماتھا ٹیکنے کے لیے نہیں آسکتا۔ دیو جی یہ تاثر لے کر واپس چلے گئے۔ وہ جو ساحر لدھیانوی نے کبھی کہا تھا۔

تیرا ملنا خوشی کی بات سہی
تجھ سے مل کر اداس رہتا ہوں

تو کچھ ایسی ہی کیفیت دیو آنند کی بھی تھی۔ آتے وقت وہ جس قدر خوش تھے جاتے وقت اسی قدر اداس تھے۔

62۔	1962ء	روپ کی رانی چوروں کا راجہ	ایچ ایس رویل	ایوریج
63۔	1962ء	بات ایک رات کی	شنکر مکرجی	ایوریج
64۔	1963ء	اصلی نقلی	رشی کیش مکرجی	ہٹ
65۔	1963ء	تیرے گھر کے سامنے	وجے آنند	ہٹ
66۔	1964ء	شرابی	راج رشی	ایوریج
67۔	1964ء	کنارے کنارے	چیتن آنند	فلاپ
68۔	1965ء	تین دیویاں	امرجیت	ہٹ
69۔	1965ء	گائیڈ	وجے آنند	ہٹ
70۔	1966ء	پیار محبت	شنکر مکرجی	فلاپ
71۔	1967ء	جیول تھیف	وجے آنند	ایوریج
72۔	1968ء	کہیں اور چل	وجے آنند	فلاپ
73۔	1968ء	فریب	جگل کشور	فلاپ
74۔	1969ء	دنیا	ٹی پرکاش راؤ	ایوریج
75۔	1969ء	محل	شنکر مکرجی	فلاپ
76۔	1970ء	دا ایول ود ھان	لیبرٹو	ایوریج
77۔	1970ء	جونی میرا نام	وجے آنند	ایوریج
78۔	1970ء	پریم پجاری	دیو آنند	فلاپ
79۔	1971ء	گیمبلر	امرجیت	ایوریج
80۔	1971ء	تیرے میرے سپنے	وجے آنند	ایوریج
81۔	1972ء	ہرے رام ہرے کرشنا	دیو آنند	ہٹ
82۔	1972ء	یہ گلستان ہمارا	آتما رام	فلاپ
83۔	1972ء	اچھا برا	محمد حسین	فلاپ
84۔	1973ء	چھپا رستم	وجے آنند	ہٹ
85۔	1973ء	بناری بابو شریف	شنکر مکرجی	ہٹ
86۔	1973ء	شریف بدمعاش	راج کھوسلہ	ہٹ
87۔	1973ء	جوشیلا	یش چوپڑا	ایوریج
88۔	1974ء	پریم شاستر	بی آر اشارا	فلاپ

"چونکہ لاہور آمد کے سلسلے میں تھوڑا اساذکر سیاست کا بھی آگیا۔" سید صاحب بولے۔ "اس تناظر میں ایک سوال ابھرتا ہے کہ دیو جی نے زندگی میں جہاں اتنا کچھ کیا۔ وہاں انہوں نے کچھ سیاست بھی کی یا نہیں جب کہ کئی بھارتی فنکاروں نے الیکشن بھی لڑا اور اسمبلیوں کے ممبر بھی بنے۔"

"بہت اچھا سوال کیا ہے تم نے۔" دادا جی بولے۔ "اس سے تمہاری بڑھتی ہوئی دلچسپی کا ایک اور ثبوت ملتا ہے۔"

دادا جی کے اس تبصرے پر سید صاحب کے چہرے پر ایک چمک سی نمودار ہوئی۔ دادا جی کہہ رہے تھے۔ "ہاں ایک ایسا وقت بھی آیا تھا کہ دیو آنند نے اس وقت کی وزیراعظم اندرا گاندھی کی مخالفت میں ایک سیاسی فلمی پارٹی کھڑی کرنے کا اعلان کردیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ حکومت صرف عوام کی ہوسکتی ہے اور عوام کوئی بے جا پابندی قبول نہیں کریں گے۔"

دادا جی سانس لینے کے لیے ذرا رکے تھے کہ سید صاحب پوچھ بیٹھے۔ "حکومت وقت کی مخالفت کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ آخر وجہ کیا تھی اس مخالفت کی؟"

"ظاہر ہے کسی وجہ کے بغیر کوئی بات رونما نہیں ہوتی۔" دادا جی بولے۔ "وجہ یہ تھی کہ 1977ء میں اندرا جی کی کانگریس نے ملک میں ایمرجنسی نافذ کردی تھی جو ملک کے پڑھے لکھے اور جمہوری شعور رکھنے والے طبقے کے لیے انتشار کا سبب بنا تھا۔ ایسے لوگوں میں فلم والے بھی تھے مگر کسی میں ہمت نہیں تھی کہ کوئی اس کے خلاف آواز بلند کرتا۔ کیوں کہ ان دنوں اندرا کے چھوٹے بیٹے سنجے گاندھی انفارمیشن منسٹر تھے جن سے تمام فلم والے ڈرتے تھے۔ ایسے میں دیو آنند ہی تھے جنہوں نے بڑھ کر ایمرجنسی کی مخالفت کی۔ نہ صرف زبانی کلامی بلکہ عملی طور پر بھی اسٹینڈ لیا۔ دیو آنند کی ہمت اور جرأت کو دیکھتے ہوئے اندرا گاندھی نے انہیں اپنے دفتر مدعو کیا اور 45 منٹ تک ان کی باتیں سنتی رہیں۔ اندرا کی مخالف جنتا پارٹی نے جب دیو آنند کی مضبوط حکومت مخالفت دیکھی تو انہیں اپنی پارٹی میں شامل کرنا چاہا اور ان سے کہا۔ آپ ہمارے ساتھ ہو کر اپنی جدوجہد جاری رکھیں۔ جنتا پارٹی کی اس دعوت پر جب آنند جی نے غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ انہیں صرف اپنا سیاسی فائدہ مطلوب ہے۔ جب کہ ان کا اپنا مقصد صرف اور صرف عوامی بہبود ہے۔ لہٰذا انہوں نے سیاست کو دور ہی سے سلام کردیا اور کہا۔ سیاست جن کا کام ہے وہی سیاست کریں۔ ہم فلم والے اپنے کام سے عوام کی خدمت ہی کرسکتے ہیں۔ ہمارا کام محبت پھیلانا ہے۔ وہ ہم

89	1974ء	ہیرا پنا	دیو آنند	ہٹ
90	1974ء	عشق عشق عشق	دیو آنند	ہٹ
91	1974ء	امیر غریب	موہن کمار	ایوریج
92	1975ء	وارنٹ	پرمود چکرورتی	ایوریج
93	1976ء	جانِ من	چیتن آنند	ایوریج
94	1977ء	قلاباز	اشوک رائے	ایوریج
95	1977ء	ڈارلنگ ڈارلنگ	گوگی آنند	ایوریج
96	1977ء	بلٹ	وجے آنند	ہٹ
97	1978ء	دیس پردیس	دیو آنند	ہٹ
98	1980ء	من پسند	باسو چٹرجی	فلاپ
99	1980ء	صاحب بہادر	چیتن آنند	فلاپ
100	1980ء	لوٹ مار	دیو آنند	فلاپ
101	1982ء	سوامی دادا	ٹی کے ڈیسائی	فلاپ
102	1984ء	آنند اور آنند	دیو آنند	فلاپ
103	1986ء	ہم نوجوان	دیو آنند	فلاپ
104	1989ء	لشکر	جگدیش قادر	فلاپ
105	1989ء	سچے کا بول بالا	دیو آنند	فلاپ
106	1990ء	اول نمبر	دیو آنند	ایوریج
107	1991ء	سو کروڑ	دیو آنند	فلاپ
108	1995ء	گینگسٹر	دیو آنند	فلاپ
109	1996ء	ریٹرن آف جیول تھیف	اشوک تیاگی	فلاپ
110	1998ء	میں سولہا برس کی	دیو آنند	فلاپ
111	2001ء	سنسر	دیو آنند	فلاپ
112	2003ء	امن کے فرشتے	قادر کاشمیری	فلاپ
113	2003ء	لو ایٹ ٹائم اسکوائر	دیو آنند	فلاپ
114	2005ء	مسٹر پرائم منسٹر	دیو آنند	فلاپ
115	2011ء	چارج شیٹ	دیو آنند	فلاپ

نوٹ: اپنی ڈائریکشن میں بننے والی فلم پیار کا ترانہ (93ء) کے ذریعے دیو آنند نے پاکستانی اداکارہ انیتا ایوب کو بولی ووڈ میں متعارف کرایا تھا۔

کرتے رہیں گے۔“

”آپ ایک عرصہ تک......“ دادا جی کے خاموش ہوتے ہی میں نے سید صاحب کو مخاطب کیا۔ ”یہ کہتے رہتے تھے نا کہ فلم بینی محض دل و دماغ اور آنکھوں کی عیاشی ہے۔ اس لیے میں دیو جی کی اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ فلم والے عوام کی خدمت کیسے کرتے ہیں؟ یہ درست ہے فلم کا بنیادی مقصد تفریح ہے لیکن دیو آنند جیسے پڑھے لکھے اور باشعور فلم میکرز نے اس تفریحی ہتھیار کے ذریعے سماج سدھار کا کام بھی لینا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں دیو آنند کی مثال ہی دوں گا۔ انہوں نے کئی ایسی فلمیں بنائیں جن کا مقصد تعمیری سینما کا فروغ تھا۔ ان کی بنائی ہوئی پہلی فلم ”پریم پجاری“ تھی۔ جو جنگ سے نفرت اور امن سے محبت کے مقصد کو پیش نظر رکھ کر بنائی گئی تھی۔ اسی طرح ”ہرے راما ہرے کرشنا“ بھارتی نوجوانوں میں بڑھتی ہوئی بے راہ روی کو روکنے کی نیت سے بنائی تھی۔ اس دور میں نوجوانوں کا بڑا طبقہ نشے کی لعنت میں مبتلا ہو کر بہکا پھرتا تھا۔ ان کے آخری دور کی فلموں ”اول نمبر“ ”سچے کا بول بالا“ ”سنسر“ اور ”چارج شیٹ“ وغیرہ ایسی ہی سماج سدھار فلمیں تھیں۔ ایسی فلموں کا کمرشل پہلو کمزور ہو جاتا ہے۔ دیو جی کی ایسی تمام فلمیں باکس آفس پر فلاپ ہو گئیں۔ یہ فلمیں چونکہ ایسے موضوعات پر تھیں جو عام فلموں میں پیش نہیں کیے جاتے۔ اس لیے ان کی واہ واہ تو بہت ہوئی، ناقدین اور مبصرین نے دل کھول کر ان کی تعریف و توصیف کی مگر ان سے انہیں کاروباری فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ اب آپ بخوبی سمجھ گئے ہوں گے کہ فلم والے اپنی فلموں کے ذریعے کس طرح عوامی خدمت کرتے ہیں؟“

”جی ہاں، شکریہ۔ آپ نے بڑی وضاحت سے سمجھایا۔ آپ دونوں کا اس بات کے لیے بھی شکر گزار ہوں کہ اتنے مہان انسان اور بے حد فنی خوبیوں کے حامل فنکار کے بارے میں اتنی ڈھیر ساری معلومات سے اتنی تفصیل کے ساتھ آگاہ کیا۔“ سید صاحب نے اپنے جذبات کا خلوص دل کے ساتھ اظہار کیا۔ ”ہم جیسے کچھ لوگوں کا یہ سمجھنا کہ فلم اور فلم والے برے ہوتے ہیں۔ سراسر بھول ہے۔ اچھے برے انسان تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔ ہماری سوسائٹی میں بھی ہوتے ہیں۔ دیو آنند جی کے زندگی نامے سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے ان جیسے پڑھے لکھے باشعور اور روشن خیال فلم والوں نے سنیما کے میڈیم کو بھی ملک، معاشرہ اور عوام کے لیے تعمیر و ترقی کا ذریعہ بنا دیا ہے۔“

”میاں! مبارک ہو۔“ دادا جی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا یہ کافر دوست تو تائب ہو گیا۔ چلیے اسی خوشی میں اس فلموگرافی کا دی اینڈ بھی آپ اپنی زبان سے کر دیں۔“ میں نے دادا جی سے درخواست کی۔

ذرا رک کر انہوں نے کہنا شروع کیا۔ ”1961ء میں اپنی رنگین فلم ”ہم دونوں“ کی نمائش پر دیو آنند بہت خوش تھے۔ اس سے کچھ قبل انہوں نے اپنی آپ بیتی رومینسنگ ود ھ لائف“ کتابی صورت میں شائع کی تھی جس میں زندگی کے اتار چڑھاؤ اور بیش قیمت تجربات بیان کیے گئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ زندگی اپنا سارا حساب طے کرنے لگی ہے اور ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ شمار یاتی گنتی پوری ہونے کو ہے۔ ”ہم دونوں“ کی کلر ورژن کی تقریب میں انہوں نے چیدہ چیدہ اسٹارز کو مدعو کیا تھا۔ سبھی ٹاپ ایکٹرز ان کے گرد جمع تھے۔ اس روز دیو آنند نے سب کو اپنی آنے والی فلم ”چارج شیٹ“ کے بارے میں بریف کیا اور بتایا کہ کس طرح کا غیر معمولی سبجیکٹ انہوں نے اس میں فلمایا ہے۔ اس تقریب میں عامر اور سلمان بھی موجود تھے جنہیں چیلنج دیتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔ اگلے سال تم دونوں کی چھٹی کر دوں گا۔“

یکم دسمبر 2011ء کو وہ اپنے چیک اپ کی غرض سے لندن گئے۔ سینے میں معمولی تکلیف کے باعث انہوں نے ایک طویل چیک اپ کا پروگرام بنایا تھا۔ ”چارج شیٹ“ کی ریلیز کے بعد ڈاکٹروں کے مشورے پر وہ انگلینڈ گئے تھے۔ وہاں ان کا قیام مے فیئر ہوٹل میں تھا۔ ابھی طویل چیک اپ شروع بھی نہیں ہوا تھا جو دسمبر 2011ء کو وہ 88 سال کی عمر میں اپنے رب سے جا ملے۔ چونکہ ان کی صحت زیادہ خراب نہ تھی۔ اس لیے یوں اچانک ان کی رخصتی سے سب کو حیرت ہوئی تھی۔ 10 دسمبر کو لندن کے شمشان گھاٹ پر ان کی آخری رسوم ادا کی گئیں۔ ان کی چتا کو ان کے بیٹے سنیل آنند نے اگنی دی۔ جس کے بعد ان کی استھیاں (خاک) بھارت لائی گئیں اور ایک دھارمک تقریب میں اس راکھ کو گوداوری ندی میں بہا دیا گیا۔

اس طرح اس مہان کلاکار کی زندگی کا دی اینڈ ہو گیا۔ جانا تو یہاں سے سب ہی کو ہے مگر جو جیسا کر کے جائے گا اسی طرح یاد رکھا جائے گا۔ دیو آنند کو ان کی تعلیم و تربیت، روشن خیالی، جواں ہمتی اور ایک فلمی ریفارمر کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

برطانیہ سے تعلق رکھنے والا ایس کے جیفری (1875ء۔1950ء) پولیس انسپکٹر کے علاوہ ماہر شکاری بھی تھا۔اس نے اپنی ملازمت کا بیشتر حصہ مشرقی ہندوستان میں منی پور،المورہ، کماؤں، ساؤ، ڈیرہ دون، ہردوار اور ترائی کے پُرخطر جنگلوں میں بسر کیا۔

دراصل انہی وادیوں اور پہاڑی علاقوں میں ملنے والے بکثرت شکار نے اسے کہنہ مشق شکاری بنایا۔تعلیم یافتہ ہونے کے باعث وہ اعلیٰ درجے کا داستان گو اور ادیب بھی

الموڑا کا آدم خور

اے آر راجپوت

گھنے جنگلوں میں جاکر شکار کھیلنا نوابین کا شوق تھا مگر جب جنگلی درندے بستیوں میں گھس کر انسانوں کا شکار کرنا شروع کردیں تو اس سے دو دو ہاتھ کرنا جوے شیر لانا ہے مگر وہ ایک پیشہ ور شکاری تھا اس لیے حکام بھی یہی چاہتے تھے کہ اگر کہیں سے آدم خوری کی اطلاع آئے تو اسے ہی بھیجا جائے۔ وہ بھی ملکوں ملکوں گھوم کر آدم خوروں کو گولی کا نشانہ بناتا تھا۔

لہو گرم کرنے والی ایک دلچسپ شکار کتھا
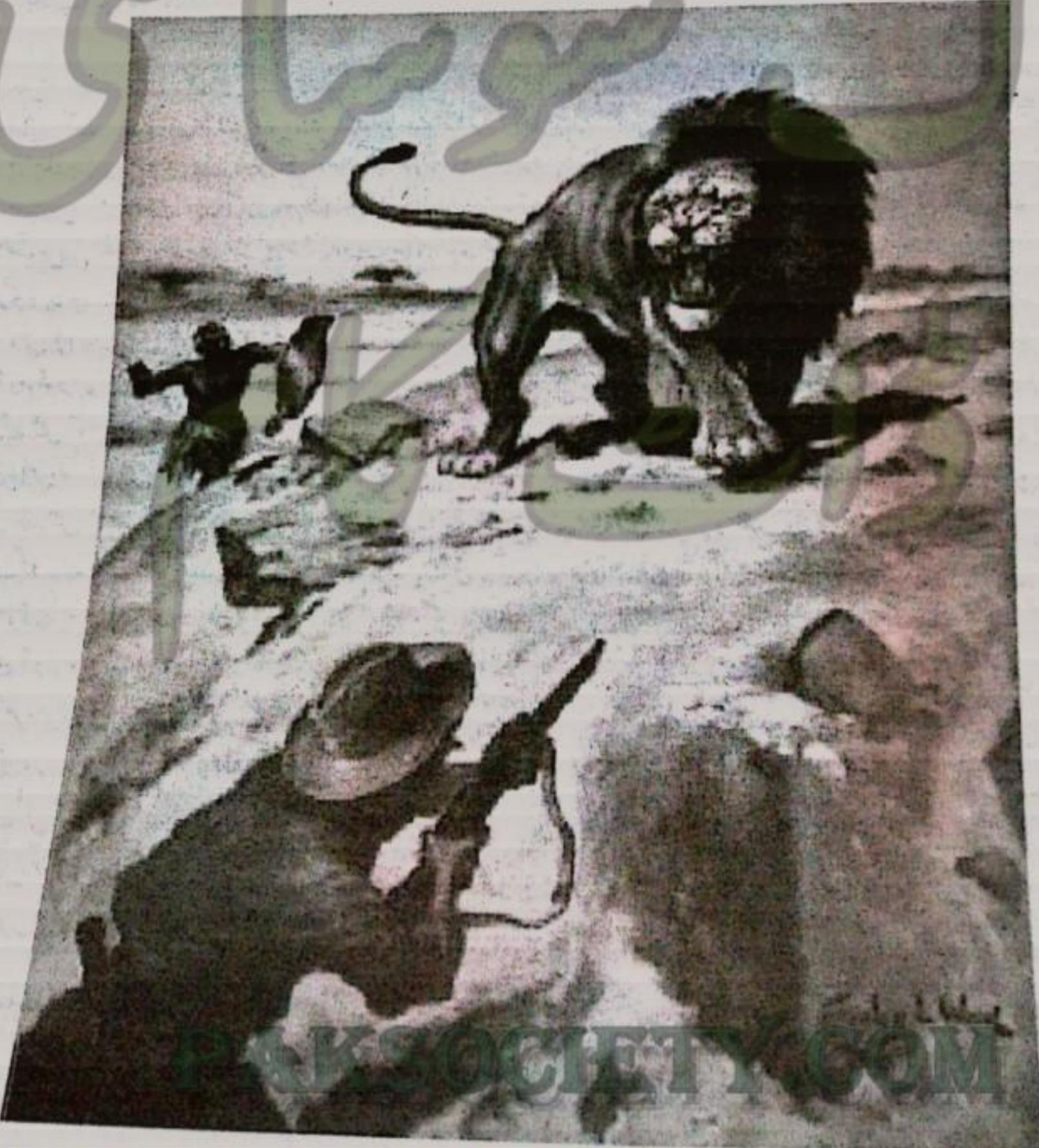
تھا۔ یہی خصوصیات اسے اپنے نامور معاصرین، جم کاربٹ، کینتھ اینڈرسن اور کرنل پیٹرسن برگ کے مقابل لاکھڑا کرتی ہے۔

لیکن کرنل جیفری کی ایک خوبی اسے ممتاز کرتی ہے، جم کاربٹ اور کینتھ اینڈرسن شکاری تھے۔ انہیں درندوں اور آدم خوروں کی تلاش کے دوران ملنے والے انسانوں یا لاشوں کی داستانیں بننے سے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ کرنل جیفری کو اگر کوئی لاش ملتی تو وہ پولیس افسر ہونے کے ناتے یہ بات ضرور کھوجتا کہ آیا کسی جانور نے ہلاک کیا ہے یا کسی نے قتل کرکے وہاں ڈال دیا ہے۔

اس نے اپنی زندگی کے تمام بڑے بڑے واقعات وحوادث اپنی اکلوتی شکاری تصنیف

(My Autobiography,Hunt and Hunter)

میں بیان کی ہے۔ اسی کتاب سے یہ مضمون ماخوذ ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے اوائل میں شائع ہونے والی یہ کتاب اب نایاب ہے۔

☆☆☆

پورا جنگل زخمی شیر کی گرجدار آوازوں سے گونج رہا تھا۔ الموڑہ کے اس آدم خور سے مجھے جانے کیوں ایک جھنجلاہٹ آمیز سی ضد ہوگئی تھی، حالانکہ یہ بات شکاری اصولوں کے خلاف تھی۔ ایک ماہر شکاری کو اپنی تمام تر فطری جبلتوں، بالخصوص غصہ اور ہٹ دھرمی کو دوران مہم ایک طرف رکھ دینا چاہیے لیکن میری بے چینی تو بڑھتی ہی چلی جارہی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی الموڑہ کا پہلا آدم خور میرے ہاتھوں بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا تھا اسی لیے میں آدم خور شیر سے دودو ہاتھ کرنے کے لیے بے تاب تھا، اس کوشش میں اپنی جان کی بازی لگا دینے پر تلا ہوا تھا۔

میں شام کے وقت پھر اسی مقام پر پہنچا جہاں شیر نے ایک گدھے کا شکار کیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ گدھے کی لاش کا صرف چوتھائی حصہ شیر نے کھایا تھا اور باقی یونہی پڑا تھا۔ مجھے آدم خور شیر کی اس ''حرکت'' پر حیرت ہوئی کہ اس نے ''مردم خوری'' چھوڑ کر گدھے کا انتخاب کیوں کیا؟ پھر سوچا کہ درندے نے غیظ وغضب میں کہ انسان اس کے ہاتھ سے نکل گیا، ایسا کیا ہوگا۔

میں تھوڑی دیر تک اس شش وپنج میں غلطاں رہا کہ شیر اب گدھے کا شکار کیوں کرنے لگا؟ اسے تو انسان کے خون کا مزہ مل چکا ہے۔

آخر کار میں نے فیصلہ کیا کہ آج رات یہیں اس آدم خور کا انتظار کروں گا۔ ہوسکتا ہے وہ آہی جائے۔ چنانچہ گدھے کی لاش موٹے آہنی تار کے ذریعے قریبی درخت سے بندھوادی، تاکہ شیر اسے اٹھا کر دوسرے مقام پر نہ لے جاسکے۔ پھر بیس گز پرے ایک درخت پر اپنے بیٹھنے کا انتظام کیا اور سرشام 302 بور کی رائفل کے ساتھ وہاں جا بیٹھا۔

رات کے وقت، جنگل کا سناٹا اور درندوں کی آمدورفت غرض ایک دہشت کا عالم تھا۔

میری آنکھیں گردوپیش کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں اور میں بے چینی سے مردم خور کا انتظار کررہا تھا۔ کم وبیش چار گھنٹے گزر گئے۔ پھر خشک پتوں پر کسی جانور کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے تاروں کی ملگجی روشنی میں دیکھا کوئی جانور گدھے کی لاش سے ذرا پرے سامنے جھاڑیوں میں خاموش کھڑا تھا۔ میں نے گولی چلانے میں تامل کیا کیونکہ مجھے پورا یقین نہ تھا کہ یہ آدم خور شیر ہے یا کوئی مردار خور جانور۔

وہ جانور مردہ گدھے کی طرف چند قدم بڑھا اور رک گیا پھر اس نے یکایک منہ اٹھا کر میری طرف دیکھا اور غضب ناک انداز میں دھاڑتے ہوئے قریبی جھاڑیوں میں جاگھسا، اور وہاں کھڑے ہوکر غرانے لگا۔ یوں مجھے پتا چل گیا کہ یہ آدم خور شیر ہی ہے اور اس نے بُو سے مجھے شناخت کرلیا ہے۔

اب مجھے افسوس ہونے لگا کہ کاش! میں اسے دیکھتے ہی گولی ماردیتا۔

آدم خور، جھاڑیوں میں بدستور گرج رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت بھوکا ہے اور گدھے کی لاش کھانا چاہتا ہے۔ جبکہ میں خود بھی اس کے لیے لقمۂ تر کی حیثیت رکھتا تھا، اسی لیے وہ غضب ناک ہورہا تھا۔ پھر یکایک وہ درندہ زور سے دھاڑا اور جست لگا کر میرے درخت کے نیچے آگیا۔

وہ درخت کے چاروں طرف چکر لگانے اور اچھل اچھل کر کوشش کرنے لگا کہ کسی طرح مجھے نیچے گرادے۔

آدم خور کی پوزیشن ایسی تھی کہ وہ گولی کی رینج میں نہیں آتا تھا۔ جان کا خطرہ درپیش ہوا تو میں نے رائفل سے اندھیرے میں بے نشانہ فائر جھونک مارا تاکہ شیر نہ بھی مرے تو ڈر کر یہاں سے دفعان ہوجائے۔

رائفل کے فائر کی گونج سے شیر خوفزدہ ہوکر جنگل میں

چلا گیا، تاہم یہ وقفہ عارضی رہا۔ کچھ دیر جنگل میں اِدھر اُدھر گرجتا رہا پھر میری طرف بڑھنے لگا حتیٰ کہ وہ پوری طرح اب میرے "نشانے" کی زد میں آگیا۔

میں نے احتیاط کے ساتھ نشانہ لے کر دنادن دو فائر کیے۔ دونوں ہی فائر کامیاب رہے۔ رائفل کی آواز کے ساتھ ہی جنگل میں قیامت آگئی۔ شیر زخمی ہو کر حالت غضب میں بری طرح چنگھاڑ رہا تھا۔ اس نے بار بار درخت پر حملہ کرنے کی اور مجھے گرانے کی کوشش کی، لیکن میں نے بھی اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ شیر بری طرح زخمی ہو کر گھنی جھاڑیوں میں چلا گیا اور ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا ہو گیا۔

ایک ظالم درندہ جس نے ہزاروں انسانوں کی زندگی عذاب بنا رکھی تھی، آج اس کی دہشت کا بت پاش پاش ہو گیا تھا۔

مجھے بے پایاں خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نہایت اطمینان سے درخت پر بیٹھا تھا۔ فائروں اور شیر کے گرجنے دھاڑنے کی آواز جب کیمپ میں پہنچی تو لوگ روشنی کے ہنڈولے اور ہتھیار لے کر نکلے اور ایک فرلانگ کے فاصلے سے مجھے پکارنے لگے۔

تاہم میں نے حفظ ماتقدم کے تحت زور سے چلا کر انہیں آگے بڑھنے سے روکا، اور کہا کہ میں بخیر و عافیت ہوں اور شیر ختم ہو چکا ہے، اس لیے تم لوگ اب واپس چلے جاؤ۔ مگر بستی اور کیمپ کے لوگ کہاں ماننے والے تھے تھوڑی ہی دیر بعد میں نے دیکھا، سیکڑوں روشن لالٹینیں اور مشعلیں میری طرف بڑھ رہی تھیں۔ ہزاروں آدمی ٹین اور ڈھول بجاتے چلے آرہے تھے۔ پھر وہاں میری جے جے کار اور کرنل زندہ باد کے نعرے گونجنے لگے۔ ان لوگوں نے چاہا کہ زخمی یا مردہ شیر ڈھونڈ نکالیں، لیکن میں نے انہیں اس ارادے سے باز رکھا، مبادا وہ زندہ ہو یا اس کا کوئی ساتھی زندہ ہو اور حملہ کر بیٹھے۔

بہر طور، میں درخت سے نیچے اتر آیا۔ لوگوں نے مارے خوشی کے مجھے کندھوں پر اٹھا لیا اور مسرت بھرے گیت گاتے، نعرے لگاتے کیمپ میں لے گئے، اور پھر صبح ہوتے ہی میرے ہمراہ بہت سے آدمی موقع واردات پر پہنچے اور خون کے نشانات دیکھتے ہوئے جھاڑیوں میں پہنچ گئے۔

دیکھا کہ ایک جگہ زبردست اور جسیم شیر خون میں لت پت پڑا ہے۔ شبہ دور کرنے کے لیے انہوں نے اس پر پتھر پھینکے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ جب اطمینان ہو گیا کہ شیر مر چکا ہے تو لوگ آگے بڑھے اور شیر کے گرد گھیرا ڈال کر خوشی سے ناچنے اور گانے لگے۔

آدم خور کے معائنے سے معلوم ہوا کہ میری پہلی دونوں گولیوں نے اسے کاری زخم پہنچائے تھے۔ لوگ مردہ شیر کو اٹھائے کیمپ میں لے آئے۔ اسے ناپا گیا تو، ناک سے دم تک دس فٹ ایک انچ تھا، جو ایک ریکارڈ لمبائی تھی۔

☆☆☆

الموڑہ کا علاقہ ہندوستان کا نشیبی اور جنگلاتی علاقہ تھا۔

یہاں ایک پل کی مرمت ہو رہی تھی اور انہی علاقوں میں دو خطرناک آدم خور شیروں نے دہشت پھیلا رکھی تھی، جس میں سے ایک میری "مہم" کا نشانہ بن چکا تھا۔

پل کی مرمت کا کام ابھی جاری تھا اور الموڑہ کے دوسرے آدم خور شیر کی دہشت بھی پائی جاتی تھی۔

بہر طور آدم خور کے مارے جانے کی خبر آناً فاناً تمام اطراف واکناف میں پھیل گئی تھی اور لوگ شیر کو دیکھنے کے لیے دور دور سے آرہے تھے۔ لندن اور ہندوستان تک کے اخباروں میں خبریں شائع ہوئیں اور میرے پاس مبارک باد کے تاروں اور خطوط کا ڈھیر لگ گیا تھا۔

مردہ شیر کی کھال اتارنے پر معلوم ہوا کہ وہ کانٹوں سے بالکل خراب ہو گئی تھی۔ یہ وہ کانٹے تھے جو خاردار باڑوں سے گزرتے ہوئے اس کی کھال میں چبھ جاتے تھے۔

الموڑہ کا پہلا آدم خور فنا کے گھاٹ اتر چکا تھا، مگر اس کا ساتھی ابھی زندہ تھا۔ چنانچہ میں اب اسے مارنے کی تدابیر سوچنے لگا۔

پہلے آدم خور کی ہلاکت سے کچھ روز کیمپ میں امن و امان رہا۔ لوگ میٹھی نیند سونے لگے۔ مگر کب تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ چند روز بعد پھر وہی صورت پیش آگئی......

دوسرے آدم خور نے کیمپ پر حملے شروع کر دیے اور اِکا دُکا آدمی غائب ہونے لگے۔ طریقہ کار اس موذی کا بھی وہی تھا۔

اندھیری راتوں کو جنگل میں گرجتا رہتا اور پھر موقع پاتے ہی جست لگا کر کسی خیمے کے اندر داخل ہو جاتا اور کسی کو منہ میں دبا کر باہر نکل جاتا۔

تمام کیمپ میں دوبارہ بے چینی پھیل گئی۔ لوگ پریشان ہو کر اپنے بچاؤ کی تدبیریں کرتے مگر خونخوار درندہ ہر شب کیمپ سے اپنی خوراک حاصل کر لیتا اور سب دیکھتے رہ جاتے۔

الموڑہ کے پہلے آدم خور کی موت اور میری بہادری کا

شہرہ دور دور تک پھیل چکا تھا۔اس سے دیگر شکاریوں کے دلوں میں بھی دوسرے آدم خور کے شکار کا شوق پیدا ہوا۔

ہندوستان سے بھی کئی شکاری وہاں آن پہنچے اور تمام امکانی کوششیں کیں لیکن اکثر کو تو دوسرے آدم خور کی شکل تک دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔آخر سب مایوسی کے ساتھ واپس چلے گئے۔

بمبئی کے آغا غلام محمد خان بھی انہی لوگوں میں سے تھے۔وہ ہندوستان کے بہت سے جنگلات میں شکار کھیل چکے تھے۔اب وہ بڑے شوق سے قسمت آزمائی کے لیے الموڑہ آئے۔امیر آدمی تھے،اور پورا اسٹاف اور مکمل سامان اپنے ساتھ لے کر آئے تھے یہاں پہنچ کر وہ بیس دن تک مقیم رہے اور اس عرصے میں جتنی تدبیریں اور ترکیبیں ممکن تھیں انہوں نے کر ڈالیں مگر کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

ایک شب آغا صاحب نے کیمپ سے میل بھر دور جنگل میں ایک درخت پر نشست (مچان) کا انتظام کرایا۔درخت کے نیچے لوہے کے بڑے سے پنجرے میں اپنا ایک ملازم بند کر کے بٹھا دیا،جو بندوق،کارتوسوں اور تلوار سے مسلح تھا۔اسے ہدایت کی گئی تھی کہ اگر شیر اس پر حملہ آور ہو تو وہ گولیوں کی بوچھاڑ اس پر کر ڈالے،اور اگر درندہ سلاخوں میں سے پنجہ اندر ڈالے تو اسے تلوار سے کاٹ ڈالے۔پنجرہ خاصا بڑا تھا اور آغا صاحب کا آدمی اگر اس کے وسط میں کھڑا ہوتا تو شیر کے پنجے اس تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔

آغا صاحب درخت پر تقریباً بارہ فٹ اوپر خود 500 بور کی ڈبل بیرل ایکسپریس رائفل لے کر بیٹھ گئے۔ان کا ایک دوسرا پٹھان ملازم ان سے ذرا نیچے دوسری شاخ پر بیٹھا۔ادھر شام ہی سے مطلع صاف نہ تھا۔ان لوگوں کے بیٹھتے ہی تھوڑی دیر بعد آسمان پر گہرے بادل چھا گئے اور ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔تھوڑی تھوڑی دیر بعد بجلی چمکتی۔بوندیں بھی پڑنے لگی تھیں۔گھٹا ٹوپ اندھیرا چھانے لگا تھا اور چہار سو ہو کا عالم تھا۔رات دس بجے آغا صاحب کو شبہ ہوا کہ پنجرے کے قریب کوئی متحرک چیز موجود ہے۔اسی اثنا میں بجلی چمکی اور انہوں نے دیکھا کہ شیر پنجرے کے چاروں طرف گھوم رہا ہے۔آغا صاحب نے اگرچہ ہندوستان میں بہت سے شیر دیکھے اور مارے تھے مگر ایسا شیر انہیں کبھی نظر نہیں آیا تھا۔بجلی چمکنے پر پنجرے کے اندر موجود آدمی نے جو شیر کو اتنے قریب دیکھا تو مارے خوف کے اسے بندوق تلوار کسی چیز کا ہوش نہ رہا اور لگا چیخنے چلّانے۔

ادھر شیر پنجرے میں اپنا ایک پنجہ ڈال کر اسے پکڑنا چاہتا تھا۔جب وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا تو غضب ناک ہو گیا اور دھکا مار کر پنجرہ الٹ دیا۔آدمی کے منہ سے بڑے زور کی چیخ نکلی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔اب آغا صاحب نے ہمت کی،شیر بالکل صاف تو دکھائی نہیں دے رہا تھا،تاہم انہوں نے اس پر فائر کر دیا۔گولی شیر کی ٹانگ میں لگی اور اس کی نظر آغا صاحب پر پڑ گئی۔

آغا صاحب نے اندھیرے ہی میں اس درندے پر پے در پے فائر کرنا شروع کر دیے۔شیر نے ایک اونچی جست لگائی اور اس کا پنجہ آغا صاحب کی ران پر پڑا۔وہ بہت مضبوطی سے جم کر بیٹھے تھے۔اس لیے گرنے سے بچ گئے۔لیکن پٹھان ملازم جو ان سے نیچے بیٹھا تھا اور شیر کے متواتر حملوں سے خوف زدہ ہو چکا تھا،لہٰذا وہ اپنے آپ کو نہ سنبھال سکا اور نیچے گر پڑا۔بھوکے زخمی درندے کے لیے وہ بے چارہ تر نوالہ ثابت ہوا،شیر نے اسے جبڑوں میں دبایا اور جنگل کے اندھیروں میں غائب ہو گیا۔

آغا صاحب پر نیم بے ہوشی طاری تھی،ران کے زخم میں بے حد تکلیف ہو رہی تھی۔رات بڑی مصیبت میں بسر کی۔ان پر آدم خور کا ایسا رعب چھا گیا تھا کہ پھر جنگل میں جانے کی ہمت نہ ہو سکی اسی طرح زخم لیے اور اپنے معتمد پٹھان ملازم کو کھو کر ناکام واپس چلے آئے۔

☆☆☆

ریلوے اسٹیشن کے نزدیک ہی کوارٹر میں ریلوے انسپکٹر جڈ بجا مقیم تھا۔ایک رات وہ اندر سو رہا تھا۔برآمدے میں کچھ آہٹ پا کر جاگ اٹھا،اور یہ سمجھ کر کہ کوئی شرابی قلی برآمدے میں گڑبڑ کر رہا ہے۔بستر پر لیٹے لیٹے ڈانٹ کر کہا۔

''چلے جاؤ یہاں سے بدمعاش کہیں کے......''انسپکٹر نے بستر سے اٹھنے کی تکلیف گوارا نہ کی،ورنہ اسے معلوم ہو جاتا کہ وہ بدمعاش قلی نہیں بلکہ آدم خور شیر تھا۔بھوکے درندے نے کچھ کھانے کو نہ پایا تو انسپکٹر کی دو بکریاں مار ڈالیں اور انہیں کھا گیا۔

اگلے دن مجھے اس کی خبر ہوئی تو وہاں پہنچ کر ساتھ والے کوارٹر میں اپنے بیٹھنے کا انتظام کیا۔تھوڑے فاصلے پر تین بکریاں بندھوا دیں۔کچھ انتظار کے بعد شیر پہنچ گیا۔اس نے آتے ہی ایک بکری مار ڈالی اور اسے گھسیٹ کر دور جھاڑیوں میں لے گیا۔رات اندھیری تھی۔میں نے

انداز سے کئی گولیاں چلائیں۔ صبح چند آدمی ساتھ لے کر تقریباً چوتھائی میل دور جھاڑیوں کے قریب پہنچا، جہاں شیر بکری کو گھسیٹ کر لے گیا تھا۔ دیکھا کہ درندہ ابھی تک اسے کھانے میں مصروف ہے۔ آہٹ پا کر وہ گرجا اور ہماری طرف لپکا۔ سب لوگ خوف زدہ ہو کر اپنی جان بچانے کے لیے درختوں پر چڑھ گئے شیر شکم سیر تھا اس لیے وہ دھاڑتا ہوا جنگل کی طرف چلا گیا۔

میں نے البتہ آگے جا کر دیکھا کہ شیر آدھی بکری تو چٹ کر گیا تھا۔ چنانچہ اس خیال سے کہ شیر اسے کھانے کے لیے رات میں ضرور آئے گا۔ وہاں سے تھوڑے فاصلے پر ایک درخت کے مضبوط ڈال پر بیٹھنے کی جگہ بنالی۔ میرا ملازم روشن خان میرے ہمراہ تھا۔ اسے بھی اپنے پاس بٹھالیا تاکہ اگر میں سو جاؤں تو وہ بوقت ضرورت مجھے بیدار کردے۔

اور حقیقت یہی تھی کہ میں کئی راتوں کا جاگا ہوا تھا۔ جلدی سو گیا۔ دفعتاً میری آنکھ کھلی، دیکھا تو روشن خان میرا بازو پکڑے مجھے جگا رہا تھا۔ اشارے سے اس نے بتایا کہ شیر، بکری کے نزدیک آگیا ہے۔ میں نے اٹھ کر دیکھا، اپنی شاٹ گن میں دو کارتوس ڈالے اور تیار ہو کر بیٹھ گیا۔ اب انتظار اس بات کا تھا کہ شیر بالکل صاف نظر آجائے تو فائر کروں۔ ادھر شیر کو بھی اطمینان نہ تھا۔ وہ کبھی بکری کے قریب آجاتا اور کبھی جھاڑیوں میں جا چھپتا۔ پھر جیسے ہی ایک بار درندہ میرے سامنے آیا، تو میں نے فوراً ہی اس کے بائیں بازو پر فائر کردیا۔ نشانہ ٹھیک بیٹھا تھا۔ شیر بہت غضب ناک ہو کر گرجا۔ میں نے اپنی رائفل اٹھائی لیکن اس سے فائر کرنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ شیر جھاڑیوں میں سے گزر کر جنگل کے اندر جا چکا تھا۔

صبح کی روشنی پھیلتے ہی میں اپنے ملازم کے ساتھ درخت سے اترا اور زخمی شیر کی تلاش میں خون کے نشانات پر ایک میل تک چلتا چلا گیا۔ راستے میں جہاں کہیں وہ رکا تھا وہاں بہت سا خون جما ہوا دکھائی دیا۔ اس کی دھاڑ سے ٹرالی چلانے والے قلی جو احاطے کے باہر ایک درخت پر سوئے ہوئے تھے۔ بیدار ہو گئے اور اب چیخ و پکار کر رہے تھے۔ میں نے شیر کو خوف زدہ کرنے کے لیے چند فائر کیے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ قلیوں کے قریب نہ آیا لیکن صبح تک اس کے دھاڑنے کی آوازیں آتی رہیں۔ صبح دیکھا گیا کہ کیمپ میں جگہ جگہ اس کے پیروں کے نشانات موجود ہیں۔ ہمیں اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کے زخم بھر گئے ہیں۔ اسی لیے وہ

جامعہ الزہر

قاہرہ (مصر) کی مسجد اور یونیورسٹی۔ (1)

مسجد: بنو فاطمہ نے جب مصر کو فتح کر کے قاہرہ کو اپنا دارالحکومت بنایا تو جوہر الکاتب صقلبی نے جو ابو تمیم کا سپہ سالار تھا۔ 359ء میں اس مسجد کی بنیاد رکھی اور یہ دو برس بعد 361ھ (973ء) میں تیار ہوگئی۔ اس کے بعد مختلف بادشاہوں نے اس میں اضافہ کیا۔ (2)

یونیورسٹی، مسجد میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا گیا جو کچھ مدت بعد دینی اور دنیاوی تعلیم کا سب سے بڑا مرکز بن گیا چونکہ یہاں دور دور سے طلبہ آتے تھے اس لیے اس کی حیثیت اقامتی درس گاہ کی ہوگئی۔ آج بھی نصف سے زیادہ لڑکے اقامت گاہوں میں رہتے ہیں۔ شروع میں یہاں صرف دینی تعلیم دی جاتی تھی۔ 1930ء میں پرائمری، ثانوی، ڈگری اور عالم (ایم اے) کے مدارج قائم ہوئے اور تعلیم کو مسجد سے نکال کر کالجوں میں منتقل کردیا گیا۔ اب صرف دینیات کا شعبہ مسجد سے وابستہ ہے۔ تدریس کے لیے دوسرے ممالک کے ہر سال سینکڑوں طلباء یہاں آتے ہیں۔

مرسلہ: ابو زین طاہری۔ لاہور

واپس آیا ہے۔ لوگوں کا اطمینان ایک بار پھر رخصت ہو گیا اور پریشانیوں نے گھیر لیا۔

رات کے وقت میں رائفل لے کر اس درخت پر بیٹھ گیا، جس پر قلیوں نے رات میں بستر لگایا۔ میں ابھی بیٹھ بھی نہ پایا تھا کہ پھنکار کی آواز آئی۔

خوش قسمتی سے میں ایک سانپ کے وار سے بال بال بچا تھا۔ میں دوبارہ نیچے اتر آیا۔ میرے آدمیوں نے سانپ کو گرانے کی پھرتی دکھائی اسے نیچے آتے ہی مار ڈالا تھا۔

رات بالکل صاف تھی۔ چاندنی چٹکی ہوئی تھی اور دور کی چیزیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ میں دو بجے تک انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آیا، چنانچہ درخت سے کمر لگا کر سو گیا۔ روشن خان نگرانی پر معمور تھا۔

ابھی مجھے سوئے ہوئے بہ مشکل ایک گھنٹا ہی ہوا ہوگا کہ اچانک ایک کرخت آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی، لیکن کچھ دکھائی نہیں دیا میدان صاف تھا۔ صرف چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں تھیں۔ میں

دوبارہ سونے کے لیے آنکھیں بند کرنا چاہتا تھا کہ نزدیک ہی کی جھاڑیوں میں کوئی شے ہلتی ہوئی دکھائی دی۔ بہت غور کے بعد معلوم ہوا کہ یہ وہی آدم خور ہے جو تندرست ہو کر مجھ سے "ملاقات" کے لیے آیا ہوا تھا۔

میں انتظار میں تھا کہ وہ بالکل قریب آجائے تو گولی داغوں پھر جب وہ کم از کم بیس گز کے فاصلے پر آگیا تو مجھ سے صبر نہ ہوسکا۔ میں نے اپنی 300 بور کی رائفل سنبھالی اور شیر کے سینے کا نشانہ لے کر فائر کردیا۔ گولی بالکل صحیح نشانے پر نہ لگی، وہ زخمی ہو کر بڑے زور سے دھاڑا اور جنگل کی طرف دوڑ گیا۔ دن کی روشنی ہوتے ہی میں اور روشن خان دونوں درخت سے نیچے اترے۔ ابھی ہم جنگل میں دو فرلانگ ہی گئے ہوں گے کہ اچانک شیر کی گرج سنائی دی۔ آواز بہت قریب کی تھی۔ معلوم ہوا شیر کہیں قریب ہی... جھاڑیوں میں موجود ہے۔ میں محتاط روی سے ذرا آگے بڑھا تو شیر کا جسم نظر آگیا، میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ نشانہ لیا اور فائر کردیا۔ شیر اچھلا اور چھلانگ مار کر باہر آگیا پھر سیدھا میری جانب لپکا، میں نے ایک اور فائر کیا، شیر گر گیا مگر پھر اٹھا اور مجھ پر حملہ آور ہوا عین اسی وقت پتا چلا کہ رائفل میں کارتوس ختم ہو چکے ہیں۔ میں نے چھوٹی رائفل کے لیے روشن خان کی طرف ہاتھ بڑھایا تو معلوم ہوا کہ وہ موصوف وہاں تھے ہی نہیں، وہ شیر کو حملہ آور ہوتے دیکھ کر درخت پر چڑھ چکا چکے تھے۔

میں نے خود کو خطرے میں پایا اب میرے پاس کوئی اور راستہ نہ تھا میں نے فوراً ایک جست بھری اور درخت پر چڑھ گیا...... شیر زخموں کی وجہ سے سست اور کمزور ہو رہا تھا، ورنہ اس نے مجھے اتنا موقع کہاں دینا تھا؟ میری ایک گولی نے شیر کا بازو بری طرح زخمی کردیا تھا۔ وہ درخت پر اب چھلانگ نہیں لگا پا رہا تھا۔ وہ درخت کے نیچے کھڑے ہو کر دھاڑنے لگا۔ میں نے اسی وقت روشن خان سے رائفل لی اور اس پر پے در پے دو فائر کر ڈالے۔ ایک گولی سینے اور دوسری گولی سر میں لگی۔ آدم خور وہیں گر پڑا اور کچھ دیر بعد ہی ٹھنڈا پڑ گیا۔ میں نے اتنے قریب سے خونخوار دشمن کو للکارا تھا کہ آج مجھے خود اس جرأت پر حیرانگی ہوتی ہے۔

دن کا وقت تھا، اس لیے متواتر فائرنگ کی آواز سن کر کیمپ کے لوگ بھاگے آئے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ دوسرا آدم خور بھی میرے ہاتھوں مارا گیا ہے تو جیسے جشن کا سماں بندھ گیا۔ لوگ خوش تھے اور ان کے منہ سے میرے لیے دعائیں نکل رہی تھیں۔ آج دوسرا آدم خور بھی ان کے سامنے پڑا ہوا تھا۔ لوگ غصے میں اسے ٹھوکریں مار رہے تھے اور اس کی بوٹی بوٹی اڑا دینے پر آمادہ نظر آرہے تھے لیکن میں نے انہیں اس حرکت سے روک دیا اور ہم اس کی لاش اٹھوا کر کیمپ میں لے آئے۔

اس آدم خور کی لمبائی نو فٹ نو انچ تھی۔ اور یہ چار فٹ اونچا تھا۔ درندے کی یہ جسامت بڑی غیر معمولی تھی۔

دوسرے آدم خور کے مارے جانے کی خبر فوری طور پر تمام علاقے میں پھیل چکی تھی۔ اور لوگ شیر اور شکاری دونوں کو دیکھنے کے لیے جوق در جوق آرہے تھے۔ اس آدم خور کے مرنے کی خبریں بھی دنیا بھر کے اخبارات میں نمایاں جگہوں پر لگی تھیں، اور میری بہادری کے چرچے ہوئے تھے، ریل ہیڈ اور بستی میں اب ہر شخص مطمئن نظر آتا تھا۔ لوگوں نے اپنی ممنونیت کا اظہار ایک شان دار جلسے کی صورت میں کیا۔ ریل ہیڈ کا انجینئر اوور سیئر، ٹائم کیپر، مستری اور مزدور غرضیکہ پورا الموڑہ کیمپ وہاں جمع ہو گیا تھا۔ سب نے مل کر مجھے نہ صرف خراجِ تحسین پیش کیا بلکہ مجھے چاندی کا ایک خوبصورت اور بیش قیمت کپ بھی پیش کیا۔

☆☆☆

کیمپ والوں کو آدم خور شیروں کے علاوہ دیگر درندے بھی تنگ کرتے رہتے تھے۔ ان میں چیتا، چرخ، اور جنگلی کتے، خاص طور پر قابلِ ذکر تھے۔ بھیڑ بکری جو کیمپ میں سپلائی کے لیے رکھی جاتی تھی، یہ جانور انہیں اکثر نقصان پہنچاتے تھے۔

چیتا تو ایسا بدمعاش جانور ہے کہ برائے خوراک تو بہت کم کسی جانور کو مارتا ہے، لیکن تفریحاً بعض بے کس جانوروں کی جان لے کر تماشا دیکھتا ہے۔

کیمپ میں میری تقریباً بیس پچیس بھیڑ بکریاں تھیں۔ انہیں رات کے وقت ایک چھپر میں بند کردیا جاتا تھا۔

ایک رات میں نے بکریوں کے چھپر میں غیر معمولی آہٹ سنی۔ سب جانور بے چین معلوم ہوتے تھے۔ اٹھ کر رائفل سنبھالی اور چھپر کا رخ کیا، وہاں ایک چیتا کھڑا دیکھا جو فوراً ہی گم ہوگیا۔ سب سے زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ تمام بھیڑ بکریاں مردہ پڑی تھیں۔ بعض سسک رہی تھیں۔ کم بخت نے سب مار ڈالی تھیں، لیکن کھائی ایک بھی نہیں تھی۔

مجھے چیتے کی اس حرکت پر بڑا غصہ آیا۔ وہ چھپر میں جگہ بنا

کر اندر داخل ہوا تھا اور وہیں سے باہر نکل گیا تھا۔ میں نے اس اُمید پر کہ چیتا رات کو ان میں کسی کو کھانے ضرور آئے گا چھپر کے سوراخ کے بالکل ساتھ مضبوط آہنی پنجرہ رکھ دیا۔ اور اس میں بکری کی ایک لاش ڈال دی۔ اسے ایک لمبی زنجیر سے درخت کے ساتھ باندھ دیا۔ اور میں خود اپنے خیمے میں بیٹھ کر درندے کا انتظار کرنے لگا۔

آدھی رات کے وقت پنجرے کے بند ہونے کی پُرشور آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی چیتے کے چیخنے اور اچھلنے کودنے کا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ میں دوڑ کر پنجرے کی طرف گیا اور دیکھا کہ واقعی چیتا اندر موجود تھا۔ میں نے چوکیدار کو جس کے پاس لالٹین تھی، بلایا اور اندھیرے ہی میں رائفل سے چیتے پر تلے اوپر کئی فائر کر ڈالے۔ گولیاں اس کے سر اور سینے پر پڑیں، اور وہ فوراً ہی ٹھنڈا ہو گیا۔

اگلے دن صبح میں اس چیتے کی کھال اتروا رہا تھا کہ چند جنگلی وہاں سے گزرے۔ انہوں نے درخواست کی کہ اگر چیتے کا گوشت انہیں دے دیا جائے تو وہ یہ کھال ابھی اتار دیں گے۔ مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ چنانچہ جنگلیوں نے چند منٹوں میں ہی کھال اتار کر الگ کر دی اور وہیں بیٹھ کر درندے کے گوشت کا ناشتا شروع کر دیا۔ وہ کچا گوشت مزے لے لے کر کھا رہے تھے اور تھوڑی دیر میں پورا چیتا چٹ کر گئے۔

☆☆☆

چلتے چلتے ...... اب میں اسی زمانے کے ایک اور آدم خور کا ذکر کرتا چلوں ...... جس کے حملوں کے وقت میں خود نیروبی میں قیام پذیر تھا۔

شروع سال 1900ء میں ایک زبردست شیر آدم خور ہو گیا۔ اس کا مسکن ''سیما'' ریلوے اسٹیشن کے نزدیک تھا۔ یہ مقام نیروبی سے تقریباً 80 میل کے فاصلے پر ''ممباسا'' کی جانب واقع ہے۔ ریلوے اسٹاف کے بہت سے آدمی اس نے کھا ڈالے تھے۔ اس کے خوف سے ریلوے اسٹیشن اور تمام کوارٹرز، سرِ شام ہی بند ہو جاتے اور غروب آفتاب کے بعد تو کوئی شخص خوف کے مارے باہر قدم نہیں نکالتا تھا۔

ایک رات یہ ظالم درندہ اپنی خوراک کی تلاش میں نکلا۔ ریلوے اسٹیشن کی عمارت چاروں طرف سے بند پا کر وہ ایک جست میں چھت پر چڑھ گیا اور اسے توڑ کر اندر کودنے کی کوشش کی۔ لیکن لوہے کی چادروں نے اس کی یہ کوشش ناکام بنا دی جبکہ اس نے اپنے پنجے زخمی کر ڈالے تھے۔ زخمی درندہ وہاں سے ٹلا تو ایک ڈرائیور کو اٹھا لے گیا۔

ریلوے اسٹیشن کے پاس پانی کی ایک بہت بڑی ٹینکی خالی پڑی تھی۔ یہ مضبوط لوہے کی بنی ہوئی تھی۔ اس میں چند سوراخ تھے اور منہ کھلا تھا۔ ایک ڈرائیور ٹینکی کے اندر اپنی بندوق لے کر اس خیال سے بیٹھ گیا کہ شیر پر نظر پڑتے ہی وہ سوراخوں میں سے اس پر فائر کر دے گا۔ لیکن آدھی رات میں جب آدم خور اپنے گشت پر نکلا تو، اسے ٹینکی میں ڈرائیور کی موجودگی کا علم ہو گیا۔ اس نے جست لگائی اور ٹینکی پر چڑھ گیا۔ پھر فوراً ہی وہ اس کے کھلے منہ سے اندر کود گیا اور ڈرائیور کو اتنا وقت ہی نہیں دیا کہ وہ اس پر ایک دو فائر ہی کر سکے۔ اس نے ڈرائیور کو پکڑا اور ایک زقند بھر کر ٹینکی سے نیچے کود گیا۔

ٹینکی سے تھوڑے فاصلے پر ندی کنارے پانی کھینچنے کا انجن تھا۔ یہاں سے پانی بڑی بلند ٹینکی اور ریلوے اسٹیشن تک پہنچایا جاتا تھا۔ شیروں اور دوسرے درندوں سے حفاظت کی خاطر انجن کے چاروں طرف لوہے کی سلاخوں کا جنگلا اور اوپر آہنی چھت تھی۔ لوہے کا ایک دروازہ آمد و رفت کے لیے تھا۔ بعض اوقات انجن رات کے وقت بھی چلایا جاتا۔

ایک رات ٹینکی بھری جا رہی تھی اور سید فضل حسین ڈرائیور انجن چلا رہا تھا کہ ایک بجے شب فائر مین نے کہا کہ میں باہر جا کر پیشاب کر آؤں۔ سید صاحب نے اسے باہر جانے سے روکا اور کہا کہ اندر بنگلے کے پاس بیٹھ کر پیشاب کر لو مگر وہ نہ مانا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ وہ کچھ فاصلے پر جا کر پیشاب کرنے لگا۔ وہاں سے فارغ ہو کر لوٹ رہا تھا کہ آدم خور نے آن دبوچا اور آناً فاناً اٹھا کر لے گیا۔ فائر مین رحمت اللہ ایک خوبصورت جوان تھا، جسے ظالم آدم خور وہیں چیرتا پھاڑتا رہا۔ سید فضل حسین اس حادثے سے خوف زدہ ہو گئے۔ وہ دروازہ بند کر کے اپنے آپ کو محفوظ کر لینے کی بجائے گھبراہٹ میں باہر بھاگے اور قریب ہی ایک درخت پر چڑھ گئے۔ ادھر انجن رک گیا اور صبح پانی نہیں پہنچا تو چند افسر ٹرالی میں بیٹھ کر انجن گھر پہنچے۔ وہاں دیکھا کہ دروازہ کھلا پڑا ہے ...... جا بجا خون کے دھبے ہیں اور پھر تھوڑی دور انہیں رحمت اللہ کی باقی ماندہ لاش پڑی ملی۔ اب سید صاحب کی ڈھنڈیا پڑی۔ لیکن پتا نہ چلا۔ آخر درخت پر دیکھ لیے گئے۔ مگر اس حال میں کہ رات کی ٹھنڈ سے جسم اکڑا ہوا تھا اور زبان سے کوئی لفظ ادا نہ ہوتا تھا۔ ان پر کئی روز تک شیر کی دہشت غالب رہی۔ آخر وہ نوکری کو ہی خیر باد کہہ کر ممباسا

چلے گئے۔

جون 1900ء کی کسی تاریخ کا ذکر ہے۔ مسٹر رائل سپرٹینڈنٹ پولیس معائنے کے بعد "مکنڈو" ریلوے اسٹیشن سے اپنی اسپیشل گاڑی میں نیروبی واپس جارہے تھے۔ ان کے ہمراہ دو دوست مسٹر ہوبز اور مسٹر پریسٹی بھی تھے۔ جب ان کی گاڑی کیما ریلوے اسٹیشن پہنچی تو معلوم ہوا کہ آدم خور ان کی آمد سے تھوڑی دیر پہلے ہی اسٹیشن پر موجود تھا۔ انہوں نے فوراً ارادہ کرلیا کہ رات وہاں ٹھہر کر اس خبیث کو موت کے گھاٹ اتاریں گے۔ چنانچہ ان کی اسپیشل گاڑی، ٹرین سے الگ کر کے اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر ایک زیر تعمیر لائن پر کھڑی کردی گئی۔ لائن کا یہ حصہ پورے طور پر مکمل نہ ہوا تھا۔ زمین اونچی نیچی تھی اور کہیں کہیں مٹی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔

یہ تینوں دوست شام سے پہلے شیر کی تلاش میں جنگل کے اندر دور تک گئے۔ مگر آدم خور کا کوئی پتا نہ چلا۔ اب اندھیرا ہو چکا تھا۔ انہوں نے واپس آکر کھانا کھایا اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ انہیں آدم خور کا بھی انتظار تھا، بہ ظاہر کوئی علامت جنگل میں شیر کے موجود ہونے کی نہیں تھی لیکن آدم خور نے انہیں دیکھ لیا تھا۔ اور وہ خاموشی سے ان کی نگرانی کر رہا تھا۔ جب نو بج گئے اور شیر کی آواز کہیں بھی سنائی نہیں دی تو مسٹر رائل نے کچھ نااُمید ہوکر اپنے دوستوں سے کہا۔ "تم دونوں سو جاؤ۔ میں خود جاگ کر نگرانی کروں گا۔ اس کے بعد تمہیں بیدار کردوں گا۔"

مسٹر رائل کھڑکی کے برابر والی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ مسٹر ہوبز ان کے مقابل اوپر والی سیٹ پر بستر لگا کر لیٹ گئے۔ مسٹر پریسٹی نے کہا کہ مجھے نیچے فرش پر زیادہ آرام ملے گا۔

چنانچہ انہوں نے مسٹر رائل کے قریب فرش پر بستر لگایا اور سو رہے۔

مسٹر رائل تنہا بارہ بجے شب تک جنگل کی طرف ٹکٹکی باندھے شیر کے منتظر رہے۔ لیکن جب وہ نہ آیا تو وہ بھی نااُمید ہوکر اپنی نشست پر دراز ہوگئے اور تھوڑی دیر میں خراٹے لینے لگے۔

یہ تینوں سو گئے تو بدمعاش آدم خور جنگل سے نکلا اور خاموشی سے ان کی گاڑی کے قریب آگیا۔ وہ ان تینوں کو بے خبر پا کر ایک مٹی کے ڈھیر پر کھڑا ہوکر آسانی سے گاڑی کے دروازے تک پہنچ گیا۔ شیر کا دھکا لگتا تھا کہ۔۔ دروازہ کھل گیا، اور وہ اندر داخل ہوگیا اب وہ تینوں سونے والوں کے سر پر کھڑا تھا۔ آدم خور فوراً مسٹر رائل پر لپکا مگر چونکہ مسٹر پریسٹی فرش پر سوئے ہوئے تھے اس لیے وہ شیروں کے پیروں تلے دب گئے۔ اسی وقت مسٹر ہوبز کی آنکھ کھل گئی۔ جب انہوں نے یہ دہشت ناک منظر دیکھا تو بے حد خوف زدہ ہوگئے اور چیخنے چلانے لگے۔ وہ سخت بد حواس ہوکر گاڑی سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے مگر بیچ میں شیر کھڑا تھا۔ ساتھ ہی نوکروں کا ڈبہ تھا جس کا ایک دروازہ ان کی طرف کھلتا تھا۔ مسٹر ہوبز کسی طرح اس دروازے تک پہنچنا چاہتے تھے۔ تاکہ ملازموں کے ڈبے میں داخل ہوکر جان بچا سکیں۔ ایک نوکر نے چیخ وپکار سن کر ادھر جھانکا تو فوراً دروازہ بند کرنے کا ارادہ کیا۔ اتنے میں مسٹر ہوبز خوف کے مارے بدحواسی کی حالت میں چیختے ہوئے اوپر سے کودے تو شیر کے اوپر گرے مگر درندہ مسٹر رائل کو کھینچ لے جانے میں ایسا مگن تھا کہ اس نے مسٹر ہوبز کے گرنے کی کوئی پروا نہیں کی۔ وہ دروازے کی طرف لپکے۔ نوکر دروازہ بند کر ہی رہا تھا کہ انہوں نے زور سے دھکیلا اور اندر داخل ہوگئے۔

ادھر شیر مسٹر رائل کو منہ میں دبا کر باہر کود گیا۔ مسٹر پریسٹی کو جیسے ہی شیر کے پنجوں سے نجات ملی، وہ ایک منٹ بھی گاڑی کے اندر نہ ٹھہرے اور نیچے کود کر ریلوے اسٹیشن کی طرف بھاگے۔ وہ زور زور سے چلا رہے تھے جیسے شیر ان کے پیچھے آرہا ہو۔ آخر اسٹیشن پہنچ کر وہ اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوگئے۔ ظالم آدم خور نے اسپیشل گاڑی کا ستیاناس کردیا تھا اور کھڑکی کے ٹکڑے ٹکڑے کردیئے تھے۔ صبح مسٹر رائل کی بچی ہوئی لاش موقع واردات سے دو فرلانگ کے فاصلے پر جنگل میں پڑی ہوئی ملی جسے دفن کرنے کے لئے نیروبی لے گئے۔ اس آدم خور کا انجام کیا ہوا؟ کچھ معلوم نہ ہوسکا...... البتہ مجھے ممباسا جانے کی کال آگئی تھی۔ مگر میں نے پختہ عزم کررکھا تھا کہ جیسے ہی مجھے کچھ عرصے کے لیے محکمہ جاتی فراغت ملے گی میں اس ظالم آدم خور کو نہیں چھوڑوں گا۔ ویسے مجھے اُمید تو تھی کہ میرے سابقہ کارناموں کو دیکھتے ہوئے میرے افسران مجھے اس نیک کام کے لیے منع نہیں کریں گے اور مجھے چند دنوں کی چھٹی مل جائے گی۔

(نوٹ۔ ایس۔ کے۔ جیفری کی یوں تو ہر مہم اپنی جگہ مکمل ہے، لیکن ان کی واقعاتی مہمات کے تسلسل کی وجہ سے اقساط میں پیش کی جارہی ہیں)

کیسے کیسے لوگ

شیراز خان

یہ دنیا ایک ایسا اسٹیج ہے جس پر کروڑ ہا رقاص و فنکار اپنا اپنا کردار اپنے اپنے انداز میں ادا کررہے ہیں، ہر کردار میں اپنی خصوصیت ہے اور وہ منفرد بھی ہے۔ ایسے ہی کچھ انوکھے کرداروں کا مختصر مختصر سا تعارف۔

منفرد انداز کے لوگوں کا بیان سحر افروز داستان

یہ دنیا بہت دل چسپ کرداروں سے بھری ہوئی ہے۔ یہ کردار تاریخ کے ہر دور میں پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں زندگی کے ہر شعبے کے لوگ ہیں۔ سائنس دان، انجینئر، مصنف، شاعر، مفکر، کھلاڑی۔

یہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے بہت شہرت حاصل کی۔ پوری دنیا ان سے اور ان کے کارناموں سے واقف ہے۔ لیکن بہت کم کو یہ معلوم ہے کہ ان لوگوں کی عادتیں بہت دل چسپ اور عجیب ہوا کرتی تھیں۔ ان کی فطرت بھی عجیب ہوتی ہے۔ یہ کارنامے انجام دینے والے لوگ عام لوگوں سے مختلف نہیں ہوتے۔ بلکہ عام لوگوں کی نسبت ان کے مزاج اور فطرت میں تیزـــ کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔

اچھی اور بری عادتوں کے علاوہ ان کی زندگی میں الٹ پھیر بھی بہت ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں کچھ جان کر آپ کو یقیناً حیرت ہوگی۔ اڈولف ہٹلر کو لے لیں۔ دنیا میں ایسا کون ہے جو ہٹلر کو نہیں جانتا۔ تاریخ اسے کس نام سے یاد کرتی ہے اس کو جانے دیں۔ اس کی خطرناک شخصیت کا دوسرا پہلو انتہائی نرم اور رومانٹک ہے۔ وہ بہت اچھا مصور تھا۔ اس کی بنائی ہوئی تصویریں نمائش کے لیے بھی پیش ہو چکی ہیں۔ اس کے بارے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اگر اس کی ماں کی کوششیں کامیاب ہو جاتیں تو ایسا کردار سامنے نہیں آتا اور شاید دنیا کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

اس کی ماں نے کئی بار اسقاط حمل کی کوشش کی۔ وہ کسی بچے کو جنم نہیں دینا چاہتی تھی لیکن ایسا نہیں ہوسکا۔

ہٹلر کو پیدا ہونا تھا وہ ہوگیا اور اب تاریخ کا ایک کردار آپ کے سامنے ہے۔

اب ایک اور کردار کو لیں۔

یہ بچپن ہی سے چوہوں سے خوف زدہ رہتا تھا۔ چوہوں کو دیکھتے ہی اس کی جان نکل جاتی۔ وہ چیخنا چلانا شروع کردیتا۔ بڑے ہو کر اس نے ایک گرجے میں ایک ایسے شرارتی چوہے کو دیکھا جو کسی طرح کسی کی

گرفت میں نہیں آرہا تھا۔ اس ذہین شخص نے چوہوں سے خوف زدہ ہونے کے باوجود اس چوہے کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیا اور پوری دنیا کے بچوں کو ایک چوہے کے کردار کا تحفہ دے گیا۔

یہ واقعہ ہے 1928ء کا اور وہ تحفہ ہے ''مکی ماؤس''
اور وہ شخص تھا والٹ ڈزنی۔ ہے نا دل چسپ بات کہ چوہوں سے خوف زدہ رہنے والے کو ایک چوہا ہی راس آگیا تھا۔

اندھیرے اس کی جان کا روگ تھے۔ وہ اندھیرا برداشت ہی نہیں کرسکتا تھا۔ بچپن میں جب اسے آرام دینے کی خاطر اس کے کمرے میں اندھیرا کردیا جاتا تو وہ رونا دھونا شروع کردیتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اندھیرے میں اسے طرح طرح کی شکلیں دکھائی دیتی ہیں۔ مجھے اندھیروں سے وحشت ہوتی ہے۔

اس کی یہی وحشت اسے اجالے کے سفر پر لے گئی اور اس نے بلب ایجاد کرلیے اور اس شخص کا نام تھا ایڈیسن۔

جس کے بارے میں بلاشبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ دنیا کا سب سے بڑا موجد تھا۔ اندھیروں سے اس کی وحشت اتنے کام آئی کہ اس نے پوری دنیا کو روشنی دے دی۔

ایک ناول نگار، ادیب۔ اس کی بے شمار تحریریں ہیں اور بہت شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ اس نے اپنے ہر ناول میں کوئی نہ کوئی ایسی جدت دکھائی ہے جو اسے دوسروں سے منفرد کرتی ہے۔ اس کا ایک بہت مشہور ناول تھا Gads by۔ یہ خاصا ضخیم ناول ہے اس نے اس ناول میں کمال یہ دکھایا کہ ایسا کوئی لفظ شامل نہیں کیا جو حرف E سے شروع ہوتا ہو۔ ہے نا دل چسپ بات۔

(اس قسم کے کارنامے ہمارے یہاں بہت سے لوگ دکھا چکے ہیں۔ اکبر کے زمانے میں قرآن شریف کا ایسا ترجمہ کیا گیا جس میں ایک بھی نقطے والا لفظ استعمال نہیں ہوا ہے اس طرح ہمارے بہت سے شاعروں نے ایسی نعتیں لکھی ہیں جو بے نقطہ ہیں)۔

یہ مکمل تجربے کی بات ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی بھرپور توجہ۔ تب جاکر ایسے شاہکار سامنے آتے ہیں۔

ارنسٹ ونسٹ کے اس ناول میں باون ہزار الفاظ استعمال ہوئے ہیں لیکن کوئی بھی حرف E سے شروع نہیں ہو رہا۔

وہ ایک تقریب تھی۔

اس تقریب میں رقص کا بھی اہتمام تھا۔ مرد اور خواتین رقص میں مصروف ہیں۔ ہال کی رنگینیاں اپنے عروج پر ہیں کہ اچانک ایک خاتون کو ڈیلیوری پین ہونا شروع ہوا۔ یعنی دردِزہ۔

تقریب میں موجود دوسری خواتین فوراً ہی اس خاتون کو لیڈیز روم کی طرف لے گئیں۔ یہاں اس خاتون نے ایک بچے کو جنم دیا۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہ بچہ کون تھا؟ سر ونسٹن چرچل۔ جی ہاں چرچل کی پیدائش رقص کی ایک تقریب کے دوران ہوئی تھی۔

ایک مشہور فلم تھی۔ اٹ از اے ونڈر فل لائف۔ اس میں دو کیریکٹر تھے۔ ایک کا نام برٹ تھا۔ وہ سپاہی تھا۔ جب کہ دوسرا ایمی تھا وہ ایک ٹیکسی ڈرائیور تھا۔

ایک مشہور سیریز تھی۔ جو آپ میں سے اکثر نے دیکھی ہوگی۔ برسوں ٹی وی پر چلتی رہی۔ شاید آج بھی چل رہی ہو۔ اور وہ تھی سیمی اسٹریٹ۔

مسئلہ یہ تھا کہ اس کے دو کرداروں کے نام سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ پھر جب اٹ از اے ونڈر فل لائف فلم سامنے آئی تو فوراً دو نام سامنے آگئے۔

یعنی برٹ اور ایمی۔ اور اسی وقت سیمی اسٹریٹ کے دو کرداروں کے نام برٹ اور ایمی رکھ دیے گئے۔

مشہور ترین رائٹر، ادب سے دل چسپی رکھنے والا ہر شخص اس نام سے واقف ہے ایسا کون ہوگا جس نے ورجینیا ولف کے ناول نہیں پڑھے ہوں گے۔

اس کی ایک حیرت انگیز عادت یہ تھی کہ وہ کبھی بیٹھ کر نہیں لکھتی تھی۔ اس نے اپنے سارے ناول کھڑے ہو کر

لکھے۔ اس مقصد کے لیے اس نے ایک اونچی سی ڈیسک بنوا رکھی تھی۔

اب اس انوکھی عادت کو کیا نام دیا جا سکتا ہے۔

بہت سے ایسے رائٹر تھے جن کا اصل کام پہلے کچھ اور ہوا کرتا تھا۔ پھر انہوں نے لکھنا شروع کیا اور مشہور ہو گئے۔

اسی طرح دوسرے شعبوں کے بھی کچھ ایسے مشہور لوگ تھے جو ابتدا میں کچھ اور تھے بعد میں کسی اور انداز سے مشہور ہوئے۔

اب ذرا دل کو قابو میں کریں اپنے اعصاب کو مضبوط بنائیں اور ایک مشہور ترین شخص کا پورا نام پڑھ جائیں۔

وہ مشہور ترین شخص تھا پکاسو۔

جی ہاں آپ نے یقیناً اس کا نام سن رکھا ہے۔ یا ہو سکتا ہے کہ اس کی تصویریں بھی دیکھی ہوں۔ جی ہاں، وہ تھا پکاسو۔

اپنے عہد کا سب سے بڑا مصور۔ تجریدی آرٹ کا بانی۔

اب ذرا اس کا پورا نام بھی پڑھ لیں۔ ''پابلو ڈیگ جوز فرانسسکو ڈی پاؤلا جوان نی پر موس نو ماریا ڈی لاس ریمیو ڈی آس لپکر یا نو ڈی لا سانٹی سی ما ری نی ڈاؤ روئز پکاسو۔

ہوش ٹھکانے آ گئے ہوں گے۔

یقیناً آپ میں سے بہت سوں نے مشہور زمانہ تھری اسٹوجیز دیکھی ہو گی۔ اس میں تین مسخرے ہوتے تھے جو ہنسا ہنسا کر پاگل کر دیتے۔

آپ کو یہ جان کر اور بھی حیرت ہو گی کہ تھری اسٹوجیز کے یہ تین کردار تین حقیقی بھائیوں کے ذہنوں کی پیداوار تھے۔

ان بھائیوں کے نام تھے ماؤ، کرلی اور شیمپ۔

آئن اسٹائن دنیا کا مشہور ترین سائنس دان۔

کہا جاتا ہے کہ اسٹائن کے دماغ پر بھی ریسرچ کی گئی اور اسے محفوظ کر لیا گیا۔ صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ اس شخص کی ذہنی صلاحیتوں کا کیا عالم تھا۔

لیکن دنیا کا یہ ذہین ترین شخص ابتداء میں اتنا کند ذہن تھا کہ اس کے اساتذہ اس کے مستقبل کی طرف سے

بالکل مایوس تھے۔ ایک بار اسے اسکول سے نکال بھی دیا گیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ نو برس کی عمر تک وہ بول بھی نہیں پاتا اور ایسا بچہ جب دنیا کا ذہین ترین فرد بن جائے تو قدرت کی رحمتوں پر حیرت ہی ہوا کرتی ہے۔

آپ نے بلیو بیری جیلی تو کھائی ہو گی۔

شاید آپ کو پسند بھی ہو لیکن آپ اطمینان رکھیں یہ مزیدار جیلی میرے اور آپ کے لیے نہیں بنائی گئی تھی۔ بلکہ یہ خاص طور پر امریکی صدر رونالڈ ریگن کے لیے بنائی گئی تھی۔ شاید امریکی صدر کا پسندیدہ ترین مشغلہ بلیو بیری جیلی سے بھی شوق فرمانا تھا۔

سکندر اعظم کو کون نہیں جانتا۔ مقدونیہ کا طاقت ور ترین کم عمر بادشاہ جس نے اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑ رکھے تھے۔ وہ اب ایک افسانوی کردار بن کر رہ گیا ہے۔

اتنا طاقت ور شخص بھی بری طرح بے بس ہو جایا کرتا تھا۔ اس کو بے بس کرنے والا باہر کا کوئی دشمن نہیں تھا۔ بلکہ اس کے اندر کی ایک بیماری تھی اور وہ تھی مرگی۔

سکندر اعظم مرگی کا مریض تھا۔

ایک اور دلچسپ کردار کے بارے میں بتاؤں یہ کردار ان معنوں میں تو دل چسپ نہیں تھا لیکن اس میں دل چسپی کی وجہ کچھ اور ہے۔

اس کا نام ہے بیسا راز۔ یہ خاتون دانتوں کے مکمل سیٹ کے ساتھ پیدا ہوئی تھی۔ یعنی پیدائش کے وقت اس کے پورے بتیس دانت تھے۔ ہے نا حیرت کی بات۔

جم پکاکس:

فلمیں دیکھنے والے الفریڈ ہچکاک سے ضرور واقف ہیں۔ اسے ماسٹر آف سسپنس بھی کہا جاتا ہے۔ اس شخص نے ایسی ایسی بے مثال فلمیں تخلیق کی ہیں۔ جو ماسٹر پیس

میں شمار ہوتی ہیں۔

سائکو اور دی برڈز اس کی مشہور فلموں سے ہیں۔

اس شخص کی ایک عادت بہت حیرت انگیز تھی۔

اس نے کبھی اپنے کوٹ یا قمیص کا نچلا بٹن بند نہیں کیا۔

اس کی وجہ سے اس کا پیٹ کھلا ہی رہتا تھا۔ اس عادت کی کیا وجہ تھی یہ صرف ہچکاک ہی بتا سکتا تھا اور شاید وہ بھی نہیں بتا پاتا۔ کیوں کہ بہت سی عادتیں بغیر کسی ظاہری وجہ کے اختیار کرلی جاتی ہیں دراصل ان عادتوں کی وجوہات نفسیاتی ہوا کرتی ہیں۔

آپ جانتے ہیں قدیم مصر کے راہبوں کی کیا عادت تھی۔

کیسی عجیب عادت تھی۔

وہ اپنے جسم کا ایک ایک بال نوچ لیتے تھے۔ اس طرح وہ یہ سمجھتے کہ وہ بہت مقدس ہوگئے ہیں۔ پلکیں اور بھنویں تک نوچ لیا کرتے۔

اگر آج کے زمانے میں ایسا کوئی انسان ہمارے سامنے آجائے تو ہم اس سے خوفزدہ ہوجائیں گے لیکن اس زمانے میں لوگ ان کے آگے احترام سے جھک جایا کرتے تھے۔

گوئٹے:

مشہور زمانہ مفکر اور فلاسفر۔ جس نے اپنے خیالات سے ایک دنیا کو متاثر کیا ہے لیکن خود کتوں کی آوازوں سے متاثر ہو کر سوچنا بھول جاتا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ وہ کسی کتے کی آواز سنتے ہی بری طرح خوف زدہ ہوجاتا۔

ایلیٹ:

ادب عالیہ سے دل چسپی رکھنے والے ٹی ایس ایلیٹ سے ضرور واقف ہوں گے۔

بیسویں صدی اس کی شاعری نے پورے انگریزی ادب کو متاثر کیا ہے لیکن شاعری اپنی جگہ ہے عادتیں اپنی جگہ۔

اس کے چہرے پر ہر وقت سبز رنگ کا پاؤڈر تھپا رہتا اور ہونٹوں پر گہری سرخ لپ اسٹک ہوا کرتی۔ اس کی وجہ سے اس کا چہرہ عجیب سا دکھائی دیتا لیکن کیا کیا جائے عادت پھر عادت ہوتی ہے۔

ایڈگر ایلن پو:

1800 صدی کا مشہور مصنف، شاعر، افسانہ نگار، جس کی تحریریں پوری دنیا میں پڑھی جاتی ہیں۔

وہ ایک عہد کو اپنی تحریروں سے متاثر کرنے والا شخص ہے۔ اس کے لکھنے کا طریقہ بہت دل چسپ اور منفرد تھا۔

وہ کاغذ کی ایک شیٹ سے دوسری شیٹ چپکا دیتا۔ پھر تیسری اس کے بعد چوتھی۔ اس طرح ایک طویل رول تیار ہوجاتا۔ پھر وہ اس رول پر لکھنا شروع کردیتا۔ اس طرح کا رول جب ایڈیٹر کے پاس جاتا تو بے چارے ایڈیٹر کے لیے اسے پڑھنا مشکل ہوجاتا۔

ایک موجد:

موجودہ عہد کا یہ بہت بڑا موجد ہے۔ جاپان کا یہ سائنس دان اس عہد کا سب سے بڑا موجد تسلیم کیا جاتا ہے۔

اس نے بے شمار انعامات اور اعزازات حاصل کیے تھے۔

1952ء میں اس شخص نے فلاپی ڈسک بنائی تھی۔ 74 برس کی عمر تک اس نے تین ہزار سے زائد چھوٹے موٹے ایجادات کیے تھے۔

دراصل کوئی بھی ایجاد اور کوئی بھی تصور اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک اس کی ایک خیال پر پوری توجہ نہ دی جائے۔

ہر مفکر کے سوچنے کا انداز مختلف ہوا کرتا ہے۔ کوئی چائے پیتے ہوئے سوچتا ہے۔ کوئی پارک میں جا کر سوچتا ہے۔ کوئی اکیلے کمرے میں بیٹھ کر غور و فکر کرتا ہے۔ بہت

سے لوگ ایسے ہیں جو لکھنے پڑھنے کا کام پہاڑی مقامات پر جا کر کرتے ہیں۔ کوئی ساحل کی طرف چلا جاتا ہے۔ لیکن اس سائنس داں نے ایک بالکل مختلف طریقہ دریافت کیا ہے۔

وہ پانی کے اندر جا کر سوچتا ہے۔ اس نے بہت سے نئے خیالات پانی کے اندر جا کر حاصل کیے۔ اس کی تھیوری یہ ہے کہ جب آپ پانی کے اندر جاتے ہیں تو آپ کو آکسیجن نہیں ملتی۔ ذہن کسی ایک نقطے پر مرکوز ہو جاتا ہے اس وقت جو خیالات آتے ہیں وہ بالکل خالص ہوتے ہیں۔

اس کے سوچنے کا دوسرا طریقہ اور بھی دل چسپ ہے۔

اس کی ریسرچ کے مطابق ٹی وی کی لہریں، موبائل کی لہریں اور ریڈیو کی لہریں آپ کے دماغ کی کارکردگی کو متاثر کردیتی ہیں۔

ڈاکٹر نے اپنے گھر میں ایک ایسا کمرا بنوا رکھا ہے جس میں سونے کی ٹائلز لگی ہوئی ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ سونے کے یہ ٹائلز ہر قسم کی فریکوئنسی کی لہروں کو روک لیتی ہیں۔ کمرے میں نہیں آنے دیتیں اس لیے سوچنے کا موقع مل جاتا ہے۔

ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ آپ جس کمرے میں لکھنے پڑھنے کا کام کرتے ہیں۔ اس کمرے میں کہیں بھی لوہے کی کیلوں کا استعمال نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ یہ کیلیں ہی آپ کے خیالات کو ڈل کردیتی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ جاسوسی اور سسپنس کے ادب میں اگاتا کرسٹی سے بڑا کوئی نام نہیں ہے۔ اس خاتون کی انگریزی کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس کی کتابیں ادب عالیہ میں شمار ہونے لگی ہیں۔

اتنی بے پناہ مقبولیت اس شعبے کے شاید ہی کسی اور رائٹر کو ملی ہوگی۔

اگاتا کرسٹی نے 66 ناولز لکھے اور مختصر کہانیوں کے سولہ مجموعے شائع ہوئے۔ اس کے ناول ماؤس ٹریپ کو مسلسل 22 برسوں تک اسٹیج پر دکھایا جاتا رہا۔

اس کی سب سے عجیب عادت یہ تھی کہ اس نے اپنے سارے ناولز ہوٹلز میں جا کر لکھے۔ ناول لکھتے ہوئے وہ کسی ہوٹل میں کمرا بک کروالیتیں اور اس وقت تک وہاں رہتیں۔ جب تک وہ ناول مکمل نہ ہو جاتا۔ ہوٹلز کے برعکس وہ مختصر کہانیاں اپنے گھر میں لکھا کرتیں لیکن کسی میز پر بیٹھ کر نہیں بلکہ کچن میں، غسل خانے میں۔

عام طور پر وہ پلاٹ سوچے بغیر کہانی شروع کردیتی تھیں اور جیسے جیسے آگے لکھتی جاتیں کہانی کا خاکہ ان کے ذہن میں بنتا چلا جاتا۔

بالزاک مشہور فرانسیسی مصنف تھا۔

دنیا کے ادب پر بالزاک کا بہت اثر ہے۔ اس شخص کو کافی پینے کی عادت تھی۔

اس کے لیے یہ لفظ عادت شاید بہت چھوٹا ہو۔

اسے کافی پینے کا جنون تھا۔ وہ دن بھر میں کم از کم ساٹھ پیالیاں کافی کی پی جایا کرتا۔ اس کا کہنا تھا کہ کافی کا اثر دماغ کی حسیات کو تیز کردیتا ہے اور اس کی سوچ میں روانی آجاتی ہے۔ اس بے تکی عادت نے اس کے پورے اندرونی سسٹم کو تباہ کردیا تھا۔ اس کے باوجود وہ کافی پیتا ہی رہتا۔

ایسی عادتوں کے بارے میں اس کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ یہ عادتیں نفسیاتی مرض کی صورت اختیار کرلیتی ہیں۔

سگمنڈ فرائڈ ایسا کون سا پڑھا لکھا شخص ہے جو اس کے نام سے واقف نہ ہو۔

اس شخص کو تحلیل نفس کا بانی کہا جاتا ہے۔ اس نے اس شعبہ میں نئی نئی جہتیں تلاش کیں اور ہر موضوع پر بے دھڑک لکھتا چلا گیا۔

یہ شخص بے تحاشا تمباکو نوشی کا عادی تھا۔ دن بھر اس کے منہ سے سگار کا دھواں نکلتا رہتا۔ کہا جاتا ہے کہ فرائڈ کو بغیر سگار کے کبھی نہیں دیکھا

گیا۔

اپنی اس عادت کی وجہ سے وہ منہ کے کینسر کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کے منہ اور جبڑے کا 33 بار آپریشن ہوا اس کے باوجود اس نے یہ عادت ترک نہیں کی۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر اس نے سگار چھوڑ دیا تو پھر لکھ نہیں سکے گا اور اسے ایسی زندگی نہیں چاہیے جس میں وہ کچھ لکھ نہ سکے۔

نکولا ٹیلا:

یہ بھی ایک بے انتہا ذہین اور بہت دل چسپ کردار ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے برقیات کے شعبے میں بے انتہا کام کیا۔ اے سی سے لے کر ٹی وی اور ریڈیو تک کے لیے بے شمار پرزے بنائے۔

اس کے کام کرنے کی عادت یہ تھی کہ وہ رات کے 3 بجے اٹھ کر کام شروع کر دیتا اور گیارہ بجے تک کام کرتا رہتا۔

25 سال کی عمر ہی میں اس کو نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا اس کے باوجود 38 برسوں تک اسی روٹین سے کام کرتا رہا۔

اس شخص کے ساتھ جو دوسری پرابلم تھی وہ اور بھی حیرت انگیز تھی۔ وہ موٹی عورتوں کو برداشت کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ان کو دیکھتے ہی اس پر دورے سے پڑنے لگتے اور نیم بے ہوش ہو جاتا۔

چارلس ڈکنز:

مشہور و معروف مصنف۔ اس کی ایک عادت سب سے الگ تھی اسے ہر وقت اپنے بال سنوارنے کا خبط رہتا۔ ہر دو تین منٹ کے بعد کنگھا نکال کر بال سنوارنے لگتا۔

یہ چند مشہور لوگ تھے جن کی عادتیں منفرد تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ بہت سے عام لوگوں کی عادتیں ان سے زیادہ منفرد ہوں لیکن عام لوگوں کا حساب کتاب کون رکھتا ہے۔

ببرک کارمل

(1929ء۔ دسمبر 1996ء)

افغان سیاسی رہنما (ببرک، بابر بمعنی ببر شیر کی تصغیر۔ کارمل: کارل مارکس کا مخفف) کابل میں پیدا ہوئے۔ لا اسکول میں تعلیم پائی۔ والد افغان فوج میں میجر جنرل تھے۔ بائیں بازو کے کارکنوں پر بادشاہ کا عتاب نازل ہوا تو ببرک بھی پکڑے گئے اور چار سال جیل میں رہے۔ اس کے بعد بھی متعدد بار قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں۔ خلق (کمیونسٹ) پارٹی کے صف اوّل کے رہنما تھے۔ 1970ء میں خلقی لیڈروں سے اختلافات کی بنا پر اپنی الگ جماعت پرچم قائم کی۔ اپریل 1978ء کے انقلاب کے بعد ترکی حکومت میں وزیر مقرر ہوئے۔ چند ماہ بعد چیکوسلواکیہ میں سفیر بنا کر بھیج دیے گئے۔ 27 دسمبر 1979ء کو صدر حفیظ اللہ امین مارے گئے تو ببرک کارمل صدر جمہوریہ، انقلابی کونسل کی مرکزی کمیٹی کے جنرل سیکریٹری اور افغان افواج کے سپریم کمانڈر مقرر ہوئے۔ مئی 1986ء تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ ماسکو میں جلاوطنی کی زندگی گزارنے کے بعد 1991ء میں افغانستان واپس آ گئے۔

مرسلہ: شاہینہ چودھری۔ لاہور

بپسی سدھوا

ممتاز ناول اور افسانہ نگار، وہ کراچی میں پیدا ہوئیں۔ مذہباً پارسی ہیں۔ کنیئرڈ کالج لاہور میں فلاسفی، پولیٹیکل سائنس اور اسلامک ہسٹری میں پوسٹ گریجویشن کیا۔ وہ انگریزی میں لکھتی ہیں۔ ان کی کتابیں پاکستان کے علاوہ انگلستان اور جرمنی میں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ مشہور تصانیف میں شامل ہیں۔ Ice Candy Man, The Crow Eaters, The Bride "دی برائڈ" پر ادبی انعام کے علاوہ 23 مارچ 1991ء کو حسن کارکردگی صدارتی تمغہ اور 25 مارچ 1991ء کو ان کی کتاب آئس کینڈی مین پر 1988ء کا ایوارڈ ملا۔ انہوں نے ایشیا ویمن کانفرنس منعقدہ 1975ء میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ وہ بعض بیرونی ممالک میں وزیٹنگ لیکچرار کے فرائض بھی انجام دیتی ہیں۔

مرسلہ: سید زریاب رضوی۔ ملتان

محمد ایاز راہی

شک ایک ایسا مرض ہے جو اپنا رنگ ہر حال میں دکھاتا ہے۔ یہ مرض صرف مشرق میں ہی نہیں مغرب میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس نے بھی اسی مرض کی وجہ سے اتنا بڑا قدم اٹھا لیا۔ اپنے ہاتھ ایک بے قصور کے خون سے رنگین کر لیے۔

وہ باوفا کو بے وفا سمجھ رہا تھا

ہماری حویلی دیہات کے ایک دور افتادہ، ویران اور سنسان قطعے میں واقع تھی۔ اونچے اونچے درختوں میں گھری ہوئی اس وسیع و عریض حویلی کی اپنی ایک الگ ہی شان تھی۔ اس کی دیواروں پر جابہ جا کائی جمی ہوئی تھی جو کسی بوڑھے کے چہرے پر اگی ہوئی داڑھی کی طرح لگتی تھی۔ یہاں ایک پارک بھی تھا...... جنگل جیسا۔ اس کے چاروں طرف نکاسی آب کے نالے کھدے ہوئے تھے۔ پارک کے آخری سرے پر بڑے بڑے تالاب تھے جو سرکنڈوں سے

بھرے ہوئے تھے۔ پاس ہی ایک چشمہ تھا جس کے کنارے پر میرے شوہر نے جنگلی بطخوں کا شکار کرنے کے لیے ایک جھونپڑا بنا رکھا تھا۔

ہمارے پاس عام نوکروں کے علاوہ ایک محافظ بھی تھا جو ذرا وحشی قسم کا تھا مگر تھا بہت تابعدار۔ ایک خادمہ تھی جو خادمہ کم اور میری سہیلی زیادہ تھی۔ سانولی رنگت اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کی مالک سوسن مجھے بہت چاہتی تھی۔ اس کے گیسو نہایت گھنے تھے اور ہمیشہ گچھوں کی صورت اس کی پیشانی کو چھپائے رکھتے تھے۔ میں اسے پانچ سال پہلے اسپین سے لائی تھی۔ وہ سولہ برس کی تھی لیکن اس کی اٹھان اس غضب کی تھی کہ بیس کی لگتی تھی۔

وہ موسم خزاں کے ابتدائی ایام تھے۔ ہم خوب شکار کرتے تھے۔ کبھی اپنی زمینوں پر، کبھی ملحقہ زمینوں پر......

وہیں میں نے ایک جوان شخص کو دیکھا وہ کوئی نواب تھا۔ بعد میں وہ اکثر ہمارے یہاں آنے لگا تھا پھر اس نے آنا ترک کر دیا۔ میں نے کوئی تردد نہیں کیا لیکن میں نے غور کیا کہ میرے شوہر کا رویہ کچھ بدلا بدلا سا نظر آنے لگا ہے۔ وہ گم گم ہو گیا تھا اور ہر وقت سوچ میں ڈوبا ہوا لگتا تھا۔ میں تنہائی کی خوگر تھی، لہٰذا الگ کمرے میں سوتی تھی۔ اس نے میرے پاس آنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ رات میں کبھی کبھی مجھے کسی کے قدموں کی آہٹ اپنے دروازے کے قریب آتی اور چند لمحوں کے بعد دور ہوتی سنائی دیتی۔ میری کھڑکی چونکہ نچلی منزل پر تھی، مجھے اکثر حویلی کے آس پاس کوئی سایہ سا منڈلاتا ہوا محسوس ہوتا۔ میں نے ایک مرتبہ اپنے شوہر سے اس کا ذکر کیا۔ وہ چند لمحے تک مجھے سخت نظروں سے گھورتا رہا اور پھر گویا ہوا ”وہ محافظ ہوگا۔ کسی تردد کی ضرورت نہیں۔“

☆☆☆

وہ ایک عام سی شام تھی۔ ہم رات کا کھانا کھا کر فارغ ہو چکے تھے۔ اس روز میرا شوہر غیر معمولی طور پر خوش اور مسرور نظر آ رہا تھا۔

”کیا تم میرے ساتھ ایک لومڑ کا شکار کرنے چلو گی جو ہر رات آ کر ہماری مرغیاں کھا جاتا ہے۔“ اس نے پوچھا ”تمہیں بندوق کے ساتھ تین گھنٹے گزارنے پڑیں گے۔“

میں اسے حیرت سے تکنے لگی۔ وہ براہ راست میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ میں تھوڑا ہچکچائی اور پھر مخاطب ہوئی ”ٹھیک ہے، چلوں گی۔“

میری حیرت کا سبب یہ تھا کہ میں بھی ایک شکاری تھی اور مردوں کی طرح بھیڑیوں اور جنگلی سوروں کا شکار کیا کرتی تھی لہٰذا اس کا مجھ سے یہ پوچھنا کیا میں اس کے ساتھ ایک لومڑ کے شکار پر جاؤں گی، مجھے بہت عجیب لگا پھر اچانک ہی وہ بہت گھبرایا گھبرایا سا نظر آنے لگا۔ شام کا بقیہ حصہ اس نے بے چینی کے عالم میں کبھی اٹھتے کبھی بیٹھتے گزار دیا۔

پھر رات کے تقریباً دس بجے وہ مجھ سے مخاطب ہوا ”تم تیار ہو؟“

میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ حسب سابق میری بندوق اٹھا لایا۔ میں نے پوچھا ”کیا ہم گولیاں لیں یا ہرن کو مارنے والے چھرے؟“

وہ مجھے قدرے اچنبھے سے گھورنے لگا ”اوہ، صرف ہرن کو مارنے والے چھرے۔“ بالآخر وہ بولا۔ ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ کافی ہوں گے۔“ پھر وہ عجیب سے لہجے میں گویا ہوا ”تم حیرت انگیز طور پر پرسکون نظر آ رہی ہو۔ میں اس کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

میں کھلکھلا کر ہنس پڑی ”میں؟ کیوں؟ کیا اس لیے کہ ایک لومڑ کا شکار کرنے جا رہی ہوں؟ تم کیا سوچ رہے ہو؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہم حویلی سے نکل گئے اور خاموشی سے جنگل عبور کرنے لگے۔ سارے نوکر جا کر سو چکے تھے۔ آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا۔ اس کی پیلی پیلی چاندنی نے اداس اداس سی پرانی حویلی پر گویا ہلکا پیلا رنگ پھیر دیا تھا۔ اس کی سلیٹی رنگ کی چھت خوب چمک رہی تھی۔ صاف وشفاف رات خاموشی کے سحر میں کھوئی کھوئی تھی۔ کائنات کا ذرہ ذرہ ساکت تھا۔ کہیں سے مینڈک کے ٹرانے کی بھی آواز نہیں آ رہی تھی۔ فضا میں ایک عجیب سی اداسی گھلی ہوئی تھی۔ کوئی اُلو بھی نہیں چیخ رہا تھا۔

جب ہم پارک میں درختوں کی چھاؤں میں پہنچے تو مجھے کچھ تازگی کا احساس ہونے لگا۔ یہاں درختوں سے جھڑے ہوئے پتوں کی مخصوص بُو پھیلی ہوئی تھی۔ میرا شوہر بالکل خاموش تھا لیکن وہ سن رہا تھا، دیکھ رہا تھا، درختوں کی بو سونگھ رہا تھا۔ وہ تعاقب کرنے کے جوش میں بھرا ہوا تھا۔

ہم جلد ہی تالاب کے کنارے پہنچ گئے۔ کھلی ہوا سے کبھی کبھی اس کی سطح پر تھوڑی سی ہلچل مچ جاتی اور لہریں ایک دائرے میں آپس میں ملتی ہوئی نظر آتیں۔

ہم تھوڑی ہی دیر میں جھونپڑے تک پہنچ گئے جہاں

ہمیں شکار کا انتظار کرنا تھا۔ میرے شوہر نے پہلے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا پھر اپنی بندوق لوڈ کر لی۔ لمحے آہستہ آہستہ بیت رہے تھے۔ اس طرح نصف گھنٹا گزر گیا۔ موسم خزاں کی وہ چاندنی رات پہلے کی طرح پُرسکوت تھی۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ ادھر سے گزرے گا؟" میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

اس نے یکبارگی جھرجھری لی پھر اپنا منہ میرے کان کے قریب لا کر بولا "مجھے پورا یقین ہے۔"

ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میری آنکھیں نیند سے بند ہونے لگیں۔ اچانک مجھے اپنے بازو پر اس کا ہاتھ محسوس ہوا۔ میں نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں "کیا وہ تمہیں درختوں کے پیچھے نظر آ رہا ہے؟" وہ سرگوشی میں پھنکارا۔

میں نے دیکھنے کی ناکام سعی کی۔ مجھے کچھ بھی نہیں سجھائی دیا۔ میرے شوہر نے آہستہ سے بندوق سیدھی کر لی۔ اس کی نظریں مجھ پر مرتکز تھیں۔ میں خود بھی فائر کرنے کی تیاری کر رہی تھی پھر ہم سے کوئی تیس قدم پر اچانک ہی ایک شخص چاندنی میں نمودار ہوا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا جا رہا تھا۔ اس کا جسم جھکا ہوا تھا گویا وہ فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہو۔ میرے منہ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی لیکن اس سے پہلے کہ میں پلٹتی میری آنکھوں کے سامنے ایک جھماکا ہوا۔ ساتھ ہی ایک سماعت شکن دھماکا سنائی دیا۔ وہ شخص زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ ایسے ہی جیسے کوئی بھیڑیا گولی کھا کر تڑپتا ہو۔ میں مارے دہشت کے چیخ اٹھی۔ اگلے ہی لمحے میرے شوہر نے میرا گلا دبوچ لیا۔ میں زمین پر گر پڑی۔ اس نے مجھے اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھا لیا اور کندھے پر ڈال کر بھاگنے لگا۔ پھر گھاس پر پڑی ہوئی اس کی لاش کے پاس پہنچ کر مجھے اتنے زور سے اس کے اوپر پٹخ دیا کہ جیسے میری گردن توڑنا چاہتا ہو۔

مجھے ایسا لگا جیسے میں بے ہوش ہو جاؤں گی۔ وہ مجھے ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی ایڑی میری پیشانی تک اٹھائی تھی کہ اچانک کسی نے اسے جکڑ کر زمین پر دے مارا۔ میں اچھل کر کھڑی ہو گئی اور پھر جھک کر دیکھا، میری خادمہ سوسن، میرے شوہر پر چڑھی بیٹھی تھی اور کسی جنگلی بلی کی طرح نہایت وحشیانہ انداز میں اس کا چہرہ اور داڑھی نوچ رہی تھی۔ اس پر جنون طاری تھا۔ اس نے میرے شوہر کا چہرہ لہولہان کر دیا پھر اچانک ہی وہ یوں رک گئی گویا ذہن میں

جلال بایار

(1884ء۔22 اگست 1986ء)

ترکی کے ایک سیاست دان اور تیسرے صدر، 1921ء سے 1937ء تک مختلف وزارتوں پر فائز رہے۔ 1923ء میں ترکی اور یونان کے مابین تبادلہ آبادی ہوا تو یہ اس کے نگران تھے۔ 1937ء میں وزیر اعظم بنے۔ 1938ء میں اتاترک کا انتقال ہوا تو استعفا دے دیا۔ 1946ء میں عدنان میندریس کے ساتھ مل کر ڈیموکریٹک پارٹی کی بنیاد رکھی۔ 1950ء کے انتخابات میں ان کی جماعت نے کامیابی حاصل کی تو عصمت انونو کی جگہ ترکی کے صدر منتخب ہوئے۔ مئی 1960ء میں جنرل جمال گورسل نے حکومت کا تختہ الٹ کر ڈیموکریٹک پارٹی کے تمام سرکردہ لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ عدنان میندریس اور ان کے دو رفقاء کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ جلال بایار کو بھی سزائے موت ہوئی مگر پیرانہ سالی کے باعث عمر قید میں تبدیل کر دی گئی۔ وہ جمہوریہ ترکیہ کے بانیوں میں سے تھے۔ استنبول میں انتقال ہوا۔

مرسلہ: نورین علی۔ کوئٹہ

کوئی دوسرا خیال آ گیا ہو۔ وہ اٹھی اور لاش پر جا پڑی۔ اس نے اپنی باہیں اس مرد کے گرد حمائل کر دیں اور اس کی بے جان آنکھوں اور چہرے پر بوسوں کی بارش کرنے لگی۔

میرا شوہر تھوڑی سی جدوجہد کر کے اٹھ کھڑا ہوا اور مجھے تکنے لگا۔ وہ سب کچھ سمجھ گیا تھا۔

یکایک وہ میرے پیروں پر گر پڑا "میری جان، مجھے معاف کر دو۔" وہ گڑگڑایا "میں تم پر شبہ کرتا تھا اور میں نے اس لڑکی کے محبوب کو مار ڈالا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میرا محافظ اس لڑکی کا عاشق ہے۔"

لیکن میں ایک لاش اور ایک جیتی جاگتی لڑکی کی محبت کا عجیب و غریب منظر دیکھ رہی تھی اور اس کی آہیں اور سسکیاں سن رہی تھی اور خاموش کھڑی سوچ رہی تھی، میں چاہوں تو واقعی اپنے شوہر سے بے وفائی کر سکتی ہوں۔

سراب

راوی : شہبازملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط نمبر: 98

وہ پیدایشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحرے میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب...... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے۔ جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

میری محبت سویرا، میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران میں نادر علی سے ٹکراؤ ہوا، اور یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ فتح خان نے مجھے مجبور کردیا کہ مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کردیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا ہی تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ میں نے کرنل زورسنگھ کو زخمی کرکے بساط اپنے حق میں کرلی۔ میں دوستوں کے درمیان آکر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ ہم مانسہرہ پہنچے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہر وتھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زورسنگھ بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کررہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگادیا۔ اس گاڑی سے کرنل زورسنگھ ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کردیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپادیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پالیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جینس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کردی اور میں نے ان کے ساتھ جا کر بریف کیس حاصل کرلیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آگئے۔ سفیر کو دبئی بھیجنا تھا اسے ایئرپورٹ سے سی آف کرکے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی بنٹی کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالت مجبوری میں راضی ہوگیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہوگیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہوکر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر میں آگے بڑھا تھا کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیر لیا گیا۔ وہ فتح خان تھا، اس نے ڈیوڈ شا کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شا کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پُراسرار وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور پیلس سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا نامی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے منشی دل جی کی آواز سنائی دی ''شاجی، شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔'' ڈیوڈ شا کا جواب سن نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مائک بند کردیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور لگادی گئی۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کررہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے وار کرکے بے ہوش کردیا اور محل میں پہنچادیا۔ مجھے پتا تھا ہر جگہ ڈیکٹا فون لگا ہوا ہے۔ تبھی فائرنگ شروع ہوئی اور میں نے چیخ کر کہا ''کنور ہوشیار'' سادی کو لے کر چیمبر...... '' مگر جملہ ادھورا رہ گیا اور سادی کی چیخ سنائی دی پھر منشی دل نظر آیا۔ اس کے آدمیوں نے بڑے کنور کے وفاداروں کو ختم کرنا شروع کردیا تھا۔ میں اس سے نمٹ رہا تھا کہ فتح خان نے آکر مجھے اور سادی کو نشانے پر لے لیا۔ تبھی راج کنور آگیا۔ اس نے گولی چلائی جو بیتو کی گردن میں لگی۔ میں نے غصے میں پورا پستول راج کنور پر خالی کردیا بیتو مرچکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چتا کے حوالے کیا اور ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعہ سرحد تک پہنچے۔ وہاں سے اپنے شہر۔ وہاں پہنچا ہی تھا کہ ڈیوڈ کی کال آگئی اس نے تصفیہ کرانے کی بات کی اور کال کٹ گئی۔ ہم بنگلے میں بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ گیس پھینک کر ہمیں بے ہوش کردیا گیا اور جب ہوش آیا تو میں قید میں تھا۔ شا کی قید میں شا نے مجھے کہا کہ میں فاضلی کی مدد کروں کیونکہ میرے ہاتھوں میں ایک ایسا کڑا پہنادیا گیا تھا جو فاضلی سے 500 میٹر دور جاتے ہی زہر انجیکٹ کردیتا، میں حکم ماننے پر تیار ہوگیا فاضلی نے مرشد کی جعلی خانقاہ پر حملے کا پروگرام بنایا۔ ہم نے فاضلی کے آدمیوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ حملہ کامیاب رہا فاضلی مارا گیا اور مجھے سانپ نے ڈس لیا مگر سانپ کا زہر مجھ پر کارگر نہ ہوا۔ فاضلی نے جو کڑا مجھے پہنایا تھا اس کا الٹا اثر ہوا اور وہ خود کڑے میں چھپے سائینائیڈ زہر سے مارا گیا۔ میں مرشد کی خانقاہ سے نکل کر دوستوں کے پاس پہنچا پھر راجا صاحب سے ملنے جیپ کے ذریعے ان کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ علاقہ بھی تھا جہاں برٹ شا نے ہیرے چھپائے تھے۔ میں اسے تلاش کرنے کے لیے پیڑ پر چڑھا تھا کہ فائر ہوا اور میں پھسل کر نیچے گرا ہی تھا کہ فتح خان کی آواز آئی کہ تم ٹھیک تو ہے پھر وہ مجھے قید کرکے لے چلا۔ راستے میں اس کے ساتھیوں نے غداری کی مگر میری مدد سے فتح خان فتح یاب ہوگیا۔ مگر آگے جا کر میں نے فتح خان کو گولی ماردی اور واپس وہاں آیا جہاں گاڑی کرکے گیا تھا۔ وہ لاش پڑی تھی۔ ابھی میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ پولیس والے آگئے اور مجھے تھانے لے آئے۔ وہاں سے

رشوت دے کر چھوٹا پھر راجا صاحب کے محل پہنچا مگر وہاں کے حالات بدل چکے تھے۔ میں واپس ہو گیا کہ راستے میں ایک عورت اور دو نوجوانوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے سر پر کسی چیز سے وار ہوا۔ میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ ہوش آیا تو میں شیر خان کی قید میں تھا۔ وہ لوگ مجھے افغانستان کے راستے بھارت لے آئے تب پتا چلا کہ وہ لڑکی ڈیوڈ کی کارندہ ہے لیکن اس نے ڈیوڈ شاہ کے گلے لگ کر کہا "پاپا" تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے خواب میں بھی ایسا نہیں سوچا تھا ڈیوڈ نے اوشا کو بھی وہیں قید کر رکھا تھا۔ وہیں میری ملاقات ایک نیپالی سے ہوئی جو انہیں کا کارندہ تھا اس نے مجھے ایک موبائل فون دیا جس سے میں نے ایمن سے باتیں کیں مگر اس کا راز کھل گیا اور شا نے اسے قتل کر دیا۔ دو دن کے بعد تاریک وادی کا سفر شروع ہو گیا۔ ہم .... چلے جا رہے تھے کہ باسو کا پیر پھسلا اور وہ ایک کھڈ میں گرنے لگا۔ ہم سب برف پوش پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے ایک ہی رسی میں خود کو باندھے ہوئے تھے اس لیے میرا توازن بگڑا اور میں آگے کی سمت گرا تھا کہ زینی نے سنبھال لیا۔ کرنل نے باسو کو رسی پھینک کر بچا لیا۔ ہمارا سفر جاری رہا۔ ایک جگہ برفانی آدمیوں کے ایک غول نے گھیر لیا۔ ان سے بچ کر نکلا تو راستہ بھٹک گیا اور ایک سرنگ میں پہنچ گیا جو برف والے آدمی کی تھی۔ وہاں سے چلا تو صرف زینی میرے ساتھ تھی۔ ہمیں بندر نما گوشت خور مخلوق نے گھیر لیا تھا۔ ان سے بچنے کے لیے ہم دوڑ رہے تھے کہ ایک کنواں نما غار میں جا گرے۔ اوپر سے وہ مخلوق پتھر برسانے لگی۔ ہم بچنے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ مخلوق خود بھاگنے لگی۔ تبھی اوپر سے ایک برفانی آدمی نے نیچے دیکھا اور قلابازی کھاتا ہوا اندر کودا۔

(اب آگے پڑھیں)

برفانی آدمی اندر کودا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس محدود جگہ اس خونخوار درندے کا مقابلہ مشکل تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ سینے میں شاٹ گن کا زخم کھا کر بھی کتنی دیر زندہ اور متحرک رہا تھا۔ فوراً ہی مجھے احساس ہوا کہ گولی زینی نے نہیں چلائی تھی۔ فائر کہیں اور سے ہوا تھا اور بالکل نزدیک ہوا تھا۔ برفانی آدمی نیچے گرا اور ساکت ہو گیا۔ میں نے زینی سے پستول لے کر اس کا رخ برفانی آدمی کی طرف کر دیا۔ جب میں نے زینی سے پستول لیا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ کانپ رہی تھی۔ خوف اس پر اتنا غالب آیا کہ وہ فائر ہی نہیں کر سکتی تھی۔ اسی لمحے اوپر سے ایک سانپ آ کر اندر گرا اور زینی نے چیخ ماری۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسری چیخ مارتی میں نے اس کا منہ دبوچ لیا کیونکہ اندر گرنے والی شے سانپ نہیں بلکہ رسی تھی اور اوپر سے کسی نے سرگوشی میں کہا۔ "جلدی اوپر آ جاؤ...... وقت نہیں ہے یہاں اور بھی برفانی آدمی ہیں۔"

میں بولنے والے کی آواز شناخت نہیں کر سکا کیونکہ وہ ڈیوڈ شا کے ساتھیوں میں سے نہیں تھا۔ وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ برفانی آدمی برف کے ڈھیر پر گرا تھا اور جب وہ سرخ ہونے لگا تب مجھے درست طور پر پتا چلا گولی برفانی آدمی کے سر میں لگی تھی اور وہ نیچے گرنے سے پہلے مر چکا تھا۔ بہ ظاہر ایسا لگا تھا کہ وہ قلابازی کھا کر نیچے کودا ہو۔ اس کے سر سے بہنے والا خون برف پر پھیل رہا تھا۔ شکر ہے گولی چلانے والے نے اس کے سر کا نشانہ لیا ورنہ وہ اتنی جلدی اور آسانی سے مرنے والی مخلوق نہیں تھی۔ میں نے رسی پکڑی اور ایک لمحے کو سوچا اور اوپر چڑھنے لگا تھا کہ زینی چمٹ گئی۔ "کہاں جا رہے ہو مجھے چھوڑ کر۔"

"تم پیچھے آؤ۔" میں نے کہا۔ "بولنے والا ہمارے ساتھیوں میں سے نہیں ہے یہ کوئی اور ہی شخص ہے۔"

زینی نے سر ہلایا اور مجھے چھوڑ دیا۔ میں اوپر چڑھا اور ایک منٹ بعد میں کنویں کے کنارے پر تھا۔ میں نے باہر جھانکا تو ایک شخص مجھے پاس ہی لیٹا ہوا نظر آیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "اٹھنا مت اور زیادہ حرکت مت کرنا اسی طرح لیٹے لیٹے اوپر آ جاؤ۔"

وہ انگریزی بول رہا تھا مگر اس کا لہجہ مقامی تھا۔ میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور سانپ کی طرح رینگ کر چٹان پر آ گیا۔ میں نے بھی سرگوشی میں پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

"جلد تمہیں پتا چل جائے گا لیکن میں دوست ہوں۔"

"تمہارے ساتھ اور کوئی بھی ہے؟"

"ہاں۔" اس نے جواب دیا۔ "لیکن وہ یہاں نہیں ہے۔"

میرے بعد زینی اوپر آ رہی تھی اور میں نے اسے بھی وہی کہا جو اس آدمی نے مجھ سے کہا۔ زینی نے اس کے بارے میں مجھ سے پوچھا۔ "یہ کون ہے؟"

"میں نہیں جانتا اور خاموش رہو۔ یہاں مزید برفانی آدمی موجود ہیں۔"

وہ سہم گئی۔ "باسو کہاں ہے؟"

یہاں سے وہ چٹان نظر نہیں آ رہی تھی جس پر باسو کو چھوڑا تھا۔ میرے پاس لیٹے آدمی کے ہاتھ میں ایک خودکار

رائفل تھی اور اس پر ایک چھوٹی دوربین بھی فٹ تھی اس کا زردی مائل شیشہ بتا رہا تھا کہ یہ نائٹ ویژن بھی تھی اور وہ شاید اسی کی مدد سے دیکھ رہا تھا کیونکہ اس کی آنکھ دوربین سے لگی ہوئی تھی۔ پھر اس نے کان پر انگلی رکھ کر آہستہ سے کہا۔ ''وہ محفوظ ہے میرے پاس ہے اوکے ہم آتے ہیں۔''

''تم کس سے بات کر رہے ہو؟''

''میرے ساتھ آؤ۔'' اس نے میری بات نظر انداز کر کے کہا اور لیٹے لیٹے دوسری طرف مڑ گیا۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر روکا۔

''میں تمہارے ساتھ ایسے ہی نہیں جاؤں گا۔ پہلے مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ تم کون ہو؟''

جواب میں اس نے اپنا دستانہ پوش ہاتھ میرے سامنے کر دیا۔ چاندنی میں دستانے پر ایک نام لکھا ہوا تھا اور میں کچھ لمحے کے لیے دنگ رہ گیا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''اگر تم نے چلنا ہے تو چلو۔''

''ہم کہیں نہیں جائیں گے۔'' زینی نے تند لہجے میں کہا۔

''آہستہ بولو۔'' اس آدمی نے گھبرا کر کہا۔ ''برفانی آدمی یہاں سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ انہوں نے سن لیا تو ہم صحیح سلامت یہاں سے نکل نہیں سکیں گے۔''

''زینی ہمیں جانا ہوگا۔'' میں نے اچانک کہا۔ ''میرا خیال ہے ڈیوڈ شا اور دوسرے یہاں سے جا چکے ہیں۔''

''اتنی جلدی؟'' اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔ ''وہ کیسے؟''

''ایسے۔'' میں نے کہا اور کہنی اس کی کنپٹی پر ماری اور وہ بے سدھ ہوگئی۔ میں نے پلٹ کر اسے اپنی پشت پر لاد لیا اور آدمی سے کہا۔ ''چلو یہاں سے۔''

آدمی نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور آگے رینگنے لگا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ شروع میں بڑا مشکل رہا کیونکہ زینی کو پشت پر لاد کر رینگنا آسان کام نہیں تھا۔ مگر کسی نہ کسی طرح اسے پشت پر رکھنے میں کامیاب رہا۔ اس دوران میں دوسرا آدمی بھی نظر آگیا۔ وہ ایک ابھری ہوئی چٹان کے پیچھے مورچہ لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی اور شاید برفانی آدمی پر اسی نے فائر کیا تھا۔ ہمارے نزدیک آتے ہی وہ ہمارے ساتھ ہو گیا۔ وہ عقب سے زینی کو میری پشت پر رہنے میں مدد دے رہا تھا۔ ہمارا رخ شمال کی طرف تھا۔ تقریباً سو گز کے بعد ہم نیچے اتر گئے۔ پہلے وہ دونوں نیچے گئے اور انہوں نے زینی کو سہارا دے کر اتارا۔ میں خود اتر آیا۔ یہ راہداری سی تھی۔ دوسرے آدمی نے زینی کو پشت پر لاد لیا اور پہلے آدمی نے پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟''

''ڈیوڈ شا کی بیٹی۔''

وہ چونکا۔ ''ڈیوڈ شا کی بیٹی...... تب اسے ساتھ لے جانا مناسب ہوگا؟''

''مناسب تو شاید نہ ہو لیکن اسے یہاں اس حال میں چھوڑ کر جانا بھی مناسب نہیں ہے اس کی جان خطرے میں پڑ سکتی ہے۔''

اس نے سوچا اور سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے اسے بھی لے چلتے ہیں۔''

ہم نے چلنا شروع کیا اور میں نے اس سے پوچھا۔ ''ہمیں کہاں جانا ہے اور وہ کہاں ہے؟''

''دور جانا ہے ویسے تم کس کی بات کر رہے ہو؟''

''جس کا نام تم نے دستانے پر دکھایا ہے۔''

''وہ بھی وہیں ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

قریب سے انہیں دیکھنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ وہ گورکھا یا اس سے ملتی جلتی کسی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ جسمانی لحاظ سے وہ تنومند اور مضبوط تھے۔ اس طرح کے نقوش کے حامل افراد اس سارے ریجن میں پائے جاتے ہیں۔ یہ نقوش میرے جانے پہچانے تھے اس لیے بھی میں نے اس پر اعتبار کیا۔ دوسرے میں ویسے ہی دشمن کی قید میں تھا۔ نیچے آنے کے بعد انہوں نے محدود روشنی والی ٹارچیں آن کر لی تھیں اور ہم ان کی روشنی میں سفر کر رہے تھے۔ راہداری بار بار مختلف دوراہوں اور بعض مقامات پر تنہ راہوں سے گزر رہی تھی اس کے باوجود وہ بغیر جھجکے جتنی تیزی سے راستے اختیار کر رہے تھے اس سے لگ رہا تھا کہ انہیں راستوں کا اچھی طرح علم تھا۔ اس لیے انہوں نے کہیں بھی رک کر راستہ سوچنے یا کوئی نقشہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ روانی سے چل رہے تھے۔ برفانی آدمیوں کا سن کر مجھے باسو کا خیال آیا تھا کہ وہ اوپر تھا اور پوری طرح فٹ بھی نہیں تھا۔ وہ یقیناً برفانی آدمیوں کا مقابلہ نہیں کر سکا ہوگا اور اسے اپنی مہلک گن چلانے کا موقع بھی نہیں ملا ہوگا۔ مجھے افسوس ہوا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''تم ہماری آمد سے کیسے واقف ہوئے؟''

''ایک فرد مستقل یہاں موجود رہتا تھا۔'' میرے ساتھ چلنے والے نے جواب دیا۔ ''اسی سے ہمیں پتا چلا پھر کچھ وقت ہم دونوں کو آنے میں لگا۔''

میں چونکا۔ ”نگران وہاں موجود ہے؟“
”نہیں۔“ اس نے گہری سانس لی۔ ”جب ہم وہاں پہنچے تو برفانی آدمی اسے مار چکے تھے۔ ہمیں ذرا تاخیر ہوئی۔ اگر ہم چاہتے تو انہیں مار سکتے تھے مگر تمہاری وجہ سے ہم نے ہنگامہ آرائی مناسب نہیں سمجھی۔ اسی وجہ سے ہم کامیاب بھی ہوئے ورنہ برفانی آدمی خاصے زیادہ تھے۔ شاید درجن سے بھی اوپر۔“
”تمہیں کیسے پتا چلا کہ ہم اس کنویں میں گر گئے ہیں۔“
”بندر نما جانوروں نے رہنمائی کی لیکن جب تک ہم تمہاری مدد کو آتے ایک برفانی آدمی وہاں آنکلا اس نے بھی بندروں کی موجودگی سے اندازہ لگایا کہ کنویں میں کوئی ہے۔ عین اس وقت جب وہ اندر کودنے والا تھا سوئینے نے اسے شوٹ کردیا۔“
”سوئینے؟“
”میرا بھائی۔“ اس نے زینی کو اٹھانے والے کی طرف اشارہ کیا۔ ”میرا نام روئینے ہے۔“
”سوئینے روئینے یہ تو خاصے مشکل نام ہیں۔“
وہ آہستہ سے ہنسا۔ ”اسی وجہ سے ہمیں سونی اور رونی کہا جاتا ہے۔“
”تمہارے ساتھ اور کتنے لوگ ہیں؟“
”ایک درجن افراد تھے۔“ اس نے سرسری سے انداز میں کہا۔ ”اب نو باقی رہ گئے ہیں تین مارے جاچکے ہیں۔ ایک کو برفانی آدمی نے مارا باقی دو راستے میں حادثات کا شکار ہوئے تھے۔“
”تم لوگوں کا واسطہ بھی برفانی آدمیوں سے پڑا تھا؟“
”نہیں ہم دوسرے راستے سے آئے ہیں۔ لیکن ہمیں معلوم ہے برفانی آدمی ان چٹانوں تک آتے ہیں کیونکہ جب ان کے پاس خوراک کی قلت ہوتی ہے تو یہاں خوراک لینے آتے ہیں۔“
”تمہارا مطلب ہے وہ وادی میں اتر کر خوراک لیتے ہیں۔“
”ہاں شاید وہ وادی سے ہی لیتے ہیں نیچے اترتے ہیں یا درمیان سے کہیں سے لیتے ہیں۔“
”تم کب سے یہاں ہو؟“
”آج ہمیں یہاں آئے ہوئے دوسرا ہفتہ شروع ہو گیا ہے۔“ اس نے بتایا تو میں مزید چونکا تھا۔

”تم جانتے تھے کہ ہم یہاں آرہے ہیں؟“
اس نے سر ہلایا۔ ”خاص طور سے یہ بھی جانتے تھے کہ آپ بھی آرہے ہیں۔“
میں سوچ میں پڑ گیا۔ مگر میں نے اس سے کچھ کہا نہیں۔ ہمیں سفر کرتے ہوئے بیس منٹ ہو چکے تھے اور میرا اندازہ تھا کہ ہم اس جگہ سے کوئی دو ڈھائی میل دور نکل آئے تھے۔ ہمارا رخ مزید شمال کی طرف تھا۔ ایک جگہ رسی کی سیڑھی اوپر جارہی تھی اس سے ہم چٹانوں پر چڑھے اور کوئی سو گز کے بعد دوبارہ نیچے اتر کر اسی طرح کی راہداریوں میں سفر کرنے لگے۔ شاید دوسری طرف جانے کا زمینی راستہ بہت طویل تھا اس لیے شارٹ کٹ بنایا گیا تھا۔ زینی کو اس شارٹ کٹ سے لے جانا کسی قدر مشکل ثابت ہوا تھا۔ اس کا وزن پہلے ہی کوئی پینسٹھ کلوگرام کے آس پاس تھا اور اس نے خاصا وزنی لباس اور دوسری چیزیں زیب تن کررکھی تھیں۔ مجموعی طور پر وہ کوئی پچھتر کلوگرام کے آس پاس وزنی تھی۔ میرے پاس گھڑی نہیں تھی اور دوسری طرف اتر کر میں نے وقت پوچھا تو رونی نے جواب دیا۔ ”سوا گیارہ بج رہے ہیں۔“
”تم لوگوں کا اپنی پارٹی سے کیسے رابطہ ہوتا ہے؟“
”ہمارے پاس ریڈیو ہیں۔“
”مارے جانے والے کے پاس بھی ریڈیو تھا؟“
”ہاں لیکن شاید اسے استعمال کرنے کا موقع نہیں ملا۔ برفانی آدمیوں نے اچانک حملہ کیا تھا۔ اس کا ریڈیو بھی تباہ کردیا تھا۔“
”حملہ کس وقت کیا؟“
”جب تم لوگ پہنچے اس کے کچھ دیر بعد ہی انہوں نے حملہ کیا ہوگا کیونکہ جب ہم وہاں پہنچے تو اسے مرے ہوئے خاصی دیر ہو چکی تھی۔“ رونی نے جواب دیا۔ ”اسی سے ہمیں برفانی آدمیوں کے بارے میں پتا چلا۔“
”وہ ہمارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آئے ہیں، انہوں نے میری ایک ساتھی عورت کو اغوا کرلیا۔ ایک آدمی کو ماردیا۔“
رونی چونکا۔ ”عورت کو اغوا کیا ہے اس کے ساتھ زیادہ برا ہوسکتا ہے۔ یہ ہماری عورتوں کو بھی اغوا کرکے لے جاتے ہیں۔“
”تمہاری عورتیں...... کیا تمہارا تعلق بھی شمالی علاقے سے ہے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”ہم یہاں سے چھ دن کی مسافت پر رہتے ہیں اور پیشہ ور گائیڈ ہیں۔“

”میرا تو خیال ہے کہ تم پیشہ ور گائیڈ سے بڑھ کر کچھ ہو۔“ میں نے اس کی رائفل کی طرف دیکھا۔ ”تمہارے بھائی کا نشانہ لاجواب ہے اس نے ایک ہی گولی میں اس درندے کو مار گرایا۔“

اس نے جواب نہیں دیا اور خاموشی سے چلتا رہا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد اس نے پوچھا۔ ”اگر آپ تھک گئے ہیں تو ہم کچھ دیر رک سکتے ہیں۔“

”ہمیں مزید کتنی دور جانا ہے؟“

”تقریباً اتنا ہی اور چلنا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”خاص تھکن نہیں ہے، اگر تم رکنا چاہتے ہو تو رک جاؤ۔“

”ہم وزن اٹھا کر چلنے کے عادی ہیں۔“ رونی نے کہا۔ اس کا بھائی نہایت کم گو تھا اس نے اس دوران میں صرف چند الفاظ کہے تھے اور وہ بھی اپنی زبان میں جس کا ایک لفظ بھی میرے پلے نہیں پڑا تھا۔ جب میں نے برفانی آدمی کو ایک ہی گولی میں مار گرانے پر اس کی تعریف کی تب بھی اس نے کوئی ردِعمل نہیں دیا تھا۔ اس پورے سفر کے دوران میں وہ زینی کو اٹھائے رہا اور اس نے ایک بار بھی تھکن ظاہر نہیں کی تھی۔ میں نے کہا۔

”تب چلتے رہو اگر میں محسوس کروں گا تو بتا دوں گا۔“

ہمیں سفر کرتے ہوئے دو گھنٹے ہو چکے تھے اور اتنا ہی سفر باقی تھا۔ میرا خیال تھا کہ دوسری پارٹی اس جگہ موجود تھی جہاں وادی میں جانے والا راستہ اترتا تھا۔ اس وقت تک ہم خطرے سے دور نکل آئے تھے کیونکہ اب وہ آواز دبا کر بات نہیں کر رہا تھا بلکہ نارمل آواز میں بول رہا تھا اس طرح چلنے کے دوران پیدا ہونے والی آہٹوں کو بھی نہیں دبا رہا تھا۔ مگر ان کے پاس بولنے کو زیادہ نہیں تھا اور اب خاموشی تھی۔ خاموش رہ کر سفر کرنے میں بوریت ہو رہی تھی اور میں فی الحال اس شخص کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا تھا جس کا نام رونی کے دستانے پر لکھا تھا۔ اس لیے میں نے برفانی آدمی کا موضوع چھیڑ دیا۔ ”تم نے بتایا کہ یہ تمہاری عورتوں کو اٹھا لے جاتے ہیں وہ کیوں؟“

”مجھے صحیح سے تو پتا نہیں ہے کیونکہ کبھی ان کے پاس نہیں گئے مگر میرے بزرگ کہتے ہیں کہ انسانی عورتوں سے نسل کشی کا کام لیتے ہیں۔“

میں چونکا۔ ”لیکن ان میں مادائیں بھی ہوتی ہیں۔“

”ہاں بزرگوں کا کہنا ہے کہ ان کی مادائیں اکثر بانجھ ہوتی ہیں اور بچے پیدا نہیں کر سکتیں اس لیے یہ اپنی نسل بڑھانے کے لیے ہماری عورتوں کو استعمال کرتے ہیں۔ میں نے تو یہ تک سنا ہے کہ ہمالیہ کے مختلف علاقوں میں لوگ انہیں شادی شدہ عورتوں کی جن کے شوہر مر جائیں یا انہیں چھوڑ دیں بھینٹ کے طور پر برفانی آدمیوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ انہوں نے بھینٹ کے مندر بنا رکھے ہیں جہاں ان عورتوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور برفانی آدمی آ کر انہیں وہاں سے لے جاتے ہیں۔“

”کوئی انسان اس موسم میں زندہ رہ سکتا ہے جس میں یہ زندہ رہتے ہیں۔“

”کیا کہہ سکتے ہیں ہو سکتا ہے عام انسان بھی ان کے ساتھ رہ کر اس قابل ہو جاتا ہو کہ اس موسم میں رہ سکے۔“ رونی نے کہا۔ وہ لہجے سے پڑھا لکھا لگ رہا تھا اس کی انگریزی بھی بہت صاف تھی۔ میرے پوچھنے پر اس نے ہنس کر کہا۔ ”اسکول کی صورت بھی نہیں دیکھی ہے ہاں انگریزی بولنا اور پڑھنا آتی ہے میں نے انگریزی ادب بھی پڑھا ہے۔ یہاں آنے والے اپنے ساتھ جو کتابیں اور رسالے لاتے ہیں میرا شوق دیکھتے ہوئے وہ جاتے ہوئے مجھے دے جاتے ہیں۔“

”گڈ یعنی تم سیلف میڈ آدمی ہو؟“ میں نے اس کی تعریف کی تو وہ خوش نظر آنے لگا۔ رونی اور سونی کا قبیلہ مظاہر پرست تھا اور یہ پہاڑوں کو خدا اقرار دیتے تھے۔ ان کے باقی رسم و رواج کسی قدر ہندومت سے ملتے تھے اور کچھ بدھ مت کے قریب تھے۔ ایک عورت کئی آدمیوں کی بیوی ہو سکتی تھی کیونکہ یہاں عورتوں کی قلت تھی اور اس کی وجہ برفانی آدمی نہیں بلکہ ان کا لالچ تھا۔ یہ پیسے کے عوض اپنی عورتیں اور لڑکیاں بیچ دیتے تھے۔ اس معاملے میں ماں اور دوسرے بڑے رشتوں کی تمیز بھی نہیں تھی۔ ماں خالہ اور پھپی تک فروخت کر دیتے تھے۔ اس سے بڑی عمر کی خواتین کا کوئی خریدار نہیں تھا ورنہ یہ نانی دادی بھی بیچ ڈالتے۔ مجھے سن کر افسوس سے زیادہ کوفت ہوئی تھی۔ پوری ہمالیائی ریجن میں عورت کی تذلیل رائج تھی۔ صرف یہاں نہیں بلکہ پاکستان میں بھی شمالی علاقے میں عورتوں کی خرید و فروخت عام تھی۔ میں چپ ہو گیا تو اس نے آہستہ سے کہا۔

”شاید تمہیں عورتیں بیچنے والی بات اچھی نہیں لگی؟“

”شاید نہیں یقیناً، میرے نزدیک عورت محترم ہستی

ہے اور اسے فروخت کرنا اس کی انتہائی تذلیل ہے۔"

"میں تم سے متفق ہوں اور ہمارے ہاں نوجوان نسل میں اس کے خلاف بغاوت رواج پارہی ہے شاید آنے والے وقت میں ہم اس لعنت سے نجات حاصل کرسکیں۔"

"تم لوگوں کو کرنی چاہیے۔" میں نے زور دے کر کہا۔ "غور کرو اس طرح سے عورت بیچ کر تم لوگ اپنی نسل کی بیخ کنی کررہے ہو۔ آدمی کی نسل کو عورت ہی پیدا کرتی اور پروان چڑھاتی ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو اس وقت میرے قبیلے میں یہ حال ہے کہ پانچ ہزار کی آبادی میں صرف بارہ سو عورتیں ہیں۔ کئی نوجوان مرد، عورت کے بغیر ہیں اور ہمیں شاید باہر سے عورت خرید کر لانی پڑے۔"

"مگر یہ دیکھی مت ورنہ یہ لعنت کبھی ختم نہیں ہوگی۔ تم خود سوچو تم خریدو گے تو کوئی نہ کوئی بیچے گا۔ پھر وہ تمہارے قبیلے سے عورت خریدنے آئے گا۔ اصل میں اس سسٹم میں فائدہ مالدار لوگ اٹھاتے ہیں وہ پیسے کے بل پر کئی کئی عورتوں پر قابض ہوجاتے ہیں اور ان کی وجہ سے کئی افراد محروم رہ جاتے ہیں۔ اس لیے سرے سے خرید و فروخت ہونی ہی نہیں چاہیے۔ اس خطے میں ویسے بھی لڑکیاں کم ہی جوان عمر کو پہنچتی ہیں۔ بچپن میں مرنے والے بچوں میں سے اکثریت لڑکیوں کی ہوتی ہے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے مگر ہمارے بزرگ اس سسٹم کو تبدیل کرنے پر رضامند نہیں ہیں۔"

"یہ کام تم نوجوانوں کا ہے کہ انہیں مجبور کرو ہر جگہ تبدیلی نوجوان ہی لاتے ہیں۔" میں نے کہا۔ اس گفتگو میں مزید ایک گھنٹا گزر گیا تھا اور اس دوران میں زینی کسمسانے لگی تھی اس لیے ہم رک گئے اور پھر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی جو تھوڑی دیر میں کامیاب رہی۔ میرے وار نے اس کا دماغ اندر سے ہلا دیا تھا اس لیے ہوش میں آنے کے بعد اسے کچھ دیر شدید درد رہا تھا اور وہ سر پکڑ کر مجھے سناتی رہی تھی۔ میں خاموش رہا اسے حق تھا۔ البتہ جب میں نے محسوس کیا کہ وہ ٹھیک ہوگئی ہے تو میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "بس تم نے بدلہ لے لیا ہے اب بولو گی تو میں جواب دینے کا حق رکھتا ہوں۔"

"آخر کیوں؟" اس نے چیخ کر پوچھا۔

"اگر میں تمہیں زبان سے قائل کرنے کی کوشش کرتا یا پستول سے دھمکاتا تو تم مزاحمت کرتیں اور اس وقت برفانی آدمیوں کا شدید خطرہ تھا ہمیں فوری وہاں سے نکلنا تھا اس لیے یہی ایک ترکیب سمجھ میں آئی تمہیں خاموش کرنے کی۔"

وہ کچھ دیر مجھے گھورتی رہی اور پھر زیرِ لب بولی۔ "ظالم، وحشی۔"

"حالانکہ میں ایسا ہوں نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں تمہیں وہیں چھوڑ آتا مگر مجھے خطرہ تھا کہ تم برفانی آدمیوں کے ہاتھ نہ لگ جاؤ۔ ابھی ان کے بارے میں جو معلوم ہوا ہے وہ کہیں زیادہ تشویش ناک ہے۔ اگر تم ان کے ہاتھ لگ جاتیں تو تمہارے مردوں کے حوالے سے تمام ارمان پورے ہوسکتے ہیں۔"

اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور بولی۔ "کیا معلوم ہوا ہے؟"

"یہی کہ یہ انسانی عورت سے نسل کشی کا کام لیتے ہیں۔"

وہ کانپ گئی۔ "نہیں......تب اوشا کی خیر نہیں ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم بھول رہی ہو وہ زہریلی ہے برفانی آدمی اس کے پاس آکر بچ نہیں سکتا اور نہ ہی وہ ماں بن سکتی ہے۔"

"مگر وہ ان کی درندگی کا شکار تو ہوسکتی ہے۔"

"اسے بس اللہ ہی بچائے۔" میں نے سرد آہ بھری۔ "سچی بات ہے اس کا کڑا ملنے کے باوجود مجھے اس کی زندگی کی امید بہت کم ہے۔"

زینی خوش تھی کہ اوشا کی زندگی کی امید کم ہے اور وہ اس خوشی کو چھپانے کی کوشش کررہی تھی۔ اوشا زندہ تھی یا نہیں لیکن زینی کے لیے میرے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آتی اس لیے مجھے اس کی خوشی سے بھی کوئی غرض نہیں تھا۔ زینی اب اپنے بارے میں فکرمند تھی۔ "تم ان لوگوں کے ساتھ کیوں جارہے ہو یہ دشمن بھی ہوسکتے ہیں۔"

"یہ دشمن نہیں ہیں اور اگر ہیں بھی تو اس سے کیا فرق پڑے گا۔ تم لوگوں کا بھی تو قیدی تھا۔"

وہ مجھے گھورنے لگی۔ "تم کچھ جانتے ہو جو مجھ سے چھپا رہے ہو۔"

"تم جو چاہے سمجھو اور اب کھڑی ہوجاؤ ہمیں خاصا سفر کرنا ہے۔"

"میں نہیں جاؤں گی کیا میں تمہاری قیدی ہوں۔"

اس نے ہٹ دھرمی سے کہا اور اپنی جگہ بیٹھی رہی۔

"مرضی تمہاری، تم نہیں جانتی کہ کہاں ہو اور نہ تمہارے پاس ہتھیار یا کوئی دوسری چیز ہے۔ بیٹھی رہو یا

جس طرف دل چاہے نکل جاؤ۔ اچھا ہے میرا ایک دردِ سر کم ہوگا۔"

میں چلنے لگا تو رونی اور سونی بھی میری دیکھا دیکھی چل پڑے۔ زینی کچھ دیر تو وہیں بیٹھی رہی پھر اٹھ کر پیچھے لپکی۔ "تم سچ مچ وحشی ہو۔" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ "تم میں کوئی حس نہیں ہے۔"

"تمہارے بھلے کو کہہ رہا تھا۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "اب بھی وقت ہے واپس چلی جاؤ ان چٹانوں سے ہوتی ہوئی تم ان تک پہنچ جاؤ گی بہ شرط کہ وہ صحیح سلامت ہوں۔ تم نے بھی دیکھ لیا تھا کہ برفانی آدمی وہاں پہنچ گئے تھے۔"

وہ چند لمحے کھڑی ہچکچاتی رہی اور پھر بولی۔ "میں تمہارے ساتھ چلوں گی مگر میں قیدی نہیں ہوں گی۔"

"اپنی حد تک میں یقین دلاتا ہوں لیکن جہاں جا رہا ہوں وہاں تمہارے ساتھ کوئی اور سلوک ہوا تو میں اس کا ذمے دار نہیں ہوں گا۔"

"کیوں میں تو تمہاری ذمے داری ہوں۔" وہ تیز لہجے میں بولی۔ "میں کسی اور کو نہیں جانتی۔"

"فی الحال میں اپنی ذمے داری نہیں لے سکتا تو کسی اور کی کہاں سے لوں گا۔" میں نے جواب دیا۔ "تم نے چلنا ہے تو انہی شرائط پر چل سکتی ہو ورنہ تمہاری مرضی ہے۔"

وہ کچھ دیر ہونٹ کاٹتی رہی پھر سر ہلا کر آگے بڑھی۔ رونی اور سونی آگے تھے اور وہ میرے ساتھ چل رہی تھی۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ "تم میں عورت سے متاثر ہونے کی صلاحیت نہیں ہے۔"

"پلیز لیو دس ٹاپک۔"

"تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا......"

"کاش کہ میری جگہ کوئی اور ہوتا۔" میں نے بھنا کر اس کی بات کاٹی۔ "کیا تم خاموش نہیں رہ سکتیں۔ یہ سوچو کہ اب تمہارے ساتھ کیا ہوگا؟"

"جب میں نے یہ پیشہ اختیار کیا تھا تب ہی سوچنا چھوڑ دیا تھا کہ آگے کیا ہوگا۔ زندہ رہوں گی یا ماری جاؤں گی۔" اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "اس کے علاوہ تیسری صورت اور کیا ہوگی؟"

"بعض اوقات آدمی زندہ نہیں رہنا چاہتا اور پھر بھی زندہ رہتا ہے اس وقت سے ڈرنا چاہیے۔"

"مجھ پر ایسے وقت بھی آئے ہیں مگر میں زندہ رہی میں نے کبھی خود سے مرنے کی کوشش نہیں کی۔"

"یہ اچھی بات ہے کہ آدمی خود سے زندہ رہنے کی کوشش کرے۔"

"ششش۔" اچانک رونی نے خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور ساتھ ہی ہم رک بھی گئے۔ وہ کان لگا کر سن رہا تھا جب کہ مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ زینی نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اسے بھی کچھ سنائی نہیں دیا تھا۔ مگر رونی اور سونی کچھ سن رہے تھے وہ چوکنا ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنے ہتھیار سنبھال لیے تھے۔ پھر وہ دبے قدموں آگے بڑھے اور ہمیں بھی اشارہ کیا کہ قدموں کی آہٹ نہ ہو۔ میں اور زینی بھی دبے قدموں آگے بڑھے۔ کچھ آگے گئے ہوں گے کہ میرے کانوں نے مخصوص چیخنے والی آوازیں سن لیں۔ یہ آوازیں وہی بندر نما مخلوق نکال رہی تھی جو کچھ دیر پہلے ہمیں بے گناہ ہی سنگسار کر رہی تھی۔ وہ آگے کہیں موجود تھے۔ چاند اب مغربی افق کی طرف جھک گیا تھا اس لیے بند جگہوں پر اس کی روشنی براہ راست نہیں آ رہی تھی مگر کسی قدر اجالا تھا البتہ جس کھلی جگہ ہم پہنچے وہاں چاند کی روشنی تھی اور اس روشنی میں بے شمار بندر نما مخلوق کسی شے پر جمع تھی اور اس پر ٹوٹی پڑ رہی تھی۔

میں نے غور کیا تو وہ نوچ کھسوٹ کر رہے تھے اور ملنے والی چیز جلدی جلدی کھا رہے تھے کیونکہ ایک کے ہاتھ میں دیکھ کر دوسرے کئی اس پر جھپٹتے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ان کی تعداد سو سے زیادہ تھی اور ایک طرف سے مزید بندروں کی آمد جاری تھی۔ درمیان میں موجود چیز پر ان کا مزید ہجوم آ رہا تھا۔ اس لیے وہ بالکل نظر نہیں آ رہی تھی۔ بندر ایک دوسرے پر چڑھے جا رہے تھے اور آپس میں بھی ایک دوسرے کو نوچ کھسوٹ رہے تھے۔ مگر ان کی یہ لڑائی صرف کھانے پر تھی۔ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے لیے نہیں تھی۔ ان کی مکروہ چیختی آواز یہاں بہت زیادہ تھی۔ میں نے رونی کو اشارے سے پیچھے کیا اور اس کے کان میں بولا۔ "اس مصیبت سے کیسے چھٹکارا ملے گا کیا کوئی اور راستہ نہیں ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اسی راستے سے جا سکتے ہیں یا پھر باہر نکل جائیں مگر اس صورت میں دوبارہ اندر آنے کا راستہ تلاش کرنا ہوگا۔"

"ان کو ڈرا دھمکا کر......"

"ہرگز نہیں یہ بہت ڈھیٹ مخلوق ہے، تم نے دیکھا نہیں وہ جسے کھا رہے ہیں وہ ایک برفانی آدمی ہے۔ یہ زیادہ ہوں تو اسے بھی مار دیتے ہیں۔"

میرے جسم میں خوف کی لہر سی دوڑ گئی۔ بہ ظاہر حقیر نظر آنے والی مخلوق اتنی خطرناک ہو سکتی ہے۔ مگر یہ شاید قدرت کا اصول ہے کہ وہ بڑے کو چھوٹے کے ہاتھوں شکست دیتی ہے۔ فطرت میں سب سے طاقتور وہ ننھی مخلوق ہے جو طاقتور ترین خردبین سے بھی بہ مشکل نظر آتی ہے یعنی وائرس اور وہ اپنے سے کروڑوں اربوں گنا بڑے انسان کو موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔ میں نہیں دیکھ سکا تھا مگر رونی نے دیکھ لیا تھا۔ ''تب کیا ہو سکتا ہے ہم واپس جائیں اور راستہ صاف ہونے کا انتظار کریں۔''

''میرے پاس ایک چیز ہے اگر ہم اسے استعمال کریں تو ان سے کچھ دیر کے لیے نجات مل سکتی ہے۔'' رونی نے کہتے ہوئے اپنے بیگ سے ایک گیس اسپرے برآمد کیا۔ ''یہ اس کی بُو سے بھاگتے ہیں۔''

''ایسے کتنے اسپرے ہیں؟''

''ایک اور ہے۔'' اس نے بیگ سے دوسرا نکالا۔

وہ میں نے لے لیا اور اس سے کہا۔ ''میں اور تم ایک سمت ہوں گے۔ سونی اور زینی درمیان میں ہوں گے۔ یہ بتاؤ کہ بوتل میں کتنی دیر کا اسپرے ہے اور ایک اسپرے کتنی دیر تک کرنا ہوگا؟''

''ایک سیکنڈ سے بھی کم۔ اس میں دو منٹ کا اسپرے ہے۔''

''ہمیں برفانی آدمی کی لاش سے دور دور سے گزرنا ہوگا تاکہ وہ اس کی طرف سے بے فکر رہیں اور ہم لاش سے دور رہیں گے تو ہماری طرف آنے والوں کی تعداد بھی کچھ کم ہوگی۔''

''آپ نے ٹھیک سوچا۔'' اس نے خوش ہو کر کہا۔

''شہباز۔'' زینی کی خبردار کرنے والی آواز آئی اور میں نے اس طرف دیکھا تو کئی بندر ہماری طرف آرہے تھے۔ پتا نہیں انہوں نے ہماری آوازیں سن لی تھیں یا بو سونگھ لی تھی۔ مگر ابھی انہیں ہماری موجودگی کا یقین نہیں تھا زینی نے آواز دے کر اپنی موجودگی ثابت کر دی اور اس کے ساتھ ان بندروں نے خبردار کرنے والے انداز میں چلانا اور ہماری طرف منہ کر کے چیختی آواز نکالنا شروع کر دی۔ میں اور رونی تیزی سے آگے آئے اور اس کھلی جگہ میں گھستے ہوئے بندروں کی طرف پہلا اسپرے کیا۔ فوراً ہی تیز چبھتی ہوئی ناگوار بو میری ناک سے ٹکرائی اور بندر اس سے زیادہ الرجک تھے وہ تیزی سے پیچھے ہٹے۔ میں نے زینی سے کہا۔

''میرے اور رونی کے درمیان میں آجاؤ۔''

''مجھے پستول دو۔'' اس نے میرے پیچھے آتے ہوئے کہا۔

''وہ بیکار ہے تم ان کی تعداد دیکھ رہی ہو۔''

اتنی سی دیر میں لاتعداد بندر ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے اور جو برفانی آدمی کی لاش سے چمٹے نہیں تھے وہ سارے کے سارے ہماری طرف آنے لگے۔ یہ کھلی جگہ تھی جس میں دائرے میں دیواریں پھیلی ہوئی تھیں اور ہم ان دیواروں کے ساتھ لگ کر آگے بڑھنے لگے۔ زینی اور سونی ہماری اوٹ میں تھے۔ رونی نے سونی سے کچھ کہا اور اس نے اپنی رائفل کا رخ اوپر کی طرف کر دیا کیونکہ بے شمار بندر ہمیں دیکھتے ہی چٹانوں پر چڑھ گئے تھے اور اس کا خطرہ تھا کہ وہ اوپر سے حملہ نہ کر دیں۔ پھر ایسا ہی ہوا۔ ایک بندر نے اوپر سے چھلانگ لگائی مگر سونی نے ایک ہی فائر میں اس کے چیتھڑے اڑا دیئے اور اس کم بخت کا خون اور دوسری باقیات ہم پر گری تھیں۔ جب میری برفانی آدمی سے دست بدست جنگ ہوئی تھی اور اس کے سینے میں موجود سوراخ سے بے تحاشہ خون نکلا تھا تو میری جیکٹ اور پتلون پر اس کا خون لگا تھا پھر بارودی سرنگ کی زد میں آنے والے سربریدہ برفانی آدمی کی باقیات بھی مجھ پر برسی تھیں اور میں اس وقت حلیے سے پنجابی فلموں کا ہیرو لگ رہا تھا جس نے کشتوں کے پشتے لگا دیئے ہوں۔ یعنی سر سے پاؤں تک خون میں نہایا ہوا تھا۔

بندر مرا تو اس کا خون بھی گرا اور میری پہلے سے رنگین جیکٹ مزید رنگین ہو گئی۔ یہ سفید رنگ کی تھی اس لیے اس پر سرخ رنگ بہت نمایاں تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ میرے پاس مزید کوئی جیکٹ نہیں تھی اور کسی کی فالتو جیکٹ بھی نہیں تھی اور اس موسم میں اس کے بغیر رہنے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اس لیے مجھے مجبوراً یہی پہننی پڑی تھی۔ میرے پاس پتلون تھی مگر اسے بدلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں نے زیر لب بندر کو کوسا جو مرتے مرتے بھی مجھے مزید گندہ کر گیا تھا۔ میں نے غصے میں ایک کسی قدر نزدیک آنے والے بندر پر آگے ہو کر اسپرے کیا اور اس نے براہ راست اسپرے کا مزہ چکھا جو یقیناً مزیدار نہیں تھا کیونکہ اس نے چیخنے کے ساتھ زمین پر لوٹنا شروع کر دیا تھا اور اس کی حالت دیکھ کر باقی بندروں نے عبرت پکڑی اور فوراً اسپرے سے محفوظ فاصلے پر چلے گئے تھے۔ رونی نے کہا۔

''یہ اچھی بات ہے اب نزدیک آنے والے بندر پر

براہ راست اسپرے کرنا ہے۔"

ہم دیوار سے لگ کر اور برفانی آدمی کی لاش سے دور ہو کر گزر رہے تھے مگر جب بندر کو براہ راست اسپرے لگا اور اس نے شور کیا تو لاش پر موجود بندر بھی ڈر کر پیچھے ہٹ گئے اور تب ہم نے دیکھا کہ انہوں نے اس دیو ہیکل اور طاقتور مخلوق کا کیا حال کیا تھا۔ وہ اس کے سینے اور سر سے تقریباً تمام گوشت نوچ کر کھا چکے تھے اور اوپری حصہ ڈھانچا کر دیا تھا۔ اب وہ اس کے پیٹ اور پسلیوں کے اندر موجود چیزیں نکال کر کھا رہے تھے۔ پیروں اور کولہوں کا بھی خاصا گوشت غائب تھا۔ شاید مشکل سے آدھے گھنٹے میں وہاں صرف اس کا ڈھانچا رہ جاتا۔ یہ رونگٹے کھڑے کر دینے والا منظر تھا۔ خالی جگہ سے گزر کر دوسری طرف موجود راہداری تک جانے میں ہمیں دو بار اور بندروں پر اسپرے کرنا پڑا اور اس کا مفید نتیجہ نکلا۔ سونی رونی اور زینی ویسے ہی اوپر کی طرف سے ہوشیار تھے۔

راہداری میں آنے کے بعد ہم کچھ دیر تو ہوشیار ہو کر الٹے قدموں چلتے رہے اور جب ذرا دور نکل آئے تو ہم نے سیدھے ہو کر دوڑ لگا دی۔ اس وقت بھی بندر شور مچا رہے تھے اور وہ چٹانوں کے اوپر بھی تھے۔ وہ رفتار میں ہمارا پیچھا نہیں کر سکتے تھے مجھے حیرت تھی کہ تیز رفتار برفانی آدمی ان سے کیسے شکست کھا گیا۔ وہ بے شک ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا مگر وہاں سے بھاگ تو سکتا تھا۔ شاید اسے کوئی ایسی چوٹ آئی تھی کہ بھاگ نہیں سکا اور بندروں نے اسے گرا لیا۔ کوئی دس منٹ بعد ہم رکے کیونکہ اب بندروں کی آوازیں معدوم ہو گئی تھیں۔ وہ خاصا پیچھے رہ گئے تھے۔ رک کر اپنا سانس درست کرتے ہوئے ہم اب عام رفتار سے چلنے لگے۔ میں نے رونی سے پوچھا۔ "اب کتنی دور جانا ہے؟"

"زیادہ نہیں بس پندرہ منٹ میں پہنچ جائیں گے۔"

رونی کا کہنا درست ثابت ہوا اور ہم پندرہ منٹ میں چٹانوں کے اندر اس بڑے سے غار تک پہنچ گئے۔ وہاں نصف درجن افراد کے ساتھ وہ شخص موجود تھا جس کا نام اردو زبان میں رونی کے دستانے پر لکھا ہوا تھا اور میں اس کی تحریر بھی پہچانتا تھا۔ تحریر راجا عمر دراز کی تھی اور وہ بذاتِ خود وہاں موجود تھا۔ اس پورے سفر کے دوران میں مجھے ایک بار بھی خیال نہیں آیا کہ راجا عمر دراز انڈیا یا وادی کی طرف محو سفر ہو گا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اپنے محل میں بستر علالت پر دراز ہو گا۔ مگر وہ یہاں موجود تھا۔ جب رونی نے دستانے پر مجھے اس کا نام دکھایا اور میں نے اس کی تحریر کو بھی شناخت کر لیا تب بھی مجھے مکمل یقین نہیں آیا تھا کہ وہ یہاں موجود ہو گا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور پرجوش انداز میں مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ "شہباز...... میرے بیٹے کیسے ہو؟"

چند دن پہلے سیکریٹری بیگ نے مجھے ذلت آمیز اور تقریباً دشمنانہ انداز میں محل سے رخصت کیا تھا تو میرے دل میں راجا عمر دراز کے لیے موجود مقام جیسے ختم سا ہو گیا تھا اور میں نے سوچ لیا تھا کہ جب اپنے مسائل سے نمٹ لوں گا تب بھی راجا عمر دراز سے تعلق استوار کرنے کی کوشش نہیں کروں گا اور اگر اس کی طرف سے ایسی کوئی کوشش ہوئی تو اسے نظر انداز کر دوں گا۔ وہ میرے لیے بھولی بسری یاد بن جائے گا۔ اس کے بعد مشکلات کا ایسا دور شروع ہوا کہ مجھے راجا تو کیا بلکہ اپنے ساتھیوں کے بارے میں بھی سوچنے کا وقت کم ہی ملا تھا۔ وادی کے پاس آ کر مجھے کئی مواقعوں پر راجا عمر دراز کا خیال آیا۔ لیکن یہ خیال اس کے کیے سفروں کے بارے میں تھا۔ میرے دل میں اس کے لیے جگہ نہیں آئی تھی۔ مگر وہ غیر متوقع طور پر مجھ سے پہلے یہاں موجود تھا۔ رونی کا کہنا تھا کہ وہ ایک ہفتے سے زیادہ وقت ہوا یہاں آ چکے تھے اور اس وقت میں شاید افغانستان میں تھا اور مجھے انڈیا لانے کی تیاری کی جا رہی تھی۔

گویا جس وقت سیکریٹری بیگ نے مجھے ذلیل کر کے محل سے نکالا تب تک راجا عمر دراز وادی کی مہم پر روانہ ہو چکا تھا یا اس کے لیے پر تول رہا تھا۔ یعنی بیگ نے مجھ سے راجا کی بیماری کے بارے میں جھوٹ بولا تھا کہ وہ کسی سے مل نہیں سکتا۔ وہ کیسے ملتا جب کہ وہ محل میں تھا ہی نہیں۔ اگر راجا عمر دراز چھپ کر گیا تھا تو دشمنوں سے چھپ کر گیا تھا مجھ سے چھپانا اور پھر ایسا سلوک کرنا سمجھ سے بالاتر تھا۔ اگر بیگ کا مقصد سچ مچ میری تذلیل نہیں تھی تب بھی اس نے مجھے کھلونے کی طرح برتا اور یہ بھی کوئی عزت والی صورت نہیں تھی۔ بے شک راجا عمر دراز میرا محسن اور بڑا ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ میرے ساتھ کوئی بھی سلوک کرنے کے لیے آزاد ہو۔ میں اپنی ذلت بھول نہیں سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب راجا عمر دراز نے مجھے سینے سے لگایا تو اس کی گرم جوشی میرے اندر موجود سرد مہری کو ذرا بھی نہیں پگھلا سکی تھی اور میں جواب میں بالکل ساکت رہا۔ جلد اس نے یہ بات محسوس کر لی اور کسی قدر جھینپ کر پیچھے ہوا۔ تب میں نے سرد ہی لہجے میں کہا۔

"آپ کے سامنے ہوں اور اس جگہ موجود ہوں

جہاں آپ اور ڈیوڈ شا مجھے لانا چاہتے تھے۔"

دوسرے لفظوں میں، میں نے اسے جتا دیا کہ اب میرے لیے اس کی حیثیت تقریباً ڈیوڈ شا جیسی ہے۔ اس بار راجا عمر دراز کا کمزور چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ اس نے سر ہلایا۔ "ہاں اب تم یہاں ہو۔" پھر اس نے زینی کی طرف دیکھا اور بولا۔ "ڈیوڈ شا کی بیٹی؟"

"آپ سے زیادہ کون جانتا ہوگا۔" میں نے چبھتے لہجے میں کہا۔ "آپ کے سیکریٹری نے مجھے ان لوگوں کے حوالے کیا تھا۔"

"شہباز بیٹے میری بات سنو۔"

"راجا صاحب جب آپ مجھے بیٹا کہتے تھے تو مجھے خوشی ہوتی تھی مگر اس وقت مجھے اس تخاطب سے الجھن ہو رہی ہے برائے مہربانی مجھے نام سے مخاطب کریں۔"

وہاں موجود افراد میں صرف دو افراد تھے جو صورت سے برصغیر کے میدانی علاقوں کے رہنے والے لگ رہے تھے۔ باقی سب کی صورتیں رونی اور سونی سے ملتی تھیں۔ سب ملا کر کل نو افراد تھے۔ ان کے پاس خاصا ساز و سامان نظر آ رہا تھا۔ راجا عمر دراز نے ان دو میں سے ایک، کسی قدر طویل قامت کی طرف دیکھا اور آنکھوں سے کوئی اشارہ کیا تو اس نے فوراً سب کو حکم دیا۔ "یہاں سے چلو۔"

یہ تخلیہ والی بات تھی۔ مگر جب رونی نے زینی کا بازو پکڑا تو میں نے کہا۔ "یہ میرے ساتھ ہے۔"

"شہباز میں تم سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔" راجا عمر دراز نے کہا۔

"یہ یہیں رہے گی۔ ورنہ میں بھی چلوں گا۔" میں نے راجا کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ اس نے گہری سانس لی اور بولا۔

"ٹھیک ہے اسے یہیں چھوڑ جاؤ۔"

وہ سب زینی کو وہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ راجا عمر دراز واپس اپنی جگہ بیٹھ گیا تھا اس نے تنہائی پاتے ہی کہا۔ "میں جانتا ہوں تم مجھ سے ناراض ہو۔"

میں اس کے سامنے ایک پتھر پر ٹک گیا۔ زینی بھی بیٹھ گئی تھی۔ چل چل کر ہمارا حشر ہو گیا تھا۔ اس بلندی پر جو کسی طرح پندرہ ہزار فٹ سے کم نہیں تھی بات کرنے سے بھی سانس پھول جاتا تھا۔ "جب یہ جانتے ہیں تو وجہ بھی جانتے ہوں گے۔"

"شہباز۔" راجا عمر دراز نے زندگی میں شاید پہلی بار مجھ سے اس طرح بات کی تھی۔ "پلیز مجھے وضاحت کا موقع دو۔"

سچی بات ہے جب میں نے اس کا کمزور چہرہ اور اس پر بے بسی کی ایک کیفیت دیکھی تو اس کے لیے میرے اندر موجود خ پگھلنے لگی تھی۔ مجھے اس پر ترس آ رہا تھا۔ وہ کینسر کے جان لیوا مرض کے ساتھ اور شاید زندگی کے آخری لمحوں میں اپنے خواب کی تکمیل کے لیے یہاں تک چلا آیا تھا۔ میں نے گہری سانس لی جو ویسے بھی مسلسل لینا پڑ رہی تھی۔ "پلیز راجا صاحب مجھ سے یوں بات نہ کریں۔"

"تب کیا کروں جب کہ تم میری بات سننے کو تیار نہیں ہو۔"

بادل ناخواستہ میں نے سر ہلایا۔ "آپ کہیں، میں سن رہا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے تم اب بھی دل سے نہیں سن رہے ہو۔ مگر میں بات ضرور کروں گا۔ پہلی بات یہ بتا دوں کہ ڈاکٹروں نے مجھے جواب دے دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کینسر میرے اندر ناقابلِ علاج حد تک جڑیں پھیلا چکا ہے۔"

اگرچہ میں بیگ سے یہ بات سن چکا تھا مگر راجا عمر دراز کے منہ سے سن کر مجھے دھچکا لگا تھا۔ "افسوس ہو رہا ہے راجا صاحب۔"

وہ مسکرایا۔ "لیکن مجھے افسوس نہیں ہے میں نے بہت لمبی عمر گزاری ہے اور اس وقت بھی بستر پر نہیں ہوں۔ اوپر والے سے امید ہے کہ وہ زندگی کی طرح موت بھی اچھی دے گا۔"

"تب راجا صاحب آپ کو اپنے گھر والوں کے ساتھ......"

"اب وہ میرے گھر والے نہیں ہیں ان کے بچوں کے بھی گھر ہو چکے ہیں۔" اس نے بات کاٹی۔ "میں ایک آزاد فرد ہوں اور اپنی مرضی کر سکتا ہوں۔ اس لیے میں نے آخری وقت کے لیے اس جگہ کا انتخاب کیا۔ ایک دن میں خاموشی سے محل سے نکل گیا اور اب میرے بچوں کو بھی نہیں معلوم کہ میں کہاں ہوں؟ صرف ایک فرد کو معلوم ہے کہ میں کہاں ہوں؟"

"سیکریٹری بیگ؟"

راجا عمر دراز نے سر ہلایا۔ "ہاں، اسی نے تمہیں یہاں بھیجا ہے کیونکہ میں تمہارے بغیر آیا۔ یہ فیصلہ اس نے خود کیا اور سارا انتظام بھی خود کیا۔"

"دوسرے لفظوں میں وہ ڈیوڈ شا سے مل گیا۔" میرا

لہجہ پھر تند ہو گیا۔

''نہیں مگر اس نے سامنے آئے بغیر ڈیوڈ شا کو ہی استعمال کیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ ان دنوں انڈیا میں ہے اور وادی کی طرف جانے کی تیاری کر رہا ہے۔''

''صرف وہی نہیں ڈیوڈ شا بھی جانتا تھا کہ آپ یہاں آچکے ہیں اب سمجھ میں آیا کہ اس کا رویہ بعض اوقات پُراسرار اور ناقابل فہم کیوں ہو جاتا تھا۔''

راجا عمر دراز چونکا۔ ''وہ جانتا ہے؟''

''بالکل جیسے آپ اس کے بارے میں جانتے ہیں۔'' میں نے یقین سے کہا۔ ''جیسے بیگ نے اس پر نظر رکھی اسی طرح اس نے آپ پر نظر رکھی ہو گی۔ اب مجھے خیال آ رہا ہے کہ کچھ عرصے پہلے وہ پاکستان میں تھا اور اس نے مجھے اپنے قبضے میں لیا تھا تب اس نے وادی کی طرف جانے کی بات نہیں کی ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے آپ کی بیماری کا سن کر اسے مستقبل پر چھوڑ دیا ہے۔ پھر اچانک ہی وہ انڈیا پہنچا اور اس نے مجھے بھی بلوانے کا بندوبست کر لیا۔ کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ اسے آپ کے سفر کا علم ہو گیا تھا اور وہ بھی فوری عازم سفر ہوا تھا۔ کیونکہ اس کا مقابلہ آپ سے ہے۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

''مگر بیگ کا رویہ اب بھی میری سمجھ سے بالاتر ہے؟''

''دیکھو جب بیگ کے علم میں ڈیوڈ شا والی بات آئی تو اسے معلوم تھا کہ وہ تمہیں حاصل کرنے اور اپنے ساتھ لے جانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔ اگر تمہاری بات درست ہے کہ ڈیوڈ شا میرے سفر کی خبر پا کر پیچھے آیا تو اس کے لیے یہ ابھی یا کبھی نہیں والا معاملہ تھا۔ بیگ سمجھ رہا تھا کہ تم نہ سہی تمہارے ساتھی شدید خطرے میں گھر سکتے تھے۔ دوسرے یہ کہ مجھے یہاں تمہاری ضرورت تھی۔ تیسرے وہ جانتا تھا کہ تمہاری زندگی کو خطرہ نہیں ہے اور ساتھ ہی وہ اس سے بھی واقف ہے کہ کوئی تمہیں زیادہ دن قید نہیں رکھ سکے گا اس لیے اس نے کوشش کی کہ تم ڈیوڈ شا کے توسط سے انڈیا پہنچ جاؤ۔ دوسری صورت میں تمہارے لیے خود یہ کام اتنا آسان نہیں ہوگا۔''

''آپ نے بیگ کی حمایت میں جو کہا ہے اس میں اصل بات شاید شامل نہیں ہے کہ اصل میں بیگ نے مجھے آپ کے لیے بھیجا ہے۔ مجھے فوری بھیجنے کا سب سے آسان اور شارٹ کٹ راستہ اور طریقہ یہی تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جب میں یہاں پہنچوں گا اور آپ کی موجودگی کا علم ہو گا تو لاری میں آپ کی طرف آؤں گا۔ اس نے بہت چالاکی سے بندوق ڈیوڈ شا کے شانے پر رکھ کر چلائی ہے۔''

پہلی بار راجا عمر دراز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نظر آئی۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

''لیکن کیا آپ ڈیوڈ شا کو بے وقوف سمجھتے ہیں اور آپ کے خیال میں وہ اتنی آسانی سے مجھے ہاتھ سے نکل جانے دے گا۔''

راجا عمر دراز چونک گیا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ وہ یہاں آ رہا ہوگا۔''

''اس صورت میں آپ کے ساتھی ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے تو بے خبری میں مارے جائیں گے۔''

راجا عمر دراز نے ایک چھوٹا واکی ٹاکی نکالا اور کسی سے کہا۔ ''ہوشیار ہو جاؤ جلد دشمن اس طرف کا رخ کرے گا۔''

''ہم ہوشیار ہیں جناب۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''سب کو پہرے پر لگا دو۔'' راجا عمر دراز نے اسے حکم دیا۔ اس نے واکی ٹاکی رکھا تو میں نے اس کے آدمیوں کے بارے میں پوچھا۔

''رونی کے قبیلے سے ہٹ کر جو دو افراد ہیں کیا وہ پاکستانی ہیں؟''

''نہیں انڈین ہیں۔ رانا ویاس نے ساتھ کیے ہیں۔''

میرا یہ اندازہ بھی درست نکلا تھا مجھے رونی اور سونی کے خدوخال میں رانا ویاس کی جھلکیاں نظر آئی تھیں۔ ''اس سفر کا بندوبست بھی اسی نے کیا ہے؟''

''بالکل کیونکہ اس کا اثر و رسوخ یہاں مسلم ہے۔'' راجا عمر دراز نے کہا۔ ''تم نے کچھ کھایا ہے؟''

''رات کا کھانا کھا لیا تھا مگر چل چل کر......'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ راجا عمر دراز نے وہاں ایک چھوٹا سا برنر چلایا ہوا تھا اس نے اس پر کیتلی رکھ دی۔ ایک تو وہ بڑا اور پھر بیمار آدمی تھا میں نے اس سے چائے سازی کا سامان لے لیا۔ اس نے بسکٹ کا ایک پیکٹ کھولا۔ یہ بہت اعلیٰ درجے کے ذائقے اور خوشبو کے حامل انرجی بسکٹ تھے۔ میں نے چائے بنائی اور مخصوص بند مگوں میں نکالی جن میں چائے دیر تک گرم رہتی تھی۔ زینی کو بھی چائے اور بسکٹ دیے۔ وہ خاموشی سے سن رہی تھی اور غالباً اس کے لیے بھی یہ بات حیرت انگیز تھی کہ اسے اور اس کے

باپ کو استعمال کیا گیا ہے۔ چائے اور بسکٹ سے فارغ ہو کر ہم لیٹ گئے۔ وہاں بہترین قسم کے گرم سلیپنگ بیگز تھے۔ راجا عمر دراز کے آدمی پہرے پر تھے اس لیے وہ بھی سونے کے لیے لیٹ گیا۔ اس نے زینی سے کچھ اور نہیں کہا سوائے ایک وارننگ کے۔

''لڑکی کوئی غلط حرکت مت کرنا، تمہارا باپ میرا دشمن ہے لیکن میں اس لیے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ تمہیں صرف اس صورت میں نقصان ہوگا جب تم کوئی غلط حرکت کرو گی۔''

زینی نے اس وارننگ کا جواب نہیں دیا اور سلیپنگ بیگ میں گھس گئی۔ یقیناً اس کا تھکن سے برا حال تھا۔ تھکن تو مجھے بھی تھی لیکن واقعات کے اس رخ نے مجھے چونکا دیا تھا اور میں راجا عمر دراز سے کچھ سوالات اور کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے میں نے کچھ دیر انتظار کیا اور جب زینی کے سلیپنگ بیگ سے نسوانی خراٹوں کی آواز آنے لگی تو میں نے آہستہ سے راجا عمر دراز کو آواز دی۔ ''آپ جاگ رہے ہیں؟''

''ہاں تم بھی جاگ رہے ہو۔'' اس نے زپ نیچے کر کے چہرہ باہر کیا۔ ''بہت راتیں ہو گئی ہیں مجھے نیند نہیں آتی ہے۔''

''آپ ایک ہفتے سے زیادہ وقت سے یہاں رکے ہوئے ہیں کیا نیچے اترنے کی کوشش نہیں کی؟''

''کی تھی۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ''لیکن راستہ نہیں ملا۔ میں ان چٹانوں کو اچھی طرح پہچانتا ہوں جہاں سے راستہ نیچے جاتا ہے میں کچھ عرصے پہلے ہی آیا تھا اس لیے بھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ مگر جہاں راستہ تھا وہاں سیدھی ڈھلان کے اور کچھ نہیں ہے۔''

''ممکن ہے چٹانیں نیچے گر گئی ہوں۔''

''اگر کوئی اور جگہ ہوتی تو میں سوچتا لیکن اس جگہ کے بارے میں، میں اچھی طرح جانتا ہوں نیچے جانے کا راستہ اس وقت تک سمجھ نہیں آئے گا جب تک برف والا بوڑھا نہیں چاہے گا اور......''

''جب تک میں ساتھ نہیں ہوں گا وہ نہیں چاہے گا؟''

''ٹھیک کہا تم نے۔''

''کیا اسے علم ہوگا کہ کچھ لوگ اوپر آ گئے ہیں اور ان میں، میں بھی ہوں۔''

''اسے علم ہوگا۔'' راجا عمر دراز نے یقین سے کہا۔ ''یہ رات خیریت سے گزر جائے تو ہم کل تمہارے ساتھ راستہ تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔''

میں سوچتے ہوئے سو گیا کہ اسے کیسے علم ہو گیا۔ بے شک اس کے بارے میں جو سنا ہے اس سے تو وہ کوئی روحانی شخصیت لگتا ہے اور پُراسرار قوتوں کا مالک ہے لیکن بہ حیثیت مسلمان میں اللہ پر اعتقاد رکھتا ہوں کہ اسے ہر جگہ ہر شے کا علم ہے اور وہ سب کا احوال جانتا ہے۔ اس کے سوا صرف وہی غیب کا علم جانتا ہے جسے اللہ علم دے۔ تو کیا اسے اللہ نے یہ علم دیا ہے کہ وہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے آس پاس کی باتوں سے واقف ہو جاتا ہے اور دور دراز مستقبل میں ہونے والے واقعات کی قبل از وقت پیش گوئی کر دیتا ہے۔ جیسا کہ اس نے رانا ویاس اور راجا عمر دراز کے معاملے میں پیش گوئی کی تھی اور وہ درست بھی نکلی۔ میری آنکھ صبح سویرے کھلی تھی اس وقت سورج نکل رہا تھا اور چٹانوں میں دھند چھانا شروع ہو گئی تھی۔ میں سلیپنگ بیگ سے نکلا تو زینی بدستور سو رہی تھی البتہ راجا عمر دراز اٹھ گیا اور بالکل ڈیوڈ شا کی طرح آئینے میں دیکھ کر استرا اپنے رخسار پر پھیر رہا تھا۔ فطرت اور کردار میں مشرق مغرب کا فرق ہونے کے باوجود ان میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔

''اٹھ گئے تم؟''

میں نے انگڑائی لے کر اپنا جسم کھولا۔ ''ہاں آپ شاید پہلے سے اٹھے ہوئے ہیں۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''میں ناشتا بھی کر چکا ہوں۔ تم ناشتا کر لو لیکن اس سے پہلے اپنا یہ خراب ہو جانے والا لباس بدل لو۔''

''میرے پاس کوئی اضافی لباس نہیں ہے جو تھا وہ ڈیوڈ شا کے کیمپ میں رہ گیا ہے۔''

''میں تمہارے لیے سب لایا ہوں۔'' اس نے کہا اور ایک بڑے بیگ کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس میں صرف تمہارا سامان ہے۔''

میں نے بیگ کھولا اس میں گرم ترین جیکٹ، پتلون، گرم جرسیاں، اونی پاجامے اور سوتی پاجامے جو سب سے نیچے پہنے جاتے ہیں تاکہ پسینا جذب کر سکیں۔ جوتے، موزے، دستانے اور گرم ٹوپیاں بھی تھیں۔ میں حیران ہوا۔ ''آپ کو یقین تھا کہ میں یہاں آؤں گا اور ان چیزوں کو استعمال کروں گا۔''

''میں اسی توقع پر یہ بیگ لے کر آیا اور صرف اسے اٹھانے کے لیے ایک اضافی پورٹر بھی لیا۔ اس میں تمہارا

سلیپنگ بیگ اور خیمہ بھی ہے۔ عجیب بات ہے کہ چوٹیاں عبور کرتے ہوئے وہ پورٹر نیچے گر گیا مگر تمہارا بیگ ایک جگہ اٹک گیا اور گرنے سے بچ گیا۔''

صرف یہی سامان نہیں بلکہ اس علاقے میں سفر کے دوران میں جن چیزوں کی ضرورت پڑ سکتی تھی وہ سب اس بیگ اور اس کے مختلف خانوں میں موجود تھیں۔ میں نے جیکٹ اور پتلون اتار دیے اور بیگ سے دوسری جیکٹ اور گرم پتلون نکال کر پہن لی اندر کے اونی اور سوتی پاجامے صاف تھے۔ جیکٹ کے نیچے جرسی بھی صاف تھی۔ ان کو تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے چہرے پر بھی خون اور آلائشیں آئی تھیں جنہیں میں نے ہاتھ سے صاف کر لیا تھا مگر یہاں مجھے چہرہ صاف کرنے کے لیے گرم پانی ملا تھا۔ منہ ہاتھ دھو کر جو سکون ملتا ہے مجھے اس سے زیادہ ہی سکون ملا تھا۔ راجا عمر دراز کے آدمی رات بھر پہرے کے بعد بھی تازہ دم نظر آ رہے تھے انہوں نے ناشتا کر لیا تھا اور سامان بھی پیک کر لیا تھا۔ روپی نے میرے اور زینی کے لیے ناشتا بنایا۔ جو دودھ ملے دلیہ، مکھن، شہد اور آخر میں کافی پر مشتمل تھا۔ سونی نے میری اتاری جیکٹ اور پتلون لپیٹ کر اپنے سامان میں شامل کر لی اور وہ اس پر بہت خوش نظر آ رہا تھا کہ اسے مفت میں اتنا اچھا گرم لباس مل گیا تھا۔

زینی کا موڈ خراب تھا اور منہ پھولا ہوا تھا۔ کیونکہ یہاں آنے کے بعد سے میں نے اس سے بات نہیں کی تھی۔ اس لیے وہ بھی اب مجھ سے بات نہیں کر رہی تھی اور ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ راجا عمر دراز نے آہستہ سے پوچھا۔ ''کیا اسے بھی ساتھ لے جانا ہے؟''

''ظاہر ہے نہ ہم اسے چھوڑ سکتے ہیں اور نہ ہی مار سکتے ہیں اس لیے ساتھ رکھنا ہی مناسب ہوگا۔''

''میں نے سنا ہے یہ خطرناک ہے ہتھیار استعمال کرنے اور لڑنے بھڑنے کی ماہر ہے۔''

''ہاتھ پاؤں کی لڑائی تو نہیں دیکھی لیکن ہتھیاروں میں اس کی مہارت کا عینی گواہ ہوں۔ میں نے بہت کم افراد کا اتنا اچھا نشانہ دیکھا ہے۔''

''ذہن کیسا ہے؟''

''اپنے باپ سے کم سازشی ہے لیکن ہو سکتا ہے یہ اس سے بھی آگے نکلے۔ سمجھ لیں فی الحال اپرنٹس ہے۔''

''یہ تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔'' راجا عمر دراز نے کہا۔ ''اس پر ایک آدمی مسلسل لگانا ہوگا۔''

''مگر وہ ہوشیار اور کردار کا پکا ہو یہ عورت پوری فتنہ ہے۔ مرد کو بہکانے کے جتنے حربے ہو سکتے ہیں اسے ان سے زیادہ ہی آتے ہیں۔''

''مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔ بعض عورتوں کی باڈی لینگویج بتا دیتی ہے کہ وہ کس فطرت کی ہیں اور یہ مجھے مردانہ ذہن والی عورت لگ رہی ہے۔''

''بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔ ''اس میں مردوں کی سی بے باکی اور کھلا پن ہے۔''

''ویر شاہ۔'' راجا عمر دراز نے کسی کو آواز دی تو رانا وباس کا ایک آدمی اندر آیا۔ وہ صاف رنگت اور چھوٹی آنکھوں والا شخص تھا۔ اس نے ادب سے کہا۔

''حکم راجا صاحب۔''

''یہ شہباز ملک ہے۔'' راجا نے میری طرف اشارہ کیا۔ ''اب تم سب اس کی کمانڈ میں ہو۔''

''جیسا حکم راجا صاحب۔'' اس نے میری طرف دیکھا۔ ''اب ہم شہباز صاحب کا حکم مانیں گے۔''

''چاہے یہ حکم میرے خلاف کیوں نہ ہو۔'' راجا عمر دراز نے اضافہ کیا تو ویر شاہ نے جھک کر سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلیم کیا۔ راجا عمر دراز نے مجھ سے پوچھا نہیں تھا اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا اس لیے میں نے بنا کسی تاثر کے ویر شاہ سے کہا۔

''تمہاری پوزیشن حسبِ سابق رہے گی۔ اپنے ساتھی کا تعارف کراؤ۔''

''اس کا نام روی شاہ ہے اور وہ میرا بھائی ہے۔''

میں مسکرایا۔ ''یہاں بھائیوں کی جوڑیاں کچھ زیادہ ہی نہیں ہیں۔''

ویر شاہ سنجیدہ رہا۔ ''جی جناب۔''

''تیاری مکمل ہے؟''

''جی جناب۔''

''ٹھیک ہے کچھ دیر میں فیصلہ کرتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔''

وہ سر جھکا کر چلا گیا۔ میں نے راجا عمر دراز سے کہا۔ ''میرا اندازہ ہے کہ ڈیوڈ شا اپنے ساتھیوں کے ہمراہ یہاں پہنچ گیا ہے یا پہنچنے والا ہے۔ ہمیں ہوشیار رہنا چاہیے۔''

''تب ہمیں روانہ ہو جانا چاہیے۔''

''اس کے برعکس ہمیں انتظار کرنا چاہیے۔''

''وہ کیوں؟''

''آپ کے آدمی مسلح ہیں اسی طرح ڈیوڈ شا بھی مسلح

ہے اگر چہ اس کے پاس افراد کم ہیں لیکن فرض کریں اگر ہم راستہ تلاش کر لیتے ہیں اور نیچے اترنے لگتے ہیں اور تب وہ حملہ کرتا ہے تو اس صورت میں ہمارے لیے دفاع مشکل نہیں ہو جائے گا۔''

میری بات نے راجا عمر دراز کو متفکر کر دیا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اس پتلے سے راستے پر دفاع بہت مشکل ہے۔''

''میرا خیال ہے ڈیوڈ شا اپنے ساتھ گرنیڈ بھی لایا ہے جو زیادہ خطرناک ہو سکتے ہیں۔''

''تب کیا کرنا چاہیے؟''

''وہ جگہ یہاں سے کتنی دور ہے جہاں آپ کے خیال میں نیچے اترنے کا راستہ ہے؟''

''تقریباً نصف کلومیٹر دور ہے۔''

''آپ کے آدمیوں نے وہ جگہ دیکھی ہے؟''

''ویر شاہ اور روی شاہ اس جگہ سے واقف ہیں۔''

''میں ان کے ساتھ جاتا ہوں اور صورتِ حال دیکھتا ہوں۔'' میں نے کہا اور ویر شاہ کو بلایا۔ ''تم اور روی میرے ساتھ چلو گے۔ اپنے آدمیوں سے کہو کہ دو یہاں راجا صاحب کے پاس رکیں اور باقی بلند جگہوں پر چڑھ کر آس پاس نظر رکھیں لیکن خود کو چھپا کر۔''

''میں سمجھا کر آتا ہوں۔'' ویر نے کہا اور چلا گیا۔ چند منٹ بعد وہ دو قبائلیوں کے ساتھ آیا۔ ان سب کے پاس اسلحہ تھا اور یہ جدید ترین اسلحہ تھا۔ راجا عمر دراز اپنے ساتھ خاصا اسلحہ لایا تھا۔ میں نے ایک عدد اے کے چوہتر منتخب کی۔ اسالٹ رائفلوں میں یہ میرا پسندیدہ ہتھیار تھا۔ میں نے اسے ایم سولہ اور جی تھری سے بہتر گن پایا ہے۔ دستے کے بغیر یہ خاصی چھوٹی ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک بریٹا لیا۔ چھوٹے ہتھیاروں میں اس سے بہتر گن اور کوئی نہیں ہے۔ میں ویر اور روی کے ساتھ روانہ ہوا۔ ان کا تعلق بنیادی طور پر راناویاس کے قبیلے سے تھا مگر کئی نسلوں سے وہ مقامی لوگوں سے رشتہ کر رہے تھے اس لیے ان کے نقوش میں انڈین جھلک بھی آ گئی تھی۔ ان کے قد پستہ مگر جسم گٹھے ہوئے تھے۔ ہم چٹانوں کے درمیان بنی ہوئی راہداریوں سے گزرتے ہوئے وادی کے اس کنارے تک پہنچے جہاں بہ قول راجا عمر دراز کے نیچے اترنے کا راستہ تھا۔ اس جگہ کی نشان دہی کے لیے انہوں نے چھپی جگہوں پر سرخ رنگ سے نشان لگائے تھے۔ ویر شاہ نے مجھے نشان دکھایا۔

''یہ راجا صاحب نے خود لگایا ہے۔''

یہاں ایک پتلی سی دراڑ آگے جا رہی تھی۔ ہمیں اس میں جانا تھا۔ ویر آگے تھا۔ میں اس کے پیچھے تھا اور روی میرے پیچھے تھا۔ ہم تقریباً پچاس گز طویل دراڑ سے گزر کر وادی کے کنارے پہنچے تو ویر نے اضطراری آواز نکالی۔ ''یہ کیا...... یہ پہلے تو نہیں تھا۔''

میں پیچھے تھا دیکھ نہیں سکا تھا۔ ''کیا ہے؟''

''یہ راستہ۔'' ویر نے ایک طرف سرک کر مجھے دیکھنے کا موقع دیا۔ تب میں نے دیکھا ایک پتلا سا راستہ نیچے دھند میں غائب ہو رہا تھا۔ ہمارے سروں کے اوپر بھی یوں دھند چھائی تھی جیسے گھرے بادل چھاتے ہیں اور نیچے روشنی اتنی تھی کہ بس چیزیں اور راستہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''تمہیں یقین ہے کہ پہلے یہاں راستہ نہیں تھا؟''

''سو فیصد جناب۔'' اس نے یقین سے کہا۔ ''یہاں ایک اونچی دیوار تھی اور اس پر چڑھ کر دیکھا تو نیچے سپاٹ دیوار تھی۔ یہ راستہ بالکل نہیں تھا۔''

''تم دونوں یہیں رکو اور پوری طرح ہوشیار رہو۔'' میں نے کہا۔ ''سمجھ لو کہ دشمن آس پاس ہے۔''

''سمجھ گئے جناب۔'' ویر بولا تو میں نے اس ترچھے نیچے جاتے راستے پر قدم رکھا۔ عام لوگوں کے نقطہ نظر سے تو یہاں کوئی راستہ ہی نہیں تھا اور وہ اس کے پاس بھی نہ پھٹکیں۔ مگر ہائکرز کے لیے یہ مناسب راستہ تھا۔ میں قدم جما کر نیچے اترنے لگا۔ دھند اتنی تھی کہ چند گز سے آگے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ راستہ دیکھنے کے لیے نظر جمانا پڑتی تھی ورنہ خلا میں جانے والا ایک قدم مجھے تحت الثریٰ میں لے جا سکتا تھا۔ نیچے آتے ہی مجھے کسی قدر گرمی کا احساس ہوا۔ یہ دھند اپنے ساتھ گرمائش بھی لا رہی تھی۔ شاید اسی وجہ سے اوپر کی کھنڈر نما چٹانیں برف سے پاک رہتی تھیں۔ تقریباً سو گز تک نیچے اترنے کے بعد بھی مجھے نہ تو کوئی نظر آیا اور نہ ہی کوئی اور جگہ یا راستہ نظر آیا۔ چٹانوں سے چمٹی یہ پتلی سی پگ ڈنڈی بس نیچے اترتی جا رہی تھی۔ میں رک گیا۔

اس سے نیچے جانا مناسب نہیں لگ رہا تھا اور وہ بھی اکیلے، اگر میں کسی مشکل میں پڑ جاتا تو اوپر والوں کو اس کی خبر بھی نہ ہوتی۔ میں تذبذب میں تھا میرے اندر سے کوئی کہہ رہا تھا کہ میں نیچے جاؤں مگر میرا دماغ اسے مناسب نہیں سمجھ رہا تھا اور میں دل کے مقابلے میں دماغ کو فوقیت دیتا ہوں اس لیے کچھ دیر بعد میں پلٹ گیا اور چند قدم اوپر کی طرف بڑھائے تھے کہ مجھے ایسا احساس ہوا اور لگا کہ جیسے میرے عقب میں کوئی ہے۔ وہ مجھے دیکھ رہا ہے اور چاہتا ہے

کہ میں رک جاؤں واپس نیچے کی طرف جاؤں۔ ساتھ ہی مجھے لگا کہ وہ دشمن نہیں ہے بلکہ خلوص رکھنے والا دوست ہے۔ میں اس کی طرف پلٹنا چاہتا تھا مگر پلٹ نہ سکا ہاں رک ضرور گیا۔ کچھ دیر بعد ایک انوکھی اور جیسے دل میں گونجتی سرگوشی میں اس نے پوچھا۔ ”کیا آؤ گے نہیں میں کب سے تمہارا انتظار کررہا ہوں۔“

”کیوں؟“ میں نے غیرارادی پوچھا۔

”میں تمہیں بتاؤں گا جب تم میرے ساتھ چلو گے۔“

”میں ابھی نہیں جاسکتا میرے ساتھی اوپر ہیں۔“

”وہ بھی آئیں گے۔“

”تب میں ان کے ساتھ ہی آؤں گا۔“

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ ”بہت ضدی ہو ٹھیک ہے جاؤ ان کے ساتھ ہی آنا۔ مگر یاد رکھنا اب مشکل سے آؤ گے۔“

اس کے ساتھ ہی وہ احساس ختم ہوگیا اور میں نے پلٹ کر دیکھا تو عقب میں کوئی نہیں تھا سوائے اس پتلے سے راستے کے جس سے میں واپس آیا تھا۔ میں دوبارہ اوپر چڑھنے لگا اور جب کنارے پہنچا تو ویر شاہ بھی راستے پر نظر آیا مجھے دیکھتے ہی اس نے سکون کا سانس لیا۔ ”شکر ہے آپ آگئے ورنہ میں پریشان ہوگیا تھا۔ اگر آپ کچھ دیر اور نہ آتے تو میں نیچے اتر جاتا۔“

”میں ذرا آگے چلا گیا تھا۔ راستہ ہے مگر میں نے اکیلے جانا مناسب نہیں سمجھا۔“ میں نے اس سے اس کیفیت کا ذکر نہیں کیا جس میں کسی فرد نے مجھ سے یوں بات کی کہ اب مجھے احساس ہورہا تھا کہ میرے کانوں نے کچھ نہیں سنا تھا۔ اب یوں لگ رہا تھا جیسے ساری گفتگو دل میں ہوئی ہو۔ میں نے بھی زبان سے کچھ نہ کہا ہو اور دل ہی دل میں جواب دیتا رہا ہوں۔ یہ حقیقت میں تھا یا میرا وہم تھا۔ ہم واپس آئے اور جب میں راجا عمر دراز کے پاس پہنچا تو وہ میری صورت دیکھ کر بھانپ گیا۔

”کچھ ہوا ہے وہاں؟“

میں نے سر ہلایا اور سب سے پہلے پانی پیا۔ میرا گلا خشک ہورہا تھا۔ پھر راجا عمر دراز سے کہا۔ ”پہلی بات تو یہ کہ وہاں راستہ ہے۔“

”راستہ ہے۔“ راجا عمر دراز پُرجوش ہوگیا۔ ”مجھے یقین تھا کہ جیسے ہی تم آؤ گے راستہ مل جائے گا۔“

”میں تقریباً سو گز نیچے گیا ہوں گا۔ تنگی سے چٹانوں سے چپٹی پگ ڈنڈی ہے جو لامتناہی نیچے جارہی ہے۔“

”اسی راستے پر برف والے کا ڈیرہ بھی ہے لیکن وہ ہر کسی کو نظر نہیں آتا ہے۔“

زینی کو راجا عمر دراز نے یہاں سے باہر بھیج دیا تھا۔ جب میں آیا تو دونوں قبائلی بھی چلے گئے تھے۔ اب وہاں ہم دونوں ہی تھے۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے راجا عمر دراز کو اس گفتگو کے بارے میں بتایا جس کے بارے میں مجھے یقین نہیں تھا کہ میں نے سچ مچ کی تھی یا میرا وہم تھا۔ مگر راجا عمر دراز پوری سنجیدگی سے سنتا رہا اس نے ایک بار بھی مجھے نہیں کہا کہ یہ میرا وہم ہوسکتا ہے۔ میں خاموش ہوا تو اس نے گہری سانس لی۔ ”وہ برف والا تھا اور اس نے ہمیں آنے والے حالات سے خبردار کردیا ہے۔“

”کیسے حالات؟“

”اس نے کیا کہا ہے کہ اب ہم بہت مشکل سے نیچے آئیں گے۔“

”یعنی دونوں پارٹیوں میں کشمکش ہوگی۔“

”اس کے علاوہ بھی مسائل ہوسکتے ہیں۔“

”ہاں برفانی آدمی بھی آسکتے ہیں اور کوئی قدرتی یا غیر قدرتی آفت بھی نازل ہوسکتی ہے اس لیے ہمیں پوری طرح ہوشیار رہنا چاہیے۔“

”نیچے جانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”اس کا فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔“ راجا عمر دراز نے کہا۔ ”تم کیا سمجھتے ہو کہ میں نے تمہیں بس ایسے ہی کمان دی ہے۔ نہیں اب تمام فیصلے تمہیں کرنے ہیں۔“

”چاہے میں کچھ بھی فیصلہ کروں یہاں سے واپس جانے کا فیصلہ بھی کرسکتا ہوں؟“

”بالکل تم فیصلہ کرو اور ہمیں اس پر عمل کرنے کو کہو۔“

اس بار میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ”راجا صاحب آپ نے بہت بڑی ذمے داری میرے سر ڈال دی ہے۔“

”تم اس کے اہل ہو۔“ اس کے لہجے میں اصرار تھا۔ ”مجھے یقین ہے تم ہمیں نیچے لے جاؤ گے۔“

اچانک کہیں پاس ہی فائر کی آواز آئی۔ یہ سنگل فائر تھا۔ میں بے ساختہ کھڑا ہوگیا۔ راجا عمر دراز بھی کھڑا ہوا تھا مگر میں نے اس سے کہا۔ ”آپ یہیں رکیں میں دیکھتا ہوں۔“

”یہ رکھ لو مجھ سے رابطہ رہے گا۔“ اس نے ایک چھوٹا واکی ٹاکی مجھے تھمایا۔ ”جب تم جارہے تھے تب میں دینا بھول گیا تھا۔ ویسے یہ دو سو گز تک کام کرتا ہے۔“

میں نے واکی ٹاکی جیکٹ میں رکھا اور باہر آ گیا۔ یہ جگہ کچھ ایسی تھی کہ اس کے چاروں طرف راہداریاں بنی ہوئی تھیں مگر اندر آنے جانے کا راستہ ایک ہی تھا میں اس سے باہر آیا اور سوچ رہا تھا کہ کہاں جاؤں، سامنے سے رونی نمودار ہوا اور اس نے کہا۔ ''وہ بھاگ گئی اس نے میرے ایک آدمی کو شوٹ کر دیا ہے۔''

''زینی۔'' میں نے کہا۔ ''کیسے؟''

''پتا نہیں جناب اسے میں نے ایک جگہ رکھا تھا اور اس پر میرا آدمی تھا۔ اس نے اسی کی رائفل سے اسے شوٹ کیا اور جب ہم فائر کی آواز سن کر وہاں پہنچے تو وہ رائفل سمیت غائب تھی۔ میرے دو آدمی سونی کے ساتھ اس کے پیچھے گئے ہیں۔''

میں فکر مند ہو گیا۔ ''یہ اچھا نہیں ہوا۔ وہ بہت شاطر اور عیار عورت ہے اور اس نے ہمارا ٹھکانہ بھی دیکھ لیا ہے۔''

ہم اس جگہ پہنچے جہاں زینی کو رکھا گیا تھا یہ تین اطراف سے بند ایک غار تھا اور خاص بات یہ تھی کہ رونی کے آدمی کی لاش غار کے اندر تھی یعنی زینی نے کسی طرح سے اسے اندر بلایا اور پھر اسی کی رائفل سے اسے شوٹ کر دیا۔ میں سوچ کر رہ گیا کہ اس نے یہ کام کیسے کیا ہوگا۔ وہ شرم و حیا سے عاری عورت تھی اور اپنے مفاد کی خاطر اپنا جسم آخر حد تک استعمال کر سکتی تھی۔ اس نے ایسا ہی کوئی حربہ استعمال کیا ہوگا۔ میں نے لاش دیکھی۔ گولی اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر لگی تھی اور وہ فوراً ہی مر گیا تھا۔ اس نے حماقت کی تھی اور اس کی سزا اسے موت کی صورت میں ملی۔ میں نے رونی سے کہا۔ ''تمہارا اپنے آدمیوں سے رابطہ ہے۔''

''کوشش کرتا ہوں۔'' اس نے کہا اور واکی ٹاکی نکال کر سونی کو پکارنے لگا۔ چند لمحے بعد سونی نے جواب دیا تو پیچھے بہت شور تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کہیں دست بدست لڑائی ہو رہی ہو اور پھر فائرنگ کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی رابطہ ختم ہو گیا۔ رونی پریشان ہو گیا۔ ''وہاں کچھ ہو رہا ہے۔''

''ہمیں جانا ہوگا لیکن پہلے باقی سب کو راجا صاحب کے پاس بھیجنا ہے ان کی حفاظت کے لیے آدمی ان کے پاس ہوں۔'' میں نے کہا اور ویر شاہ کو پکارا۔ اس نے فوری جواب دیا اور میں نے کہا۔ ''تم تین آدمی راجا صاحب کے پاس چھوڑ کر میرے ساتھ آؤ۔''

ویر شاہ نے حکم کی تعمیل کی۔ وہ روی کے ساتھ دو قبائلی راجا عمر دراز کے پاس چھوڑ کر ہمارے پاس آیا اور ہم اس طرف روانہ ہو گئے جہاں سونی اور اس کے دو ساتھی زینی کے تعاقب میں گئے تھے۔ ایک ذرا سی غفلت نے اچھا خاصا کام بگاڑ دیا تھا۔ اگر میں اسے وہیں چھوڑ آتا تو شاید یہ نوبت نہ آتی۔ مگر یہ مقدر میں بھی تھا۔ یہاں کے راستوں سے رونی سب سے زیادہ واقف تھا۔ اس کے بعد سونی جانتا تھا۔ ہم چند سو گز آگے گئے ہوں گے کہ گڑبڑ کے آثار نظر آئے ایک جگہ زمین پر خاصا خون پڑا ہوا تھا۔ کوئی شدید زخمی ہوا تھا اور زخمی بھی کچھ آگے جا کر نظر آ گیا۔ وہ سونی تھا۔ وہ چٹانی دیوار سے ٹیک لگائے اور اپنا سینہ تھامے گہرے سانس لے رہا تھا اور اس کا ہاتھ خون میں تربتر تھا۔ رونی اس کی طرف لپکا۔ اس نے اپنی زبان میں کچھ کہا تھا۔ سونی نے اکھڑتی سانسوں کے درمیان اسے کچھ بتایا۔ میں نے اس کا ہاتھ ہٹا کر زخم دیکھا جس سے خون بہت تیزی سے بہہ رہا تھا اور بہ ظاہر اس کا بچنا مشکل لگ رہا تھا کیونکہ کسی تیز دھار آلے کا زخم عین دل کے مقام پر تھا۔ رونی نے یہ بات محسوس کر لی وہ رونے لگا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سونی نے دم توڑ دیا اور رونی اب سوگ میں رو رہا تھا۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''مجھے افسوس ہے تمہارا نقصان بڑا ہوا ہے مگر اس کی قاتلہ آزاد ہے یہاں کیا ہوا تھا سونی نے کیا بتایا ہے۔''

''عورت نے ان پر خنجر سے حملہ کیا تھا اس نے سونی کے دونوں ساتھیوں کو اس کے سامنے مار دیا اور پھر اس پر بھی حملہ کیا تھا۔ اس کے وار کے بعد سونی نے اس پر فائر کیا تھا۔ پتا نہیں اسے گولی لگی یا نہیں مگر وہ فرار ہو گئی تھی۔ سونی اس کے پیچھے بھاگا مگر یہاں آ کر اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ گر گیا۔'' رونی نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ اس کو سونی کی لاش کے پاس چھوڑ کر ہم باقی دو قبائلیوں کو دیکھنے لگے اور ان کی لاشیں دو الگ راہداریوں میں ملی تھیں۔ زینی میرے اندازے سے زیادہ خطرناک اور سفاک ثابت ہوئی تھی۔ اس کے پاس خنجر تھا اور اس نے اسے چھپا کر رکھا مگر جب رائفل حاصل کر لی تب بھی اس نے خنجر سے کام کیا اس نے ان دونوں قبائلیوں کی گردنیں کاٹ دی تھیں۔ حالانکہ وہ رائفل سے یہ کام زیادہ آسانی سے لے سکتی تھی۔ اب آزاد اور مسلح تھی۔ میں واپس آیا۔ میں نے رونی سے کہا۔

''ہمیں واپس جانا ہوگا۔ اس وقت ہم خطرے میں ہیں وہ مسلح ہے اور کسی جگہ سے چھپ کر کارروائی کی تو ہم مارے جائیں گے۔''

رونی اپنے بھائی کی لاش چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہیں تھا مگر ہم اسے تقریباً زبردستی لے گئے۔ لاشیں لے جانا بھی آسان نہیں تھا البتہ ان کا اسلحہ سمیٹ لیا تھا۔ ہم واپس آئے۔ راجا اور دوسروں کے علم میں صورتِ حال آئی تو سب ہی متفکر ہو گئے تھے۔ صورتِ حال یوں زیادہ گھمبیر تھی کہ ذرا سی دیر میں ہماری پارٹی آدھی رہ گئی تھی۔ اب ویرا اور اس کے بھائی کے علاوہ صرف تین قبائلی تھے۔ چھٹا میں اور ساتواں عمردراز تھا۔ افرادی قوت کے لحاظ سے اب ہم ڈیوڈ شا سے برتر نہیں رہے تھے۔ برف والے کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی تھی ہم آسانی سے نہیں آ سکیں گے۔ میں نے کہا۔ ”ہمیں فوری طور پر یہ جگہ چھوڑنی ہو گی۔“

”تب کہاں جائیں؟“

”کسی اور جگہ ٹھکانہ بناتے ہیں۔“

”کیوں نہ نیچے اتریں۔“ راجا عمردراز نے کہا تو میں سوچ میں پڑ گیا۔ جانا تو ہم نے وہیں تھا۔ اگر فوری روانہ ہو جاتے تو امکان تھا کہ ڈیوڈ شا اور اس کے ساتھیوں کی آمد سے پہلے نیچے اتر جاتے۔ میں نے سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے، ہم نیچے چلتے ہیں، مگر سارا سامان لے کر جانا مشکل ہوگا۔“

”ہم یہاں کچھ سامان چھپا دیتے ہیں۔“ ویرا شاہ نے تجویز دی۔

”بس تو فوری ضرورت کا سامان اور اسلحہ ہمارے ساتھ جائے گا۔ ہلکا پھلکا کھانے پینے کا سامان بھی ساتھ رکھ لو۔“

ویرا اور روی سامان چھانٹنے لگے۔ رونی جواب تک بھائی کے دکھ میں تھا اس نے میرے اور قبائلیوں کے ساتھ مل کر ایک جگہ تلاش کی جہاں ہم سامان چھپا سکتے تھے ایک جگہ پتھروں کا ڈھیر تھا ہم نے یہ ڈھیر ہٹایا اور رکھنے والا سامان اس کے پیچھے چھپا کر پتھروں کا ڈھیر پھر ویسے ہی کر دیا۔ ڈھیر چٹان ٹوٹنے سے بنا تھا اور بالکل قدرتی لگ رہا تھا۔ ان چکروں میں ایک گھنٹے سے زیادہ کا وقت گزر گیا تھا۔ اس کے بعد ہم روانہ ہوئے۔ میں نے روانہ ہونے سے پہلے کہا۔ ”ہمیں بالکل خاموشی سے اور بنا آواز کے سفر کرنا ہے کیونکہ یہاں اگر دشمن موجود ہے تو وہ آواز کی مدد سے ہمارا سراغ لگا لے گا۔ آپس میں گفتگو بھی اشاروں سے کی جائے اور صرف انتہائی ضرورت کے وقت آواز نکالی جائے۔“

سب نے اثبات میں سر ہلایا اور ہم روانہ ہو گئے۔ ہم جو سامان لے کر جا رہے تھے اس میں کوہ پیمائی کا سامان بھی تھا۔ نیچے اترتے ہوئے ہمیں اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ ہم دبے قدموں اور خاموشی سے چلتے ہوئے اس جگہ تک آئے جہاں سے نیچے اترنے کا راستہ جاتا تھا۔ رونی سب سے آگے تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس میں خطرات بھانپنے والی حس بھی اس کی باقی حسوں کی طرح تیز تھی۔ اس نے بندروں کی آواز بھی سب سے پہلے سنی تھی اور ہم بروقت خبردار ہوئے تھے۔ اسی لیے اسے آگے رکھا گیا تھا۔ اس کے پیچھے میں اور میرے پیچھے راجا عمردراز تھا۔ کینسر کے مرض کے آخری اسٹیج میں ہونے کے باوجود اس کے دم خم میں کمی نہیں آئی تھی اور وہ بالکل سیدھا چل رہا تھا۔ گھر میں وہ عام طور سے چھڑی کا سہارا لیتا تھا مگر یہاں اس نے چھڑی کا سہارا بھی نہیں لیا ہوا تھا۔ البتہ اس کے پاس فولڈ ہو جانے والی چھڑی ضرور تھی۔ اس نے کوئی سامان نہیں اٹھایا تھا اور خالی ہاتھ تھا۔ اس کے پیچھے باقی پارٹی تھی۔ اچانک رونی نے پہلے کی طرح ہاتھ بلند کر کے رکنے کا اشارہ کیا اور پھر پلٹ کر آیا اور سرگوشی میں بولا۔

”آگے کوئی ہے آپ سب ذرا پیچھے ہو جائیں میں دیکھ کر آتا ہوں۔“

وہ آگے گیا اور غائب ہو گیا۔ چٹانوں کے اوپر مکمل دھند تھی البتہ نیچے راستوں پر اس کی شدت کم تھی اس وجہ سے دس بارہ قدم تک دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے بعد منظر غائب ہو جاتا تھا۔ رونی چند منٹ بعد نمودار ہوا اور اس کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ آگے گڑبڑ ہے اس نے آ کر پہلے کی طرح سرگوشی میں کہا۔ ”آگے کچھ لوگ ہیں نظر نہیں آ رہے ہیں مگر ان کی باتوں کی آواز آ رہی ہے۔“

میں نے احتیاطاً سب کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا اور پھر رونی سے پوچھا۔ ”تم نے کچھ سنا وہ کون سی زبان استعمال کر رہے تھے اور لہجے سے کہاں کے لگ رہے تھے؟“

”انگریزی۔“ اس نے یقین سے کہا پھر جذباتی لہجے میں بولا۔ ”وہ یہاں کے نہیں تھے اور اس لڑکی کی آواز بھی آ رہی تھی جو میرے بھائی اور قبیلے والوں کی قاتل ہے۔ کاش میں آپ کے ساتھ نہ ہوتا تو جان پر کھیل کر اسے ختم کر دیتا۔“

”تم فکر مت کرو ہمیں موقع ملے گا۔“ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ یہ یقینی ثبوت تھا کہ ڈیوڈ شا اینڈ پارٹی چٹانوں کے اس حصے میں پہنچ گئی تھی جہاں سے نیچے اترنے

والا راستہ نکلتا تھا۔ وہ اس پتلی سی دراڑ پر قابض ہو گئے تھے جس سے گزرے بغیر ہم کنارے تک نہیں جا سکتے تھے۔ راجا عمر دراز یہ سن کر جھنجلا گیا تھا اس نے کہا۔

''یہ کہاں سے آ گئے؟''

''مجھے پہلے ہی اس کا خدشہ تھا۔'' میں نے کہا۔ ''ہم نے خاصا وقت ضائع کیا ہے اور اب ہمیں متبادل راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔''

''متبادل راستہ کہاں ہے؟''

''چٹانوں کے اوپر سے۔'' میں نے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔

''یہاں چٹانیں بہت اونچی ہیں جناب۔'' ویر شاہ نے کہا۔

''ہاں مگر ہم اسی راستے سے جائیں گے۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''سب سے پہلے اوپر جانے کا راستہ تلاش کرنا ہوگا۔''

ہم جس جگہ کھڑے تھے یہاں چٹانوں کی بلندی پچاس فٹ کے لگ بھگ تھی اور اتنی بلند چٹانوں پر چڑھنا آسان کام نہیں تھا۔ مگر کوئی کام آسان نہیں ہوتا جب تک اسے کرنے کا ارادہ نہ کر لیا جائے۔ جب انسان ارادہ کر لے تو پھر کوئی نہ کوئی راستہ نکل آتا تھا۔ ہم الگ الگ جگہوں پر اوپر جانے کا راستہ تلاش کر رہے تھے۔ چٹانیں اس طرح ٹوٹی ہوئی تھیں کہ اوپر تک ان کی دیواریں اکثر مقامات پر سپاٹ تھیں اور جہاں کہیں سے یہ کھردری تھیں ان میں بھی اوپر جانے کی گنجائش اتنی نظر نہیں آ رہی تھی۔ بالآخر رونی کے ایک آدمی جانوس نے ایک جگہ دریافت کی یہاں دیوار پر گمر سے نکلے ہوئے تھے اور اس نے دعویٰ کیا کہ وہ ان گمروں کو پکڑ کر اوپر پہنچ سکتا ہے۔ میں نے پہلے انکار کیا کیونکہ مجھے یہ خطرناک لگ رہا تھا مگر جب اس نے رونی کے توسط سے اصرار کیا اور رونی نے بھی اس کی تائید کی کہ وہ اس قسم کے کاموں کا ماہر تھا۔ تو میں مان گیا۔

اجازت ملنے پر جانوس نے اپنا بھاری لباس اتارا۔ جوتے اتار کر اپنے بیگ سے عجیب ساخت کے پمپی جیسے شوز نکال کر پہنے جن کے تلے بے انتہا کھردرے تھے۔ ہاتھوں میں ایسے دستانے پہنے جو گرپ لینے کے لیے بہترین تھے۔ وہ صرف جرسی اور اونی پاجامے میں تھا۔ اس نے رسی اور ہتھوڑی نما کلہاڑی لی اور اوپر چڑھنے لگا۔ شروع کے گمر آسان تھے مگر اس کے بعد گمر چھوٹے اور دور ہونے لگے۔ ہم نے احتیاطاً نیچے سلیپنگ بیگز بچھا دیے تھے کہ اگر وہ گرے بھی تو اسے جان لیوا چوٹ نہ لگے۔ جیسے جیسے وہ اوپر جا رہا تھا۔ اس کے لیے آگے جانا مشکل ہوتا جا رہا تھا اور اسے زیادہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا پڑ رہا تھا۔ اب اسے کلہاڑی بھی استعمال کرنا پڑ رہی تھی اس کے بغیر اسے سہارا نہیں مل رہا تھا۔ ایک جگہ پہنچ کر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ہم دھڑکتے دل سے انتظار کر رہے تھے کہ مہم کے آخری حصے کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

چند منٹ انتظار کے بعد اچانک اوپر سے رسی لہراتی ہوئی آ کر نیچے گری تو ہم سب نے سکون کا سانس لیا تھا۔ اس نے رسی اوپر باندھ دی تھی۔ سب سے پہلے رونی گیا۔ اس نے اوپر مزید رسیاں باندھیں۔ ویر شاہ بھی اوپر چلا گیا۔ پہلے انہوں نے سامان کھینچا پھر راجا عمر دراز کو اوپر کھینچا اور آخری میں، میں اور رونی شاہ بھی اوپر پہنچ گئے۔ یہ اچھا ہوا کہ ہمارے پاس صرف ضروری سامان تھا ورنہ اس طرح سے سارا سامان اوپر پہنچانا بہت مشکل کام بن جاتا کیونکہ باقی سامان خاصا بڑا اور بھاری تھا۔ اوپر دھند شدید تھی۔ یہاں چند فٹ سے آگے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اور یہاں ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا تھا۔ پہلا مرحلہ اس پتلی دراڑ کو تلاش کرنا تھا جس سے راستہ گزر کر کنارے تک جاتا تھا اور پھر اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہم کنارے تک پہنچ سکتے تھے وہاں سے نیچے اترنے کے لیے کوئی دوسری تدبیر کی جا سکتی تھی۔

سب نے اپنا اپنا سامان سنبھالا اور ہم محتاط انداز میں آگے بڑھے۔ میرا اندازہ تھا کہ ہم کنارے سے کوئی دو سو گز دور تھے۔ چٹانیں اوپر سے ہموار نہیں تھیں۔ کہیں یہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھیں اور کہیں ان میں کوہان سے نکلے ہوئے تھے۔ ٹوٹے حصوں سے بہت احتیاط سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ ایک چٹان تک پہنچے تو اسے متعدد حصوں میں تقسیم پایا اور ہر حصہ ہل رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بڑے زلزلے یا دھماکے سے یہ چٹان اوپر سے نیچے تک مکمل طور پر بے شمار حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ یہ خاصے بڑے رقبے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس پر قدم رکھنا خطرناک ہو سکتا تھا اس لیے ہم اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگے اور خاصا گھوم کر ہم اس کے دوسری طرف پہنچے تھے۔ میرا اور دوسروں کا بھی یہی خیال تھا کہ اسی سیدھ میں ہمیں اس پتلی دراڑ کا اوپری حصہ ملے گا جو کنارے تک جاتی تھی مگر آگے جانے پر بھی اس دراڑ کا کوئی نشان نظر نہیں آیا۔ راجا عمر دراز نے کہا۔

''ہم غلط سمت تو نہیں آ نکلے ہیں؟''

"یقیناً ایسا ہی ہے۔" میں نے کہا۔ "دھند اور ٹوٹی چٹان کی وجہ سے ہم اصل راستے سے ہٹ گئے ہیں۔ اس صورت میں ہمیں سب سے پہلے کنارے تک جانا ہوگا اس کے بعد ہم اس کے دائیں بائیں دراڑ تلاش کریں گے۔ مجھے یاد ہے آخری حصے میں وہ خاصی چوڑی ہوگئی تھی۔"

"ایسا ہی کرتے ہیں۔" ویر شاہ نے کہا اور ہم آگے بڑھے۔ اب ہمیں چٹانیں پھلانگنا بھی پڑ رہی تھیں۔ اگرچہ خلا گز ڈیڑھ گز سے زیادہ نہیں تھا مگر حد نظر محدود ہونے کی وجہ سے ہمیں احتیاط کرنی پڑتی تھی ایک لڑکھڑا جانے والا قدم ہمیں خاصا نیچے لے جاسکتا۔ اسی طرح چٹانیں پھلانگتے ہوئے ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جس کے دوسری طرف خلا تھا اور دھند کے پاس اگلی چٹان نظر نہیں آرہی تھی۔ رونی نے ہتھوڑی رسی سے باندھ کر آگے پھینکی مگر وہ کسی شے پر گرنے یا اس سے ٹکرانے کی بجائے واپس آئی اور اس چٹان کے ساتھ ٹکرائی جس کے کنارے ہم کھڑے ہوئے تھے۔ ٹن کی آواز خاصی بلند تھی۔ میں نے رونی کو خبردار کیا۔

"احتیاط سے ہم دشمن سے زیادہ دور نہیں ہیں ایک آواز ہماری نشان دہی کردے گی۔"

"سوری صاحب۔" اس نے ندامت سے کہا اور رسی اوپر کھینچ لی۔

"یہ تو طے ہے کہ ہم وادی کے کنارے کھڑے ہیں اب معلوم یہ کرنا ہے کہ دراڑ کس طرف ہے۔" میں نے کہا۔ "دو افراد بائیں طرف جائیں اور دو دائیں طرف۔"

"میں اور رونی بائیں طرف جاتے ہیں۔" روی شاہ نے کہا۔

"میں اور ویر دائیں طرف جاتے ہیں۔" میں نے سر ہلایا۔ "واکی ٹاکی ساتھ رکھنا اور ہر دس گز کے بعد اشارہ دینا۔ اس سے پتا چلتا رہے گا کہ کون سی پارٹی کتنی دور ہے۔ اگر سو گز بعد بھی دراڑ نہ ملے تو لازمی واپس آنا ہوگا۔"

"میں سمجھ گیا۔" روی شاہ نے کہا اور رونی کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ دونوں پارٹیوں کو راجا عمر دراز کو رپورٹ کرنی تھی۔ میں نے اپنا واکی ٹاکی ہاتھ میں رکھا اور ویر شاہ کے پیچھے چلتے ہوئے دس قدم گن کر واکی ٹاکی میں کہا۔ "دس قدم۔"

اسی طرح ہر دس قدم کے بعد میں اعلان کرتا رہا اور راستہ دیکھنے کا کام ویر شاہ کرتا رہا۔ سو قدم یعنی سو گز پورے ہوگئے۔ مگر اب تک دراڑ نمودار نہیں ہوئی تھی دوسری طرف روی شاہ بھی اسی طرح اعلان کرتا ہوا سو گز دور نکل گیا تھا اور اسے بھی دراڑ نہیں ملی تھی۔ راجا عمر دراز نے مشورہ دیا کہ ہم مزید پچاس گز اور جائیں۔ اس پر بھی عمل کر کے دیکھا مگر دراڑ اب بھی نہیں ملی تو راجا عمر دراز نے کہا۔ "اس وقت تک چلتے رہو جب تک واکی ٹاکی کی حد ختم نہیں ہو جاتی۔ جب تم لوگوں کو میری طرف سے جواب نہ ملے تو واپس آجانا۔"

ہم روانہ ہوئے اور تقریباً تین سو گز کے بعد راجا عمر دراز کی آواز آنا بند ہوگئی یعنی واکی ٹاکی کی حد ختم ہوگئی تھی۔ میں نے ویر شاہ کو روکا اور ہم واپس آئے۔ بیس گز کے بعد راجا عمر دراز کو میری آواز آئی اور اس نے بھی جواب دیا۔ اس نے کہا۔ "دوسری پارٹی کی طرف سے جواب نہیں آرہا ہے حالانکہ اسے رینج سے نکلے ہوئے کئی منٹ ہوچکے ہیں۔"

"ہم واپس آرہے ہیں ہوسکتا ہے وہ بھی واپس آرہے ہوں۔" میں نے کہا اور واپس چلنا شروع کیا۔ یہ واکی ٹاکی فکس فریکوینسی پر سیٹ تھے اور ایک بولتا تو رینج میں موجود تمام واکی ٹاکی سیٹ پر آواز آتی تھی۔ کیونکہ ہمارے اور روی شاہ پارٹی کے درمیان خاصا فاصلہ تھا اس لیے مجھے ان کی آواز نہیں سنائی دی۔ میں نے ویر شاہ کو بتایا کہ روی کی طرف سے جواب نہیں مل رہا ہے تو وہ بے چین ہوگیا۔ اس نے رفتار تیز کردی۔ واپسی کا راستہ دیکھا بھالا تھا اس لیے میں نے اس کی تیز رفتاری پر اعتراض نہیں کیا۔ راستے میں ہمیں صرف چند گڑھے ملے تھے اور ہم نے آرام سے انہیں پھلانگ لیا تھا۔ اسی وجہ سے ویر شاہ بے فکر تھا اور اس نے ایک گڑھا پھلانگنا چاہا تو نہ جانے کیا ہوا کہ وہ اچھلتے ہوئے دوسری طرف جانے کی بجائے نیچے کی طرف گیا۔ وہ یوں گڑھے میں چلا گیا جیسے اسے کسی نے کھینچ لیا ہو۔ گرتے ہوئے اس نے کناروں پر ہاتھ جما لیے تھے اور خود کو اوپر اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ ساتھ ہی اس نے دہشت زدہ لہجے میں کہا۔

"مجھے کسی نے پکڑ لیا ہے۔"

میں نے نیچے گرتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے اس کے ہاتھ کی سختی سے اندازہ ہوا کہ نیچے کوئی سچ مچ اسے کھینچ رہا تھا میں نے گڑھے میں دیکھنے کی کوشش کی مگر اس کے عقب میں تاریکی اور دھند تھی اس لیے کچھ نظر نہیں آیا۔ میں نے پورا زور لگایا اور اسے کمر تک واپس بھی کھینچ لیا۔ ویر شاہ کے چہرے پر اذیت کے آثار نظر آرہے تھے۔ اس نے بھنچی آواز میں کہا۔ "میرا پاؤں الگ ہوجائے گا۔"

"خود کو قائم رکھو۔" میں نے پستول نکالتے ہوئے کہا اور ذرا گھوم کر سوراخ میں ہاتھ کر کے لگاتار کئی فائر کیے۔ اندر سے غراہٹ کی آواز آئی اور فوراً ہی ویرشاہ جھٹکے سے نیچے گیا۔ اس نے خود کو روکنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا اور جب تک میں اس کے پاس آتا وہ گڑھے میں جا چکا تھا۔ اس کی آخری چیخ بہت کربناک تھی اور دیر تک سنائی دیتی رہی۔

دوسری طرف راجا عمر دراز بار بار پوچھ رہا تھا کہ اس طرف کیا ہوا ہے؟ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے اسے جواب دیا۔ "برفانی آدمی نے ویرشاہ کو ایک سوراخ سے اندر کھینچ لیا ہے۔"

راجا عمر دراز پریشان ہو گیا۔ "میرے خدا! روی اور رونی کی طرف سے بھی جواب نہیں مل رہا ہے۔"

"میں آرہا ہوں۔" میں نے کہا اور جیکٹ سے طاقتور ٹارچ نکال کر اس کی روشنی سوراخ میں ڈالی۔ روشنی دس بارہ گز سے نیچے نہیں جا رہی تھی اور یہاں تک خلا میں کچھ نہیں تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ یہاں سے زمین پچاس ساٹھ فٹ نیچے تھی اور اتنا نیچے اترنا ممکن نہیں تھا۔ پتا نہیں برفانی آدمی میری فائرنگ کا نشانہ بنا تھا یا وہ بچ گیا تھا دونوں صورتوں میں وہ ویرشاہ کو ساتھ لے گیا تھا۔ اس کے پیچھے جانا ممکن نہیں تھا۔ میں نے گہری سانس لی اور پستول رکھ کر رائفل سنبھال لی۔ خطرہ ہمارے آس پاس تھا اور یہ برفانی آدمی کا خطرہ تھا جسے ہم اپنے طور پر پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اب مجھے روی شاہ اور رونی کی طرف سے بھی فکر ہو رہی تھی۔ میں تیز قدموں سے چند منٹ میں واپس پہنچ گیا تو راجا عمر دراز اور اس کے ساتھ موجود جانوس چوکنا تھا۔ انہوں نے ہتھیار سنبھال رکھے تھے۔ میں نے جاتے ہی کہا۔ "یہاں ہم شدید خطرے میں ہیں اور ہمیں نیچے اترنا ہو گا۔"

"وہ کیسے؟" راجا عمر دراز نے پوچھا۔ "اگر ہم نیچے بھی اتر گئے تب بھی جانے والے راستے پر ڈیوڈ شا قابض ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "ہمیں وادی میں اترنا ہے۔"

اسی اثنا میں دوسری طرف سے کوئی نمودار ہوا تو ہم نے بھڑک کر رائفلیں اس کی طرف کیں مگر وہ رونی تھا جو ہراساں اور پریشان دوڑا آرہا تھا۔ اس نے نزدیک آکر ہانپتے ہوئے کہا۔ "برفانی آدمی انہوں نے روی پر حملہ کیا اور اسے مار کر لے گئے۔"

"وہ ویرشاہ کو بھی مار چکے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اب وہ ہمارے لیے آئیں گے اور ہمارے لیے ایک ہی جائے پناہ ہے۔" میں نے ایک بیگ پشت پر باندھا۔ "ہمیں نیچے اترنا ہے۔"

راجا عمر دراز فکرمند ہو گیا۔ "اس طرح اندھا دھند نیچے اترنا خطرناک ہو سکتا ہے۔"

"اور جو خطرہ پیچھے ہے۔ بلکہ ہمارے آس پاس ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" رونی نے میری تائید کی۔ "وہ بہت خوفناک ہیں۔ دو برفانی آدمیوں نے روی شاہ کو پکڑ کر کھینچا اور اس کے دو ٹکڑے کر دیئے۔"

مجھے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے تھے۔ رونی اور جانوس نے بھی اپنے بیگ لاد لیے۔ اس کے باوجود دو بیگ باقی تھے مگر ان کو لے جانا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے انہیں وہیں چھوڑا۔ البتہ رسیاں ساری لے لی تھیں۔ ہماری بیلٹوں سے کلپس پہلے ہی بندھے ہوئے تھے ہم نے کیلیں اور ہتھوڑی بھی ساتھ رکھ لیں۔ پہلے جانوس نیچے گیا اور اس نے جائزہ لے کر اوکے کیا تو پھر میں اور میرے بعد راجا عمر دراز نیچے آئے سب سے آخر میں رونی آیا تھا۔ ہم ایک چھجے پر تھے اور ابھی ہم رسیاں اور کیلیں لگانے جا ہی رہے تھے کہ اوپر سے غرانے اور بھاری سانسوں کی آوازیں آئیں۔ ہم سب چھجے کی دیوار سے چپک گئے تھے۔ اوپر ایک یا زیادہ برفانی آدمی تھے۔ انہوں نے یقیناً بیگ دیکھ لیے تھے اور انہیں الٹ پلٹ رہے تھے۔ میں نے کلہاڑی سنبھال لی۔ بہت زیادہ چانس تھا کہ برفانی آدمی ہمیں دریافت کر لیں گے۔

میں نے سوچ لیا کہ مجھے کیا کرنا ہے اور ساتھ ہی اشارے سے دوسروں کو بھی تیار رہنے کو کہا۔ سانسوں کی آواز نزدیک آنے لگی اور پھر ایک برفانی آدمی نے نیچے جھانکا ہی تھا کہ میں نے ہتھوڑی کا کلہاڑی نما حصہ گھما کر اس کے سر پر مارا۔ وہ دستے تک ماتھے پر اس کے سر میں گھس گیا اور وہ ایک کریہہ چیخ کے ساتھ سر کے بل نیچے آیا تھا میں نے کلہاڑی اس کے سر سے نکالنے کی کوشش کی مگر وہ بری طرح سر میں دھنسی ہوئی تھی اگر میں اس پر گرفت رکھتا تو اس کے ساتھ میں بھی نیچے جاتا مجبوراً مجھے چھوڑنا پڑا۔ وہ لمحوں میں گہری دھند میں غائب ہو گیا۔ میں نے کلہاڑی استعمال کرنے کا فیصلہ اس لیے کیا کیونکہ کسی اور ہتھیار کے استعمال سے خطرہ تھا برفانی آدمی فوری نہیں مرے گا اور نیچے جاتے

ہوئے کسی دوسرے کو بھی ساتھ لے جائے گا۔ جہاں تک میں نے اس مخلوق کو دیکھا تھا یہ بے انتہا ضدی اور مرنے مارنے والی تھی۔ وہ نیچے گیا تو میں نے پستول نکال لیا۔ اگر اوپر کوئی اور برفانی آدمی تھا تو وہ یقیناً آنے والا تھا اور میں اسے دیکھتے ہی شوٹ کر دیتا۔ میرے ساتھ راجا عمر دراز بھی تیار تھا۔ مگر اوپر سے مزید کوئی آواز نہیں آئی ایسا لگ رہا تھا کہ اوپر ایک یہی تھا جو یہاں تک آیا تھا۔ میں نے رونی سے کہا۔

''اب رسی لگاؤ۔''

وہ ہتھوڑی لے کر رسی کے لیے کیل ٹھونکنے لگا اور میں اوپر تک آیا اور کنارے سے نگرانی کرنے لگا۔ بے شک حد نظر چند گز تک تھی مگر برفانی آدمی یہاں تک بھی آجاتا تو میں اسے دیکھ لیتا اور کنارے آنے سے پہلے میں اسے مار گراتا۔ رونی نے دو الگ کیلیں ٹھونکیں اور ان سے رسیاں منسلک کر کے نیچے پھینکیں۔ اس نے کیلوں سے کلپ لگا کر ان سے ایک باریک رسی یوں لگائی کہ نیچے سے ہم رسی کھول سکتے تھے اور اسے دوبارہ استعمال کر سکتے تھے۔ یہ ضروری تھا ہمارے پاس رسیاں محدود تھیں اور ہم نے ابھی نامعلوم بلندیوں سے نیچے جانا تھا۔ پہلے راجا عمر دراز نیچے گیا۔ کلپ کی مدد سے اسے نیچے جانے میں آسانی رہی تھی اور اسے اپنا زور نہیں لگانا پڑ رہا تھا لیکن پھر بھی ایک تو وہ بوڑھا تھا اور دوسرے بیمار تھا۔ مجھے اس کی فکر تھی۔ اب تک میں نے کئی بار اسے ان ہیلر لیتے دیکھا تھا۔ پتا نہیں یہ سادہ ان ہیلر تھا یا اس میں کینسر کے لیے کوئی دوا ہوتی تھی۔ میں نے کہا۔

''سب پاس پاس رہیں۔''

راجا عمر دراز کے پیچھے رونی گیا تھا۔ دوسری رسی سے جانوس گیا اور جب رونی نے نیچے سے آواز دی۔ ''کلیئر ہے۔'' تو میں بھی نیچے آیا اور رسی سے کلپ منسلک کر کے نیچے جانے لگا۔ تقریباً بیس گز کے بعد ہمیں ایک اور چھجا ملا یہاں اتنی جگہ تھی کہ ہم چاروں آرام سے کھڑے ہو سکتے تھے۔ رونی نے ایک رسی سے منسلک باریک ڈوری کھینچی اور اوپر کیل سے بندھی گرہ کھل گئی۔ اس رسی کو لپھا بنا کر اس نے شانے پر ڈالا اور دوسری رسی کھولنے لگا۔ میں آس پاس دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر یہاں دھند کہیں زیادہ گہری تھی اور دو گز سے آگے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس طرح اندھا دھند نیچے جانا مناسب ہوگا یا نہیں۔ اگر خاصا نیچے جانے کے بعد ہمیں ڈیڈ اینڈ ملا اور نیچے اترنے کا کوئی اور راستہ نہ ملا تو ہم اوپر بھی نہیں جا سکیں گے۔ دیکھا جائے تو ہم ایک ناقابل گزر راترائی کے دہانے پر تھے۔ ہزاروں فٹ تک سیدھی دیوار پر اترنا ناممکن حد تک مشکل کام تھا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ نیچے جانے والا راستہ ہمارے دائیں طرف ہے۔ اچانک رونی نے پریشانی سے کہا۔

''یہ رسی نیچے نہیں آ رہی ہے۔''

وہ بار بار ڈوری کو جھٹکا دے رہا تھا جو بڑی رسی کی گرہ کھول دیتی مگر بڑی رسی نیچے نہیں آ رہی تھی۔ رونی نے میری طرف دیکھا۔ ''کچھ مسئلہ ہے کیا میں اوپر جاؤں؟''

''یہ رسی ضروری ہے کیا؟''

''بالکل جناب یہ سو میٹرز لمبی ہے۔'' رونی نے کہا۔ ''اتنی لمبی صرف تین رسیاں ہیں آگے ان کی ضرورت ہوگی۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ اوپر خطرہ موجود تھا اور برفانی آدمی اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھے۔ پتا نہیں وہ کس تعداد میں وادی تک آئے تھے۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ وہ یہاں تک نہیں آئے ہیں مگر وہ یہاں بھی آچکے تھے۔ ممکن ہے وہ اوپری چھجا دریافت کر چکے ہوں۔ اس صورت میں رونی کے اوپر جانے میں خطرہ تھا۔ دوسری طرف ہمیں اس نامعلوم بلندی والی جگہ پر لازمی رسیوں کی ضرورت تھی۔ میں نے سر ہلایا۔ ''لیکن کسی خطرے کی صورت میں تم فوری نیچے آؤ گے۔''

رونی نے سر ہلایا اور رسی کی مدد سے اوپر جانے لگا۔ میں نے اپنے پاس موجود بیم ٹارچ نکال کر اس سے آس پاس دیکھا۔ اس کی لیزر کی طرح طاقتور بیم دھند کو چیر کر کچھ دور تک دکھا رہی تھی۔ میں دائیں طرف والی دیوار کا جائزہ لے رہا تھا اس چھجے سے کوئی بیس گز کے فاصلے پر ایک چھجا اور تھا اور یہ خاصا طویل تھا جہاں تک ٹارچ کی روشنی کام کر رہی تھی یہ چٹان کے ساتھ لگا ہوا نظر آ رہا تھا۔ راجا عمر دراز بھی دیکھ رہا تھا اور میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے منہ سے کچھ کہے بغیر اثبات میں سر ہلا کر میرے خیال کی تائید کی۔ مجھے خیال آیا کہ اوپر بندھی رسی کی مدد سے ہم اس چھجے تک جا سکتے تھے۔ دوسری صورت میں یہ کام مشکل ہو جاتا۔ میں نے خیال آتے ہی رونی کو آواز دی اور اپنی آواز بس اتنی رکھی کہ اس تک جائے۔ اس نے پوچھا۔ ''یس سر۔''

''ابھی رسی مت کھولو میں اس کی مدد سے دائیں طرف موجود ایک چھجے تک جا رہا ہوں۔ سب اس طرف چلے جائیں تب تم بھی اسی طرف آنا میری بات سمجھ گئے ہو۔''

"سمجھ گیا جناب۔"

میں نے رسی اپنے کلپ سے منسلک کی اور چھجے سے اتر کر چٹان سے چمٹ گیا اس میں پتھر ابھرے ہوئے تھے۔ اگر میرا ہاتھ یا پاؤں سلپ ہو جاتا تب بھی میں رسی سے بندھا ہوا تھا۔ اس لیے میں بے فکری سے مشکل جگہوں سے بھی گزرتا ہوا چند منٹ میں دوسرے چھجے تک پہنچ گیا۔ یہاں میں نے رسی باندھی اور اس کا بقیہ حصہ جانوس کی طرف اچھالا اس نے اسے اپنے چھجے پر باندھا اور اس کی مدد سے راجا عمر دراز میری طرف آ گیا۔ آخری چند گز اس نے میری مدد سے طے کیے۔ اس ذرا سی مشقت نے اسے ہانپنے پر مجبور کر دیا تھا اور اس کا چہرہ نیلگوں ہو رہا تھا۔ چھجے پر آتے ہی اس نے ان ہیلر نکالا اور منہ سے لگا کر چند لمبے سانس لیے۔ اس کے پیچھے جانوس رسی کھولتا ہوا آ گیا اور پھر میں نے رونی کو نیچے آنے کو کہا۔ مگر نہ تو وہ نیچے آیا اور نہ اس کی طرف سے جواب آیا۔

میں فکرمند ہو گیا۔ اگلی بار میں نے کسی قدر بلند آواز سے پکارا اور جواب میں کوئی ذرا دور دھند میں ہوتا ہوا نیچے گیا تھا۔ کوئی آواز نہیں آئی بس ایک جسم نیچے جاتا دکھائی دیا۔ فاصلہ اور دھند اتنی تھی کہ میں اسے ٹھیک طرح سے دیکھنے سے بھی قاصر رہا تھا۔ ویسے بھی لمحے میں گزر گیا تھا۔ اتنے میں رسی اچانک ہلی اور بری طرح تن گئی۔ میں نے چاقو نکال لیا اور رسی تھام لی۔ میری نظر اوپر لگی ہوئی تھی اور میں نے جانوس کو ہوشیار رہنے کو کہا تھا۔ اس نے رائفل کا رخ اوپر کر دیا۔ راجا عمر دراز ذرا پیچھے ہٹ گیا تھا۔ چاقو کی نوک رسی پر لگی ہوئی تھی اور جیسے ہی کوئی اوپر سے نمودار ہوا میرا ہاتھ تن گیا تھا مگر اس سے پہلے میں چاقو سے رسی کاٹتا میں نے رونی کو دیکھ لیا تھا۔ وہ رسی تھامے پھسلتا ہوا آ رہا تھا۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹا اور جانوس بھی پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس نے نیچے آتے ہی رسی کے ساتھ موجود باریک ڈوری کھینچی اور اوپر سے گرہ کھل گئی رسی لہراتی ہوئی نیچے آ گئی تھی۔

"کیا ہوا تھا؟"

"سوری میں آپ کو جواب نہیں دے رہا تھا وہ وہاں موجود تھے۔" اس نے ہانپتے اور رسی سمیٹتے ہوئے کہا۔ "ایک کو میں نے گردن میں چاقو مار کر نیچے پھینکا مگر وہ کئی تھے میں آواز نکالتا تو مارا جاتا۔ ایک کو مارتے ہی میں نیچے آ گیا۔"

اسی لمحے غراہٹ کی آواز آئی اور یہ دوسرے چھجے کی طرف سے آئی تھی جس سے ہم آئے تھے۔ وہ جگہ یہاں سے نظر نہیں آ رہی تھی میں نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور آگے بڑھا۔ ہم کوشش کر رہے تھے کہ کوئی آواز نہ نکالیں جس سے ہماری نشان دہی ہو سکے۔ جانوس سب سے آگے تھا اس کے پیچھے راجا عمر دراز، پھر رونی اور سب سے پیچھے میں تھا۔ جب وہ لوگ آگے نکل گئے تب میں نے چلنا شروع کیا مگر کچھ آگے جاتے ہی مجھے لگا کہ پیچھے کچھ سرگرمی ہو رہی ہے۔ میں رکا اور واپس آیا۔ میں نے پستول واپس رکھ کر رائفل شانے سے اتار لی۔ مجھے لگا دھند میں ذرا پیچھے کوئی حرکت کر رہا ہے۔ لیکن یہاں خلا تھا یہاں کون اس طرح حرکت کر سکتا تھا۔ مگر جلد ہی سانس لینے کی حیوانی آوازوں نے واضح کر دیا کہ یہاں کون تھا۔ وہ ایک برفانی آدمی تھا جو دونوں چھجوں کے درمیان چٹان میں ابھرے پتھروں کو پکڑتا ہوا اس طرف آ رہا تھا۔

اس کا وجود نمایاں ہوتے ہی میں نے برسٹ مارا اور اس کی ٹانگوں کا نشانہ لیا۔ اس کا فوری ردعمل ہوا اور اس نے بھیانک سی آواز نکالی اور نیچے گر گیا۔ اس کے پیچھے ایک اور تھا اور وہ خطرہ بھانپ کر واپس جانے لگا مگر اب میں اسے کہاں جانے دیتا میں نے اسے بھی مار گرایا۔ میں نے دیکھا تھا کہ ان کے جسم کو نشانہ بنایا جائے تو وہ اتنی جلدی نہیں مرتے تھے۔ ان کے سر کو نشانہ بنانا ضروری تھا اور یہاں میں نے ان کو گرانے کے لیے ان کے پیروں کو نشانہ بنایا۔ دونوں بار یہ تدبیر کارگر رہی۔ دوسرے کو گرانے کے بعد میں کچھ دیر انتظار کرتا رہا کہ اس کے پیچھے کوئی اور آ رہا ہے تو اسے بھی نشانہ بناؤں۔ مگر اس کے پیچھے اگر کوئی تھا تو وہ واپس جا چکا تھا یا چھجے سے اترا ہی نہیں تھا۔ رونی عقب سے آیا۔ اس نے سہمے لہجے میں پوچھا۔ "وہ پیچھے آ رہے ہیں؟"

"اب نہیں آ رہے۔" میں نے رائفل شانے سے لٹکائی۔ اسی لمحے اوپر سے ایک خاصا بڑا پتھر میرے بالکل پاس سے گزرا۔ چھجے کے کنارے سے ٹکرایا اور نیچے چلا گیا۔ میں بال بال بچا تھا۔ میں اور رونی بے ساختہ دیوار سے چپکے اور پھر چپکے چپکے آگے سرکنے لگے۔ یہاں کھڑے ہو کر گفتگو کرنا ہماری غلطی تھی۔ آواز پر اوپر سے پتھر پھینکا گیا۔ میں اور رونی آگے سرک رہے تھے اتنے میں مزید پتھر آئے مگر وہ سب دور رہے تھے۔ کچھ آگے جانے کے بعد ہم نے تیزی سے سفر شروع کیا۔ مگر میرے ذہن میں خدشہ تھا۔ برفانی آدمی جان گئے تھے کہ ہم کہاں تھے؟ اور وہ ایسی مشکل جگہوں کے عادی تھے اور ہماری نسبت یہاں بہت تیزی

سے سفر کر سکتے تھے۔ ان سے صرف ایک صورت میں ہماری بچت تھی کہ ہم ان سے دور رہیں۔ جانوس اور راجا عمر دراز ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہمارے آتے ہی وہ آگے چل پڑے۔ یہ چھجا خاصا طویل ثابت ہو رہا تھا۔ تقریباً دو سو گز کے بعد اس کا ایک حصہ گرا ہوا تھا مگر اسے پار کرنا مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد دوبارہ سفر شروع ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ چھجا نیچے کی طرف جا رہا ہے اور اب ہم وادی کے کنارے سے خاصا نیچے آ گئے تھے۔ یہاں دھند گہری ہوتی جا رہی تھی۔ ہمیں آگے بڑھنے کے لیے پہلے نیچے دیکھنا پڑتا تھا۔ سب نے ٹارچ نکال لی تھیں اور اس کی روشنی میں آگے بڑھ رہے تھے۔ چھجے کا ٹوٹا حصہ عبور کرنے کے بعد میں نے راجا عمر دراز سے مختصر میٹنگ کی تھی اور میں نے اسے اپنا خیال پیش کیا کہ شاید ہم اسی سمت میں سفر کر رہے تھے جس طرف نیچے جانے کا راستہ تھا اور اس نے مجھ سے اتفاق کیا خود اس کا بھی یہی خیال تھا۔ جانوس اور رونی وہی کر رہے تھے جو میں کہہ رہا تھا۔

ایک گھنٹے بعد ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں ایک بڑی چٹان راستے میں حائل تھی اور اس کے دوسری طرف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ رونی نے دیوار میں کیل گاڑھی اور رسی سے نیچے لٹک کر جھولتے ہوئے چٹان کے دوسری طرف جانے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر چٹان نہ صرف بڑی بلکہ چکنی اور ہموار تھی اس پر ہاتھ پاؤں جمانے کی جگہیں بہت کم تھیں۔ رونی نے مجھ سے کہا۔ ”مجھے مزید نیچے جانا ہوگا۔“

”اگر تمہیں مشکل پیش نہ آئے تو یہ کر کے دیکھو۔“

”بات مشکل کی نہیں ہے ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔“ اس نے کہا اور نیچے جانے لگا۔ اسے کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں سے وہ اس چٹان کے دوسری طرف جا سکے۔ راجا عمر دراز جو ذرا پیچھے تھا اس نے مجھے متوجہ کیا۔ ”یہ آواز کیسی ہے؟“

میں اس کے پاس آیا تو ایسا لگا جیسے دیوار کے اندر پانی بہہ رہا ہو۔ شاید یہاں چٹانوں کے اندر کوئی چشمہ تھا۔ میں کان لگا کر سن رہا تھا کہ پانی کی رم ترم میں عجیب سی چیخنے جیسی آواز بھی شامل ہو گئی۔ جلد مجھے اندازہ ہو گیا کہ چیخنے کی آواز اوپر سے آ رہی تھی اور ہمارے نزدیک آ رہی تھی۔ میں نے راجا کو پیچھے کھینچا اور ہم راستے پر ابھری چٹان سے لگ گئے۔ چنچناہٹ کی آوازیں بہت زیادہ اور بلند بھی تھیں ایسا لگ رہا تھا کہ اوپر سے بندر نما جانوروں کا پورا جھنڈ آ رہا ہے اور ایسا ہی تھا۔ چند لمحے بعد اوپر سے چلانگیں لگاتے اور تقریباً سیدھی دیوار پر چہل قدمی کرتے بندر گزر کر نیچے جانے لگے۔ ان کی تعداد درجنوں میں تھی۔ ان میں سے کچھ چھجے پر بھی رکے مگر پھر تیزی سے نیچے چلے گئے۔ شاید یہ وہی جھنڈ تھا جس نے برفانی آدمی کو مار گرایا تھا اور اسے کھا پی گئے تھے۔ ان کی آوازوں میں ایک پیٹ بھرا خوش کن تاثر تھا۔

بندر ہم سے کچھ فاصلے سے گزر رہے تھے۔ شاید جہاں ہم کھڑے تھے وہاں گزرنے کا راستہ نہیں تھا مگر میرا خیال اس وقت غلط ثابت ہوا جب ایک بندر سیدھا میرے سر پر نازل ہوا۔ جتنی غیر متوقع اس کی آمد تھی۔ اتنی غیر متوقع اس کے لیے یہاں میری موجودگی ثابت ہوئی تھی۔ وہ میرے سر پر گرا اور میرا سر ہلا تو وہ ہوا میں اچھلا اور سیدھا خلا میں گیا تھا۔ اس نے نیچے گرتے ہوئے عجیب سی آواز نکالی۔

اس سے پہلے کہ اس کی آواز دوسروں کو متوجہ کرتی وہ غائب ہو چکا تھا۔ مگر ایک بندر کو اس کی آواز نے متوجہ کیا تھا اور وہ چھجے پر ہم سے چند گز کے فاصلے پر رکا ہوا تھا اور کان گھما گھما کر گویا سن گن لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان بندروں کی آنکھیں زیادہ بڑی نہیں تھیں اس کا مطلب تھا کہ ان کی نظر زیادہ تیز نہیں تھی مگر ان کے کانوں کی ساخت بتا رہی تھی کہ وہ آواز سن لیتے تھے اور شاید معمولی سی آواز بھی سن سکتے تھے۔ میں نے سانس روک لی۔

راجا عمر دراز سانس نہیں روک سکتا تھا بلکہ وہ سانس تیزی سے اور کسی قدر شور والے انداز میں لے رہا تھا۔ اس وقت مجھے رک جانے والے بندر سے زیادہ رونی کی فکر تھی جو نیچے گیا تھا اور بندر بھی نیچے جا رہے تھے اسے دیکھ لیتے تو اس کی عافیت خطرے میں پڑ جاتی۔ پھر بندر نے شاید راجا عمر دراز کی سانس کی آواز سن لی اور وہ تفتیش کے لیے اس طرف آیا میں نے دل ہی دل میں اس کے جذبہ تجسس کو نامناسب الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔ نزدیک آ کر اس نے منہ اٹھا کر سونگھا۔ اب غالباً اسے ہماری بو بھی آ رہی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ چلا کر اپنے ساتھیوں کو خبردار کرتا میں نے اچانک پاؤں اٹھا کر اسے دبا دیا۔ اتفاق سے میرا پاؤں سیدھا اس کی گردن پر آیا تھا اور وہ بھنچی ہوئی چیں چیں کی آواز نکالتے ہوئے خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا مگر یہ اس کے لیے ممکن نہیں تھا اس کی چیں چیں سے خوفزدہ ہو کر میں پورا ہی اس پر کھڑا ہو گیا اور منٹ سے بھی پہلے اس کا دم نکل گیا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر دور اچھال دیا تا کہ اس کی لاش بہت نیچے جائے اس کے بھائی بندوں کو نہ مل

جائے۔ بندروں کا جھنڈ نیچے جا چکا تھا۔

اس طرف سے اطمینان کے بعد میں نے رسی کو جھٹکا دے کر رونی سے پوچھا اور اس نے جھٹکا دے کر اوکے کا اشارہ کیا۔ وہ ذرا دیر بعد اوپر آیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اس نے سانس درست کرتے ہوئے کہا۔ ''پتا نہیں کیسے بچا وہ میرے پاس سے گزر رہے تھے۔''

''یہاں بھی پاس سے گزرے ہیں بلکہ دو تو جان بھی گئے تھے۔''

رونی چونکا۔ ''وہ کہاں ہیں۔''

''نیچے گئے۔'' میں نے اشارہ کیا۔ ''یہ بتاؤ کہ راستہ ملا؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں لیکن بہت نیچے جا کر ہے اور وہاں سے اوپر جانا بھی ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں، جانوس اور آپ شاید چلے جائیں مگر......'' اس نے راجا عمر دراز کی طرف دیکھا۔ ''ان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ بہت دشوار چڑھائی ہے۔''

میں بھی سمجھ رہا تھا کہ راجا عمر دراز کے لیے اس قسم کی کوہ پیمائی ممکن نہیں تھی۔ مگر میرے ذہن میں ایک طریقہ آ گیا تھا۔ ''اگر نیچے سے اوپر جا کر رسی باندھی جائے تب ممکن ہے؟''

''ہاں تب ممکن ہے۔''

''تب تم جاؤ اور رسی دوسری طرف باندھو۔''

رونی تھکا ہوا تھا مگر وہ سر ہلاتا ہوا نیچے اتر گیا۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ یہ ہمارے لیے موقع تھا کہ سستا لیں۔ ہم نے سامان میں کھانے پینے کی ایسی چیزیں رکھی تھیں جو تیار تھیں اور جنہیں فوری استعمال کیا جا سکتا تھا میں نے ایک چاکلیٹ نکالی، جانوس کولڈ ڈرنک پی رہا تھا۔ البتہ راجا عمر دراز اپنی دواؤں والا بیگ کھولے بیٹھا ہوا تھا اور اس میں سے اپنے لیے ڈوز نکال رہا تھا۔ یہ کوئی نصف درجن مختلف سائز کی گولیاں اور کیپسول تھے جنہیں اس نے انرجی ڈرنک کی مدد سے حلق سے اتار لیا۔ پھر وہ وہیں لیٹ گیا۔ میں فکر مند ہوا کہ شاید اس کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ ''آپ کی طبیعت ٹھیک ہے۔''

''ہاں یہ دوائیں لینے کے بعد دس پندرہ منٹ آرام کرنا ہوتا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ویسے میں تھکا ضرور ہوں لیکن پھر بھی بہتر محسوس کر رہا ہوں۔ بالآخر میں اس جگہ کے پاس ہوں جہاں آنے کے خواب میں برسوں سے دیکھتا رہا ہوں۔''

''آپ کچھ عرصے پہلے وادی تک آئے تھے۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔ اس نے سر ہلایا۔

''لیکن میں نیچے نہیں جا سکا تھا۔''

''اب آپ جا سکیں گے؟''

''ہاں کیونکہ میں نے برف والے کی شرط پوری کر دی ہے۔'' راجا عمر دراز نے مسرور لہجے میں کہا۔ ''اب میں نیچے جا سکوں گا۔''

''فی الحال تو ہمیں وادی میں اترنے والا راستہ تلاش کرنا ہے اور دیکھا جائے تو ابھی ہم راستے میں ہیں۔''

''مجھے یقین ہے کہ راستہ مل جائے گا۔'' اس نے یقین سے کہا۔ ''تم ساتھ آئے تو سب راستے کھل جائیں گے اور سب راستے مل جائیں گے۔''

میں مسکرا کر رہ گیا۔ اب میں اس کی باتوں کو بچکانہ نہیں لے رہا تھا مگر اب بھی اس کی بعض باتوں کو مبالغہ آمیز ضرور سمجھ رہا تھا۔ وہ مجھے ہر تالے کی چابی سمجھ رہا تھا۔ جب کہ میں ایسا نہیں سمجھ رہا تھا۔ رونی کو گئے ہوئے بیس منٹ ہونے کو آئے تھے کچھ دیر بعد رسی اوپر کی سمت آنے لگی۔ وہ کھینچ کر چٹان کے متوازی ہو رہی تھی یعنی رونی چٹان کے دوسری طرف جانے کے بعد اوپر چڑھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد رسی کو جھٹکا لگا۔ میں نے جوابی جھٹکا دیا۔ رسی دوسری طرف باندھی جا چکی تھی۔ میں نے راجا عمر دراز سے کہا۔ ''اب آپ کو ہمت کرنا ہوگی۔ دوسری طرف جانے کے لیے۔''

اس نے سر ہلایا اور اپنا کلپ رسی سے منسلک کیا۔ رسی دوسری طرف کسی قدر نیچے تھی اس لیے جب اس نے خلا میں قدم رکھا تو خود بہ خود آگے جانے لگا۔ ساتھ ہی وہ ہاتھوں سے چٹان کے سہارے خود کو آگے بڑھا رہا تھا۔ ایک منٹ میں وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ راجا عمر دراز دوسری طرف پہنچا تو رسی خود بہ خود ڈھیلی ہو گئی اور رونی نے جھٹکا مارا۔ اب میں نے جانوس کو جانے کا اشارہ کیا اور کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ وہ رسی پکڑتا اور لٹکتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔ اس کے بعد میری باری تھی۔ میں نے رسی سے کلپ باندھا اور خلا میں جاتے ہی تیزی سے آگے بڑھا تھا۔ چٹان کی رگڑ سے بچنے کے لیے میں ہاتھوں کا سہارا لے رہا تھا اور اس وجہ سے میں ذرا گھوما اور میں نے عقب میں دھند سے چھجے پر ایک ہیولہ برآمد ہوتے دیکھا۔

اس کی قامت بتا رہی تھی کہ وہ برفانی آدمی تھا اور اس نے آتے ہی رسی پکڑ لی۔ مجھے جھٹکا لگا۔ وہ رسی کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر میں رکا نہیں کیونکہ میں کلپ کی مدد سے

آگے پھسل رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے میں گھوم کر چٹان کے دوسری طرف جا چکا تھا۔ اب برفانی آدمی رسی توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے رسی کو لگنے والے جھٹکوں سے ہوا۔ مگر رسی بہت مضبوط تھی۔ اللہ نے مجھے عقل دی اور میں نے فوراً ہی رسی کو اپنے پکڑنے والے کلپ سے باندھ لیا۔ مجھے خیال آیا کہ برفانی آدمی رسی توڑنے میں ناکامی کے بعد کیا کرے گا اور اس نے ایسا ہی کیا۔ اس نے رسی توڑنے میں ناکامی کے بعد وہ کیل نکال دی جس سے رسی بندھی تھی اور کیل نکلتے ہی میں تیزی سے نیچے گیا۔

میں اتنی تیزی سے نیچے گیا تھا کہ ایک لمحے کو میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ مجھے لگا کہ میں نیچے گر رہا ہوں۔ چند گز نیچے جاتے ہی مجھے جھٹکا لگا اور میں چٹان سے ٹکرایا۔ سر بچانے کے چکر میں میرے ہاتھوں کو ضرب سہنا پڑی تھی۔ پھر پھسلتا ہوا نیچے جانے لگا۔ میری جیکٹ چٹان سے رگڑ کھا رہی تھی اور میں اپنا جسم بچا رہا تھا۔ بدقسمتی سے یہاں چٹان نہایت کھردری تھی۔ اس کے حصے سے رگڑ کھا کر میری جیکٹ جواب دے گئی ایک طرف شانے اور بازو کا حصہ پھٹ گیا۔ میں پاؤں اڑا کر خود کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر آخری جھٹکے نے مجھے ہوا میں معلق کر دیا اور میں چٹان سے دور ہو کر جھولنے لگا۔ چند لمحے تو ہوش بحال ہونے میں لگے۔ رونی کی آواز نے مجھے چونکایا اور میں نے اوپر دیکھا۔ وہ پوچھ رہا تھا۔ ''آپ ٹھیک ہیں؟''

''ہاں تم نے کیل صحیح سے ٹھونکی تھی۔'' میں نے کہا اور اوپر جانے لگا۔ گرپ کرنے والا کلپ اس قسم کا ہوتا ہے کہ اس میں رسی ایک طرف آسانی سے حرکت کرتی ہے اور دوسری طرف صرف کلپ کی گرفت کم کرنے پر چھوٹتی ہے۔ میں آرام سے اوپر پہنچ گیا۔ پہلے ایک ڈھلان تھی اور اس کے بعد اوپر چھجا اسی طرح کا تھا جیسا چٹان کے دوسری طرف تھا۔ میں ڈھلان سے اوپر آیا اور رسی سے کلپ الگ کیا۔ رونی نے پوچھا۔

''رسی کیسے نکل گئی؟''

''نکلی نہیں نکالی گئی ہے۔ وہ بدبخت اس چھجے تک چلے آئے ہیں۔'' میں نے کہا تو ان لوگوں کے چہرے سفید پڑ گئے۔ راجا عمر دراز نے کہا۔

''انہوں نے پیچھا نہیں چھوڑا؟''

''یہ نہایت ضدی اور سفاک مخلوق ہے۔'' میں نے اپنی پھٹ جانے والی جیکٹ کا جائزہ لیا۔ اس کا اوپری پیراشوٹ پھٹ گیا تھا اور اندر کا گرم میٹریل جھانک رہا تھا۔ رونی نے اس کا جائزہ لیا اور سامان سے ٹیپ نکال کر پھٹ جانے والے حصوں پر لگا دیا تاکہ اندر کا گرم حصہ محفوظ رہے۔ یہاں چھجا زیادہ ترچھا ہو کر نیچے جا رہا تھا اور خاصا تنگ بھی تھا۔ راجا عمر دراز نے توجہ دلائی۔

''کہیں ہم نیچے جانے والے راستے پر تو نہیں آگئے ہیں۔''

''شاید ایسا ہی ہے مگر اس پر کہیں اس قسم کی چٹان نظر نہیں آئی۔''

''ہو سکتا ہے کسی وجہ سے چٹان کے ساتھ والا حصہ نیچے گر گیا ہو۔''

میں نے چٹان دیکھی تھی اور مجھے اس میں ٹوٹ پھوٹ نظر نہیں آئی تھی۔ مگر میں نے راجا عمر دراز کی بات کو رد نہیں کیا۔ ''آگے چل کر پتا چل جائے گا۔''

''برفانی آدمی پیچھے آئے گا۔'' رونی بولا۔

یہ خدشہ میرے ذہن میں بھی تھا۔ وہ اب تک جس مستقل مزاجی سے ہمارے پیچھے لگے ہوئے تھے لگ رہا تھا کہ اتنی آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ جہاں تک درمیان والی چٹان کا تعلق تھا۔ اسے عبور کرنا برفانی آدمیوں کے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا۔ وہ نہایت آسانی سے نیچے جا کر دوبارہ اوپر چڑھ سکتے تھے جیسا کہ رونی نے کیا تھا۔ اس خدشے کے ساتھ ہم آگے روانہ ہوئے۔ نیچے آنے کے بعد ہم نے چھجے پر ہی خاصا سفر کیا تھا اور ہم خاصا نیچے بھی آگئے تھے۔ یہاں چھجا تنگ اور کھردرا تھا جیسے اس کے حصے موسم کا شکار ہو کر نیچے گرتے رہے ہوں۔ بعض جگہوں پر پاؤں رکھتے تو وہاں سے پتھر اور مٹی گرتی تھی۔ اس لیے ہم کنارے والے حصوں پر قدم رکھنے سے گریز کر رہے تھے۔ میں راجا عمر دراز کے پاس تھا کہ کسی موقع پر اسے ضرورت ہو تو سہارا دے سکوں۔ مگر ابھی تک اسے ضرورت نہیں پڑی تھی وہ نہایت ہمت سے چل رہا تھا۔

دیکھا جائے تو راجا عمر دراز کی مہم تباہی سے دوچار ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ آنے والے تین چوتھائی افراد موت کی نیند سو چکے تھے۔ صرف رونی اور جانوس بچے تھے۔ میں اس کے ساتھ نہیں آیا تھا۔ اتنے افراد کے ساتھ واپس جانا آسان نہیں تھا جب کہ راستے میں برفانی آدمی جیسا خطرہ بھی موجود تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ نیچے اترنے والے راستے پر موجود ڈیوڈ شا اینڈ پارٹی پر کیا گزری ہوگی۔ یہ تو یقینی تھا کہ برفانی آدمی اصل میں ان کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں آئے تھے۔ انہوں نے ان پر حملہ کیا ہوگا۔ ابھی ہم ذرا ہی

نیچے گئے ہوں گے کہ اچانک اوپر سے چند بوندیں ٹپکیں۔ اس سے پہلے کہ ہم سنبھلتے اچانک ہی نہایت تیز بارش شروع ہوگئی۔ ہم نے افراتفری میں سامان سے برساتیاں نکال کر پہنیں۔ ویسے ہمارے لباس پیراشوٹ کے تھے جو تقریباً واٹر پروف ہوتے ہیں اس کے باوجود ہم تھوڑے بہت بھیگے تھے۔ بارش کے ساتھ ہی موسم سرد ہوگیا اور ہم عادی ہونے تک لرزا ٹھے تھے۔

جب ہم نے برساتی پہن کر آس پاس دیکھا تو حیران رہ گئے۔ بارش کے ساتھ ہی دھند نہایت تیزی سے غائب ہونے لگی تھی۔ پہلے قریب کے مناظر دکھائی دیئے اور اس کے بعد دور دور تک دکھائی دینے لگا۔ منظر ایسا ہی تھا جیسا شدید بارش میں دکھائی دیتا۔ یہ نہایت حیرت انگیز منظر تھا جس میں وادی دور تک پھیلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ گہرائی میں رنگ غالب تھے۔ جہاں سبزہ تھا وہاں سبز رنگ غالب تھا اور جہاں آبادی تھی یا خالی زمین تھی تو وہاں بھورا اور سفید رنگ نمایاں تھا۔ وادی کی ننگی دیواریں پہلی بار نمایاں تھیں۔ ان پر کئی ہزار فٹ کے بعد سبز رنگ شروع ہوا تھا۔ ورنہ سرخ، سفید، سرمئی اور بھورے رنگ نمایاں تھے۔ اوپر آسمان پر گہرے بادل تھے۔ ہم جس چھجے پر تھے اس کے نیچے کئی ہزار فٹ تک صرف چٹانیں تھیں اور بارش کی وجہ سے چند سوفٹ بعد جو منظر واضح دکھائی دے رہا تھا۔ اس میں تفصیلات واضح نہیں تھیں اس لیے ہم نہیں کہہ سکتے تھے کہ یہ چھجا کہاں تک جارہا تھا؟

"میرا خیال ہے ہمیں بارش ختم ہونے تک رکنا چاہیے۔" راجا عمر دراز نے کہا۔ "اس وقت سفر کرنا مناسب نہیں ہوگا۔"

مگر میرا خیال کچھ اور تھا اس وقت ہم آنکھوں سے دیکھ کر کوئی مناسب جگہ یا نیچے جانے والا راستہ تلاش کر سکتے تھے۔ کیونکہ جیسے ہی بارش رکتی دھند دوبارہ مسلط ہو جاتی اور حد نظر محدود ہو جاتی۔ میں نے راجا عمر دراز کے سامنے اپنا نقطہ نظر بیان کیا اور دوبارہ سفر کے لیے اصرار کیا۔ راجا عمر دراز مان گیا۔ "یو آر دی باس۔"

"یہ آپ کا بڑا پن ہے ورنہ بہر حال باس آپ ہی ہیں۔"

"نہیں رہنمائی وہی کرتا ہے جو اس کا اہل ہوتا ہے اور جو خطرہ مول لینا جانتا ہو۔ جیسا کہ تم کر رہے ہو۔ تمہاری جگہ میں باس ہوتا تو اس وقت سفر نہ کرنے کا فیصلہ کرتا۔"

ہم بارش سے گیلے چھجے پر احتیاط سے سفر کرنے لگے۔ میں نے عقب میں بھی دیکھ لیا تھا کہ اگر کہیں برفانی آدمی موجود ہوں تو ہم انہیں دیکھ سکیں مگر جہاں تک نظر کام کرتی تھی کوئی ایسی چیز حرکت کرتی یا ساکت نظر نہیں آئی جسے برفانی آدمی کہہ سکتے۔ جب آگے بڑھنے لگے تو دھیان ہر طرف سے ہٹ کر راستے پر آگیا۔ جب تک دھند تھی تو ہمیں علم نہیں تھا کہ ہم کس ہیبت ناک بلندی پر ہیں۔ یہاں سے نیچے دیکھنا ہی دل گردے کا کام تھا۔ سفر کرنا زیادہ دشوار تھا۔ مگر ہمیں سفر کرنا ہی تھا۔ راجا عمر دراز کے پاس اعلیٰ درجے کی طاقتور دوربین تھی وہ وقفے وقفے سے رک کر دوربین آنکھوں سے لگاتا اور آس پاس کا جائزہ لیتا تھا۔ ایک بار اس نے آنکھوں سے دوربین لگائی اور بولا۔

"میرا خیال ہے مجھے نیچے جانے والا راستہ مل گیا ہے۔"

اس نے اشارے سے بتایا اور دوربین میری طرف بڑھائی۔ میں نے آنکھوں سے لگا کر دیکھا۔ واقعی تقریباً نصف کلومیٹر دور ایک راستہ نیچے کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے جاننے کی کوشش کی کہ اس چھجے سے وہاں تک رسائی کا راستہ کہاں سے گزر رہا ہے مگر مجھے ناکامی ہوئی۔ درمیان میں کچھ ایسی جگہیں دکھائی دیں۔ جہاں سے راستہ غیر واضح تھا۔ ان میں وادی کی دیوار پر بنا ہوا ایک پیالہ نما بھی تھا۔ میں نے اس پیالے نما جگہ کی طرف اشارہ کیا۔ "میرا خیال ہے ہمیں وہاں تک جانا ہوگا وہاں سے راستہ واضح ہوگا۔"

یہ پیالہ رکھا ہوا نہیں تھا بلکہ دیوار پر بنا ہوا تھا اور وہاں سے راستہ غیر واضح تھا۔ ہم پھر سفر کرنے لگے۔ اتفاق سے اس وقت بھی میرے پاس گھڑی نہیں تھی اور مجھے رونی سے وقت پوچھنا پڑا اس نے بتایا کہ دوپہر کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ گویا ہمیں سفر کرتے ہوئے تین گھنٹے کا وقت گزر چکا تھا مگر ابھی تک ہم وادی میں اترنے والے راستے پر بھی نہیں آئے تھے۔ راجا عمر دراز کے مطابق وادی کی تہہ سے اوپر چڑھنے یا وادی کے اوپر سے نیچے اترنے میں پورا دن لگتا ہے۔ لیکن اوّلین مرحلہ برف والے کے ڈیرے تک رسائی کا تھا۔ پیالے نما جگہ تک جانے کا چھجا اب اوپر چڑھ رہا تھا۔ ساتھ ہی یہ تنگ بھی ہوتا جا رہا تھا۔ کئی جگہوں سے ہمیں دیوار سے چپک کر چلنا پڑا تھا کیونکہ پشت پر بندھے بیگز کی وجہ سے ہم دیوار سے پشت بھی نہیں لگا سکتے تھے۔ صرف راجا عمر دراز پشت لگا سکتا تھا کیونکہ اس نے کچھ بھی نہیں لیا تھا۔

میرا خیال ہے نیچے دھند چھٹنے کی ایک وجہ تو بارش تھی

اور دوسرے چونکہ اوپر بادل آ گئے تھے اور بلندی یا خلا سے یہ وادی نظر نہیں آتی اس لیے بھی دھند غائب ہو گئی تھی۔ اگرچہ یہ ایک تخیل تھا کہ صرف وادی کو دنیا کی نظروں سے بچانے کے لیے یہ دھند آتی اور غائب ہوتی تھی۔ یہ خودکار نظام تھا جو زمینی عوامل کی وجہ سے ہوتا تھا۔ اس میں کسی انسانی یا روحانی طاقت کا دخل نہیں تھا۔ بارش جیسے اچانک شروع ہوئی تھی اسی طرح اچانک رک گئی اور اوپر موجود بادل چھٹنے لگے۔ ایک طرف سے بادل کچھ چھٹے تو عقب سے سورج کی شعاعیں ہم تک آنے لگیں۔ سورج بالکل اوپر تھا اس لیے اس کی روشنی نیچے تک گئی تھی اور نیچے سے کسی چیز کی چمک یہاں تک محسوس ہوئی تھی۔ راجا عمر دراز نے اشارہ کیا۔ ”یہ اہرام نما عمارت کا اوپری حصہ ہے جو سونے جیسے رنگ کی ہے۔“

سورج مشکل سے چند منٹ کے لیے نکلا تھا اور فوراً ہی نیچے سے دھند کا ریلا اوپر چڑھنے لگا۔ اس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے نیچے وادی والا حصہ مکمل طور پر چھپ گیا اور اب وہاں بادل جیسے چھائے ہوئے تھے۔ اس کے بعد دھند نے اوپر کا رخ کیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”جلدی چلو اس سے پہلے کہ دھند منظر غائب کر دے۔“

ہم تیزی سے پیالے کی طرف بڑھے لیکن اس کے پاس جانے سے پہلے ہی ہمارے آس پاس کا ماحول دھندلانے لگا تھا۔ صرف وادی کی تہ سے ہی نہیں بلکہ دیواروں پر موجود نمی بھی تیزی سے دھند میں بدل رہی تھی۔ ورنہ صرف نیچے سے دھند کا اتنی جلد اوپر آنا ممکن نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ منظر مکمل طور پر دھندلا جاتا اچانک آگے جانے والے رونی نے گھگھیائی آواز میں کہا۔ ”برفانی آدمی۔“

”کہاں؟......“

”کدھر......؟“

مختلف آوازیں بے ساختہ بلند ہوئیں۔ مگر رونی کے بتانے سے پہلے میں نے دیکھ لیا تھا۔ وہ تین برفانی آدمی تھے جو تقریباً چار سو گز نیچے ڈھلان سے اوپر چڑھ رہے تھے اور ان کا رخ ہماری طرف تھا اس کا مطلب تھا انہوں نے ہمیں دیکھ لیا تھا اور اسی وقت دیکھا تھا جب بارش نے دھند کو تحلیل کر دیا تھا۔ میرا اور سب کا خدشہ درست نکلا تھا انہوں نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا تھا اور مستقل مزاجی سے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ اب انہوں نے ہمیں دیکھ بھی لیا تھا۔ میں نے رفتار تیز کرنے کو کہا اور خود بھی جلدی قدم اٹھانے لگا۔ ایک منٹ سے بھی پہلے دھند نے برفانی آدمیوں کو ڈھانپ لیا تھا اور اب وہ نظر نہیں آ رہے تھے۔ پیالہ نما جگہ کوئی دو سو گز دور رہ گئی تھی۔ جب تک برفانی آدمی نظر آتے رہے میں ان کی اوپر چڑھنے کی رفتار دیکھتا رہا اور مجھے لگا کہ وہ اتنی ہی رفتار سے اوپر آ رہے ہیں جتنی رفتار سے ہم اس جگہ پر سفر کر رہے تھے۔

ہم پیالہ نما جگہ ان سے پہلے پہنچ سکتے تھے مگر وہاں سے آگے جانے کا کوئی راستہ نہ ہوتا تو ہم وہیں ٹریپ ہو جاتے اور ہمیں برفانی آدمیوں سے مقابلہ کرنا پڑتا اور اس میں کہنا مشکل تھا کہ کون بچے گا اور کون نہیں۔ دس منٹ بعد ہم پیالے نما جگہ کے کنارے تھے اور یہاں آتے ہی ایک حیرت انگیز چیز سامنے آئی۔ دیوار کے گھومتے ہوئے پیندے والے حصے سے ذرا دور پتھر کا ایک معلق پل تھا جو پیالے کے اگلے حصے تک جا رہا تھا اور وہاں سے وادی میں نیچے جانے والے راستے تک اترنے تک رسائی ممکن تھی۔ ہمیں اس معلق پل کو عبور کرنا تھا مگر وہ دیکھنے میں ہی نہایت مخدوش لگ رہا تھا۔ اوپر سے آنے والی بارش اور شاید سنگ باری نے بھی اس پل کے دونوں طرف موجود حصوں کو اڑا دیا تھا اور درمیان میں بھی جو پتھر بچا تھا اس میں بھی جا بجا دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ مگر یہ پل اسی وجہ سے وجود میں آیا تھا۔ ایک منٹ میں ہم گھوم کر پل کے سامنے جا پہنچے تھے۔ اس کے نیچے لامتناہی خلا تھا۔

”یہ تو دیکھنے میں ہی خطرناک لگ رہا ہے۔“ راجا عمر دراز نے تشویش سے کہا۔

”مگر دوسری طرف جانے کا یہی ایک راستہ ہے۔“ میں نے نیچے دیکھا۔ ”اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔“

”میں پہلے جاتا ہوں۔“ رونی نے ہمت کر کے کہا۔ اس نے پہلے اس طرف ایک رسی باندھی اور اسے اپنی بیلٹ سے منسلک کر کے پل پر قدم رکھا۔ یہ دو ڈھائی فٹ سے زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ وہ محتاط قدموں سے چلتا ہوا تقریباً پچاس فٹ چوڑے پل کو عبور کر کے دوسری طرف چلا گیا اور رسی اپنی بیلٹ سے کھول دی۔ میں نے نوٹ کیا کہ پل مخدوش تھا اور رونی کے سفر کے دوران میں اس کے کچھ حصے حرکت بھی کر رہے تھے مگر وہ بہرحال قابل گزر تھا۔ اس کے بعد راجا عمر دراز گیا اور اس نے بھی خیریت سے اسے کراس کر لیا۔ جانوس مجھے کہہ رہا تھا مگر میں نے اسے جانے کو کہا۔ میری توجہ اب نیچے سے آنے والے راستے پر تھی۔ برفانی آدمی اسی سمت سے آ سکتے تھے۔ مگر ابھی تک ان کی آمد کے

آثار نظر نہیں آئے تھے۔ جانوس دوسری طرف گیا اور اس نے مجھے آواز دی تو میں چونکا اور میں نے رائفل شانے سے لٹکا کر پل پر قدم رکھا تو ایک لمحے کے لیے مجھے ڈولتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ شاید کئی لوگوں کے چڑھنے سے پتھر اپنی جگہ چھوڑ رہے تھے۔ میں کچھ دیر کے لیے ساکت ہو گیا اور جب پل ہلنا بند ہو گیا تو میں احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ اچانک رونی چلایا۔

''اپنے پیچھے دیکھیں۔''

اس سے پہلے میں مڑ کر دیکھتا مجھے جھٹکا لگا اور میں پیچھے گرا تھا۔ پشت کے بل گرتے ہوئے میں نے خود کو نہ جانے کیسے نیچے گرنے سے بچایا۔ میرے ہاتھ پتھروں سے چمٹ گئے تھے۔ جس رسی سے میں منسلک تھا وہ کھنچ رہی تھی۔ میں نے سر گھما کر دیکھا تو ایک برفانی آدمی رسی پکڑ کر کھینچتا دکھائی دیا۔ میں نے پستول نکالا اور اسی طرح اس کی طرف کر کے گولی چلائی۔ دھماکے کے ساتھ وہ جھٹکے سے پیچھے گیا تھا اور رسی اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ رسی پر دباؤ ختم ہوا تو موقع غنیمت جان کر میں جلدی سے کھڑا ہوا۔ پل ایک بار پھر واضح طور پر ڈولا تھا۔ میں نے رسی کلپ سے نکالنے کا سوچا مگر اس طرح مخدوش ہو جانے والے پل پر رسی نکالنا بھی درست نہیں لگا تھا اگر یہ ٹوٹ جاتا تو رسی ہی تو تھی جو مجھے نیچے گرنے سے بچاتی۔ برفانی آدمی گولی کھا کر پیچھے گیا تھا مگر وہ پھر آگے آیا اور اس نے ایک بار پھر رسی تھام لی تو مجبوراً مجھے اسے کلپ سے الگ کرنا پڑا تھا۔

اس کے ساتھ ہی میں پیچھے ہٹنے لگا اس وقت میں کوئی تیس فٹ کا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ ابھی بیس بائیس فٹ کا فاصلہ باقی تھا۔ برفانی آدمی نے غرا کر رسی ایک طرف پھینک دی اور پل کی طرف بڑھا۔ اگر وہ پل پر چڑھ جاتا تو اس کے وزن سے یہ شاید ٹوٹ جاتا۔ میں نے اس کے سر کا نشانہ لیا مگر گولی اس کے شانے پر لگی۔ وہ جھٹکے سے پیچھے گیا تھا۔ میں چند قدم اور پیچھے ہٹا اور رک کر پھر اس کی طرف پستول سیدھا کیا۔ دو گولیاں کھا کر وہ اب تکلیف سے غرا رہا تھا۔ شاید اس کی ہمت جواب دے رہی تھی اور وہ پل پر قدم رکھتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ میں چند قدم اور پیچھے ہٹا۔ اب میں دوسرے سرے سے کوئی دس بارہ فٹ دور تھا۔ میں اگر پلٹ کر تیزی دکھاتا تو شاید پل کراس کر جاتا یا شاید وہ گر جاتا۔ اب میں رکا ہوا تھا تب بھی وہ ڈول رہا تھا۔ کسی وقت بھی پتھروں کے بونڈ جواب دے سکتے تھے اور میں ان پتھروں سمیت نیچے جاتا۔ اچانک برفانی آدمی کا موڈ بدل گیا اور وہ دھاڑ کر پل کی طرف لپکا۔

اس کا ارادہ بھانپتے ہی میں پلٹ کر بھاگا اور فوراً ہی پل گرنے لگا۔ اس کے پتھر خوفناک گڑگڑاہٹ کے ساتھ ایک دوسرے سے الگ ہونے لگے اور یہ نیچے کی طرف جھکنے لگا۔ میں نے گرتے پتھروں پر زور مارا اور خود کو پوری قوت سے دوسری سمت اچھالا تھا۔ اس کے ساتھ ہی تیز برسٹ کی آواز گونجی۔ بعد میں مجھے علم ہوا کہ رونی نے پل پر چڑھتے برفانی آدمی پر برسٹ مارا تھا۔ مگر وہ اسے چڑھنے سے نہیں روک سکا تھا۔ اس کے پل پر آتے ہی رہی سہی کسر پوری ہو گئی اور وہ مکمل طور پر ٹوٹ پھوٹ کر نیچے گر گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ عقب میں کیا ہو رہا ہے، میری ساری توجہ کنارے تک پہنچنے کی تھی۔ میں نے جست لگائی اور خلا میں گیا تھا۔ میرا سانس رک گیا اور جب تک میرے پھیلے ہاتھ کنارے پر نہیں جمے سانس رکا ہی رہا۔ جھٹکے سے میرا جسم نیچے گیا۔ مگر میں گرا نہیں تھا بلکہ چٹان سے چمٹا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ چٹان سے یوں چمٹے تھے جیسے شیر خوار بچہ ڈر کر ماں سے چمٹتا ہے۔ بالآخر رونی نے دھول اور دھند سے نمودار ہو کر میرا ہاتھ پکڑا تو میں اوپر چڑھا تھا۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ میں کیسے بچا؟ میں کوئی دس بارہ فٹ پیچھے تھا اور مجھے دو قدم سے زیادہ اٹھانے کا موقع نہیں ملا تھا۔

کنارے اور میرے درمیان کم سے کم بھی آٹھ فٹ کا فاصلہ تھا اور میری جست بس نمائشی تھی۔ اس کے باوجود میں کنارے تک پہنچ گیا۔ اوپر چڑھ کر میں نے چند گہرے سانس لیے اور پلٹ کر دیکھا۔ پل تقریباً غائب ہو گیا تھا۔ اس کے ٹوٹنے سے اڑنے والا گرد و غبار جیسے اس جگہ جم گیا تھا۔ یہ دھند کی وجہ سے اتنی آسانی سے تحلیل ہونے والا نہیں تھا۔ میں دائیں طرف جانے لگا تاکہ پیالے کے دوسری طرف دیکھ سکوں۔ میرا خیال تھا کہ وہاں موجود صرف ایک برفانی آدمی نیچے گرا ہے جب کہ ہم نے ڈھلان سے تین برفانی آدمی اوپر آتے دیکھے تھے تو باقی دو کہاں تھے؟ مگر پیالے کے دوسری طرف کا حصہ خالی تھا۔ راجا عمر دراز میرے پیچھے تھا اس نے پوچھا۔ ''کیا دیکھ رہے ہو؟''

''باقی برفانی آدمی کہاں ہیں؟''

''میرا خیال ہے وہ اس طرف آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' راجا عمر دراز نے سکون سے کہا اور جہاں ہم کھڑے تھے اس کے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس طرف آنا ذرا مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔ ہمیں جلد از جلد یہاں سے آگے روانہ ہو جانا چاہیے۔''

میں نے اس سے اتفاق کیا اور ہم آگے روانہ ہو گئے۔ مجھے خیال آیا کہ راجا عمر دراز نے اتنی مشکل سے بچنے کے بعد میرا احوال نہیں پوچھا۔ وہ یوں مطمئن تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ شاید وہ اسی خیال میں تھا کہ مجھے کچھ نہیں ہو گا۔ میں ہر مشکل سے گزر جاؤں گا اور ہم بہر صورت نیچے پہنچیں گے اس لیے وہ برفانی آدمیوں سے بھی خوفزدہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اب ہم پیالے سے نکل کر دیوار سے چپٹے ہوئے نیچے جانے والے راستے کی طرف جا رہے تھے جو ہم سے ابھی بھی کوئی سو گز کے فاصلے پر تھا۔ یہاں چٹان بالکل سیدھی تھی اور راستہ بھی نیچے کی طرف جھک رہا تھا اور اس پر پاؤں پھسل رہا تھا۔ یہاں بھی رونی سب سے آگے تھا۔ اس سے پیچھے راجا عمر دراز البتہ اس بار میں تیسرے نمبر پر تھا۔ جانوس سب سے پیچھے تھا۔ ہم نے منہ دیوار کی طرف کیا ہوا تھا اور ہاتھوں سے ابھرے حصے تھام کر آگے بڑھ رہے تھے۔ اس جگہ ہمیں چاروں ہاتھوں پاؤں سے کام لینا پڑ رہا تھا۔

اچانک عقب سے جانوس کی مضطرب آواز آئی اور میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر دہشت تھی اور وہ دیوار سے چمٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پہلے میں سمجھا کہ اس کا توازن بگڑا تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ اس کے بائیں پاؤں پر ایک بالوں بھرا ہاتھ موجود ہے اور وہ اسے نیچے کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے ہر ممکن تیزی سے پستول نکالا اور ہاتھ کا نشانہ لے کر فائر کیا اور ہاتھ ایک جھٹکے سے غائب ہوا۔ مگر اتنی دیر میں جانوس کا توازن بگڑ گیا تھا اور اس کے ہاتھ دیوار سے ہٹ کر خلا میں لہرا رہے تھے۔ میں اس کی طرف سرکا۔ میرا ہاتھ اس کی طرف لپکا۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں اسے پکڑتا وہ طویل ہوتی چیخ کے ساتھ نیچے گرتا چلا گیا۔ اس کی چیخ اس وقت تک سنائی دیتی رہی جب تک نیچے سے دھپ کی ہیبت ناک آواز نہیں آئی۔ شاید کوئی جگہ تھی جہاں جانوس کا سفر جلد ختم ہو گیا اور اسے زندگی کے آخری لمحات کی تکلیف زیادہ دیر نہیں اٹھانی پڑی تھی۔ آواز بتا رہی تھی کہ وہ کم سے کم دو ڈھائی سو فٹ کی گہرائی میں گرا۔ میں اس کی خالی جگہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ابھی یہاں تھا اور اب نہیں رہا تھا۔ میں دکھ سے ساکت رہ گیا۔ پھر راجا عمر دراز کی آواز نے مجھے چونکایا۔

''رکو مت وہ ہمارے پیچھے ہیں۔ چلتے رہو۔'' وہ کہتے ہوئے آگے سرکنے لگا اور چند منٹ بعد ہم نیچے جانے والے راستے پر تھے جو اوپر سے آ رہا تھا۔ میں اس جگہ تک نہیں آیا تھا اور یہ جگہ شاید اوپر سے کوئی آدھا کلو میٹر نیچے تھی۔ یہاں برف تھی مگر اتنی سردی نہیں تھی۔ مسلسل پُر مشقت سفر سے مجھے لباس کے اندر پسینا آتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے جیکٹ کی زپ کھول لی۔ یہاں پہنچ کر میں نے عقب میں دیکھا مگر جہاں تک دھند اجازت دیتی تھی کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اب ہم آواز نہیں نکال رہے تھے۔ راجا عمر دراز نے رک کر اپنا ان ہیلر استعمال کیا اور پھر اشارے سے مجھے کہا کہ ہمیں چلنا چاہیے۔ جب کہ میں چاہتا تھا کہ ہم کچھ رک کر ستا لیں۔ خاص طور سے راجا عمر دراز۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ اگر برفانی آدمی پاس آ چکے تھے تو ہمیں بے خبری میں ان کا شکار ہونے کی بجائے ان کو شکار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔

میں نے آس پاس کا جائزہ لیا اور راستے کے ساتھ چٹان میں موجود ایک چھوٹے سے خلا کی طرف اشارہ کیا۔ راجا عمر دراز نے دیکھا اور سمجھ گیا وہ سر ہلاتا ہوا اس کی طرف چلا گیا میں نے رونی کو بھی اسی سمت جانے کا اشارہ کیا۔ میں خود راستے پر ذرا اوپر چڑھا اور ایک ابھرے پتھر کے ساتھ یوں ٹک گیا کہ مجھے نیچے نظر آ رہا تھا۔ اب اس طرف سے چاہے کوئی راستے سے آتا یا ڈھلان سے اوپر چڑھتا میری نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکتا تھا۔ میں نے رائفل اتار لی تھی۔ نیچے رونی بھی ہوشیار تھا اور وہ مزید نیچے زیادہ بہتر دیکھ سکتا تھا۔ چند منٹ اسی طرح گزرے۔ اچانک مجھے اوپر سے جیسے کنکر گرنے کی آواز آئی۔ میں دیوار کے ساتھ مزید چپک گیا۔ اوپر کوئی تھا جو مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر خطرہ اسی سمت میں تھا۔ میں رائفل کا رخ اوپر کی طرف کر رہا تھا کہ ایک برفانی آدمی اوپر سے میرے عین سامنے کودا اور اس نے میرے شانوں کو دبوچ لیا۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ میں رائفل سامنے ہونے کے باوجود اس پر فائر نہیں کر سکا تھا۔ اصل میں رائفل کا رخ اوپر کی طرف تھا اور وہ ایک لمحے میں اس کے سامنے سے گزر گیا۔

برفانی آدمی نے خوفناک غراہٹ کے ساتھ مجھے اتنی قوت سے دیوار پر مارا کہ مجھے لگا کہ میں چٹان میں گھس گیا ہوں۔ ظاہر ہے میں چٹان میں نہیں گھسا تھا بلکہ چٹان نے میری پشت کو دبا دیا تھا اور میری ہڈیوں کو توڑ ڈالا تھا۔ تکلیف کی ایسی لہر تھی جس نے میرا جسم سن کر دیا اور مجھے لگا کہ میری ریڑھ کی ہڈی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہے۔ شدت تکلیف سے میں برفانی آدمی کے ہاتھوں میں جھول کر رہ گیا۔ مجھے بے بس پا کر وہ بھیانک انداز میں غرایا۔ اس کے سیاہی مائل بڑے دانت اس کے کھلے منہ سے جھانک رہے تھے اور منہ

سے ایسی بُو آ رہی تھی کہ میرا دل مالش کرنے لگا تھا۔ رائفل بدستور میرے ہاتھ میں تھی مگر شانوں پر آنے والے دباؤ کی وجہ سے میرے ہاتھ بیکار ہو گئے تھے۔ پھر بھی میں نے کوشش کی اور رائفل کا ٹریگر دبانا چاہا۔ نال کا رخ اب اوپر کی طرف تھا۔ اسے گولی نہیں لگ سکتی تھی مگر گولی چلتی تو شاید وہ ڈر کر مجھے چھوڑ دیتا۔ یہ اور بات تھی کہ میری انگلیوں میں اتنی طاقت بھی نہیں رہی تھی کہ میں ٹریگر دبا دیتا۔

اس نے مجھے پھر اپنے قریب کیا اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ مجھے دوبارہ چٹان پر مارنا چاہتا ہو۔ اس بار شاید رہی سہی کسر پوری ہو جاتی۔ پہلی بار میں میرا سر بچ گیا تھا اور اس بار وہ میرا سر مارنا چاہتا تھا۔ میں نے جسم و جان کی ساری قوت جمع کی اور حلق کے بل دھاڑا۔ اس دھاڑ نے اثر کیا اور وہ جھجکا۔ اس کی گرفت کمزور ہوئی اور میں نے رائفل کا ٹریگر دبا دیا برسٹ نے اس کے ساتھ میرے کانوں کو بھی جھنجنا دیا تھا مگر میں عادی تھا اور وہ بری طرح بوکھلا دیا۔ اس کی گرفت مزید کم ہوئی تھی اور اگلی بار میں نے نال کا رخ اس کی طرف کر کے ٹریگر دبایا اور برسٹ نے اس کا چہرہ اڑا دیا۔ نزدیک سے یہ نہایت خوفناک منظر تھا۔ اس نے میرے شانے کھینچے۔ اصل میں وہ گر رہا تھا اور اس کی گرفت بدستور میرے شانوں پر قائم تھی۔ میں اس کے ساتھ کھنچا جا رہا تھا۔ یہاں راستہ بہت تنگ تھا اور اس کے نیچے لامحدود گہرائی تھی۔

میں اس گہرائی کی طرف جھک رہا تھا کہ مجھے جھٹکا لگا اور اس کے ساتھ ہی برفانی آدمی کے ہاتھ میرے شانے سے چھوٹ گئے۔ وہ پہلے ہاتھوں کے ساتھ دھند میں غائب ہو گیا اور میں واپس آ گیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا یہ راجا عمر دراز تھا جس نے مجھے بیگ کی اسٹرپ سے پکڑ کر واپس کھینچ لیا تھا۔ اس نے دوسرا ہاتھ ابھرے پتھر پر جما رکھا تھا تاکہ اپنا توازن برقرار رکھ سکے۔ میں واپس آیا اور سکون کا سانس لیا۔ اللہ نے ایک بار پھر مجھے محفوظ رکھا تھا۔ اس بار اس نے راجا عمر دراز کو وسیلہ بنایا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''احتیاط سے بیٹے تم بہت سے لوگوں کے لیے بہت قیمتی ہو۔''

''شکریہ، آپ نے بروقت تھام لیا۔''

''یہ کیا ہے۔'' راجا عمر دراز نے عقب میں چٹان کی طرف اشارہ کیا جس پر برفانی آدمی نے مجھے دے مارا تھا اور مجھے لگا تھا کہ میری پشت کی ہڈیاں چکنا چور ہو گئی ہیں۔ میں اب تک اپنی جسمانی کیفیت چیک کر رہا تھا کہ مجھے کیا ہوا ہے اور نقصان کس حد تک ہے۔ میں آرام سے کھڑا ہوا تھا اور پشت میں درد تھا مگر یہ ناقابل برداشت نہیں تھا۔ جب راجا عمر دراز نے توجہ دلائی تب پتا چلا کہ اصل میں میری پشت نہیں بلکہ چٹان میں ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی اور برفانی آدمی نے مجھے جہاں مارا تھا وہاں چٹان ٹوٹ گئی تھی اور اس میں ایک خلا نمودار ہوا تھا۔ راجا عمر دراز اندر جھانک رہا تھا پھر اس نے ٹارچ کی روشنی اندر ڈالی اور بولا ''یہ تو کوئی سرنگ لگ رہی ہے۔''

میں نے بھی اندر دیکھا۔ واقعی یہ سرنگ تھی جو اوپر سے نیچے کی طرف جا رہی تھی۔ مجھے یاد آیا۔ ''آپ نے بتایا تھا کہ چٹانوں کے اندر بھی کوئی پوشیدہ راستہ ہے جو اوپر سے نیچے تک جاتا ہے اور شاید صرف برف والا اس سے واقف ہے۔''

''ہاں میں نے ایسا ہی ذکر کیا تھا۔''

''نہیں یہ وہی راستہ تو نہیں ہے۔''

رونی آس پاس دیکھ رہا تھا کہ مزید برفانی آدمی تو نہیں ہیں کہ ڈھلان کی طرف سے پتھر گرنے کی آواز آئی اور ہم سب چونک گئے۔ راجا عمر دراز نے مضطرب لہجے میں کہا۔ ''اس میں چلو، وہ مزید ہیں۔ یہاں آنے والے ہیں۔''

''پہلے آپ جائیں۔'' میں نے بیگ اتارتے ہوئے کہا کیونکہ میں بیگ سمیت نہیں جا سکتا تھا۔ رونی نے راجا عمر دراز کو اندر جانے میں مدد دی۔ وہ اندر گیا تو میں نے اسے اپنا بیگ پکڑا دیا۔ پھر میں گیا۔ راستہ بہت تنگ تھا اور میں بڑی مشکل سے سمٹ سمٹا کر اندر گیا تھا۔ چٹان کمزور نہیں تھی کیونکہ ٹوٹ جانے والے حصے کے علاوہ یہ باقی طرف سے خاصی موٹی تھی۔ صرف یہی حصہ پتلا تھا۔ یوں لگ رہا تھا قدرت نے خاص طور سے ہمارے لیے یہ راستہ بنایا تھا۔ میں اندر گھسا تو رونی نے مجھے اپنا بیگ تھما دیا۔ اب وہ خود اندر آ رہا تھا۔ اس کا سر اور اوپری جسم اندر آیا تو میں نے اسے سہارا دے کر اندر کرنا چاہا۔ اچانک اسے جھٹکا لگا اور وہ تیزی سے واپس گیا تھا۔ مجھے ایک لمحہ لگا صورتِ حال بھانپنے میں اور میں نے دیوار پر پاؤں جماتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو وہ اب تک باہر جا چکا ہوتا۔

رونی چیخ رہا تھا۔ برفانی آدمی نے اس کے پاؤں پکڑ لیے تھے اور اسے باہر کھینچ رہا تھا۔ راجا عمر دراز اپنا پستول لے کر آگے آیا اور سوراخ میں جگہ تلاش کرنے لگا جہاں سے وہ برفانی آدمی پر گولی چلا سکے مگر بدقسمتی سے رونی کا کولہے

والا حصہ خلا میں پھنسا ہوا تھا اور اس میں بالکل بھی گنجائش نہیں تھی۔ باہر سے ایک زوردار جھٹکے سے اسے کھینچا گیا تو اب پیٹ تک باہر چلا گیا تھا اور صرف اس کا سینہ اور سر اندر رہ گیا تھا۔ اچانک اس کی آنکھیں پتھرانے لگیں اور وہ یوں سانس لینے لگا جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو باہر سے ایسی آوازیں آرہی تھیں جیسے کوئی درندہ کسی جاندار کو چیر پھاڑ رہا ہو اور حقیقتاً ایسا ہی تھا۔ میں جو پوری قوت صرف کر کے رونی کو اندر کھینچ رہا تھا۔ اچانک کامیاب رہا اور اس سمیت پیچھے جا گرا۔ خلا ہوتے ہی راجا عمر دراز نے باہر کی طرف لگاتار فائر کیے۔ ایک غراہٹ سنائی دی۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ برفانی آدمی نشانہ بنا ہے یا عادتاً غرایا ہے۔

میں جلدی سے اٹھا اور پھر ساکت رہ گیا کیونکہ رونی پورا نہیں آیا تھا اس کا پیٹ کے نیچے کا دھڑ باہر ہی رہ گیا تھا اور صرف سینہ اور سر اندر آیا تھا۔ برفانی آدمی نے اسے زندہ ہی چیر پھاڑ کر رکھ دیا تھا اور وہ آخری دموں پر تھا۔ میں دم بہ خود اسے دیکھ رہا تھا اور چند سانس لے کر اس نے دم توڑ دیا۔ میں لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا اور نیچے بیٹھ گیا۔ چھ سات گھنٹے پہلے تک میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ آنے والے چند گھنٹے اس قدر خوفناک اور خونریز گزریں گے۔ ہمارے سارے ساتھی مارے جا چکے تھے اور میرے ساتھ صرف راجا عمر دراز باقی بچا تھا۔ وہ بھی تھکے انداز میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ شاید اس نے بھی نہیں سوچا ہوگا کہ اس کی خواہش پر اتنے انسان اپنی جان وار دیں گے۔ رونی کے جسم سے نکلنے والا خون سرنگ کے فرش پر پھیل رہا تھا اور اب باہر خاموشی تھی۔ مگر یہ خاموشی زیادہ دیر برقرار نہیں رہتی۔ جب تک ایک بھی برفانی آدمی زندہ تھا وہ ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اچانک ایک بالوں بھرا ہاتھ خلا سے اندر آیا اور اس نے ناقابل یقین انداز میں دراز ہو کر رونی کا جسم پکڑا اور اسے کھینچ کر لے گیا۔ جب تک میں اٹھتا وہ اسے کسی نہ کسی طرح کھینچ کر سوراخ سے نکال چکا تھا۔ میں سوراخ کی طرف جھپٹا تھا کہ راجا عمر دراز نے کہا۔

''کوئی فائدہ نہیں۔''

''تب اس کا کیا فائدہ۔'' میں نے سرنگ کی طرف اشارہ کر کے تلخ لہجے میں کہا۔ ''کیا یہاں ہم بچ جائیں گے۔''

''یہ کم سے کم یہاں اندر نہیں آسکتے ہیں۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔

''آپ کو آگے کی فکر بھی نہیں ہے۔'' میں چڑ گیا تھا اور اس وقت راجا عمر دراز مجھے بہت خود غرض شخص لگا تھا جسے صرف اپنے مفاد کی فکر تھی اور ان لوگوں کا کوئی خیال نہیں تھا جو اس کے مفاد کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ یہ بے شمار لوگ تھے۔ اس وقت وہ مجھے بالکل ڈیوڈ شا کی طرح لگا جو انسانوں کو صرف استعمال کی چیز سمجھتا تھا۔

''تم کیا سمجھتے ہو کہ مجھے فکر نہیں ہے۔'' اس نے سکون سے کہا۔

''شاید ایسا ہی ہے کیونکہ آپ کا انداز بتا رہا ہے کہ آپ واپس جانے کے لیے نہیں آئے ہیں اس لیے دوسرے جاتے ہیں یا نہیں اس کی آپ کو پروا نہیں ہے۔''

''تم غلط سمجھ رہے۔'' اس نے کچھ دیر بعد آہستہ سے کہا۔ ''اور کیا تم تقدیر پر ایمان نہیں رکھتے ہو؟''

''رکھتا ہوں۔'' میں ذرا دھیما پڑ گیا تھا۔

''تب یوں کیوں نہیں سوچتے کہ یہ سب تقدیر میں تھا۔ ان سب کی موت اسی طرح لکھی تھی۔ انہیں یہاں آنا ہی تھا۔''

میں نے چند لمحے بعد گہری سانس لی۔ ''شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر میں انسان ہوں جذباتی ہو جاتا ہوں۔''

''تم جوان ہو تم نے ابھی لمبی عمر جینا ہے۔ لیکن میں موت کو سامنے دیکھ رہا ہوں اور ایسے شخص کے لیے زندگی کی اہمیت وہ نہیں رہتی ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں اس کے باوجود اتنے لوگوں کو یوں مرتے دیکھنا جو آپ کے نزدیک ہوں آسان کام نہیں ہے۔ سچی بات ہے میں اپنے اعصاب پر اس کا بہت دباؤ محسوس کر رہا ہوں۔''

راجا عمر دراز نے رونی کے بیگ سے ایک انرجی ڈرنک نکال کر میری طرف بڑھائی۔ ''یہ لو تمہیں اس کی ضرورت ہے۔''

میں عام طور سے ایسی مصنوعی ڈرنکس پسند نہیں کرتا ہوں لیکن اس وقت میں نے لے کر ٹن کھولا اور چند گھونٹ میں ٹن خالی کر دیا۔ مجھے پہلی بار علم ہوا کہ میرا گلا کیسے خشک ہو رہا تھا اور ڈرنک نے اسے تر کر دیا تھا۔ اب میں بہتر محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر رونی کے فرش پر رہ جانے والے خون سے نظریں چراتے ہوئے سرنگ کا جائزہ لیا۔ ایک طرف یہ اوپر جا رہی تھی اور دوسری طرف نیچے جا رہی تھی اور اس کی ساخت میں انسانی ہاتھوں کی کاریگری واضح تھی۔ ترچھا فرش جان بوجھ کر کسی قدر کھردرا رکھا گیا تھا

تاکہ اس پر قدم اچھی طرح جمیں اور دیواروں و چھت کو تراش کر ایسی صورت دی گئی تھی کہ اس میں چلتے ہوئے آدمی کو کوئی دقت محسوس نہ ہو۔ چھت کی اونچائی سات فٹ تھی اور سرنگ کی چوڑائی ساڑھے پانچ یا چھ فٹ تھی۔ میں نیچے کی طرف بڑھا اور جہاں سے سرنگ مڑ رہی تھی نیچے جھانک کر دیکھا تو یہ تقریباً چالیس درجے زاویے پر نیچے جاتی دکھائی دی اور کوئی بیس پچیس گز بعد پھر مڑ رہی تھی۔ میں نے مڑ کر راجا عمر دراز سے کہا۔

"اگر آپ کہیں تو آگے بڑھیں۔"

"بالکل۔" وہ کھڑا ہو گیا۔ میں نے دونوں بیگ اٹھا لیے اور ہم نیچے جانے لگے۔ فرش اتنا ترچھا تھا کہ اس پر قدم خود بہ خود تیز اٹھ رہے تھے اور ہم نہ چاہنے کے باوجود تقریباً دوڑتے ہوئے نیچے جا رہے تھے۔ کوئی تین سو گز نیچے جانے کے بعد سرنگ دائیں طرف گھوم گئی اور اب یہ تقریباً سیدھی جا رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ہم کسی اندرونی غار میں نکلیں گے مگر غار کی بجائے ہم ایک بہت بڑے ہال میں نکلے جس کا بڑا حصہ ایک جھیل پر مشتمل تھا۔ ایک طرف چھت سے پانی کسی آبشار کی طرح جھیل میں گر رہا تھا اور اس کے وسط میں بننے والا بھنور بتا رہا تھا کہ وہاں کوئی سوراخ تھا جس سے یہ پانی مزید نیچے کی طرف جا رہا تھا۔ اوپر سے یہ پانی یقیناً برف پگھلنے سے نیچے آ رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ نیچے آتے ہوئے وادی کی ایک دیوار کے اندر سے پانی بہنے کی آواز آ رہی تھی۔ اوپر سے نہ جانے ایسے کتنے چشمے نیچے آتے ہوں گے اور وادی میں بسنے والے انسانوں، حیوانات اور نباتات کی ضرورت پوری کرتے ہوں گے۔ میں نے یخ بستہ پانی میں ہاتھ ڈالا اور اسے پیا تو اس کی ٹھنڈک اور تازگی نے جیسے مجھے اندر تک بھر دیا تھا۔

راجا عمر دراز نے پانی کے پاس آنے سے گریز کیا۔ شاید سرد پانی اس کے لیے ٹھیک نہیں تھا۔ مگر میں نے دل بھر کر منہ ہاتھ دھویا اور جہاں جہاں خون اور آلائشوں کے دھبے آئے تھے انہیں صاف کیا۔ میں نے اس کی پروا نہیں کی کہ پانی تقریباً سیال برف کی طرح سرد تھا۔ یہاں سے ایک راستہ دوبارہ سرنگ کی صورت میں نیچے جا رہا تھا۔ مگر یہ راستہ ہال کے دوسرے سرے میں تھا اور وہاں تک جانے کے لیے ہمیں جھیل کے کنارے ہو کر جانا پڑتا۔ میں تازہ دم ہوا تو ہم آگے روانہ ہوئے۔ بعض جگہوں پر پانی دیواروں تک آ گیا تھا اور ہمیں پانی سے گزرنا پڑا۔ شاید یہ جھیل کا پیک تھا کیونکہ جلد ہی اوپر موسم سرما شروع ہو جاتا اور پانی کی آمد کم ہو جاتی اس کے بعد جھیل کا رقبہ سکڑ جاتا۔ ہم نے ٹارچ نکال لی تھیں اور ان کی روشنی میں سفر کر رہے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد ہم مزید کوئی آدھا کلومیٹر نیچے آ چکے تھے اور اب موسم واضح تبدیل ہو گیا تھا۔

ولیم شا نے طیارے کے آلٹی میٹر سے اندازہ لگایا تھا کہ ہم وادی کے کنارے، سطح سمندر سے کوئی سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر تھے جب کہ وادی کی سطح کوئی سات ہزار فٹ کے قریب بلند تھی۔ اس طرح اس کی دیواروں کی گہرائی کوئی نو ہزار فٹ یا تین کلومیٹرز بنتی تھی۔ میں نے جو پیمائشیں بتائی ہیں پہاڑوں کے لحاظ سے ان کی کوئی خاص حیثیت نہیں ہے۔

پاکستان کے شمالی علاقے میں اس سے زیادہ اونچائیاں اور گہرائیاں ہیں۔ صرف نانگا پربت کی چوٹی کے نیچے ایک چٹان ہے جو ساڑھے چار ہزار میٹرز اونچی ہے۔ دنیا میں کہیں بھی اتنی اونچی اور سیدھی چٹان نہیں ہے۔ قراقرم اور ہمالیہ میں ایک ایک گلیشیر اتنا بڑا ہے جو اس وادی کو بھرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ان میں سے بعض گلیشیرز کی لمبائی سو کلومیٹرز سے زیادہ ہے اور ان میں جمی برف کی موٹائی کئی کلومیٹرز بنتی ہے۔

میرا اندازہ تھا کہ ہم کوئی ڈیڑھ کلومیٹر تک وادی میں اتر چکے تھے۔ راجا عمر دراز کی بتائی کہانی کے مطابق برف والا بوڑھا تقریباً اتنی ہی بلندی پر قیام کرتا تھا کیونکہ یہاں تک برف کی حد تھی اور اس سے نیچے گرمیوں میں بھی برف نہیں ہوتی تھی۔ میدانوں کے قریب پہاڑوں میں برف گرمیوں میں بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر بھی پگھل جاتی ہے جب کہ جو جگہیں پہاڑوں کے درمیان ہوں وہاں دس ہزار فٹ کی بلندی پر بھی برف موجود رہتی تھی لیکن اس وادی میں گرمائش کا کوئی اپنا سسٹم تھا جس کی وجہ سے یہاں گیارہ ہزار فٹ تک برف صاف ہو جاتی تھی۔ ویسے بھی اوپر سے نیچے تک برف ٹکنے والی جگہیں بہت کم تھیں۔ اس لیے اگر کہیں برف ہوتی بھی تو بہت کم ہوتی تھی۔ میں نے راجا عمر دراز سے کہا۔ "ہم برف والے بوڑھے کے ڈیرے کے پاس پہنچ گئے ہیں۔"

"اگر ہم باہر ہوتے تو میں بتا سکتا تھا مگر یہاں بتانا مشکل ہے کہ ہم اس کے ڈیرے کے پاس ہیں یا نہیں۔"

اس کے باوجود کہ اب تک کوئی جگہ ایسی نہیں آئی تھی جہاں کسی آدمی کا کوئی نشان بھی نظر آتا۔ میں مطمئن تھا کہ ہم درست سرنگ میں سفر کر رہے تھے۔ ہم ایک موڑ سے مڑے تو ٹھٹک گئے کیونکہ پہلی بار سرنگ میں دو راستے دکھائی دیے

تھے۔ ایک تقریباً سیدھا جا رہا تھا مگر دوسرا اس کے دائیں طرف مڑ گیا تھا۔ ہم دائیں طرف جانے والے راستے پر آئے اور اندر روشنی ڈالی تو خلاف توقع یہ راستہ کسی قدر اوپر جاتا دکھائی دیا۔ سرنگ بھی الٹی سمت میں مڑ رہی تھی جیسے گھوم کر واپس اسی سمت میں جا رہی ہو جہاں سے ہم آ رہے تھے۔ اس کا زاویہ ہمارے لیے غیر متوقع تھا۔ راجا عمر دراز نے جھانکا اور بولا۔ ''شاید یہ کوئی سابق حصہ ہے جو کسی وجہ سے بند ہو گیا اور اس کی جگہ یہ سرنگ بنائی گئی ہوگی۔''

راجا عمر دراز نے اس سرنگ کی طرف اشارہ کیا جہاں سے ہم آ رہے تھے وہ اسے نیا راستہ قرار دے رہا تھا۔ دوسرے لفظوں میں ہمیں مڑنے کی بجائے جو راستہ نیچے جا رہا تھا اسی پر سفر جاری رکھنا چاہیے تھا۔ مگر میری عقل کہہ رہی تھی کہ یہ راستہ متروک نہیں ہے۔ اول تو وہ صاف ستھرا تھا جیسے استعمال ہوتا رہا ہے اور دوسرے وہ اس راستے سے الگ محسوس ہو رہا تھا۔ گویا اسے بعد میں بنایا گیا تھا۔ جب کہ دونوں طرف سیدھی سرنگ پہلے سے بنی ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے سیدھی سرنگ تو یہی تھی جس سے ہم سفر کرتے ہوئے یہاں تک آئے تھے اور یہی آگے بھی جا رہی تھی۔ راجا عمر دراز کی بات درست نہیں تھی کہ یہ راستہ الگ سے ہے اور متروک ہو گیا ہوگا۔ میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ ''ہمیں اس پر جانا چاہیے۔''

اس نے اصرار کیا۔ ''یہ واپس اوپر جا رہا ہے اور ہمیں اوپر نہیں جانا ہے۔''

''ضروری نہیں ہے کہ یہ اوپر ہی جائے ممکن ہے یہ کسی ایسی جگہ نکل رہا ہو جہاں سے ہمیں برف والے کے ٹھکانے یا نیچے وادی تک رسائی ہو سکے۔''

''اس کے لیے یہ راستہ ہے۔'' راجا عمر دراز نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے یہ نیچے وادی کی طرف جا رہا ہے۔''

میں چونکا۔ راجا عمر دراز کے لہجے میں جیسی بے تابی نیچے وادی کا ذکر کرتے ہوئے آئی تھی۔ اس سے لگ رہا تھا کہ اسے برف والے سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ وہ تو اصل میں وادی تک رسائی چاہتا تھا۔ وادی جہاں سامیرا تھی۔ اس کا گمان تھا کہ وہ اب تک زندہ ہوگی کیونکہ اس وادی کے لوگ طویل عمر پاتے تھے۔ برف والا اس کے لیے ایک ضمنی کردار تھا۔ اس کے لیے اصل اہمیت حسین سامیرا کی تھی۔ وہ اسی کے لیے اتنے عرصے سے آنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ میں اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا مگر میں نے راجا سے بحث نہیں کی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''آپ یہیں رکیں میں آگے تک دیکھ کر آتا ہوں اگر یہ کسی جگہ نکلا یا بند ہوا، دونوں صورتوں میں، میں واپس آ جاؤں گا۔''

راجا عمر دراز کی جھنجلاہٹ بڑھ گئی تھی۔ ''شہباز تم وقت ضائع کر رہے ہو۔''

''اتفاق سے ہمارے پاس ضائع کرنے کے لیے یہی چیز بچی ہے۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا اور سرنگ کی طرف بڑھ گیا پہلے میں نے سوچا تھا کہ بیگ اتار دوں مگر پھر میں انہیں لیے ہی اندر داخل ہوا۔ سرنگ اسی سائز اور انداز کی تھی اور یہ نیم دائرے میں گھوم کر اوپر جا رہی تھی۔ مگر پہلا موڑ آتے ہی یہ سیدھی ہو گئی یعنی اب یہ اوپر نیچے نہیں جا رہی تھی بلکہ لیول پر تھی مگر دائیں طرف اس کا گھماؤ جاری تھی۔ میں حیران تھا کہ اتنے گھماؤ کے بعد تو اسے منطقی طور پر باہر کھلی جگہ نکل جانا چاہیے تھا مگر فوراً ہی میری سمجھ میں آ گیا۔ لاشعوری طور پر ہم اب بھی سرنگ کے ایک طرف وادی کی دیوار تصور کر رہے تھے جب کہ عین ممکن تھا کہ یہ سرنگ دیوار سے بہت دور چٹانوں کے کہیں درمیان سے گزر رہی ہو۔ سخت چٹانوں میں اس سرنگ کو کاٹنے اور یوں ہموار کرنے میں اگر سینکڑوں نہیں تو کئی عشروں کا عرصہ ضرور لگا ہوگا۔

میں گھومتا ہوا سرنگ کے آخری حصے میں پہنچا تو اسے یوں بند پایا کہ سامنے ایک ہموار اور تراشیدہ دیوار تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ میں اوپر سے نیچے جانے والی سرنگ کے پاس ہی کہیں تھا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ جب اسے بند کرنا تھا تو بنانے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر عقل نے دوبارہ میری رہنمائی کی اور میں دیوار پر ہاتھ پھیر کر اس راستے کا لاک تلاش کرنے لگا جسے دبانے یا کچھ کرنے سے یہ خفیہ راستہ کھل سکتا تھا۔ میں ٹارچ کی روشنی ہر طرف ڈال رہا تھا۔ مگر کوئی ایسی چیز نہ تو مل رہی تھی اور نہ ہی دکھائی دے رہی تھی۔ البتہ جیسے ہی میں ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے کھڑا ہوا ہلکی سی گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ پتھر کی سل میرے سامنے سے سرک گئی اور دوسری طرف روشنی نظر آنے لگی۔ میں حیران ضرور ہوا مگر فوراً ٹارچ بند کر دی اور محتاط قدموں سے باہر آیا تو خود کو ایک درمیانے سائز کے کمرے میں پایا۔ یہاں فرش اور دیواروں پر بے شمار خوب صورت اشیا سجی ہوئی تھیں۔ بیشتر اشیا شیشے کی تھیں۔ یہاں ایسی تصویریں بھی آویزاں تھیں جیسے میں نے راجا عمر دراز کے پاس دیکھی تھی۔ ان تصویروں میں یہاں وادی کے مناظر بیان کیے گئے تھے۔ دیواروں کے ساتھ تراشے ہوئے پتھر کے اسٹولز پر ویسے ہی سیاہ خول رکھے تھے جن میں کوئی سیال بھرا ہوتا

ہے جو روشنی جذب اور خارج کرتا ہے۔ اس وقت ان سے روشنی خارج ہو رہی تھی اور اسی سے یہ جگہ روشن تھی۔ یہاں وادی میں استعمال ہونے والے جنگی ہتھیار سجے ہوئے تھے اور حیرت انگیز طور پر جدید اسلحہ بھی نظر آ رہا تھا۔ یہ جدید اسلحہ جس میں کئی رائفلیں، شاٹ گنز، پستول اور چند ہینڈ گرنیڈز بھی نظر آ رہے تھے۔ ایک طرف ریک میں سجے ہوئے تھے۔ اس کے پاس لکڑی کی ریلنگ پر ہینگ کیے ہوئے عجیب کپڑے کے بنے لبادے تھے۔ ان کے ساتھ ہی مختلف سائز کے جوتے اور چپلیں رکھی تھیں۔ اس سنہری اہرام کا ایک چھوٹا ماڈل بھی رکھا ہوا تھا اور اس کے اوپری حصے پر ایک شفاف ہیرا اٹکا ہوا تھا۔ مجھے خیال آیا اور میں نے اہرام چھو کر دیکھا تو اسے سچ مچ خالص سونے کا پایا۔

دھات بالکل سونے کی طرح ملائم اور دبنے والی تھی۔ میں دنگ رہ گیا۔ اس ایک میٹر اونچے اہرام کا وزن شاید ٹن کے آس پاس ہوگا۔ اس کے پاس ہی لائن سے نصف درجن تاج رکھے تھے جو سونے یا اس سے ملتی جلتی کسی دھات کے تھے لیکن ان کی اصل مالیت ان پر لگے ہوئے جواہرات کی تھی۔ سنہری لکڑی سے بنا ہوا فرنیچر رکھا تھا۔ یہ سارے کا سارا تقریباً فرنیچر تھا۔ کرسیاں، میزیں، صوفے اور اسٹول تھے۔ یہ جگہ قیمتی اشیا سے مالا مال تھی۔ مگر میں ان چیزوں کی تلاش میں نہیں آیا۔ سچ تو یہ ہے کہ نیچے آنے کے بعد مجھے اس حیرت انگیز آدمی کی تلاش تھی جس نے میری زندگی کا رخ بدل دیا تھا اور مجھے یہاں بلوالیا تھا جب کہ میں یہاں آنا نہیں چاہتا تھا۔ آغاز میں مجھے اس کمرے سے باہر جانے کا راستہ نظر نہیں آیا لیکن جلد میں نے ایک دیوار سے ملتا جلتا چڑے کا بنا ہوا پردہ دریافت کر لیا۔ دروازہ اس کے عقب میں تھا۔ میں کمرے میں داخل ہوا اور ششدر رہ گیا۔

یہ کمرا پورے کا پورا سنگ مرمر جیسے کسی پتھر کا بنا ہوا تھا۔ اس کے ایک طرف بہت بڑی کھڑکی تھی۔ اس پر حریری پردے لہرا رہے تھے۔ یہاں بھی دیواروں پر وہی خول لگے تھے جو بلب کی طرح روشن ہوتے ہیں۔ ششدر رہ جانے کی وجہ کمرے کے وسط میں ایک نہایت عالی شان اور خوب صورت مسہری پر لیٹی اوشا تھی۔ شانوں سے پنڈلیوں تک بے حد سفید لبادے میں ملبوس یوں محو خرام تھی کہ صرف اس کا سینہ حرکت پذیر تھا اور لباس اس کے بدن پر کسی مجسمہ ساز کی طرح سنگ تراشی کر رہا تھا۔ اس کی زلفیں تکیے پر بکھری ہوئی تھیں۔ میں بے ساختہ اس کی طرف بڑھا تھا کہ رک گیا مجھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اور میں نے پہلی بار اس

بوڑھے کو دیکھا۔ استخوانی جسم پر صرف ایک معمولی سا سفید پاجامہ تھا۔ اس کے براق سفید بال اور داڑھی اس کے شانوں اور سینے کو چھپا رہی تھی اور آنکھوں میں شاید دیواروں پر لگے بلبوں سے زیادہ روشنی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میں پہچان گیا کہ وہ کون ہو سکتا تھا۔

''آپ......'' میں نے بے ساختہ کہا۔

''ہاں میں۔'' وہ مسکرایا تو جیسے کمرے کی روشنی بڑھ گئی تھی۔ میں حیران ہوا کہ کوئی مرد اور وہ بھی اتنا عمر رسیدہ اتنے دل کش انداز میں مسکرا سکتا ہے۔ ''میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔''

''کیوں؟'' یہ سوال بھی میں نے غیر ارادی طور پر کیا تھا۔ میں نے غور نہیں کیا کہ وہ کون سی زبان بول رہا ہے لیکن مجھے اس کے الفاظ اردو میں سنائی دے رہے تھے اور میں اسے اردو میں جواب دے رہا تھا۔

''تم جان جاؤ گے۔'' اس نے کہا اور میرے پاس آیا۔ اس نے بڑی محبت سے میرا ہاتھ تھاما تو میرے پورے جسم میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔ لیکن یہ ناگوار نہیں تھی بلکہ پر کیف تھی۔ اس نے پھر دہرایا۔ ''میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔''

یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مجھ پر اس بات کی اہمیت واضح کر دینا چاہتا ہو کہ وہ بہت عرصے سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے سر ہلایا اور اوشا کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں حیران ہوں کہ یہ یہاں کیسے آئی؟''

اس بار اس نے اتنی ہی محبت سے اوشا کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''یہ بہت باہمت اور بہادر لڑکی ہے۔ اس سے بچ آئی جس سے کوئی مشکل سے ہی بچتا ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے برفانی آدمی؟''

اس نے میرا سوال نظر انداز کر کے کہا۔ ''مجھے اس کا بھی انتظار تھا مگر میں جانتا تھا اس کی آمد تم سے مشروط ہے۔''

برف والے کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ اسے ایک سے زیادہ لوگوں کا انتظار تھا۔ میں نے کہا۔ ''میرے ساتھ راجا عمر دراز بھی آیا ہے وہ سرنگ کے دہانے پر موجود ہے۔''

اس نے میری بات کو سرسری سا لیا۔ ''ہاں وہ بھی آیا ہے مگر مجھے اس کا انتظار نہیں تھا۔''

''کیا میں اسے لا سکتا ہوں۔ وہ اکیلا اور بیمار ہے۔''

''اب وہ اکیلا نہیں ہے مگر بیمار ضرور ہے۔'' برف والے نے کہا تو میں چونک گیا۔

''آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں وہ کہاں ہے؟''

"وہ اس جگہ نہیں ہے۔ وہ دیکھو۔" اس نے مسہری کے سامنے لگی بہت بڑی سی ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کی طرف اشارہ کیا اور اس کا ایک حصہ جیسے ٹی وی بن گیا۔ اس میں سرنگ کا وہ دوراہا دکھائی دے رہا تھا جہاں میں راجا عمر دراز کو چھوڑ کر آیا تھا اور وہ جگہ اب خالی تھی۔ میں اس کرتب پر قطعی حیران نہیں ہوا۔ مجھے لگا کہ اس کے لیے یہ معمولی سی بات تھی۔ اس کی بجائے میں بے چین ہو گیا۔

"وہ کہاں گیا؟"

"وہ کہیں بھی اور کسی کے ساتھ بھی گیا ہو وہ یہیں آئے گا۔"

اتنی دیر میں برف والے نے کسی ایک سوال کا بھی ڈھنگ سے جواب نہیں دیا تھا مگر عجیب بات تھی کہ مجھے ایک بار بھی الجھن نہیں ہوئی۔ میں اس کے جوابوں سے بالکل مطمئن تھا۔ مجھے راجا عمر دراز کی فکر ضرور تھی مگر برف والے کی طرف سے اطمینان دلانے پر میری فکر ختم ہو گئی اور میں نے اوشا کی طرف دیکھا۔ "کیا یہ سو رہی ہے یا بے ہوش ہے؟"

"آرام میں ہے اس نے کچھ وقت بہت مشکل گزارا ہے۔ یہ اسی کی ہمت ہے جو بچ کر یہاں تک آ گئی۔ ابھی اسے آرام کی ضرورت ہے۔"

راجا عمر دراز نے رانا ویاس کے حوالے سے بتایا کہ جب وہ برفانی آدمی کی مادہ کے جبر کا شکار ہو کر مرنے کے قریب ہو گیا تھا تب برف والے نے اس کی مدد کی تھی اور اس کا علاج کیا تھا۔ تب وہ بہت دنوں تک سوتا رہا تھا صرف کھانے پینے اور رفع حاجت کے لیے اٹھتا تھا۔ برف والا اسے کچھ انوکھی غذائیں کھانے پینے کو دیتا تھا۔ شاید اوشا کو بھی ایسی ہی کوئی چیز دی جا رہی تھی اور وہ سو کر اپنی توانائی بحال کر رہی تھی۔ میں نے جھجک کر پوچھا۔ "یہ محفوظ ہے نا میرا مطلب ہے اس کی عزت......"

"تم جانتے ہو کوئی اس کے پاس نہیں آسکتا ہے۔"

"کیا آپ نے اس کی مدد کی تھی؟"

اس بار بھی اس نے واضح جواب دینے سے گریز کیا۔ "سب کی مدد ایک ہی ہستی کرتی ہے جب تک وہ نہ چاہے کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی کسی کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔"

میں نے سر ہلایا۔ "آپ نے ٹھیک کہا۔"

اس نے پھر محبت سے میری طرف دیکھا۔ جب وہ یوں دیکھتا تو لگتا جیسے مجسم محبت ہو۔ اس میں اس جذبے کے سوا کسی دوسرے جذبے کی ذرا بھی آمیزش نہ ہو۔ "تم بھوکے ہو کچھ کھاؤ گے؟"

"ہاں میں بھوکا ہوں۔" میں نے بلا تکلف کہہ دیا۔ ساتھ ہی میں حیران ہوا کیونکہ میں کتنا ہی بھوکا کیوں نہ ہوں کسی شخص سے پہلی ملاقات میں اس طرح اقرار نہیں کر سکتا مگر اس شخص میں نہ جانے کیا بات تھی مجھے اس سے کوئی پردہ ہی محسوس نہیں ہو رہا تھا یوں لگ رہا تھا کہ میری شخصیت کی کھلی کتاب اس کے سامنے ہو۔

"میرے ساتھ آؤ۔" اس نے کہا اور ایک طرف دیوار کی طرف بڑھا اور جیسے ہی دیوار کے پاس پہنچا اس میں جیسے خود بہ خود دروازہ نمودار ہوا۔ میں اس کے پیچھے آیا اور دیوار کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ بہت مہارت سے پتھر کا دروازہ یوں جوڑا گیا تھا کہ وہ کسی میکنزم کے تحت سرک کر خلا پیدا کرتا تھا جیسے ہی میں گزر کر دوسری طرف آیا دروازہ خود بند ہو گیا۔ ہم ایک چھوٹی سی سرنگ میں کھڑے تھے۔ برف والا آگے بڑھنے لگا۔ اس کا جسم استخوانی مگر بدہیت نہیں تھا۔ اس کا رنگ جیسے ہلکے رنگ کے زیتون کے تیل جیسا تھا۔ اس کا بدن یوں شفاف تھا کہ اس پر کہیں ذرا بھی میل کا شائبہ نہیں تھا۔ اس کے بال بہت صاف اور سلیقے سے پشت پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے پاؤں ننگے تھے۔ چلتے ہوئے وہ اچانک دیوار کی طرف مڑا تو اس میں بھی اسی طرح خلا پیدا ہو گیا اور وہ اس میں داخل ہوا جب میں اندر آیا تو میں نے خود کو سجے ہوئے عالی شان قسم کے ڈائننگ ہال میں پایا۔ یہ اسی سنہری لکڑی کی بنی تھی۔ میز پھلوں، دودھ، جوس اور خشک میووں سے بھری ہوئی تھی۔ برف والے نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"مجھے معلوم ہے تم صرف مخصوص گوشت کھاتے ہو اور ابھی میرے پاس تمہارے لیے قابلِ قبول گوشت نہیں ہے۔" اس نے نام لیے بغیر حلال اور حرام گوشت کی وضاحت کر دی۔

"کوئی بات نہیں میں یہ بھی کھاتا ہوں۔" میں نے کہا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ پھل تقریباً وہی تھے جو ہم کھاتے ہیں بس شکل، ذائقے اور خوشبو میں ذرا مختلف تھے۔ میں نے دل بھر کر پھل اور خشک میوے کھائے۔ دودھ پیا اور آخر میں جوس پیا جو شاید مختلف پھلوں کے رس کی کاک ٹیل تھی۔ تمام چیزیں نہایت لذیذ اور اعلیٰ درجے کی تھیں۔ میں نے آج تک ایسے ذائقے والی چیزیں نہیں کھائی تھیں۔ حد یہ کہ دودھ بھی بنا کسی بو کے تھا۔ اس دوران میں برف والا میرے

سامنے بیٹھا رہا۔ اس نے ان میں سے کوئی چیز نہیں لی تھی۔ میں نے اس کے علاوہ وہاں اب تک کسی مقامی فرد کو نہیں دیکھا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس کے لیے یہ سب کون کرتا ہے۔ اس نے اچانک کہا۔

"انسان کو اپنے لیے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔"

"تو آپ جو کر رہے ہیں وہ اپنے لیے کر رہے ہیں؟"

"ظاہر ہے۔" اس نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ "دنیا میں کون ہے جو اپنے کسی مفاد کے بغیر کچھ کرے۔"

"آپ کا کیا مفاد ہے؟"

"تم جان جاؤ گے۔" اس نے کہا۔

میں نے ہاتھ روک لیا۔ "بس میں نے کھا لیا۔ لیکن آپ نے کچھ نہیں کھایا۔"

اس نے بے نیازی سے میز پر بچی غذاؤں کو دیکھا۔ "میں جو کھاتا ہوں میرے لیے وہی کافی ہے۔"

میں اس کے بارے میں پوچھتے ہوئے ذرا جھجکا تھا۔

"میں نے سنا ہے کہ آپ صرف برف کھاتے ہیں۔"

"میرے ساتھ آؤ۔" اس نے اس بار بھی میرا سوال نظر انداز کیا۔ "میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔"

وہ مجھے لے کر ایک سرنگ میں آیا اور ہم نے نیچے اترنا شروع کیا۔ ہم اترتے چلے گئے اور بلاشبہ ہم بہت نیچے آ گئے۔ شاید ایک کلومیٹر نیچے اترے تھے مگر عجیب بات ہے مجھے ذرا بھی تھکن کا احساس نہیں ہوا۔ میں نے پیٹ بھر کر کھایا تھا اور اتنا کھانے کے بعد اتنا چلنا آسان نہیں ہوتا ہے مگر مجھے ذرا بھی گرانی اور بھاری پن محسوس نہیں ہوا تھا۔ اسی طرح برف والا بوڑھا بھی ان تھک چلے جا رہا تھا۔ کئی سرنگوں سے ہوتے ہوئے بالآخر ہم ایک ٹیرس نما جگہ نکلے اور تب میں نے نیچے دور تک پھیلی ہوئی وادی کو دیکھا۔ یہاں وادی سے بلندی شاید تین ہزار فٹ تھی اور ہم سطح سمندر سے کوئی ساڑھے نو دس ہزار فٹ کی بلندی پر تھے۔ یہاں دھند ختم ہو گئی تھی۔ اس سے اوپر یہ بادلوں کی طرح چھائی ہوئی تھی۔ برف والے نے نیچے دور تک پھیلے شہر اور اس کے آس پاس کھیتوں اور چھوٹے قلعوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ سب دیکھ رہے ہو؟"

"دیکھ رہا ہوں۔"

"ان چھوٹے قلعوں والوں نے مرکزی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی ہے اور وہ ان کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ وہ مزید پجاریوں اور ایک خاص طرز زندگی کے غلام بن کر نہیں رہنا چاہتے۔"

"یہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔" میں نے تبصرہ کیا۔ "اسے ہزاروں سال بعد بھی نہیں دبایا جا سکتا ہے۔"

"لیکن اس صورت میں یہ وادی تباہ ہو جائے گی۔ اس کا سسٹم ہزاروں سال کا آزمودہ ہے اور اسی وجہ سے وادی میں انسانی نسل موجود ہے۔ اگر یہ سسٹم ختم کیا گیا تو یہاں سب ختم ہو جائے گا۔"

"دوام کسی شے کو نہیں ہے، آپ اس وادی کی بات کر رہے ہیں ہمارے عقیدے کے مطابق نہ صرف یہ دنیا بلکہ آنکھوں سے نظر آنے والی اور آنکھوں سے اوجھل پوری کائنات بھی ایک دن تباہ ہو جائے گی۔ شاید ایسا ہونا اب زیادہ دیر کی بات بھی نہیں ہے۔"

اس نے گہری سانس لی۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو ایک دن سب ختم ہو جائے گا۔ لیکن یہ وادی میرے بزرگوں کی نشانی ہے میں اسے قبل از وقت تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔"

"کیا آپ اس خانہ جنگی کو روکنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے؟"

"نیچے والے میرا احترام کرتے ہیں۔" اس نے گہری سانس لی۔ "لیکن وہ اس احترام کو ایک حد میں رکھتے ہیں کہ میرے معاملات میں مداخلت نہیں کرتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ چاہتے ہیں کہ میں ان کے معاملے میں مداخلت نہ کروں۔"

"ایسا ہر جگہ ہوتا ہے۔ مفاد پرست طبقے دوسروں کی مداخلت اسی حد تک برداشت کرتے ہیں جب تک ان کے مفاد پر ضرب نہ آئے۔" میں نے کہا۔ "آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"میں چاہتا ہوں کہ یہ کشیدگی ختم ہو جائے اور قلعوں والے مرکزی حکومت کی اطاعت کریں۔ ساتھ ہی میں چاہتا ہوں کہ لوگوں کو زیادہ آزادی دی جائے۔ ان کی نجی زندگی کو پابندیوں سے آزاد کیا جائے۔"

یہ ٹیرس پتھر سے بنا ہوا تھا اور اس کے کنارے پتھر کی چھوٹے چھوٹے ستونوں والی ریلنگ تھی۔ اسے تراش کر بنایا گیا تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ جگہ خاص وادی کا جائزہ لینے کے لیے بنائی گئی تھی کیونکہ یہاں سے وادی کا مکمل

نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ شہر تو بالکل سامنے تھا اس کے عقب میں اہرام نما مندر اور اس کے پیچھے گھنا جنگل صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اسی طرح کاشت کاری کے لیے مخصوص رقبہ اور چھوٹے قلعے بھی یہاں سے دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے نیچے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ’’اس تحریک مزاحمت کے پیچھے کون ہے؟‘‘

’’سامیرا...... اورگان کی بیٹی۔‘‘

میں چونکا۔ ’’سامیرا! کیا وہ اس قابل ہے کہ کسی تحریک مزاحمت کی قیادت کر سکے۔‘‘

’’وہ اورگان کی بیٹی ہے۔‘‘

’’میرا مطلب ہے اس کی عمر اچھی خاصی ہو گی کیا وہ اس عمر میں قیادت جیسا سخت کام کر سکے گی۔‘‘

بوڑھا مسکرایا۔ ’’یہاں وقت سست ہو جاتا ہے۔‘‘

میں بھول گیا تھا میرے سامنے جیتی جاگتی مثال تھی اس بوڑھے کو راجا عمر دراز نے آج نصف صدی سے زیادہ وقت پہلے اسی طرح دیکھا تھا۔ میں نے کہا۔ ’’لیکن راجا عمر دراز نے جو کہانی سنائی ہے اس کے مطابق تو اورگان خود مہا پجاری بن کر حکمران طبقے میں شامل ہو گیا تھا۔‘‘

’’یہ درست ہے لیکن وہ زیادہ عرصے مہا پجاری نہیں رہا تھا کیونکہ ایک رات اس کی پُراسرار موت واقع ہو گئی۔ سامیرا کا کہنا ہے کہ اسے زہر دیا گیا تھا۔ مگر یہ الزام ثابت نہیں ہوا تھا۔‘‘

’’آپ تو حقیقت جانتے ہوں گے۔‘‘

’’جو حقیقت جانتے ہیں وہ اسے بیان نہیں کر سکتے کیونکہ ان کی زبان بند ہوتی ہے۔‘‘

’’پھر سامیرا نے کیا کیا؟‘‘

’’وہ عورت تھی مہا پجاری نہیں بن سکتی تھی مگر اورگان نے اسے اپنے خاص اور معبد کے مخصوص علوم سکھائے تھے۔ جب تک نیکاٹ حکمران رہا معاملات ٹھیک رہے لیکن ایک حادثے میں اس کی موت کے بعد اس کا بیٹا حکمران بنا تو یہاں سے خرابی شروع ہو گئی۔ ریناٹ ایک خود غرض اور سفاک شخص ہے۔ اس نے اقتدار کو ذاتی آسائش اور خواہشات پورا کرنے کا ذریعہ بنا لیا اور جب اس کے ظلم و ستم حد سے زیادہ بڑھے تو لوگوں نے سامیرا کی قیادت میں اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ وہ اورگان کی موت کے کچھ عرصے بعد ہی شہر چھوڑ کر اپنے گھر چلی گئی تھی اور وہیں اس نے پہلا قلعہ بنایا۔ ریناٹ کے ظلم و ستم سے بچنے والے اس کے پاس پناہ لینے لگے۔ پھر ان کی تعداد اتنی بڑھی کہ انہوں نے کئی قلعے بنا لیے۔ اب وہ اتنے طاقتور ضرور ہیں کہ حکومت ان پر آسانی سے قابو نہیں پا سکتی ہے۔‘‘

’’آپ کو سامیرا کا ساتھ دینا چاہیے تھا۔‘‘

’’میں ایسا ہی کرتا۔‘‘ اس نے آہستہ سے کہا۔ ’’لیکن میرا وقت آ گیا ہے اور میرے پاس وقت نہیں ہے کہ وادی کے معاملات میں مداخلت کر سکوں۔‘‘

’’آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟‘‘

اس نے میری طرف دیکھا اور سرسراتے لہجے میں کہا۔ ’’میں چاہتا ہوں کہ تم اس کشمکش میں کسی کی طرف سے شامل ہو جاؤ۔ تم جس کے ساتھ ہو گے اسے فتح نصیب ہو گی اور پھر تم اس وادی کے حکمران بن جاؤ۔‘‘

میں دم بہ خود رہ گیا تھا۔ میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ مجھ سے کسی جگہ کا حکمران بننے کی فرمائش کی جائے گی۔ ’’آپ سچ مچ ایسا چاہتے ہیں۔‘‘

’’میرے چاہنے سے کچھ نہیں ہو گا اصل بات تمہارے اور نیچے والوں کے چاہنے کی ہے۔‘‘

میں چونکا۔ ’’نیچے والے......؟ کیا وہ میری آمد سے واقف ہو چکے ہیں؟‘‘

’’ہاں وہ واقف ہو گئے ہیں۔‘‘

’’مگر کیسے جب کہ میرا سامنا سوائے آپ کے اور کسی فرد سے نہیں ہوا ہے؟‘‘

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ’’یہ تو میں بھی نہیں جانتا لیکن آج مجھے وادی میں کچھ اجنبی پرندے محسوس ہوئے ہیں۔‘‘

میں نے کسی قدر بے چینی سے کہا۔ ’’میں یہ سوچ کر نہیں آیا ہوں کہ مجھے وادی میں اترنا پڑے گا۔‘‘

’’انسان آتا اپنی مرضی سے ہے لیکن جاتا دوسرے کی مرضی سے ہے۔‘‘ اس نے ایک بار پھر استعارے کی زبان میں مجھے جواب دیا۔ اس نے راجا عمر دراز کے بارے میں بھی مجھے کھل کر نہیں بتایا تھا بس اتنا کہا تھا کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔ مجھے خیال آیا کہ میں نے اسے ڈیوڈ شا کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ لیکن شاید وہ اس کی آمد سے بھی واقف تھا۔ میں نے کہا۔

’’آپ جانتے ہیں ڈیوڈ شا بھی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ آیا ہے۔‘‘

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے دوبارہ کہا۔ ’’اب سمجھ میں آ رہا ہے کہ مجھے اجنبی پرندے کیوں محسوس ہوئے تھے؟‘‘

میں اس کی استعارے پر مشتمل بات سمجھنے کی کوشش کر

رہا تھا۔ ’’جب ہم نیچے آئے تو وہ اوپر تھے۔ میری آمد کے بعد نیچے آنے والا راستہ نظر آنے لگا تھا۔ یقیناً ڈیوڈ شا کو بھی ملا ہوں گا اور وہ نیچے آیا ہوگا۔‘‘

’’بعض لوگوں کو سیدھا راستہ بھی مل رہا ہو تب بھی وہ اسے اختیار نہیں کرتے ہیں۔‘‘

’’ویسے اگر ڈیوڈ شا کسی طرح سے نیچے اتر بھی گیا ہے تو وہ کیا کر لے گا ہماری طرح وہ بھی اجنبی ہے۔‘‘

’’تم بھول رہے ہو ولیم شا بھی اجنبی تھا مگر اس نے اپنی سازشانہ ذہانت سے اس وادی میں کتنا بڑا فساد کھڑا کیا تھا ہزاروں لوگ مارے گئے تھے۔‘‘

میں اس کی بات کا قائل ہوا کیونکہ ڈیوڈ شا ولیم شا سے زیادہ شاطر آدمی تھا۔ اسے بین الاقوامی سازشوں کا عملی تجربہ تھا۔ مگر سوال وہی تھا کہ وہ نیچے کیسے پہنچا جب کہ وہ مخصوص راستے سے بھی نہیں گزرا تھا۔ ان ہزاروں بلکہ میلوں اونچی دیواروں سے رسیوں کی مدد سے نیچے جانا بھی ممکن نہیں تھا۔ برف والے کی سنجیدگی کا اندازہ اس سے بھی ہوا کہ وہ سیدھے انداز میں بات کر رہا تھا۔ میں کسی قدر قائل ہوا تھا مگر مکمل طور پر نہیں۔ میں نے ایک سوال اور کیا۔ ’’اگر نیچے جانے پر مجھے گرفتار کر لیا گیا تو؟‘‘

’’شاید ایسا ہی ہو لیکن وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔‘‘

’’پھر بھی آپ مجھے نیچے بھیجنا چاہتے ہیں؟‘‘

’’ہاں کیونکہ اسی طرح معاملہ آگے بڑھے گا۔ دوسرے اگر تم نیچے نہیں گئے تو نیچے والے یہاں آجائیں گے۔‘‘

’’میں نے سنا ہے کہ آپ کی مرضی کے بغیر کوئی یہاں نہیں آسکتا ہے؟‘‘

’’ہاں لیکن وہ وقت اب گزر گیا ہے جب سب میری مرضی سے ہوتا تھا۔ میں نے تمہیں بتایا ہے کہ میرا آخری وقت آگیا ہے اور اب میں اپنی مرضی کا مختار نہیں رہا ہوں۔‘‘

’’کیا رینا ٹ اوشا کے بارے میں جانتا ہے؟‘‘

’’نہیں اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا ہے سوائے میرے اور تمہارے۔‘‘

’’نہیں ایک شخص جانتا ہے اور جب برفانی آدمی اوشا کو لے گیا تھا تو اس نے پورے یقین سے اس کے بارے میں پیش گوئی کی تھی کہ وہ زندہ رہے گی اور مجھے واپس ملے گی۔‘‘

برف والے کے فراخ اور شفاف ماتھے پر شکنیں آگئیں۔ اس نے زیرِ لب کہا۔ ’’ڈیوڈ شا......‘‘

’’جی اسی نے کہا تھا۔‘‘

’’شاید میں بھی اس کے بارے میں ٹھیک سے نہیں جان سکا ہوں۔‘‘

میں نے اسے ڈیوڈ شا کے بارے میں بتایا۔ ’’وہ کچھ ماورائی علوم میں بھی دسترس رکھتا ہے۔ شاید عمل تنویم کا ماہر ہے۔ ستاروں کا علم جانتا ہے اور مستقبل کی پیش گوئی کر سکتا ہے۔ پھر جدید سائنسی علوم کا بھی ماہر ہے۔‘‘

برف والے نے سائنسی علوم کی وضاحت نہیں چاہی تھی اس کا مطلب ہے کہ وہ مادی علم کی اس تشریح سے واقف تھا۔ اب وہ زیادہ فکر مند لگ رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ’’میرے بیٹے نیچے جانا ہوگا۔ اب یہ بہت سے لوگوں کی ہی نہیں بلکہ اس وادی کی بقا کا مسئلہ بھی ہے۔‘‘

اس کے لہجے میں ایسی التجا تھی کہ میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے گہری سانس لے کر پوچھا۔ ’’اگر میں مان جاؤں تب بھی میں ان کی زبان نہیں جانتا۔‘‘

’’تم اس کی فکر مت کرو، ہاں کیرٹ کو یاد رکھنا۔‘‘ برف والے نے کہا اور پھر اس نے وہ حرکت کی جو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ اس نے اچانک ہاتھ بڑھا کر اپنا انگوٹھا میری کن پٹی پر رکھا اور اس کی انگشت شہادت میرے ماتھے پر سامنے آئی اور جب اس نے کن پٹی پر انگوٹھے کا دباؤ ڈالا تو جیسے میرے سر کے اندر ایک دھما کا ہوا اور میں ایک لمحے میں بے ہوش کر نیچے گر پڑا تھا۔ میں نہ جانے کتنی دیر بے ہوش رہا اور پھر جیسے میں اچانک بے ہوش ہوا تھا اسی طرح ہوش میں بھی آگیا۔ میرا سر کسی قدر بوجھل تھا مگر جہاں دھما کا سا ہوا تھا اب وہاں درد نہیں تھا۔ پھر میں چونک کر اٹھا کیونکہ میں اس ٹیرس پر نہیں تھا جہاں میں بے ہوش ہونے سے پہلے برف والے کے ساتھ تھا۔ بلکہ یہ نیچے اترنے والے راستے پر ایک کشادہ سی جگہ تھی۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ برف والے نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا اور میں یہاں کیسے آیا؟ کہ آہٹوں نے مجھے چونکایا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو نصف درجن قدیم طرز کے سپاہی نیزوں اور تیر کمان سے مسلح مجھے گھیرے کھڑے تھے۔ پھر ان میں سے ایک نے ہاتھ اٹھا کر میری طرف اشارہ کیا اور اپنے ساتھیوں سے بولا۔

’’پکڑ لو اسے۔‘‘

میرا ہاتھ اپنے شانے کی طرف گیا مگر وہاں رائفل نہیں تھی۔

(جاری ہے)

(نسیم مظہر کراچی کا جواب)

مرزا اسفار بیگ........ حیدر آباد

اپنی تو وہ مثال ہے جیسے کوئی درخت
دنیا کو چھاؤں بخش کے خود دھوپ میں جلے

محمد احمد جائی........ ملتان

آہٹ پہ کان در پہ نظر دل میں اشتیاق
کچھ ایسی بے خودی ہے تیرے انتظار میں

رمیشہ دیوریہ........ سکھر

اے عیش کوئی غم کا مارا دیتا ہے تسلی یوں مجھ کو
تجھ پر ہی نہیں آفت آئی دنیا پہ مصیبت آئی ہے

ارم حسین........ منڈی بہاؤ الدین

اس دور کا معیارِ محبت بھی ہے دولت
ٹھکراؤ مگر کچھ میری قیمت ہی لگا دو

غزالہ امتیاز........ کوٹلی جام

اس کی اپنی بیٹی کی ہتھیلی خشک رہتی ہے
جو بوڑھا دھوپ میں دن بھر حنا تقسیم کرتا ہے

عرشیہ ارشد........ ہری پور

اچھی گزر رہی ہے میری عمر آپ کے
وعدوں کے درمیان، بہانوں کے درمیان

(صدیق عثمانی ڈی آئی خان کا جواب)

ہادیہ ایمان، ماہا ایمان........ کھاتاں

وہ عزم ہو کہ منزل بیدار نہیں ٹھہرے
ہر نقش پا پہ جرأت راہوار ہنس پڑے

نرجس زیدی........ کراچی

وہ جہاں جو تو وہ خاشاک و خس تھا جل گیا
اور ابھی تک اس زمیں کو آسمان سمجھا ہے تو

نادیہ اصفہانی........ اسلام آباد

وہ مصائب زیست کا عنوان تھے
جن کو جینے کی سزا سمجھے تھے ہم

(عاصمہ اکبر کراچی کا جواب)

رانا حبیب الرحمٰن........ سینٹرل جیل لاہور

اب تو اس مرحلے بے خبری میں ہے انساں
کہ اپنے ہی خدوخال سے انجان ہو گئے

(امتیاز میمن میر پور خاص کا جواب)

نجمی رحمٰن........ برٹ لٹ (امریکا)

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

فہم انصار........ حیدر آباد

غم کا موسم بیت جائے شادمانی آئے گی
زرد شاخوں کے لیے پوشاک دھانی آئے گی

(نورین طلعت کراچی کا جواب)

منشی عزیز مگے........ لڈن

اے کاش دھڑکنوں کو ملے پھر کوئی زباں
جی چاہتا ہے لطفِ ستم گار دیکھنا

(حسنہ جعفری لاہور کا جواب)

عبدالجبار رومی انصاری........ لاہور

وسعت ہے میرے دل میں محبت بے کراں کی
وہ دشمن ہے یا غیر دل میں سما جائے گا

منظر علی خاں........ لاہور

وعظِ کمال ترک سے ملتی ہے ہر مراد
دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے

نوروز ملک........ لاہور

وہ ترا دشمن ہے مار آستیں ہے غیر ہے
جس کے پیکر میں محبت کو نہاں سمجھا ہے تو

(ناز، شادی پور کا جواب)

رانا حبیب الرحمٰن........ لاہور

آج محفل میں جھوٹ بول کر وہ لاجواب کر گیا تو کیا ہوا
سچائی خوشبو کی طرح ہے آج نہیں تو کل کو لوگ جان جائیں گے

سیف اللہ........ ملک وال

اک قیامت ہے کہ ہر شام گزر جاتی ہے
تو نے دیکھا نہیں نقشہ میری تنہائی کا

نورعین ملک........ بھلوال

اس شرط پہ کھیلوں گی پیا پیار کی بازی
جیتوں تو تجھے پاؤں ہاروں تو پیا تیری

ارم عارث........ کراچی
اپنی اپنی راحتوں سے جب بھی فرصت ملے
دوسروں کا درد بھی دل میں جگا کر دیکھیے
(ناعمہ تحریم کراچی کا جواب)

نسرین نیتا........ کوٹ ادو
یوں کمی سا پتا دیتا ہے احساسِ قیام
جیسے گھر سے کہیں ہمسائے چلے جاتے ہیں

حسنہ پروین........ کراچی
یہ زنگ جوہرِ دانش کو چاٹ جائے گا
مری لغت میں کچھ الفاظ معتبر ہیں ابھی

امتیاز احسن........لاہور
یہ سمجھ لینا کوئی مشکل نہ تھا میرے لیے
درد کی پہچان کا رشتہ ہے کیا میرے لیے
(محمد عزیز مے لڈن کا جواب)

قائم علی رضوی........ کراچی
نازک ہے بہت لفظ و معانی کا سلیقہ
ہر اہلِ نظر اہل زباں ہو نہیں سکتا

عرفان مروت........ حب (بلوچستان)
نمودِ صبح کا پیغام لا رہے ہیں چراغ
اندھیری رات کے دامن پہ چھا رہے ہیں چراغ

سید علی محمد جوادی........ حیدر آباد
نہ جانے کتنے غم لکھے ہوئے ہوں بے چاروں کی قسمت میں
نہ جانے جرمِ الفت میں مرے دل کی سزا کیا ہو
(فہیم منظر، کراچی کا جواب)

معراج محمد عباسی........ ہری پور
نصیحت کی تھی مجھے قیس نے صحرا کے بارے میں
یہ میرا گھر ہے اس کی چار دیواری نہ کرنا
(شیر نواز گل پشاور کا جواب)

احباب خان........ پشاور
یہ زمانہ اس نے تو مجھ کو بدل کر رکھ دیا
اس کے بدلے کچھ زمانے کو بدلتا جاؤں میں
(رانا حبیب الرحمٰن لاہور کا جواب)

تبریز حسن........ ملتان
آسماں سے ابھر کے نجمِ سحر
وسعتِ آسماں میں ڈوب گیا

نیاز احمد........ کراچی
اشک نکلے تو ہوا اندازہ
خشک تھا کب سے دریا مجھ میں

نسیم زہرہ........ لاہور
اے نگاہ چشم مست و خواب ناک و سرور سا
ہر کسی کو تو سمجھتی ہے سزاوار خدنگ
(فیصل شہزاد لکھویرا لڈن کا جواب)

نسیم نکہت........ اسلام آباد
نہ جنوں کی فتنہ خیزی نہ سبو نہ جام و مینا
نہیں جانے کیسے گزرے گا یہ موسم بہاراں

عاطف حسن........ لاہور
ناسازگاریوں نے مسلسل وہ غم دیے
چہرہ اتر گیا ہے ظہوری حیات کا

ذہین منیار........ کراچی
نظر اٹھائیں گے کیا مہر و ماہ کی جانب
جو ان کی روئے درخشاں کا خواب دیکھ چکے

نوشاد دلبر........ کوئٹہ
نہیں سنتا کسی کی بات ہی جب وہ سلیقے سے
سحر اس سنگ دل سے ہم کو تابِ التجا کیا ہو
(ذیشان اکبر کوئٹہ کا جواب)

نعیم اختر........ زاہدان (ایران)
موسیٰ سے سن کے واقعہ اک کوہسار کا
مجھ کو بھی شوق ہو گیا دیدار یار کا

ابرار احمد........ کوئٹہ
مجھ سے کہتی ہیں زمانے کی نگاہیں یہ رضا
تم ہو بیچ سے تم اہلِ نظر ہو شاید

نیاز اسرانی........ سکرنڈ
میری نظروں کی تمنا ہے مسلسل انتظار
سب کی نظروں کا تقاضا ہے کہ جلوا یار ہو

ناہید ارسلان........ جھنگ صدر
ماحول کے تپتے صحرا سے حالات کی اجڑی شاخوں سے
اہلِ جنوں پھولوں سے بھرے دامن کی توقع رکھتے ہیں

بینا مشتاق........ ملتان
مسلسل ذہن و دل پر ہے مسلط
یہ دنیا عارضی ہوتے ہوئے بھی

بیت بازی کا اصول ہے، جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدِ نظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔

نام: ....

پتا: ....
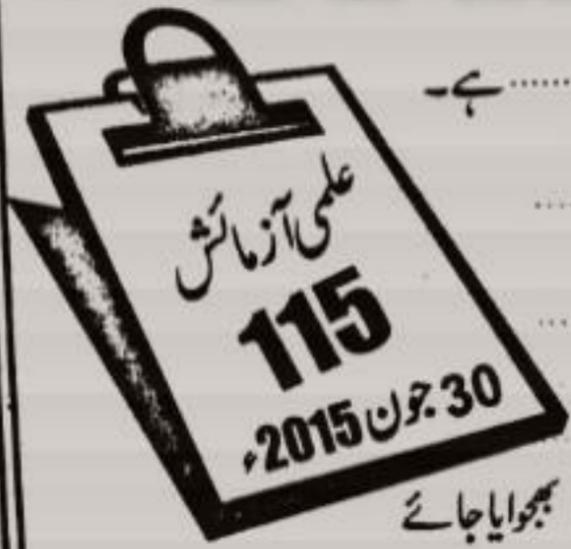
انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے
کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 جون 2015ء تک علمی آزمائش 115 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

مقابلہ

بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ ''بیت بازی'' شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کرسکتے ہیں۔

نام ....

پتا ....

....

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کررہاہوں اسے شاملِ اشاعت کرلیں (شعر الگ کاغذ پر ہے)

75

مقابلہ بیت بازی
پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

علمی آزمائش۔ 115

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماهنامه سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماهنامه پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک علمی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 28 جون 2015ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

17 اکتوبر 1817ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ دادا مغل فرماں رواں شاہ عالم کے عہد میں منتسب تھے اور نانا ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم۔ والد ایک مشہور نقش بندی بزرگ کے مرید تھے۔ انہوں نے ہی اس بچے کا نام تجویز کیا۔ بڑے ہونے پر اس بچے نے برصغیر میں تعلیمی انقلاب پیدا کر دیا۔ آج بھی لوگ ان کا نام ادب سے لیتے ہیں۔

علمی آزمائش 113 کا جواب

یحییٰ خاں 14 فروری کو چکوال میں پیدا ہوئے۔ 1938ء میں فوج میں کمیشن حاصل کیا۔ قیام پاکستان کے وقت اسٹاف کالج کے واحد مسلمان انسٹرکٹر تھے مگر بعد میں وہ تاریخ پاکستان کے سب سے متنازع کردار قرار دیے گئے۔

انعام یافتگان

1- محمد توفیق بوچہ، کراچی 2- ملک اظہر اللہ، سرگودھا 3- رانا بشیر احمد، چکوال
4- فہیم الدین شاس، حیدرآباد 5- گل ناز حسن زئی، ایبٹ آباد

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی تفسیر حسین، اقبال جاوید، نوشین توقیر، حیات توقیر، توقیر صدیق، مرتضیٰ احسن، عاقل حسین، عطا محمد، کاشان قریشی، یاسین جوکھیو، مرزا اختر بیگ، مریم کاشف، ارشاد علی، عباس خان، آغا ظہیر، قاسم جاہ، امداد حسین مرزا، فرحت فاطمہ، سید عباس رضا رضوی تنویر (دو کوپن)، انتصار حسین، ارباب خان، اشتیاق محمد، تانیہ ارم، قاسم علی خان، فرحت بیگ، صفدر علی خان، پیام عنایت، نسیم منظر، زہیب کمال، محمد ریحان، انیس بھٹائی، خادم حسین،

کاشف اختر، محمد برہان، ضیاء قزلباش، نوشین فاطمی۔ لاہور سے ظفر الحسن، فہیم عباسی، خاقان خان، کاظم علی سید، میاں توفیق، نازلی ناز، ناصر اکرم، شفقت ممتاز احسن، خالد چشتی، فخر بتول، نازش نسیم، اکرام بھٹ، وسیم انصاری، نیاز فیضان، زاہد علی سید، نوید شہناز، محمد فیض بخش صدیقی، بتول زیدی۔ پشاور سے حکیم سردار سوہن سنگھ، امیر حسن، زریاب اچکزئی، مفتی خان، احمد شفیق، باقر رضا طوری بنگش، انعم ممتاز، آفتاب حسن، نایاب زیدی، فراست خان۔ راولپنڈی سے عاجز ضیا عابدی، احمد نیاز، عقیب الدین، ظفر اسماعیل، سرفراز بٹ، احمد شیراز، ظفر خانزادہ، عابد الدین، سرفراز بٹ، گل فراز میمن، وسیع ہمدانی، احمد نیاز، فرحت بانو، ملک ارشد، عبدالواحد، نوشاد گجر، فہمیدہ اشرف، سلمان نیازی، نصیر نقوی، اشرف علی، عباس کھوکھر۔ اسلام آباد سے مرزا محمد ریاض راحیل، مسز نیلوفر شاہین، ملک رشید اصغر، فرحت عباس، توقیر اسلم، نازش علیم، دلدار نقوی، عباس حسن خان، فہیم الدین فہیم، نواز خان۔ ملتان سے خواجہ محمد حسین، محمد سجاد اعوان (مخدوم رشید) سبطین اصغر، راؤ ممتاز، فراست عباس زیدی، عنبرین انصاری، سرفراز علی، کمال الدین خاقان، الیاس حسن۔ حیدرآباد سے مرزا ہادی بیگ، مرزا اصفار بیگ، احمد سعید مراد آبادی، سلطان خان، الیاس حیدر پلیجو، واثق حسن، قرۃ العین طاہرہ، ناہید علی۔ جہلم سے امجد علی امجد، جمیل خان، نظیر احسن، سندس گیلانی، ثناء گیلانی، دلاور خان، سلیم احمد سلیم، نادر بخاری، غیاث الدین سوز، نوشین ملک۔ سرگودھا سے شفقت الرحمن، عاقل علی، عطا احمد، نوشین افضل، برہان الدین۔ چکوال سے فرہاد علی، صبیحہ محسن، قاسم جان، احمد علی، داور صدیقی، نعمان بٹ، ملک ممتاز۔ فیصل آباد سے حسان ملک، محمد سلام، ذیشان مجاہد، اشفاق خان، آفتاب علی۔ ڈی آئی خان سے فصاحت اللہ خان، ارباز سید، فہیم قاسم خان، قمر الحسن، محمد وحید۔ ڈی جی خان سے آفتاب علی نیازی، مرتضیٰ مرلاس، نیاز حسن زئی، قائم علی زیدی۔ گل باز خان، خالد آفریدی، ذکیہ ممتاز، عامر جمیل قریشی، محمد علی، صنوبر جوکھیو، صفہ بلوچ، ملک سرفراز۔ راولپنڈی سے: جویریہ حلیم، محمد سلیم، حافظ محمد اقبال، مرزا الطاف حسین، نفیسہ جمال، صغراں بیگم، نواز علی، مہوش خان، اطہر احمد قریشی۔ لالہ موسیٰ سے: رخسانہ یاسین، فوزیہ وہاب۔ اوکاڑہ سے: سید احسن محمود، جعفر افتخار، افضل بیزو۔ بہاولنگر سے: فرید عباسی، محمد ارشد ظفر۔ کراچی سے: محسن اختر بلوچ، سعید احمد چاند، سید عزیز الدین، نہال قیوم، شکیل اشرف، ساجد حمید، وجاہت، اسد علی، عبدالرؤف کھتری، دانش قریشی، وکیل عثمان، نشا خان، میر جاوید، ظفر سلطان، بلقیس عثمانی، سعید حیدر، انجم، اعتبار علی، رابعہ اختر، پروین بھٹو۔ یو اے ای العین سے: اشرف سفیر احمد، نعمان سعید۔ میرپور خاص سے مرزا طاہر الدین بیگ، ضیا احمد، نوشین ملک، فرحت اللہ، اظہر قائم خانی، نگہت مرتضیٰ، آفتاب حسن خان، عباس ڈھرکی، رام ولاس کورائی۔ میرپور آزاد کشمیر سے قمر سلطان، وحید بھٹ۔ کھاتاں سے شکیل الرحمن۔ میانوالی سے عبدالخالق (کالاباغ)، ملک صنوبر، آفتاب علی، باسط علی۔ بدین سے اشرف جوکھیو۔ بھٹ شاہ سے عباس مہک۔ ڈیرا بگٹی سے ثاقب الیاس۔ کوئٹہ سے فیض خان، خلیل عباس، ناصر کاظمی، نیاز خان، شاہ نواز، کاظم علی، اختر عباس، مہتاب خان، طٰہٰ حسن خان، انعام اللہ خاقان، نصرت علی خان۔ سکھر سے کمال احسن، محمد ریحان، سعید عباس عباسی، افضل سومرو۔ شکارپور سے نجمہ امتیاز۔ ماتلی سے ناز پھولپوٹو، ممتاز عباسی۔ تلہار سے صفور بھیو۔ جھنگ سے امینہ ملک، نگہت شاہد، شگفتہ مظہر۔ پارہ چنار سے اصغر حسین، عابد علی طوری، عندلیب۔ بہاولپور سے عالیہ فراز، نگینہ اصغر، شازیہ اظہر، فائز علی خان، ارم حسن کمال، فہیم نیازی، صغریٰ ابتسام علی۔ بہاولنگر سے حمیرہ اصغر، یاسر شاہ، غزالہ امراؤ۔ تلہ گنگ سے آصف خان، نگہت علی شاہ، مرتضیٰ حسن۔ جڑانوالہ سے انجم عالیہ سحر جبین۔ منڈی بہاؤالدین سے انصار حسین، ممتاز خانم ممتاز۔ چونیاں سے افضل شاہین خان، اقصیٰ۔ کوہاٹ سے صائمہ بنگش، عمران، اصغر علی۔ کوٹلی سے ارم حسن۔ کوٹ ادو سے عباس علی۔ شہر سلطان سے علی کوثر انصاری۔ مظفر گڑھ سے کلیم اللہ، توقیر علی، ندیم ممتاز، ارشاد حسن خان۔ بھکر سے منظر کلیم۔ حافظ آباد سے منور حسن، ناصر سید، فیضان اختر۔

بیرون ملک سے اشرف سید (جرمنی)، ارباز خان (ٹورنٹو کینیڈا)، ملیحہ خاتون (دبئی)، اشفاق خان (العین)، ذاکر علی خان (ڈیرا دبئی)

نادانیاں

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم!
آج کل پوری دنیا میں "سلفی" کا مرض بری طرح پھیل چکا ہے۔ لوگ تو جنازہ کندھے پر اٹھا کر بھی سلفی لیتے دیکھے گئے ہیں۔ یہ سلفی کس طرح زندگی برباد کررہا ہے اس کا ایک نمونہ میں بھیج رہی ہوں۔ یہ میری اپنی سرگزشت ہے لیکن میں نے اپنا اور اپنے شہر کا نام تبدیل کردیا ہے۔ اس وقت میں مملکت کینیڈا میں ہوں مگر دھڑکا اب بھی لگا ہوتا ہے۔

زبیدہ، ٹورنٹو
(کینیڈا)

"آپا اسے سنبھال کر رکھو۔" پڑوسن نے اماں سے کہا۔ "اس کا تو انگ انگ بولتا ہے۔"

میں صحن میں اپنی سہیلی کے ساتھ پہل دوج کھیل رہی تھی۔ پڑوسن تخت پر دال صاف کرتی اماں کے پاس بیٹھی تھی۔ غیرارادی طور پر میرے کان ان دونوں کی طرف لگے تھے۔ اماں نے جواب دیا۔ "میں خود پریشان ہوں، کم بخت چودہ کی ہے مگر جوان لگنے لگی ہے۔"

"بہت سی لڑکیاں چھوٹی عمر میں جوان لگتی ہیں پر یہ تو الگ ہی دکھتی ہے، ایسی لڑکیاں اندر سے......" پڑوسن کی آواز دھیمی پڑ گئی تھی اور میں اس سے آگے نہیں سن سکی تھی۔ مگر میں نے اماں کا منہ بنتے دیکھ لیا۔ انہوں نے کہا۔

"اب ایسی بھی نہیں ہے۔"

اپنی بات رد کیے جانے پر پڑوسن کھسیا گئی اور اٹھ کر چپل پہنتے ہوئے بولی۔ "نہ مانو، بعد میں نہ کہنا کہ خبردار نہیں کیا۔ میں چلتی ہوں، میاں گھر آنے والا ہے۔"

"ہاں اپنے میاں کو سنبھالو۔" اماں نے اس کے جانے کے بعد کہا اور دال چننے لگیں۔ میں بچپن سے متجسس قسم کی لڑکی تھی۔ میرے تجسس سے تنگ آکر بعض اوقات اماں مجھے عورت کہتی تھیں۔ سچی بات ہے مجھے بڑوں کی باتیں سننا اچھا لگتا تھا خاص طور سے جب عورتیں یا بڑی عمر کی لڑکیاں بات کررہی ہوتی تھیں تو میں ان کے آس پاس ہی منڈلاتی اور ان کی گفتگو سننے کی کوشش کرتی۔ میرا تجسس اس وقت مزید بڑھ جاتا جب گفتگو سرگوشیوں میں ہونے لگتی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں ان کی باتیں سمجھتی بھی تھی بس مجھے تجسس ہوتا کہ وہ اس طرح دھیمی سرگوشیوں میں کیوں بات کررہی ہیں۔ اتفاق سے گھر میں مجھ سے بڑی تین بہنیں تھیں اور تینوں ہی خاصی بڑی تھیں۔ سب سے بڑی شاہدہ آپا تھیں، ان کے بعد زاہدہ باجی اور ان سے چھوٹی ناہید باجی تھیں اور وہ بھی مجھ سے دس سال بڑی تھیں۔ مجھ سے بڑے دو بھائی تھے۔ یوں ہم کل چھ بہن بھائی تھے۔ اماں ابا کے چار بچے بچپن میں گزر چکے تھے۔

بچپن سے چلبلی اور کھیلنے کودنے میں تیز تھی۔ مگر گھر والوں کے کام بھی بھاگ بھاگ کر کرتی تھی اس لیے سب خوش رہتے تھے۔ مجھے گھر کے کام کر کے خوشی ہوتی تھی، البتہ جس کام سے میری جان جاتی تھی وہ پڑھنا اور اسکول جانا تھا۔ بچپن میں بہت مشکل سے اسکول جانا شروع کیا اور کئی سال تک صبح اسکول جاتے ہوئے میرا موڈ آف ہوتا اور کبھی کبھی روتی دھوتی تھی۔ رفتہ رفتہ مجھے اس معاملے میں صبر آگیا۔ اس وجہ سے بھی کہ میں جس اسکول میں پڑھتی تھی وہ بس ایسے ہی تھا اور وہاں تعلیم پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا تھا اور

بچوں کو بس پاس کر دیا جاتا تھا۔ میں خوش تھی کہ ہر سال زیادہ پڑھے بغیر کامیاب ہو جاتی تھی۔ ہاں ایک مضمون تھا جو مجھے شروع سے پسند تھا اور اس میں، میں خود سے محنت کر کے پاس ہوتی تھی۔ یہ مضمون اردو تھا کیونکہ چھ سات سال کی عمر میں مجھے کہانیاں پڑھنے کا شوق ہوا تھا۔ پہلے اماں اور بہنوں سے پڑھوا کر سنتی تھی لیکن جب تنگ آ کر انہوں نے سنانے سے انکار کیا تو میں خود کوشش کرنے لگی۔ بالآخر مجھے اردو پڑھنا آ گیا اور میں خود سے کہانیاں پڑھنے لگی۔

بچپن میں پہلے بچوں کی چھوٹی کہانیاں پڑھتی تھی۔ پھر بچوں کے رسالے پڑھنا شروع کیے اور ساتویں کلاس تک میں ڈائجسٹ پڑھنے لگی تھی۔ اماں کو مطالعے کا شوق نہیں تھا مگر تینوں بہنیں ڈائجسٹ پڑھتی تھیں اور ان کی وجہ سے گھر میں کئی ڈائجسٹ آتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کا انبار جمع ہو گیا تھا جسے بہنیں اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں۔ وہ کہانیاں پڑھتی اور پھر ان پر تبصرے کرتیں۔ میں یہ تبصرے غور سے سنتی تھی اور مجھے خود بہ خود ڈائجسٹوں اور انہیں لکھنے والی مصنفاؤں سے دل چسپی پیدا ہو گئی۔ پہلے میں نے چھپ کر ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیا کیونکہ اماں مخالف تھیں۔ انہوں نے بڑی بہنوں کو بھی بہت عرصے تک پڑھنے سے روکا تھا مگر جب وہ بڑی ہو گئیں تو اماں کی روک ٹوک ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا کرتی تھیں۔ ان کا الگ کمرا تھا اور وہ وہاں آرام سے ڈائجسٹ پڑھتی تھیں۔ میری مصیبت یہ تھی کہ میں اماں کے کمرے میں ہوتی تھی۔ گھر میں کل چار کمرے تھے۔ ایک اماں ابا کا، ایک بہنوں کا اور ایک بھائیوں کا تھا۔ چوتھا کمرا نشست گاہ تھی۔ اس لیے مجھے کونے کھدروں میں چھپ کر ڈائجسٹ پڑھنا پڑتا تھا۔ اگر پکڑی جاتی تو اماں کے ہاتھوں شامت آ جاتی تھی۔

میری تمام بڑی بہنیں عام شکل و صورت کی تھیں۔ پھر زمانے کی ہوا بھی نہیں لگی تھی کہ ذرا سج سنور کر رہتیں اور دنیا والوں کی نظر میں آتیں۔ اس لیے ان کی شادیاں دیر سے اور خاصی بڑی عمر میں جا کر ہوئی تھیں۔ شاہدہ آپا کی شادی بتیس سال کی عمر میں ہوئی تھی اور زاہدہ باجی بھی تقریباً اتنی ہی عمر میں پیا دیس سدھاری تھیں۔ البتہ ناہید باجی کی شادی تقریباً تیس برس کی عمر میں ہو گئی تھی۔ اس وقت میں بیس سال کی تھی۔ البتہ جس وقت کا ذکر کر رہی ہوں اس وقت میں چودہ سال کی تھی۔ جوانی کی جسمانی تبدیلیوں کا آغاز ہو گیا تھا اور ساتھ ہی ذہنی لحاظ سے بھی میچور ہو رہی تھی۔ مگر بہت سی باتیں جو میں چھپ چھپا کر یا ایسے ہی سن لیتی تھی وہ میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ بعد میں بہنوں یا اماں سے ان کی وضاحت چاہتی اور ان کے ہاتھوں بے عزتی کرواتی تھی۔ سہیلی کے جانے کے بعد میں اماں کے پاس آئی اور تجسس سے پوچھا۔

"اماں خالہ کیا کہہ رہی تھی۔ یہ انگ انگ کیسے بولتا ہے؟"

"بتاؤں تجھے۔" اماں نے جوتی اٹھاتے ہوئے کہا تو میں وہاں سے فرار ہوگئی تھی۔ اماں جب جوتی اٹھاتی تھیں تو مارے بغیر نہیں رکھتی تھی اور اب بھی ایسا ہی ہوا اماں نے عقب سے جوتی کھینچ کر ماری جو میری کمر سے ٹکرائی اور میں کراہ کر اندر آئی تھی۔ تینوں بہنیں بیٹھی ہوئی آپس میں کچھ سرگوشیوں میں بات کررہی تھیں۔ میں بھی ان کے پاس بیٹھی تو شاہدہ آپا نے ڈانٹ کر کہا۔

"یہاں کیوں گھسی آرہی ہے جا کر اپنا کام کر۔"

"کیا کام کروں۔" میں نے منہ بسور کر کہا۔ "اماں کے پاس جاؤ تو جوتی پڑتی ہے اور تم لوگوں کے پاس آؤ تو بھگا دیتی ہو۔ میں کہاں جاؤں؟"

"جوتیاں کھانے والے کام جو کرتی ہے۔" زاہدہ باجی بولیں۔

"اسے چھوڑو یہ بتاؤ کہ انگ انگ کیسے بولتا ہے؟" میں جوتی کی چوٹ بھلا کر بولی تو وہ تینوں ہنسنے لگیں۔ زاہدہ باجی نے کہا۔

"اماں سے پوچھا تھا؟"

"اسی پر تو اماں نے جوتی ماری۔" میں نے اپنی کمر سہلائی۔

"سوال ہی جوتی کھانے والا ہے۔"

میں اتنی متجسس تھی کہ پھر جوتی کھانے کو تیار تھی۔ مگر میری بہنوں نے بتا کر نہ دیا۔ وہ مجھے ٹالتی رہیں اور ہنسی مذاق کرتی رہیں۔ میں مایوس ہو کر ان کے پاس سے اٹھ گئی۔ ان تینوں کی عمروں میں زیادہ فرق نہیں تھا مگر میں بہت چھوٹی تھی اس لیے ہمیشہ ان کے گروپ سے الگ رہی۔ اتفاق سے اسکول میں بھی جو میری سہیلیاں تھیں وہ سب مجھ سے چھوٹی یا آس پاس تھیں اور ایسے معاملات میں ان کی بھی معلومات زیادہ نہیں تھیں۔ اس لیے کوئی میری تسلی نہ کرسکا۔ کئی دن میں بہت بے چین رہی کہ اس کا کیا مطلب ہوسکتا ہے، پھر رفتہ رفتہ ذہن سے نکل گیا اور میں بھول گئی۔ جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی بہت سی باتوں کا علم وشعور ہوتا چلا گیا۔ سولہ سترہ سال کی ہوئی تو بہنوں نے میری جوانی قبول کرلی اور اب وہ میرے سامنے بھی بے تکلفی سے بات کرلیتی تھیں۔

میرا رنگ بہنوں کے مقابلے میں گورا تھا۔ بہت گورا ... تو نہیں تھا مگر اسے واضح سرخ وسفید کہا جاسکتا تھا۔ صبیح نقوش اور لائٹ براؤن آنکھیں اور بالوں کا رنگ بھی ایسا ہی تھا۔ موتیوں کی طرح دمکتے دانت جو مسکراہٹ کو جلا دیتے تھے۔ نازک سے ہاتھ پاؤں اور خوب صورت جسم تھا۔ مجھے شروع سے اپنا جسم خوب صورت لگتا تھا۔ لباس بدلتے ہوئے کبھی خود کو ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں دیکھتی تو مجھے لگتا کہ میں بہنوں میں ۔۔۔ سب سے خوب صورت ہوں۔ حالانکہ شاہدہ آپا اور زاہدہ باجی کی شادی بھی ہوگئی تھی اور شادی کے بعد ان کے جسم بھر گئے تھے۔ مگر وہ اب بھی دلکش نہیں لگتی تھیں بلکہ مجھے تھوڑی سی بھدی لگتی تھیں۔ ناہید باجی بھی ایسی ہی تھیں۔ انہیں دلکش اور خوب صورت نظر آنے کے لیے جتن کرنا پڑتے تھے اور پھر بھی وہ مشکل سے خوب صورت لگتی تھیں۔ جب کہ میں عام سے حلیے میں اور سادہ سے لباس میں بھی اچھی لگتی تھی۔ یہ بات میں نہیں بلکہ میری تمام سہیلیاں اور کزنز بارہا کہہ چکی تھیں۔ خود میری بہنیں میری تعریف کرتے نہیں تھکتی تھیں۔

پندرہ سولہ سال کی عمر میں احساس ہوا کہ میں خوب صورت ہوں تو میں نے اپنا خیال رکھنا شروع کردیا۔ خاص طور سے صفائی کا بہت خیال رکھتی تھی۔ گرمیوں میں ہر روز اور سردیوں میں بھی ایک دن چھوڑ کر ایک دن نہاتی تھی۔ صبح اور رات دوبار دانت صاف کرتی اور مجھے ایسا کوئی شوق نہیں تھا جو منہ اور دانتوں کو گندہ کرتا۔ پان تو دور کی بات میں سادہ چھالیہ اور سپاری تک نہیں کھاتی تھی۔ چائے کا مجھے شوق نہیں تھا۔ بس کسی کے ہاں جاتی تو پی لیتی تھی۔ اپنے بالوں کا خاص خیال رکھتی تھی میں اٹھارہ سال کی تھی تو ان کی لمبائی میری کمر سے نیچے آرہی تھی گھنے اتنے تھے کہ میری کلائی سے موٹی میری بالوں کی چوٹی ہوتی تھی۔ جسمانی ساخت ایسی تھی کہ معمولی لباس بھی بج جاتا اور اسی وجہ سے امی مجھے دیکھ کر ہولتیں اور کہتیں۔ "کم بخت دو کو تو بڑی مشکل سے رخصت کیا ہے اور تیسری بیٹھی ہے، تو کہاں سے فٹا فٹ لائن میں لگ گئی۔"

"لو اماں کوئی بارہ سال کی ہوں کیا۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "انیس سال کی ہونے والی ہوں اور آپ نے ہی بتایا تھا کہ آپ کی شادی سولہ سال کی عمر میں ہوگئی تھی۔"

اماں نے سر ہلایا۔ "ارے تو وہ وقت اور تھا۔ شادی بیاہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ اب تو لڑکیاں پہاڑ بن گئی ہیں جب تک گھر بیٹھی ہوں لگتا ہے سینے پر دھری ہیں۔"

بہنوں سے نہیں کہا تھا مگر اماں کو چھیڑتی تھی۔ ''آپ نے بھی چن چن کر پیدا کیے۔ ذرا جو ایک ڈھنگ کا ہو سوائے میرے۔''

''ہاں...... ہاں بس تو ہی مال زادی ہے نا۔'' اماں کا ہاتھ جوتی کی طرف جاتا اور مجھے فرار ہونا پڑتا تھا۔ میرا نام زبیدہ تھا اور شروع میں سب بیدو کہتے تھے مگر مجھے اس نک نیم سے چڑ آتی تھی اس۔۔۔ لیے میں نے اپنا نک نیم خود رکھ لیا اور زیبا کہلوانے لگی۔ رفتہ رفتہ سب زیبا کہنے لگے۔ اتفاق کی بات ہے میری صورت بھی فلم اسٹار زیبا سے ملتی تھی۔ اگرچہ وہ اب پرانی ہوگئی تھی مگر پھر بھی اس کا شہرہ تھا خاص طور سے اماں کی پسندیدہ اداکارہ تھی۔ انہوں نے توجہ دلائی تھی کہ میری صورت زیبا سے ملتی ہے۔ یعنی اماں بھی مانتی تھیں کہ میں شکل صورت کی اچھی ہوں۔ ایک دن میں نے اماں ابا کو باتیں کرتے سنا۔ اماں حسبِ معمول بیٹیوں کے لیے پریشان تھیں۔ ابا نے ان سے کہا۔

''زیبا کی تم فکر مت کرو۔''

''کیوں نہ کروں؟'' اماں نے تنک کر کہا۔ ''بیٹی ہے میری۔''

''ارے میرا یہ مطلب نہیں ہے۔'' ابا ہنسے۔ ''بھئی وہ پیاری ہے اور ایسی لڑکیوں کے لیے رشتوں کی کمی نہیں ہوتی۔''

اماں نے سوچا اور ابا کی بات کی تائید کی۔ ''کہہ تو ٹھیک رہے ہیں جہاں جاتی ہوں محفل میں کوئی نہ کوئی اس کے بارے میں سوال ضرور کرتا ہے۔ مگر ابھی تو اس سے بڑی بیٹھی ہے اس لیے لوگوں کو ٹال دیتی ہوں کہ ابھی ارادہ نہیں ہے۔''

''بس تو اطمینان رکھو۔''

ان ہی دنوں ناہید باجی کی شادی بھی ہوگئی۔ میری تینوں بہنوں کی شادیاں عام سے گھرانوں میں اور عام سے مردوں سے ہوئی تھیں۔ بلکہ شاہدہ آپا اور زاہدہ باجی کے شوہر عمروں میں بھی ان سے خاصے بڑے تھے۔ ناہید باجی کے شوہر ان سے چار سال بڑے تھے مگر شکل و صورت کے لحاظ سے میرے بہنوئیوں میں وہی سب سے کم تھے۔ ناہید باجی ان سے شادی پر آمادہ نہیں تھیں اور اماں ابا کے بہت زور دینے پر مانی تھیں۔ یہ اور بات تھی کہ شادی کے بعد سب بہنوں میں سب سے زیادہ خوش بھی وہی ہیں۔ تینوں بہنوں کو اللہ نے خاصی اولاد سے نوازہ ہے اور میری شادی

تک جب وہ ہمارے ہاں ایک ساتھ آتیں تو گھر بھر جا تا تھا۔ اس وقت تک بھائیوں کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ میرے بڑے بھائی حمید کی شادی میری شادی کے ساتھ ہی ہوئی تھی۔ مجھ سے بڑے وحید کی شادی میرے بعد ہوئی تھی۔

میں نے مشکل سے میٹرک تک پڑھا اور تین بار یو میں بالآخر میٹرک کا امتحان پاس کر ہی لیا۔ اس سے پہلے ہی میں نے اعلان کر دیا تھا کہ اب میرا آگے پڑھنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اماں ابا نے بھی اعتراض نہیں کیا کیونکہ ہمارے ہاں لڑکیوں کو زیادہ پڑھانے کا رواج نہیں تھا۔ تینوں بڑی بہنوں نے بھی میٹرک ہی کیا تھا اور دونوں بھائی میٹرک کے بعد ڈپلومہ کر کے ملازمتوں پر لگ گئے تھے۔ ابا کا لیتھ مشین کا کارخانہ تھا۔ کام اچھا مگر محنت والا تھا۔ بھائیوں نے ڈپلومہ کر کے کارخانہ سنبھال لیا اور اب وہ موٹر سائیکل کے پرزے بناتے تھے اس سے آمدنی بڑھی تھی۔ خاص طور سے جب تک میری شادی کا وقت آیا تو گھر میں خاصی خوشحالی آگئی تھی۔ پہلے ہمارا گھر ایک منزلہ تھا پھر اسے دو منزلہ کر لیا۔ ابا کا ارادہ تھا کہ حمید بھائی کی شادی کے بعد انہیں اوپر والا پورشن دے دیں گے۔ گھر میں نیا فرنیچر اور دوسرا سامان بھی آگیا تھا۔ میرے مزے ہوئے کیونکہ پہلے مجھے صرف ابا اماں خرچ دیتے تھے اور اب بھائی بھی خرچ دینے لگے تھے۔ اسی طرح میری فرمائشیں بھی پوری کرتے تھے۔

ان ہی دنوں میں نے پہلا موبائل لیا تھا اور میری شدید خواہش تھی کہ مجھے کیمرے والا موبائل ملے اور میں اپنی دل بھر کر تصویریں لے سکوں۔ میری تقریباً ساری سہیلیاں ایسے موبائل لے چکی تھیں اور جب وہ دکھاتیں کہ وہ کیسے موقع بہ موقع اپنی تصویریں خود لے کر فیس بک پر اپ لوڈ کرتی ہیں۔ ان دنوں اسمارٹ موبائل عام نہیں تھے مگر کیمرے والے موبائل بہت عام تھے۔ اس وقت سیلفی کہنے کا رواج نہیں تھا۔ حمید بھائی نے مجھے اکیسویں سالگرہ پر ایسا موبائل گفٹ کیا تو میں خوشی سے پاگل ہوگئی تھی۔ اب میرا مشغلہ یہی تھا کہ صبح سے شام تک اپنی تصویریں لیتی تھی اور اماں سے صلواتیں سنتی۔ اماں بے چاری سمجھتی تھیں کہ ان باتوں سے لڑکیاں بگڑ جاتی ہیں۔ حالانکہ وہ جانتی ہی نہیں تھیں کہ ہمارے معاشرے میں بگاڑ اور خرابیاں کیسے آرہی تھیں اور ان کی جڑ موبائل فون تھا مگر میں ان کو بتا کر اپنے ہاتھ پاؤں نہیں کٹوا سکتی تھی۔ اماں سب سے پہلے میرا

موبائل لے لیتیں چند دنوں میں موبائل میری زندگی کا لازمی حصہ بن گیا تھا میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

اٹھارہ برس کی عمر میں میٹرک کر کے گھر بیٹھ گئی تھی اور گھر کی ذمے داریاں پوری کرتی تھی۔ صبح کا ناشتا اماں بناتی تھیں۔ اس کے بعد میں دوپہر کا کھانا بناتی۔ جب تک ناہید باجی کی شادی نہیں ہوگئی رات کا کھانا میں اور وہ مل کر بناتے تھے۔ کبھی کبھی اماں بھی مدد کر دیتی تھیں۔ ناہید باجی کی شادی کے بعد اماں میرا ہاتھ بٹانے لگیں۔ صفائی کرنے اور کپڑے دھونے کے لیے ماسی آتی تھی۔ البتہ اتوار والے دن مجھے خود صفائی کرنا پڑتی تھی۔ اتوار والا دن سب سے زیادہ مصروفیت کا ہوتا تھا کیونکہ کوئی نہ کوئی آیا ہوتا تھا اور اس کے لیے اہتمام کرنا پڑتے تھے۔ اس لیے مجھے سب سے زیادہ اتوار سے چڑ آتی تھی۔ باقی دنوں میں آرام ہوتا تھا اور کاموں کے درمیان مجھے اپنے لیے بہت وقت مل جاتا تھا۔ میں دل بھر کر ڈائجسٹ پڑھتی اور موبائل پر اپنی سہیلیوں سے ایس ایم ایس یا کال پر گپ شپ کرتی تھی یا پھر فیس بک استعمال کرتی۔

شاہدہ آپا کی شادی کے بعد لڑکیوں والے کمرے میں مجھے جگہ مل گئی تھی۔ پھر زاہدہ باجی گئیں اور ان کے بعد ناہید باجی بھی بیاہ کر چلی گئیں تو کمرا بلا شرکت غیرے میرا ہو گیا۔ ہمارے ہاں کمپیوٹر تھا مگر وہ نشست گاہ میں رکھا ہوا تھا اور مجھے اس کے استعمال کا موقع کم ملتا تھا۔ موبائل سے نیٹ استعمال کرنا مہنگا پڑتا تھا اس لیے میں فیس بک بھی کم استعمال کرتی تھی۔ مگر مجھے مسئلہ نہیں تھا وقت گزاری کے لیے بہت کچھ تھا۔ بائیس سال کی ہوئی تو امی کو میری شادی کی فکر ہوئی۔ اگرچہ میری بہنوں کی شادیاں خاصی بڑی عمر میں ہوئی تھیں مگر وہ مجبوری تھی اور امی چاہتی تھیں کہ میری شادی مناسب عمر میں کر دی جائے اس لیے جاننے والوں میں میرے لیے رشتے کا کہنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی امی حمید بھائی کے لیے لڑکی تلاش کر رہی تھیں۔ وہ ہم دونوں کو ایک ساتھ ہی نمٹانا چاہتی تھیں۔

ابا کا کہنا درست ثابت ہوا میرے لیے رشتہ تلاش کرنا زیادہ مشکل نہیں ثابت ہوا۔ ثاقب کی امی نے مجھے ایک شادی میں دیکھا اور وہیں امی سے بات کر لی۔ ثاقب ان کے اکلوتے بیٹے تھے۔ یہاں ایک فرم میں سول انجینئر تھے۔ اپنی گاڑی اور گھر تھا۔ کھاتے پیتے لوگ تھے اور اچھے علاقے میں رہتے تھے۔ امی کو یہ رشتہ اچھا لگا اور انہوں نے ابو اور بھائیوں سے بات کی۔ انہیں بھی یہ رشتہ پسند آیا اور ان کی رضامندی سے امی نے آنٹی کو اوکے کا سگنل دیا اور وہ باقاعدہ رشتہ لے کر ہمارے ہاں آگئیں۔ ان کا خاندان زیادہ بڑا تھا۔ ثاقب سے بڑی ایک بہن تھیں اور وہ بیاہ کر کینیڈا گئی تھیں۔ ثاقب کے والد کئی سال پہلے گزر چکے تھے۔ اب بڑے سے گھر میں بس دو ماں بیٹے رہتے تھے۔ شادی میں آنٹی میری تیاری اور گفتگو سے متاثر ہوئی تھیں اور وہ سمجھیں کہ میں خاصی پڑھی لکھی ہوں کم سے کم گریجویٹ ہوں مگر جب انہیں یہاں آکر پتا چلا کہ میں صرف میٹرک پاس ہوں تو وہ ذرا پریشان ہوئیں۔

شادی کے لیے ثاقب کی شرط یہی تھی کہ لڑکی خوب صورت اور پڑھی لکھی ہو۔ شادی کی تقریب میں وہ جاتے ہوئے اپنے موبائل کے کیمرے سے میری تصویر لیتی گئی تھیں اور ثاقب نے مجھے پسند کیا تھا۔ انہوں نے جاتے ہوئے امی سے چپکے سے کہا کہ وہ پہلے ثاقب کو بتائیں گی اور اسے منانے کی پوری کوشش کریں گی اگر وہ مان گیا تو پھر بات آگے بڑھے گی۔ امی کو یہ رشتہ پسند آیا تھا اس لیے وہ فکر مند ہوگئیں کہ کہیں ثاقب تعلیم والے معاملے میں اڑ گیا تو کیا ہوگا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ ثاقب موبائل میں تصویر دیکھ کر مجھ پر ایسا فریفتہ ہوا کہ اس نے میرے میٹرک پاس ہونے کو ذرا بھی اہمیت نہیں دی۔ اس نے آنٹی سے کہا کہ وہ مجھ سے ہی شادی کرے گا اور اگر اسے محسوس ہوا کہ میری تعلیم میں کمی ہے تو وہ مجھے آگے پڑھائے گا۔ اگلے دن ہی آنٹی نے امی کو کال کر کے خوشخبری سنا دی اور امی بھی خوش ہوگئیں۔ یہ سن کر میں ذرا پریشان ہوئی تھی کیونکہ میرا آگے پڑھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ثاقب کی بات سن کر ہی میں نے سوچ لیا کہ اگر اس نے کہا تو میں اسے منا لوں گی۔ پھر بات چیت اور رکھ رکھاؤ ایسا کروں گی کہ اسے مجھ میں کوئی کمی محسوس ہی نہ ہو۔

آنٹی آچکی تھیں اور اب ہماری باری تھی۔ پہلے حمید بھائی نے ثاقب کے بارے میں انکوائری کروائی اور اس میں سب اوکے آیا تھا۔ اس لیے ایک مہینے بعد ہی میری اور ثاقب کی باقاعدہ نسبت طے ہوگئی تھی۔ اس دوران میں میری بے چینی عروج پر رہی۔ پہلے اس کی وجہ یہ تھی کہ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ ثاقب دیکھنے میں کیسا تھا۔ اتفاق سے آنٹی رشتے کے لیے آتے ہوئے اس کی تصویریں لانا بھول گئی تھیں۔ مگر حمید بھائی اس سے ملے اور وہ اس کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ اس کے باوجود میں بے چین تھی۔ خدا خدا

کر کے کئی ہفتے بعد ان کی طرف سے ثاقب کی تصاویر ملیں۔ میں نے تصویریں دیکھیں اور پہلی نظر میں ثاقب میرے دل میں اتر گیا تھا۔ اس کا رنگ پرکشش کھلتا ہوا گندمی مائل تھا۔ سیاہ چمکتی آنکھیں اور کھڑے نقوش کے ساتھ ہلکی سی مونچھیں اور فرنچ کٹ اسے مزید خوبرو بنا رہی تھیں۔ اس نے جدید فیشن کی دور کی نظر کی عینک لگا رکھی تھی اور اس پر یہ بھی بچ رہی تھی۔ جسم چھریرا اور قد پانچ فٹ دس انچ تھا۔ مجھ سے پانچ انچ زیادہ تھا اور بہ قول ناہید باجی کے ہماری جوڑی خوب بنتی۔

ثاقب کو دیکھ کر مجھے چین آیا اور ساتھ ہی اپنی خوش نصیبی پر رشک بھی آیا کہ میری شادی ایسے پڑھے لکھے اور خوب صورت مرد سے ہو رہی تھی۔ اس کی عمر تیس کے پاس تھی مگر دیکھنے میں پچیس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ رشتہ طے ہونے سے پہلے میں نے اسے فیس بک پر تلاش کر کے اپنے پاس ایڈ کر لیا اور ہمارے درمیان اس کی مدد سے بات ہونے لگی تھی۔ مجھے پہلے ہی فیس بک پر اپنی تصویریں دینے کا شوق تھا مگر جب ثاقب نے فرمائش کی تو میں اپنی نت نئے پوز میں تصویریں فیس بک پر لگانے لگی اور کچھ ایسی تصویریں جو میں نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اور دیکھے تو وہ میں اسے پرائیویٹ میسیج کر دیتی تھی۔ پھر وہ جس طرح میرے حسن کی تعریف کرتا اس سے میری روح تک سرشار ہو جاتی۔ مجھے لگتا کہ میں نہ جانے کب سے ان بولوں کی پیاسی تھی اور اب جا کر میری پیاس بجھ رہی تھی۔ ثاقب کا والہانہ پن بتا رہا تھا کہ وہ میرا دیوانہ ہو گیا ہے۔ اس نے دو تین بار مجھ سے کہیں ملنے کی فرمائش کی مگر میں نے اسے بتایا کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں لڑکیاں اکیلے کہیں باہر نہیں جا سکتی ہیں اور کسی کے ساتھ جا کر میں اس سے نہیں مل سکتی تھی۔

رشتہ طے ہونے کے بعد ثاقب ایک بار ہمارے ہاں آیا تو میں نے کھڑکی سے چھپ کر اسے دیکھا تھا اور وہ بے چارہ میری ایک جھلک دیکھے بغیر ہی چلا گیا۔ اس پر بہت دنوں تک وہ تڑپتا رہا تھا اس نے کہا کہ اسے یوں لگا جیسے ازل کا پیاسا ٹھنڈے پانی کے چشمے کے پاس سے ہو کر چلا گیا ہے۔ خود میں بھی تڑپ گئی تھی۔ مگر ہم دونوں یوں صبر کر رہے تھے کہ شادی کی دونوں طرف سے جلدی تھی۔ رشتہ ہونے کے ایک مہینے بعد ہی شادی کی تاریخ رکھ دی گئی تھی اور یہ دو مہینے بعد کی ایک تاریخ تھی۔ اماں نے پہلے ہی تیاری شروع کر دی تھی۔ بڑی بہنوں کی شادی کے وقت مالی تنگی تھی مگر

اب ہاتھ کھلا تھا اس لیے میرا جہیز اور دوسری چیزیں اتنی شاندار بنیں کہ جس نے دیکھا رشک کرتا رہ گیا۔ اسی طرح میری بری بھی بہت اچھی آئی تھی۔ مگر مجھے ان چیزوں کا ہوش کہاں تھا۔ میری تو بس یہی خواہش تھی کہ وقت کو پر لگ جائیں اور وہ دن آ جائے جب ثاقب مجھے ہمیشہ کے لیے اپنے گھر لے جائے، میں اس کی اور وہ میرا ہو جائے۔

بالآخر وہ دن آ گیا۔ ایک اچھے ہال میں حمید بھائی کے ولیمے کے ساتھ میری رخصتی بھی ہوئی تھی۔ میری اب تک کی کہانی سے پڑھنے والوں کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہمارا تعلق ایک نچلے درجے کے خاندان سے تھا۔ اماں اور ابا دونوں طرف سے ہمارا خاندان ایک ہی تھا اور یہ سارے کاری گر قسم کے لوگ تھے۔ جو زیادہ تر اپنا کام کرتے تھے۔ اکثر گھرانے پیسے والے تھے مگر تہذیب اور تمیز چند ایک گھرانوں میں تھی جنہوں نے تعلیم کو بھی اہمیت دی تھی۔ آپ کو سن کر تعجب ہو گا کہ اس دور میں ہمارے خاندان میں نہ صرف کئی لڑکیاں بلکہ لڑکے بھی بالکل ان پڑھ تھے اور وہ اسی شہر کراچی میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے تھے۔ دوسری طرف ثاقب کا خاندان تعلیم و تہذیب یافتہ تھا۔ مجھے ایک بار پھر رشک آیا کہ میری شادی ایسے خاندان میں ہوئی ہے اور میں نے دلہن بنتے بنتے عہد کیا کہ میں بھی ان کا حصہ بن کر دکھاؤں گی تاکہ ثاقب کو کبھی میری وجہ سے کہیں شرمندگی نہ ہو۔

ہمارا نکاح دو دن پہلے ہی ہو گیا تھا اور اب رخصتی کی رہی کارروائی تھی۔ ثاقب میرے پاس آ کر بیٹھا تو مجھے لگا میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ حالانکہ یہ تعبیر تھی۔ سہاگ رات یوں گزری کہ پتا ہی نہیں چلا۔ میں مدہوش سی ثاقب کے پہلو میں لیٹی ہوئی تھی کہ اس نے کہا۔ ”زیبا تیرا انگ انگ بولتا ہے۔“

میں چونکی اور مجھے برسوں پرانی بات یاد آ گئی جب پڑوسن نے اماں سے یہی بات کہی تھی اس وقت میں اسے صحیح معنوں میں نہیں سمجھی تھی مگر بعد میں اس کا مطلب جان گئی تھی البتہ اپنے حوالے سے یہ جملہ پھر سننے کو نہیں ملا تھا۔ آج ثاقب نے یہ جملہ کہا تو میں چونک گئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”آپ نے یہ کیوں کہا ہے؟“

”پتا نہیں میں نے محسوس کیا ہے تبھی کہا ہے۔“ وہ والہانہ انداز میں بولا۔ ”سچ کہوں تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ تم اندر سے بھی اتنی حسین نکلو گی۔“

میں شرما گئی۔ "کیسی باتیں کر رہے ہیں؟"

"دل تو اس سے بھی زیادہ بولنے کو چاہ رہا ہے مگر جھجک آرہی ہے۔ اب مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے انجینئر بن کر جھک کیوں ماری۔ شاعر بنا ہوتا تو تمہاری تعریف میں غزل کہتا۔ دیوان بنا دیتا۔"

"ابھی تو آپ دیوانے ہو رہے ہیں۔"

"ہاں تم نے بنایا ہے۔" اس نے حسرت سے مجھے دیکھا۔ "رات گزر گئی اور کتنی جلدی گزر گئی کاش کہ یہ رات ٹھہر جاتی۔"

خواہش تو میری بھی یہی تھی مگر میں نے کہا۔ "بس جناب اب ذرا آرام کر لیں۔ ورنہ صبح سوتے رہ جائیں گے۔"

ہمیں کچھ دیر سونے کا موقع ملا اور ہم فریش ہو گئے تھے۔ اس کے بعد آنے والے چند دن بہت مصروفیت کے تھے۔ ولیمہ دو دن بعد تھا۔ ثاقب کو اس کے انتظامات بھی دیکھنے تھے۔ پھر آنے جانے والوں کا ایک تانتا بندھا ہوا تھا۔ میں اماں کے پاس ایک رات رہ کر آگئی اور ثاقب سے کیسے دور رہی یہ میرا ہی دل جانتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان دنوں ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے ترس گئے تھے۔

خدا خدا کر کے یہ چند دن گزرے اور ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کا موقع ملا تو میں نے سکون کا سانس لیا اور ثاقب دیوانہ ہو گیا تھا اور میں اس کے پاگل پن پر خوش بھی ہوتی اور شرماتی بھی تھی۔ میں اس سے کہتی۔ "چند دن بعد یہ جنون اتر جائے گا تب مجھے کتنا سونا لگے گا۔"

"یہ جنون کبھی نہیں اترے گا۔" وہ یقین سے کہتا۔ "زیبا تو نے مجھے اپنا اسیر کر لیا ہے۔ میں چاہوں بھی تو تجھ سے دور نہیں جا سکوں گا۔"

اس کی عملی محبت سے زیادہ اس کے الفاظ کی ستائش مجھے بھی پاگل کر دیتی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ثاقب کے لیے اپنے اندر موجود محبت کا اظہار کیسے کروں؟ وہ مرد تھا اس لیے اظہار میں بے باک تھا مگر میں عورت ہونے کے ناطے جھجک جاتی تھی۔ اسے تو نہیں مگر دس بارہ دن بعد مجھے ہوش آنے لگا اور میں نے اس سے کہا۔ "اب ہم رات ہوتے ہی کمرے میں نہیں آئیں گے۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ آنٹی بھی ہیں اور ہمیں ان کو بھی کمپنی دینی چاہیے۔ وہ کیا سوچتی ہوں گی؟"

اس نے بے پروائی سے کہا۔ "تم فکر مت کرو امی جانتی ہیں کہ ان دنوں آدمی کو اپنا ہوش نہیں ہوتا ہے۔"

"ہاں مگر وہ چند دن گزر چکے ہیں اور اب ہمیں کچھ نہ کچھ ہوش کرنا ہوگا۔"

ثاقب نہیں مان رہا تھا مگر میں نے اسے منا لیا۔ وہ میری بات نہیں ٹالتا تھا۔ ویسے بھی ثاقب کی چھٹی ختم ہونے والی تھی اور اس نے دو دن بعد ڈیوٹی پر جانا تھا اس لیے میں چاہتی تھی کہ اس کے جانے سے پہلے گھر میں ایک ماحول بنا لوں۔ آنٹی سچ مچ بہت سمجھدار خاتون تھیں اور انہوں نے کبھی اشارتاً بھی ہمیں نہیں جتایا کہ ہم اتنی جلدی کمرے میں چلے جاتے تھے اور پھر صبح بھی دیر سے نکلتے تھے۔ اس لیے جب میں اگلے دن صبح سویرے نکلی تو وہ کچھ حیران اور خوش ہوئی تھیں۔ تینوں وقت کھانا وہی بناتی تھیں۔ انہوں نے کہا۔ "تم جلدی کیوں اٹھ گئیں آرام کرتیں۔"

"نہیں آنٹی آرام بہت کر لیا اب کام کی باری ہے۔"

میں نے کہا اور ان کے منع کرنے کے باوجود ان کے ساتھ مل کر ناشتا بنایا اور اسی دوران میں دبے لفظوں میں ان سے معذرت بھی کر لی کہ شادی کے بعد میں انہیں زیادہ وقت نہیں دے سکی تھی۔ انہوں نے مجھے گلے لگایا۔

"میں سمجھتی ہوں کہ یہی وقت ہوتا ہے جب میاں بیوی ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں۔ یہ دو جسموں کا نہیں دو ذہنوں کا ملاپ بھی ہوتا ہے اور مجھے یقین ہے اللہ نے تم دونوں کے اندر ایک دوسرے کے لیے بہت ساری محبت رکھ دی ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" میں نے شرما کر کہا۔

"بس اسی لیے میں بھی خوش ہوں کہ میری بہو اور بیٹے میں محبت ہو اور ان کی ساری عمر ایسے ہی گزرے۔"

ثاقب آیا تو وہ کچھ جھینپا ہوا تھا مگر پھر آنٹی کے رویے کی وجہ سے وہ بھی نارمل ہو گیا۔ دوپہر میں وہ کام سے چلا گیا اور میں کمرے میں جانے کی بجائے آنٹی کے ساتھ رہی اگرچہ انہوں نے ابھی باقاعدہ کھانا بنانے سے منع کر دیا کہ اس کے لیے وہ باقاعدہ ایک دعوت کریں گی۔ مگر میں چھوٹے موٹے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتی رہی۔ یہ دو سو گز پر بنا ہوا بنگلا نما گھر تھا۔ تین بیڈز اور ڈرائنگ کے ساتھ بڑا سا لاؤنج تھا جس میں اوپن کچن اور ڈائننگ بھی تھا۔ ایک بیڈ آنٹی کے پاس تھا اور ایک ثاقب کا تھا جو اب میرا تھا اور تیسرا بیڈ آنے جانے والوں کے لیے مخصوص تھا مگر اس کی نوبت بہت کم آتی تھی۔ میری نند شمیم بھائی کی شادی پر آئی

تھی مگر ویسے کے اگلے ہی دن چلی گئی تھی۔ آنٹی نے بتایا کہ وہ کئی کئی سال بعد آتی تھی اتنی دور سے آدمی ہر سال بھی نہیں آسکتا تھا۔ آنٹی کا ارادہ تھا کہ میں سیٹ ہو جاؤں تو وہ بیٹی کے پاس ایک چکر لگا آئیں۔

"اب تک میں ثاقب کی وجہ سے نہیں جاسکی مجھے اس کی فکر رہتی ہے کیونکہ اسے اپنا کوئی کام خود کرنے کی عادت نہیں ہے۔"

یہ سچ تھا ثاقب کو کچھ بھی خود کرنے کی عادت نہیں تھی۔ اسے اپنی ہر چیز تیار چاہیے ہوتی تھی۔ ہاں وہ پھیلاوا نہیں کرتا تھا اور جو چیز جہاں سے لیتا وہیں رکھتا تھا۔ ورنہ اس نے زندگی میں اپنے لیے چائے کا ایک کپ بھی نہیں بنایا تھا۔ "آپ فکر مت کریں آنٹی میں اب سب دیکھ لوں گی آپ کا جب دل چاہے شمیم باجی کے پاس ہو آئیں۔"

"وہ بس تم لوگ دعوتوں اور ہنی مون سے نمٹ لو اس کے بعد دیکھتی ہوں۔"

میری اور ثاقب کی شادی سردی میں ہوئی تھی اس لیے ہمیں ہنی مون کے لیے شمالی علاقے کی طرف جانے کے لیے دو مہینے انتظار کرنا پڑا تھا۔ اس دوران میں دعوتیں نمٹاتے رہے۔ ہفتے میں ایک بار میں میکے جاتی تھی اور کبھی کبھی اماں ابا اصرار کرتے تو رک جاتی تھی مگر اگلے ہی دن واپس آجاتی تھی۔ جس طرح ثاقب میرے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اسی طرح میں بھی اس کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ دو مہینے بعد ثاقب نے بیس دن کی چھٹیاں لی تھیں اور ہم ٹور پر نکلے۔ پہلے لاہور گئے اور وہاں دو دن رک کر اسلام آباد پہنچے وہاں بھی دو دن رہے اور یہ سارے دن سیر و تفریح میں گزرے تھے پھر ہم سوات پہنچے ان دنوں خراب حالات سے گزر کر سوات کی رونقیں پھر سے بحال ہو رہی تھیں۔ واپسی میں مری اور نتھیا گلی سے ہوتے ہوئے آئے تھے۔ یہ دن کیسے گزرے کچھ پتا ہی نہیں چلا تھا؟ سچی بات ہے میرا واپس آنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا اور میں نے کتنی بار ثاقب سے کہا کہ ہم یہیں رہ جاتے ہیں بے شک ایک جھونپڑی ڈال لیں۔ وہ ہمیشہ سرد آہ بھر کر کہتا۔ "خواہش تو میری بھی یہی ہے لیکن رہ نہیں سکتے۔"

انسان کی بہت سی خواہشیں ایسی ہوتی ہیں جو خواہش ہی رہ جاتی ہے۔ ہم واپس آئے تو آنٹی نے کینیڈا جانے کی تیاری شروع کر دی۔ ان کے پاس بھی کینیڈا کی شہریت تھی اور ثاقب چاہتا تو اسے بھی آسانی سے مل سکتی تھی مگر اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنی موجودہ جاب سے مطمئن ہے۔ یہ ایک غیر ملکی ملٹی نیشنل کنسٹرکشن کمپنی تھی۔ جس کے پروجیکٹ ساری دنیا میں پھیلے ہوئے تھے اور وہ یہاں بھی کام کرتی تھی۔ زیادہ تر پرائیویٹ ٹھیکے لیتی تھی۔ ثاقب انجینئر تھا اور اچھی تنخواہ لے رہا تھا۔ پھر گھر اپنا تھا اس لیے مطمئن تھا۔ مجھے بھی اپنا ملک اچھا لگتا ہے۔ بے شک اس میں کتنی مشکلات اور مسائل ہیں مگر ہمارے سارے جاننے والے یہیں تھے اس لیے میں ثاقب کے فیصلے سے بالکل متفق تھی۔ ثاقب نے آنٹی کے لیے ٹکٹ اور دوسرے بندوبست کیے اور ہماری واپسی کے پندرہ دن بعد وہ روانہ ہو گئیں۔ ان کا ارادہ سارے گرما وہاں رہنے کا تھا اور وہ ستمبر میں واپس آتیں کیونکہ وہاں سردی بہت شدید ہوتی ہے اور آنٹی سے سردی برداشت نہیں ہوتی تھی۔

میں مطمئن تھی کہ میں اکیلے رہ لوں گی مگر جب ایک دن اکیلے رہنا پڑا تو مجھے تنہائی زیادہ محسوس ہوئی تھی۔ بڑے سے گھر میں بالکل اکیلی تھی اور ثاقب صبح کا گیا تو شام آیا تھا اور اس دوران میں صرف ماسی آئی اور دو گھنٹے میں سارے کام نمٹا کر وہ بھی چلی گئی۔ ثاقب کو صبح بھاری ناشتے کی عادت تھی کیونکہ وہ لنچ نہیں کرتا تھا اس کے ساتھ میں بھی بھاری ناشتا کرنے لگی۔ مجھے ویسے بھی ناشتے کی عادت تھی۔ پہلے میں پراٹھا اور چائے لیتی تھی مگر ثاقب نے مجبور کر کے مجھے ابلے ہوئے انڈے اور دودھ کا گلاس لینے پر مجبور کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ شادی شدہ زندگی میں توانائی کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے مجھے توانائی والی چیزیں لینی چاہییں۔ چھٹی والے دن مکھن، توس اور شہد سے ناشتا کیا جاتا تھا۔ مجھے ان چیزوں کی عادت نہیں تھی مگر ثاقب کی وجہ سے میں بھی یہی کھانے لگی تھی۔ سچی بات ہے مجھے کھانے کی عادتیں بدلنا پڑی تھیں۔ کیونکہ میں ثاقب کی دیوانگی میں اس کا ساتھ نہیں دے پاتی تھی۔ قربتوں کے سفر میں جلد تھک جاتی تھی۔ اس لیے اب خوراک میں توانائی والی چیزیں لینے لگی اور اس کا اثر بھی ہوا تھا۔

میں نے بتایا کہ مجھے موبائل کا شوق تھا۔ شادی تک میرے پاس ایک ہی موبائل رہا جو مجھے حمید بھائی نے دلایا تھا۔ شادی کے بعد بھی میرے پاس یہی تھا اور کیونکہ اس کا کیمرا بہت اچھا تھا اس لیے مجھے ضرورت نہیں محسوس ہوئی کہ دوسرا موبائل لوں یا ثاقب سے کہوں۔ پھر مجھے کسی اور چیز کا خیال بھی نہیں آتا میرے لیے ثاقب کی ہمراہی ہی سب کچھ تھی۔ شادی کے بعد میں نے اس سے یہ مشکل ہی

کسی چیز کی فرمائش کی۔ وہ خود میرے لیے چیزیں لاتا تھا۔

ایک دن ثاقب دفتر سے آیا تو اس نے اشارے سے مجھے کمرے میں آنے کو کہا۔ میں سمجھی کہ شاید وہ رومانی موڈ میں ہے۔ مگر جب میں اندر آئی تو اس نے ہاتھ پیچھے کر کے مجھ سے پوچھا۔ ''تمہارے لیے کچھ لایا ہوں۔''

''سچ۔'' میں خوش ہوگئی۔ ''کیا لائے ہیں؟''

''تم بوجھو۔''

''بھئی مجھے کیا پتا دکھائیں نا۔''

ثاقب نے ہاتھ آگے کیا تو اس میں ایک ڈبا بند موبائل تھا۔ یہ ایک اچھی کمپنی کا جدید اسمارٹ ٹچ فون تھا۔ میں نے خوش ہو کر شکریہ ادا کیا تو ثاقب نے کہا۔ ''کاش میں روز تمہارے لیے ایسی کوئی چیز لاسکوں تا کہ تم اسی طرح خوش ہو کر شکریہ ادا کرو۔''

میں شرما گئی۔ ''جی نہیں ہر بار نہیں۔''

''موبائل تو دیکھو۔''

''میں جانتی ہوں آج کل ٹی وی پر اس کا اشتہار آرہا ہے۔'' میں نے ڈبا کھولتے ہوئے کہا۔ موبائل کو چارج کرنا تھا۔

ثاقب نے کہا۔ ''جانتی ہو خاص طور سے یہ ماڈل کیوں لایا ہوں؟''

''اچھا ہے اس لیے؟''

''نہیں بلکہ اس کا کیمرا رزلٹ بہت لاجواب ہے۔'' ثاقب نے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ جب میں آفس میں ہوں تب بھی تم اپنی پک لے کر مجھے واٹس اپ کردو۔''

''ایسی بھی کیا بے تابی۔'' میں شرما کر ہنسی۔ ''آپ کے پاس میری کتنی ہی پک ہیں موبائل میں۔''

''ہاں لیکن میں دیکھنا چاہوں گا کہ اس وقت تم کیسی لگ رہی ہو اس لیے جب میں کہوں تم مجھے اپنی پک لے کر واٹس اپ کروگی۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے سر ہلایا۔

اب دفتر سے ثاقب کا ایس ایم ایس آتا کہ میں اپنی سیلفی لے کر اسے واٹس اپ کروں اور میں اپنی فوری سیلفی لے کر اسے بھیج دیتی۔ کبھی کبھی ثاقب فرمائش کرتا کہ اس پوز میں تصویر دوں تو میں ویسی تصویر لے کر بھیجتی۔ وہ دن میں متعدد بار مجھے ایس ایم ایس یا کال کرتا تھا اس لیے میں موبائل اپنے پاس ہی رکھتی تھی۔ تا کہ اسے فوری جواب دے سکوں یا کال ریسیو کرسکوں۔ دو تین بار میں نے موبائل کہیں چھوڑا اور اسے جواب نہیں ملا تو وہ پریشان ہوگیا اور شام کو گھر آکر مجھ سے ناراض ہوا تھا۔ اس لیے اب میں خاص خیال رکھتی تھی۔ حد یہ کہ واش روم جاتی تب بھی موبائل میرے پاس ہوتا تھا۔ اس دن میں کچن صاف کر کے فارغ ہوئی تو گرمی کا احساس ہوا میں نے کپڑے نکالے اور نہانے کے لیے واش روم میں آئی۔ ابھی شاور کا آغاز کیا تھا کہ موبائل کی بیل بجی۔ میں شیمپو کر رہی تھی اس لیے کال ریسیو نہیں کرسکی۔ بیل بج کر خاموش ہوگئی۔ میرا خیال تھا کہ ثاقب کی کال ہوگی۔ اس لیے میں نے عجلت میں غسل مکمل کیا اور تولیہ باندھتے ہوئے موبائل تک آئی۔ حسبِ توقع ثاقب کی کال تھی۔ میں نے اسے جوابی کال کی۔

''آپ کال کر رہے تھے۔''

''ہاں کہاں تھیں تم؟'' اس نے خراب موڈ کے ساتھ کہا۔

''سوری میں شاور لے رہی تھی اس وقت شیمپو کیا ہوا تھا کیسے کال ریسیو کرتی۔ شاور لیتے ہی آپ کو کال کی ہے ابھی کپڑے تک نہیں پہنے۔''

''اچھا۔'' ثاقب کا موڈ بدل گیا۔ ''کیسی لگ رہی ہو، سیلفی لے کر بھیجو۔''

''کیا؟'' میں بوکھلا گئی۔ ''کیسی بات کر رہے ہیں۔''

''کردونا....'' اس نے اصرار کیا۔ ''میرے علاوہ کون دیکھے گا۔''

میں نے انکار کیا مگر ثاقب پیچھے پڑ گیا کہ مجھے اسی وقت دیکھنا چاہتا ہے۔ میں نے جسم پر تولیہ باندھا ہوا تھا۔ مجبوراً میں نے واش روم کے آئینے کے سامنے آکر اپنی سیلفی لی اور پھر اسے ثاقب کو واٹس اپ کردیا۔ مگر ساتھ ہی اسے میسج کیا کہ وہ تصویر دیکھتے ہی ڈیلیٹ کردے۔ کچھ دیر بعد اس کا ایس ایم ایس آیا۔

''جان غضب ڈھا رہی ہو کیا ایک پک بغیر تولیے کے نہیں ہوسکتی۔''

میں نے اس بار صاف انکار کیا اور اپنے انداز سے بتا دیا کہ مجھے اس کی یہ بات بالکل اچھی نہیں لگی تھی۔ ثاقب نے محسوس کرلیا اور اس نے سوری کی تھی مگر میرا موڈ شام تک ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ شام کو جب ثاقب آفس سے آیا تو میں نے اس سے کہا۔ ''آیندہ آپ مجھ سے ایسی کوئی سیلفی لینے کو نہیں کہیں گے۔ میں آپ کی ہوں یہاں گھر میں بیڈ روم میں مجھے جیسے چاہیں دیکھیں مگر اب مجھ سے ایسی فرمائش

مت کیجیے گا۔''

''اچھانا۔'' اس نے شرمندگی سے کہا۔ ''پتا نہیں مجھے اس وقت کیا ہوا تھا جو تم سے ایسی فرمائش کر دی۔''

''آپ نے اپنے موبائل سے پک ڈیلیٹ کر دی۔''

''بالکل تم خود دیکھ لو۔'' ثاقب نے اپنا موبائل میرے حوالے کیا اور میں نے اس میں موجود اپنی تمام تصویریں دیکھ کر تسلی کر لی کہ وہ تصویر سچ ڈیلیٹ کر دی گئی ہے۔ مجھے ثاقب کی بات کا یقین تھا مگر ساتھ ہی خدشہ تھا کہ کہیں اس کی کوئی کاپی نہ رہ گئی ہو۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ رات ثاقب نے مجھ سے کہا کہ میں تصویر میں جتنی حسین اور دلکش لگ رہی تھی شاید حقیقت میں ایسی نہ لگوں۔ میں نے خفا ہو کر کہا۔

''تب مجھے موبائل کے کیمرے سے ہی دیکھا کریں۔''

ثاقب نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''پھر تم ہی ناراض ہو گی۔''

''جی نہیں اب کوئی ایسی ویسی تصویر نہیں ہو گی۔''

ثاقب کچھ دیر مجھے چھیڑتا رہا پھر اس نے سوری کر لی کہ اب وہ مجھے اس لحاظ سے تنگ نہیں کرے گا۔ اگلے دن تک بات میرے ذہن سے نکل گئی۔ ثاقب کی کمپنی کے پروجیکٹ صرف کراچی نہیں بلکہ ملک کے اور بھی علاقوں میں تھے۔ ان میں کئی کام بڑے تھے۔ شادی سے پہلے ثاقب کئی بار دوسرے شہروں اور علاقوں میں چلنے والے پروجیکٹس پر کام کرنے جا چکا تھا اور ہر بار اسے دو تین ہفتے وہاں رکنا پڑا تھا۔ آنٹی کے جانے کے ایک مہینے بعد اچانک اسے بتایا گیا کہ اسے اسلام آباد میں چلنے والے پروجیکٹ کے لیے وہاں جانا تھا۔ کمپنی اسے ایک مہینے کے لیے بھیج رہی تھی۔ ثاقب پریشان ہو گیا کیونکہ وہ مجھ سے دور نہیں جانا چاہتا تھا۔ مجھے پتا چلا تو میری حالت اس سے زیادہ بری ہو گئی۔ میں خود کون سا اس سے دور رہ سکتی تھی۔ میں نے ثاقب سے کہا۔

''میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی۔''

اس نے بے بسی سے کہا۔ ''نہیں لے جا سکتا، وہاں مجھے کوئی الگ جگہ نہیں ملے گی بلکہ سائٹ پر ہی ایک چھوٹا سا کیمپ ہے سارا اسٹاف وہاں رہتا ہے۔ تمہیں کہاں رکھوں گا؟''

''تب میں کیا کروں گی؟'' میں روہانسی ہو گئی۔ ''آپ جانتے ہیں آپ کے بغیر ایک دن بھی کتنا

مشکل ہے۔ اسی لیے امی کے گھر ٹھہرنے بھی کم جاتی ہوں۔ حالانکہ سب اتنا بلاتے ہیں اور پھر طعنے بھی دیتے ہیں۔''

''تو میں کون سے رہ سکتا ہوں لیکن کیا کروں مجبوری ہے۔ نوکری کی ہے تو بات ماننا ہی پڑے گی۔''

''آپ چلے جائیں گے پورے ایک مہینے کے لیے۔'' میں نے ڈوبتے لہجے میں کہا۔ مجھے لگ رہا میں خود کہیں ڈوب رہی ہوں۔ ''میں کیسے رہوں گی۔ یہاں رہوں یا امی کے پاس چلی جاؤں۔''

''یہاں اکیلے کیسے رہ سکتی ہو۔'' ثاقب نے کہا۔ ''ایسا کرو کہ امی کے پاس چلی جاؤ۔''

''نہیں وہاں وائی فائی نہیں ہے اس کے بغیر میں آپ سے واٹس اپ پر بات نہیں کر سکوں گی۔'' میں نے انکار کیا۔ یہاں ڈی ایس ایل لگا ہوا تھا اور اس کے وائی فائی سے میں موبائل کی مدد سے انٹرنیٹ استعمال کرتی تھی۔ گھر میں بھائیوں نے کیبل نیٹ لیا ہوا تھا جو صرف کمپیوٹر سے استعمال ہوتا تھا۔ وہاں وائی فائی نہیں تھا۔

''تب ایسا کرو امی کو یہاں بلا لو۔'' ثاقب نے تجویز پیش کی۔ میں خوش ہو گئی۔ میں بہت دنوں سے اماں سے کہہ رہی تھی کہ وہ کچھ دن کے لیے میرے پاس رہنے کو آجائیں مگر اماں ٹال رہی تھیں۔ اب اس بہانے اماں کو بلا سکتی تھی۔ وہاں بھائی بھابی تھیں وہ ابا اور بھائیوں کو دیکھ لیتیں۔ بھابی ویسے تو اچھی تھیں مگر ذرا کاہل واقع ہوئی تھیں اور زیادہ کام کرنا پڑتا تو ان کی حالت خراب ہو جاتی تھی۔

میں نے اماں سے بات کی اور میری مجبوری دیکھتے ہوئے وہ آنے کو تیار ہو گئیں۔ گھر کے لیے بہانہ کیا کہ اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتے کہ علاقے میں چوریاں بہت ہو رہی ہیں۔ خود اماں بھی گھر کے کام کر کے تھک گئی تھیں اور اب کچھ عرصے آرام کرنا چاہتی تھیں۔ اس لیے وہ مان گئیں اور ثاقب کے جانے سے دو دن پہلے آ گئیں۔ اماں کو اکیلے سونے کی عادت تھی اس لیے ان کے لیے گیسٹ ہاؤس والا کمرا سیٹ کر دیا۔

اماں کے آنے سے میرا وقت اچھا گزرنے لگا اور میں جو سوچ رہی تھی کہ ثاقب کا دور جانا مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔ مگر امی کی وجہ سے میں دن میں نارمل رہتی تھی۔ ہاں رات کو جب سونے کے لیے کمرے میں آتی اور لیٹتی تو ثاقب کی شدت سے یاد آتی مگر یہ وقت یوں پاس ہو جاتا کہ ثاقب مجھ سے واٹس اپ پر بات کرتا یا براہ راست بات کرنے کو دل چاہتا تو کال کر لیتا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بات کر کے ہم دونوں ہی مطمئن ہو جاتے اور رات نیند آ جاتی تھی۔ ثاقب کے ساتھ میں عام طور سے نائٹی میں ہوتی تھی کیونکہ اسے میرا نائٹی پہننا اچھا لگتا تھا۔ اس کے موڈ کے لحاظ سے مختلف نائٹیاں پہنتی تھی۔ مگر جب اماں آئیں تو میں عام لباس میں سونے لگی۔ میں کمرا لاک نہیں کرتی تھی اور مجھے معلوم تھا کہ اماں اچانک کمرے میں آ سکتی تھیں۔ مجھے محتاط رہنا پڑتا تھا۔ اس رات بھی میں عام سے لباس میں تھی کہ ثاقب نے مجھے دیکھنے کی فرمائش کی۔ میں نے سیلفی لے کر اسے بھیج دی۔ اس کا جواب آیا۔ ''یہ کیا تم نے نائٹی نہیں پہنی۔''

میں نے جواب دیا۔ ''وہ تو آپ کے ہوتے ہوئے پہنتی ہوں ابھی پہن کر کیا کروں۔''

''میرے لیے ہی پہنو اور سیلفی لے کر مجھے دکھاؤ۔''

میں نے اسے یاد دلایا۔ ''پلیز ثاقب میں آپ سے کہہ چکی ہوں کہ میں اپنی اس قسم کی کوئی تصویر اب نہ لوں گی اور نہ آپ کو بھیجوں گی۔''

''پلیز زیبی۔'' اس نے التجا کی۔ ''تمہارا یہ دیوانہ تمہیں دیکھنے کے لیے تڑپ رہا ہے۔ تم سے دور ہے تو تصویر ہی مل جائے کہ کچھ تو دل بہلے۔''

''آپ نے مجھے ہی دیکھنا ہے چاہے نائٹی میں دیکھیں یا عام لباس میں۔''

''ہاں لیکن جو غضب تم نائٹی میں ڈھاتی ہو وہ بات اس سوٹ میں کہاں سے آئے گی پلیز زیبا۔''

میں نے انکار کیا اور ثاقب نے اصرار کیا۔ مگر ہمارے ہاں رواج ہے کہ عورت کو ہی ہار ماننا پڑتی ہے اور مجھے ہار ماننا پڑی۔ میں نے اس کی پسند کی نائٹی پہنی اور اس میں اپنی تصویر لے کر اسے واٹس اپ کر دی۔ اس نے فرمائش کر کے کئی طرح کے پوز میں تصویریں لینے کو کہا اور میں نے جب ایک فرمائش پوری کر دی تھی تو باقی کرنے میں کیا حرج تھا۔ اگرچہ ان سیلفیز میں میرا جسم بہت نمایاں تھا مگر میں مانتی گئی اور ثاقب خوش ہوتا رہا اس نے تصویریں دیکھ کر فوری ڈیلیٹ کر دی تھیں۔ کم سے کم اس نے کہا یہی تھا۔ دو تین دن بعد اس نے دوبارہ پھر اسی قسم کی فرمائش کی حالانکہ پچھلی بار میں اس سے کہہ چکی تھی کہ اب وہ مجھ سے نہ کہے۔ اس نے مبہم سا وعدہ کیا تھا اور اسی کا سہارا لے کر وہ پھر میرے پیچھے پڑ گیا۔ مجبوراً مجھے اس بار بھی ماننا پڑا۔ چند

دن بعد اس نے پھر میری سیلفی مانگی۔ میں جانتی تھی کہ وہ میرا دیوانہ ہے اور مجھ سے دور رہنا اس کے لیے کتنی بڑی آزمائش ہے اس لیے دل پر جبر کر کے اپنے محبوب شوہر کی ایسی فرمائشیں بھی پوری کرتی رہی۔

ثاقب نے مجھے بڑا اچھا والا موبائل دلایا تھا مگر ابھی اسے آئے ہوئے دو مہینے بھی نہیں ہوئے تھے کہ اس نے گڑبڑ شروع کر دی۔ کبھی ہینگ ہو جاتا اور کبھی خود بہ خود ری اسٹارٹ ہو جاتا۔ کبھی کوئی اپلی کیشن کام نہیں کرتی تھی۔ پھر میں ثاقب سے مدد لیتی اور وہ مجھے بتاتا اور موبائل ٹھیک ہو جاتا۔ لیکن ایک دن میں صبح اٹھی تو وہ موبائل بند پڑا ہوا تھا۔ میں سمجھی چارج ختم ہو گیا ہے چارج پر لگایا مگر پھر بھی آن نہیں ہوا۔ میرے پاس پرانا موبائل بھی تھا اور وہ بھی استعمال میں رہتا تھا۔ میں نے اس سے کال کر کے ثاقب کو موبائل کے بارے میں بتایا تو اس نے فون پر ہی مختلف طریقے بتائے جن سے موبائل آن ہو سکتا تھا مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ ثاقب نے کہا۔ ”مجھے لگ رہا ہے اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہو گیا ہے میں ہوتا تو وارنٹی والوں کو دکھاتا مگر ابھی تم کہیں آس پاس چیک کرا لو۔“

”کہاں سے کراؤں میں تو بالکل نہیں جانتی کہ موبائل کہاں ری پیئر ہوتے ہیں۔“

”میں تمہیں بتاتا ہوں۔“ ثاقب نے کہا اور علاقے میں ہی ایک بڑے شاپنگ سینٹر کا بتایا جہاں میں اکثر جاتی تھی وہیں موبائل کی شاپس بھی تھیں اس نے ایک شاپ کا نام بتایا۔ ”یہاں ہر طرح کا موبائل ری پیئر ہوتا ہے اور وہ کام بھی جلدی کر کے دیتا ہے۔ تمہیں ہاتھ کے ہاتھ کر دے گا۔“

”ٹھیک ہے میں جلد امی کے ساتھ جاؤں گی۔“

”جلد نہیں آج ہی جاؤ۔“ اس نے بے تابی سے کہا اور میں اس کی بے تابی کی وجہ سمجھ رہی تھی۔ صرف اسی موبائل سے میں اپنی سیلفی لے کر اسے بھیج سکتی تھی۔ پرانے موبائل میں واٹس اپ نہیں چلتا تھا اس پر صرف فیس بک استعمال ہو سکتی تھی اور میں فیس بک پر کسی صورت اپنی ایسی تصویریں اسے میسج نہیں کر سکتی تھی کیونکہ میں نے سنا تھا اور خود ثاقب نے بھی بتایا تھا کہ فیس بک بہت آسانی سے ہیک ہو جاتا ہے اور کوئی بھی آپ کے اکاؤنٹ تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ ثاقب کو گئے ہوئے تین ہفتے ہونے کو آئے تھے اور میں نے سوچا کہ اگر میں موبائل بنوانے میں ذرا دیر کروں تو پھر اس کے آنے کا وقت ہو جائے گا اور میں اسے سیلفی کے مطالبے پر ٹال سکوں گی۔ شاید اس نے بھی یہ بات محسوس کر لی اس لیے جب میں ایک دن نہیں گئی تو اس نے اگلے دن مجھ سے پھر جانے کو کہا۔ ”چلی جاؤں گی اتنی جلدی کیا ہے یہ موبائل ہے تو آپ سے بات کرنے کے لیے۔“

”ایک موبائل کا کچھ بھروسا نہیں ہے تم اسے بھی ٹھیک کراؤ، آج ہی جاؤ۔“

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ میں نے بہانہ کیا۔

”ٹھیک ہے میں اختر سے کہتا ہوں۔“ اس نے اپنے کزن کا نام لیا۔ ”وہ آکر تم سے لے جائے گا اور ٹھیک کرا کے واپس لا دے گا۔“

میں اپنا موبائل کسی کو نہیں دیتی تھی کہ اس میں میری ذاتی چیزیں تھیں اس لیے میں نے جلدی سے کہا۔ ”آپ اختر بھائی سے نہ کہیں، میری طبیعت ٹھیک ہو گی تو میں شام تک چلی جاؤں گی۔ ویسے بھی آپ جانتے ہیں مجھے اپنا موبائل کسی کو دینا اچھا نہیں لگتا ہے۔“

”میں شام تک دیکھتا ہوں اس کے بعد میں اختر کو کال کر دوں گا۔“

شام کے قریب ثاقب نے پھر پوچھا اور مجبوراً میں نے کہا۔ ”اچھا بابا جا رہی ہوں آپ تو پیچھے ہی پڑ جاتے ہیں۔“

میں امی کے ساتھ نکلی اور رکشا لے کر شاپنگ سینٹر پہنچ گئی۔ کچھ کام اور تھے وہ بھی نمٹانے تھے اور سب سے آخر میں میں موبائل شاپ پر پہنچی۔ وہاں ایک نوجوان لڑکا کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اپنا موبائل اس کے سامنے رکھا۔ ”بھائی اسے دیکھنا یہ آن نہیں ہو رہا۔“

اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا اور بولا۔ ”باجی یہ نیا ہے ہارڈ ویئر کا مسئلہ تو ہم حل نہیں کر سکتے ہیں لیکن سوفٹ ویئر کر سکتے ہیں۔ آپ کہیں تو میں چیک کر لیتا ہوں۔ جب تک آپ کوئی اور کام کر کے آ جائیں۔“

”کوئی اور کام نہیں ہے آپ دیکھ لیں میں یہیں ہوں۔“ میں نے جواب دیا تو اس نے کمپیوٹر سے ایک تار لے کر موبائل کی یو ایس بی پورٹ میں لگائی اور اپنے کمپیوٹر پر کچھ دیکھنے لگا۔ اس کے مانیٹر کی اسکرین اس طرح رکھی تھی کہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں موبائل دیکھ رہی تھی وہ آن نہیں ہوا تھا۔ یعنی اس کی اسکرین آف تھی۔ چند منٹ اچانک

اسکرین آن ہوئی۔ اس نے کہا۔ "باجی سوفٹ ویئر کا مسئلہ ہے آپ کہیں تو دوبارہ سوفٹ ویئر کر دوں مگر اس میں موجود آپ کا سارا ڈیٹا اڑ جائے گا۔"

اس میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کی مجھے فکر ہوتی ہاں یہ فکر ہوتی کہ وہ کوئی اور نہ دیکھ لے اس لیے میں نے اسے اجازت دے دی کہ وہ اڑا دے اور اس نے مشکل سے پندرہ منٹ میں موبائل میں دوبارہ سوفٹ ویئر کر کے دے دیا۔ میں نے اسے استعمال کر کے دیکھا واقعی وہ بالکل ٹھیک کام کر رہا تھا مگر سارے فولڈر خالی ہو گئے تھے۔ یعنی اس میں موجود میری تصاویر اور دوسری چیزیں ڈیلیٹ ہو گئی تھیں۔ میں مطمئن ہو کر گھر آ گئی اور ثاقب کو بتایا کہ موبائل ٹھیک ہو گیا ہے اور رات ہوتے ہی اس کا فرمائشی پروگرام شروع ہو گیا۔ میں نے فرمائش پوری کر دی۔ اگلے دن جب خاصی دیر تک ثاقب کی طرف سے نہ تو کوئی کال آئی نہ واٹس اپ اور نہ ہی کوئی میسج تو میں نے پریشان ہو کر اسے کال کی۔ جواب میں ریکارڈنگ سنائی دی کہ آپ کا مطلوبہ نمبر بند ہے۔ میں نے فکر مند ہو کر ثاقب کے آفس کال کی اور بتایا کہ ثاقب سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔ وہاں موجود صاحب نے مجھے تسلی دی کہ وہ اسلام آباد کال کر کے معلوم کرتے ہیں۔ بہر حال آدھے گھنٹے بعد ایک اور نمبر سے ثاقب کی کال آئی۔ اس کی آواز سنتے ہی میں نے کہا۔

"کہاں تھے آپ میں کتنی پریشان ہو رہی تھی؟"

"سوری یار میں صبح ناشتے کے لیے ہوٹل گیا تھا تو نہ جانے موبائل کہاں گر گیا۔ میں تلاش کر رہا تھا اور کال بھی کی لیکن لگ رہا ہے کہ کسی کے ہاتھ لگ گیا ہے۔"

میں دھک سے رہ گئی۔ "ثاقب آپ نے رات والی سیلفی ڈیلیٹ کر دی تھیں۔"

"ہاں...... ہاں۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "میں دیکھنے کے فوراً بعد ڈیلیٹ کر دیتا ہوں۔"

مگر نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ وہ ٹھیک نہیں کہہ رہا ہے اس نے میری تصویریں ڈیلیٹ نہیں کی تھیں۔ "ثاقب آپ سچ کہہ رہے ہیں نا، اگر کسی اور نے وہ تصویریں دیکھ لیں تو میں تو شرم سے مر جاؤں گی۔"

"تم فکر مت کرو ایسا نہیں ہوگا۔" ثاقب نے مجھے تسلی دی۔ "میں نے تمام تصویریں ڈیلیٹ کر دی تھیں۔"

"میں اسی ڈر سے آپ کو منع کرتی تھی۔" میں روہانسی ہو گئی۔ "آدمی کا موبائل کہیں بھی کھو سکتا ہے۔ چوری ہو سکتا ہے، چھن سکتا ہے جیسے کہ آپ کا ہوا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" ثاقب نے تسلیم کیا۔ "میں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر تم سے سیلفی کی فرمائشیں کیں۔"

"بس یہ آخری سیلفی تھیں اب آپ نے جو دیکھنا ہے اور جیسے دیکھنا ہے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے گا۔"

ثاقب نے سوری کی اور پھر مجھے منا لیا۔ اس کا موبائل نہیں ملا تھا اور اس نے چند دن بعد دوسرا موبائل لے لیا۔ مگر اس کے بعد اس نے پھر مجھ سے سیلفی کی فرمائش نہیں کی۔ چند دن بعد ثاقب واپس آ گیا اور اماں چلیں گئیں۔ اس واقعے سے قطع نظر ہم دونوں ہی بے تابی سے منتظر تھے کہ کب ملتے ہیں۔ شادی کے بعد اتنی طویل جدائی ہمارے درمیان کبھی نہیں آئی تھی۔ طویل ڈیوٹی کے بعد ثاقب کو ایک ہفتے کی چھٹی ملی تھی اور یہ سارا وقت ہم نے ساتھ گزارہ تھا۔ جدائی کی ساری کسر پوری کرتے رہے اور بس دو بار ہی ہم باہر گئے تھے۔ اتوار والے دن میں نے ثاقب سے کہا۔ "مجھے کچھ سوٹ دلا دیں۔ میرے پاس گرمی میں گھر کے سوٹ کم رہ گئے ہیں۔ آج چلیں باہر؟"

"ابھی میرا دل نہیں چاہ رہا باہر جانے کو۔"

"پلیز۔" میں نے کہا اور پھر اصرار کر کے منوا لیا۔ ہم شام کو باہر نکلے۔ میں نے شاپنگ کے ساتھ ڈنر کی فرمائش بھی کی تھی۔ ثاقب مان گیا۔ میں کپڑے کم لیتی تھی مگر اچھے اور اچھی جگہ سے لیتی تھی۔ ہم ایک اچھے شاپنگ سینٹر آئے اور میں نے وہاں سے کئی سوٹ لیے جو نئے ڈیزائن کے تھے۔ ہم شاپنگ کر کے باہر نکل رہے تھے کہ میں نے دیکھا تین لڑکے ہم سے کچھ فاصلے پر تھے اور موبائل سے میری تصویریں لے رہے تھے۔ میں نے گھبرا کر ثاقب سے کہا۔ "دیکھیں یہ لڑکے میری تصویریں لے رہے ہیں۔"

ثاقب نے ان کی طرف دیکھا اور اسے غصہ آ گیا۔ وہ ان کی طرف بڑھا۔ مگر لڑکے آرام سے کھڑے رہے۔ ثاقب نے کہا۔ "تم لوگ میری بیوی کی تصویر کیوں لے رہے ہو۔"

"تمہاری بیوی ہے۔" ایک لڑکے نے واہیات انداز میں کہا۔ "اس کی تصویریں تو نیٹ پر ہیں اور ہم تو کپڑوں میں لے رہے ہیں اس میں تو......"

کوئی شوہر اپنی بیوی کے بارے میں ایسی بات نہیں

سن سکتا تھا۔ اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ثاقب نے اسے گھونسا مارا اور ان میں جھگڑا ہو گیا۔ وہ تین تھے اور ثاقب اکیلا تھا۔ میں چیخنے لگی اور میری چیخیں سن کر لوگ آ گئے جنہوں نے ثاقب اور ان لڑکوں کو الگ کیا۔ دوسروں کو پتا چلا کہ لڑکے میری تصویریں لے رہے تھے تو وہ ان کو سنانے لگے اور ماحول دیکھ کر لڑکے وہاں سے کھسک گئے۔ ثاقب کو بھی چوٹیں آئی تھیں اور اس کا ہونٹ سوج گیا تھا۔ یہ واقعہ ایسا تھا کہ ہمارا موڈ آف ہو گیا اور ہم ڈنر پر جانے کی بجائے گھر آ گئے۔ اس وقت میرا ذہن لڑکوں کی بات پر نہیں گیا تھا میرا خیال تھا کہ وہ اپنی حرکت پر پردہ ڈالنے کے لیے ایسی بات کر رہے تھے مگر ثاقب کے ذہن میں یہ بات تھی اور اس کا موڈ آف رہا تھا۔ اس نے گھر آ کر مجھ سے بہت کم بات کی اور جب ہم نے رات کا کھانا کھا لیا تو وہ بیڈ روم میں آنے کی بجائے کام کا کہہ کر اور لیپ ٹاپ لے کر نشست گاہ میں چلا گیا۔ خاصی دیر بعد آیا تو بنا بات کیے کروٹ لے کر سو گیا۔ میں بھی اس واقعے پر محجوب تھی لیکن اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں تھا۔

اگلی صبح میں نے ثاقب سے بات کی کہ کل جو ہوا اس میں میرا تو قصور نہیں ہے۔ مگر اس نے ہوں ہاں کے علاوہ اور کوئی جواب نہیں دیا اور برائے نام ناشتا کر کے دفتر چلا گیا۔ میں اس کے رویے پر اتنی ششدر تھی کہ اس سے احتجاج بھی نہ کر سکی اور اس کے جانے کے بعد پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسی محبت کرنے والا اور جان نثار کرنے والا شوہر ایک ایسی بات پر یوں مجھ سے آنکھیں پھیر لے گا جس میں میرا قصور بھی نہیں تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ رات کو وہ لیپ ٹاپ لے کر بہت دیر ڈرائنگ روم میں بیٹھا رہا تھا۔ آخر ایسی کیا بات تھی جو وہ آ کر مجھ سے بات کیے بنا کروٹ لے کر سو گیا تھا۔ میں نے اٹھ کر اس کا لیپ ٹاپ کھولا۔ مجھے کمپیوٹر کا زیادہ علم نہیں تھا مگر کچھ جانتی تھی۔ میں نے براؤزر کی ہسٹری کھولی اور دیکھا کہ رات میں ثاقب نے کون کون سے پیج کھولے تھے اور پھر میں نے انہیں باری باری کھولنا شروع کر دیا۔

تیسرا پیج اوپن کیا اور اسے اسکرول کر کے نیچے تک لائی۔ یہ بہت واہیات سائٹ تھی جس میں پاکستانی لڑکیوں اور عورتوں کی ایسی تصاویر تھیں جو ناقابلِ بیان تھیں۔ ان میں سے بعض تو بالکل عریاں تصاویر تھیں۔ پھر میں دنگ رہ گئی جب میں نے اس میں اپنی تصویر دیکھی۔ یہ وہی تصویر تھی جو میں نے آخری بار سیلفی لے کر بھیجی تھی اور میں اس میں بہت چھوٹی سی نائٹی میں تھی اور جسم جھلک رہا تھا۔ اسی پیج پر میری ایک تصویر اور تھی۔ یہ بھی اسی قسم کی تھی۔ اس کے بعد بھی چند دوسری سائٹس پر مجھے اپنی تصویریں نظر آئیں جو میں نے سیلفی لے کر ثاقب کو واٹس اپ کی تھیں۔ یہ تصاویر میرے اور ثاقب دونوں کے موبائلز میں تھیں اور نہ جانے کیسے یہ انٹرنیٹ کی ان سائٹس تک جا پہنچی تھیں۔ میں اپنا موبائل ٹھیک کرنے لے گئی تھی اور ثاقب کا موبائل گم ہو گیا تھا۔ دونوں ہی موبائلوں سے یہ سیلفیز انٹرنیٹ تک جا سکتی تھیں۔ بہر حال یہ کسی بھی طرح گئی تھیں۔ میں تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ یہ سب دیکھ کر میرا سر چکرانے لگا اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔

ہوش آیا تو ثاقب میرے پاس موجود تھا اور میرے منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا۔ اس نے مجھے کچھ پلایا تھا۔ ہوش میں آتے ہی میں نے روہانسے لہجے میں کہا۔ ”دیکھ لیا اپنی فرمائشوں کا انجام۔“

ثاقب نے ندامت سے سر جھکا لیا تھا کہ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ تو میرے پاس بھی نہیں تھا۔ اگر ثاقب قصوروار تھا تو میں بھی اس کی شریک تھی۔ ثاقب نے کوشش کی اور ان ویب سائٹس کی رپورٹ کی جس کی وجہ سے یہ ویب سائٹس بند ہو گئیں۔ اسی طرح کچھ ویب سائٹس سے تصویریں ہٹا دی گئیں۔ مگر پھر بھی کچھ سائٹس پر موجود رہی تھیں۔ دوسروں کو کیا ہم میاں بیوی ایک دوسرے کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ تنہائی میں بھی ایک دوسرے سے آنکھیں چراتے تھے۔ پھر ثاقب نے ملک سے باہر جانے کا فیصلہ کر لیا اور اس نے کینیڈا کے امیگریشن کے لیے کوشش شروع ... کر دی اور اب سے چند مہینے پہلے ہمیں کینیڈا کی امیگریشن مل گئی۔ میں نے اب پردہ شروع کر دیا کہ باہر جاتے ہوئے خوف آتا تھا کہ کہیں پھر کوئی ایسا شخص نہ مل جائے جس نے ویب سائٹس پر میری تصاویر دیکھی ہوں۔ پتا نہیں آنے والے دنوں میں میرے نصیب میں کیا لکھا ہے اور میری رسوائی کی یہ کہانی نہ جانے کہاں تک پہنچے گی؟ کہانی آپ تک پہنچانے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ شاید کوئی اور اس نادانی سے بچ جائے جو میں نے اور ثاقب نے کی ہے۔

راکھ

جناب ایڈیٹر صاحب
السلام علیکم!
عورت کو سمجھنا آسان نہیں۔ یہی عورت پیر، پیغمبر کی ماں ہے اور یہی عورت "ماتا ہاری" بھی۔ سازش کرنے پر آئے تو لومڑی کو پیچھے چھوڑ دے۔ دشمنی پر اتر جائے تو ناگن کو مات دے دے۔ میری زندگی بھی ایک مقدس رشتہ والی عورت نے خراب کی، کیسے یہ میں نے کھل کر بیان کردیا ہے اگر سرگزشت کے معیار کی ثابت ہو جائے تو اسے شاملِ اشاعت کرلیں۔

سعید احمد
(بہاولپور)

میں پاکستان کے ایک بڑے بینک کا وی پی ہوں۔ میرے ماتحت مجھے مغرور اور بددماغ سمجھتے ہیں۔ کیونکہ میں کسی کو سگریٹ پیتا دیکھ کر آپے سے باہر ہو جاتا ہوں۔
اس دن میں دفتر پہنچا تو چپراسی نے لپک کر دروازہ کھولا۔ میں اندر داخل ہوا تو بینک کے ایک نوجوان ملازم کو سگریٹ نوشی میں مصروف پایا۔ مجھے دیکھ کر اس نے سگریٹ چھپانے کی کوشش کی لیکن وہ اس دھوئیں کو کہاں چھپاتا جو اس کے اردگرد منڈلا رہا تھا۔

میں آپے سے باہر ہو گیا۔ میں نے اسے بے نقط سنائیں۔ میں نے چیخ کر کہا۔ ''تمہاری جرأت کیسے ہوئی یہاں سگریٹ پینے کی؟''

''سوری سر۔'' اس نے شرمندگی سے سر جھکا کر کہا۔ ''میں......''

''شٹ اپ!'' میں نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔ ''تم میرے آفس آؤ۔'' یہ کہہ کر میں اپنے آراستہ کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد بینک کی ایک اسسٹنٹ وائس پریزیڈنٹ مسز نورین کمرے میں داخل ہوئیں اور بولیں۔ ''سر میں اندر آسکتی ہوں؟''

''اندر تو آپ آچکی ہیں۔'' میں نے بھنا کر کہا۔

وہ ہنستی ہوئی میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئیں اور بولیں۔ ''سر وہ لڑکا بینک میں نیا نیا ملازم ہوا ہے اسے نہیں معلوم تھا......''

''آپ کس لڑکے کی بات کر رہی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''محمود کی۔'' مسز نورین نے کہا۔ ''وہ لڑکا جو ابھی اسموکنگ کر رہا تھا۔''

میں پھر بھڑک اٹھا۔ ''مسز نورین! اگر آپ اس لڑکے کی سفارش کرنے آئی ہیں تو آئی ایم سوری، میں اسے ملازمت سے فارغ کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔''

''کیا؟'' مسز نورین نے حیرت سے کہا۔ ''آپ اتنی سی بات پر اسے فارغ کر دیں گے، نکال دیں گے ملازمت سے؟''

''ہاں، میں اسے ملازمت سے نکال دوں گا۔'' میں نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ لڑکا بھی آگیا۔ وہ بہت زیادہ سہما ہوا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر کہا۔ ''سر مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہاں سگریٹ پینا جرم ہے ورنہ میں کبھی اس کی جرأت نہ کرتا۔''

''مسٹر محمود!'' میں نے کہا۔ ''آپ سگریٹ پئیں، حقہ پئیں یا شیشہ پئیں مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ میں ابھی اور اسی وقت آپ کو ملازمت سے فارغ کر رہا ہوں۔''

''او کے۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

مسز نورین بھی کچھ دیر بیٹھی رہیں لیکن میرا سرد رویہ دیکھ کر وہ بھی اٹھ گئیں۔ پھر جاتے جاتے بولیں۔ ''سر! آپ جانتے ہیں کہ محمود کتنا ضرورت مند ہے اور اسے کتنی مشکل سے یہ ملازمت ملی ہے۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے چار بہن بھائیوں اور والدہ کا واحد کفیل ہے اور بہت چھوٹی عمر سے اپنے گھر کا بوجھ اٹھا رکھا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئیں۔

میری آنکھوں میں اس نوجوان کا چہرہ گھوم گیا۔ اس کے چہرے میں مجھے سجاد بھائی کا عکس نظر آرہا تھا۔

میں آپ کو شروع سے سب کچھ بتاتا ہوں۔ میں نے ہوش سنبھالا تو سجاد بھائی ہی گھر کے سرپرست تھے۔ ابو کا انتقال اس وقت ہو گیا تھا جب میں بہت چھوٹا تھا اور شہلا تو مجھ سے بھی چھوٹی تھی۔ امی بتاتی تھیں کہ جب تمہارے ابو کا انتقال ہوا تو سجاد میٹرک میں پڑھ رہا تھا۔ گھر کی ذمہ داریوں کی وجہ سے اس نے تعلیم ادھوری چھوڑ دی اور محنت مزدوری کرنے لگا۔

وہ صبح منہ اندھیرے اٹھ کر لوگوں کے گھروں میں اخبار ڈالتا تھا۔ پھر انڈے ڈبل روٹی لے کر سائیکل پر نکل جاتا تھا۔ دن میں وہ ایک دکان پر ملازمت کرتا تھا۔ میں نے بھی سجاد بھائی کو اتنی ہی محنت کرتے دیکھا تھا۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو انہوں نے پرچون کی چھوٹی سی ایک دکان کھول لی تھی۔ وہ صبح گھر سے نکلتے تو رات ہی کو گھر میں داخل ہوتے تھے۔ مجھے اور شہلا کو انہوں نے اسکول میں داخل کرا دیا تھا اور مجھ سے ہمیشہ یہ ہی کہتے تھے کہ ''خوب پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بنو سعید! یہ ابو کا خواب تھا اور اب میرا بھی خواب ہے۔''

ابو نے تو یہ خواب سجاد بھائی کے لیے دیکھا تھا لیکن موت نے انہیں مہلت ہی نہ دی اور ابو کی جگہ اب سجاد بھائی نے لے لی تھی۔

وقت گزرتا رہا۔ میں میٹرک میں پہنچ گیا اور شہلا آٹھویں کلاس میں آگئی۔ امی سجاد بھائی پر شادی کے لیے زور دیتی تھیں لیکن وہ ہمیشہ ٹال جاتے تھے۔ اب تو شہلا بھی امی کا ساتھ دینے لگی تھی۔ مگر وہ یہ کہہ کر ٹال دیتے تھے۔ ''سجاد بھائی یہ ہی کہتے تھے کہ سعید کسی قابل ہو جائے تو میں شادی کر لوں گا۔''

سجاد بھائی کی عمر ڈھل رہی تھی۔ ان کے بال آہستہ آہستہ سفید ہو رہے تھے لیکن وہ شادی کرنے پر راضی نہیں تھے۔ ان ہی دنوں اچانک امی پر فالج کا حملہ ہوا اور ان کا

بایاں حصہ مفلوج ہوگیا۔ سجاد بھائی نے ان کے علاج میں پیسا پانی کی طرح بہایا۔ پہلے تو جو تھوڑی بہت جمع پونجی تھی وہ ختم ہوئی، پھر سجاد بھائی کی دکان کے پیسے بھی ان کی بیماری میں خرچ ہونے لگے۔ وہ دکان کی طرف سے بھی بالکل بے پروا ہوگئے تھے۔ دن رات امی کی خدمت میں لگے رہتے تھے۔

سجاد بھائی کی محنت اور علاج سے امی صحت مند ہو گئیں۔

اس دوران میں گھر کا سارا کام شہلا پر آپڑا تھا۔ امی اب زیادہ شدت سے سجاد بھائی کی بات کرنے لگیں۔

آخر شہلا اور امی کے آگے سجاد بھائی نے ہتھیار ڈال دیے اور وہ شادی کے لیے راضی ہوگئے۔

امی اور شہلا سجاد بھائی کے لیے لڑکی تلاش کرنے لگیں۔

منظور صاحب ہمارے محلے ہی میں رہتے تھے اور وہ سبزی منڈی میں پیاز اور لہسن کی آڑھت کرتے تھے۔ ان کا ہمارے گھر آنا جانا بھی تھا۔ ان کی صرف دو بیٹیاں تھیں۔ سعدیہ اور نازیہ۔ بڑی بیٹی نازیہ کی شادی ہو چکی تھی۔ سعدیہ گھر بیٹھی تھی۔

ان کو سعدیہ پسند آگئی۔ میں نے بھی اکثر اسے دیکھا تھا۔ وہ بھرے بھرے جسم کی پرکشش لڑکی تھی۔ امی نے مجھ سے مشورہ کیا تو میں نے کہا۔ ”امی آپ سجاد بھائی سے پوچھیں۔ مجھے تو سعدیہ باجی میں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔“

”ہاں لیکن ان کی عمر زیادہ ہے۔“ شہلا نے کہا۔ ”میرا اندازہ ہے کہ وہ تیس سال کی تو ہوں گی۔“

”تو سجاد بھائی کون سے کم سن ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”وہ بھی تو اب چالیس سال کے ہونے کو آئے ہیں۔“

منظور انکل نے بھی اس رشتے کو قبول کرلیا اور ایک شام بہت سادگی سے سجاد بھائی اور سعدیہ کی شادی ہوگئی۔

ہمارے مکان میں بہت گنجائش تھی۔ ابو نے اچھے وقتوں میں سو گز کا وہ پلاٹ خریدا تھا جس میں پرانی طرز کے صرف تین کمرے تھے۔ ایک کمرے میں سجاد بھائی اور میں تھا، دوسرا کمرا امی اور شہلا کے پاس تھا اور تیسرے کمرے کو ہم نے ڈرائنگ روم بنا رکھا تھا۔ ڈرائنگ روم کیا بس وہاں ایک پرانی طرز کا صوفہ اور دو تین کرسیاں رکھی تھیں۔

سعدیہ بھابی گھر میں آئیں تو مجھے ڈرائنگ روم میں جانا پڑا۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرا زیادہ وقت تو گھر سے باہر گزرتا تھا۔ کالج کے بعد میں کچھ ٹیوشنز کرتا تھا۔ پھر ایک دوست کے ساتھ پڑھائی کرنے کے لیے اس کے گھر چلا جاتا تھا۔

سجاد بھائی کی خواہش تھی کہ میں سی ایس ایس کر کے اعلیٰ سول ملازمت کروں۔ میں اسی لیے اتنی شدید محنت کر رہا تھا۔ سعدیہ بھابی بہت ہنسنے ہنسانے والی تھیں اس لیے جلد ہی وہ ہم میں گھل مل گئیں۔ اب تو مجھے سجاد بھائی کے چہرے پر بھی مسکراہٹ نظر آنے لگی تھی۔ سعدیہ بھابی نے ان کی بے رنگ و بے کیف زندگی میں رنگ بھر دیئے تھے۔ میں نے کبھی سجاد بھائی کو قہقہہ لگاتے نہیں دیکھا تھا۔ اب وہ اکثر قہقہے بھی لگاتے۔

پھر میں نے ایک عجیب بات محسوس کی۔ سجاد بھائی کی غیر موجودگی میں سعدیہ بھابی مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرتی تھیں۔ پہلے تو میں اسے ان کی کھلنڈری طبیعت سمجھا لیکن جلد ہی مجھے احساس ہوگیا کہ سعدیہ بھابی مجھ سے مذاق ہی مذاق میں بہت ذومعنی باتیں کرنے لگی ہیں۔

ایک دفعہ تو حد ہی ہوگئی۔ میں اس وقت باہر سے آیا تھا۔ بھابی میرے پاس آئیں اور بولیں۔ ”سعید! میرے کمرے کا پنکھا نہیں چل رہا ہے۔ گرمی کے مارے برا حال ہے تم ذرا دیکھ لو۔“

مجھے الیکٹرک کے بارے میں اتنی معلومات تھی کہ میں فیوز لگا لیتا تھا، بلب تبدیل کرلیتا تھا اور اسی طرح کے چھوٹے موٹے کام کرلیتا تھا۔ بھابی کی تسلی کے لیے میں ان کے کمرے میں چلا گیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ان کے کمرے کا پنکھا تو چل رہا تھا۔

میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”بھابی! کون سا پنکھا خراب ہے؟“

”ویسے تو تم میرے کمرے میں آتے ہی نہیں ہو۔“ بھابی نے ایک ادا سے کہا اور اپنا دوپٹا ڈھلکا دیا۔ ”میں نے سوچا تمہیں اسی بہانے اپنے کمرے میں بلا لوں۔“

”بھابی! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”آپ ویسے ہی مجھ سے کہہ دیتیں میں کوئی غیر ہوں جو آپ کو بہانے بنانے کی ضرورت پڑی؟“

”میرے لیے تو تم غیر ہی بنے ہوئے ہو، ایک گھر میں ہوتے ہوئے بھی نہ میری طرف دیکھتے ہو نہ میرا حال پوچھتے ہو۔“ بھابی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”بیٹھو۔“ پھر انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر خود ہی بٹھا دیا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بھابی آخر چاہتی کیا

ہیں؟ میں نے یہ ہی سوال ان سے کر بھی دیا۔
''میں کیا چاہتی ہوں، تم نے کبھی میری آنکھوں میں جھانکا ہے۔ میری آنکھوں میں جھانکو سعید، تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں کیا چاہتی ہوں۔'' وہ مجھ پر جھک گئیں۔
میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''بھابی میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے میں جارہا ہوں۔''
پھر بھابی مجھے آوازیں ہی دیتی رہیں اور میں کمرے سے نکل گیا۔
اب میں کوشش کرتا تھا کہ میں اس وقت گھر جاؤں جب سجاد بھائی گھر میں موجود ہوں۔
بی اے فائنل کے امتحان ہونے والے تھے۔ مجھے بی اے میں بہترین نمبر لانے تھے۔ اس کے بعد ہی میں سی ایس ایس کے امتحان میں شرکت کرسکتا تھا۔ امتحان کی تیاری کے لیے کالج سے چھٹی دے دی گئی تھی۔ میں سارا سارا دن پڑھائی میں مصروف رہتا تھا۔
ایک دو دن تو مجھے یہ دھڑکا لگا رہا کہ کہیں بھابی میرے کمرے میں نہ آدھمکیں لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تو میں مطمئن ہو گیا۔
ایک دن میں پڑھنے میں مصروف تھا کہ گھر کے باہر موٹر سائیکل رکنے کی آواز آئی۔ گلی میں گاڑیاں اور موٹر سائیکلیں آتی ہی رہتی تھیں۔ میں اس وقت کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ میری نظر یوں ہی باہر پڑ گئی۔ موٹر سائیکل والا نوجوان ہمارے ہی گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ کون ہے۔ میں نے اس سے پہلے اسے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور اندر داخل ہو گیا۔
میں کمرے سے باہر نکلا تو وہ نوجوان بھابی کے کمرے میں جارہا تھا۔ اس وقت شہلا بھی موجود تھی اور وہ بھی اس نوجوان کو دیکھ رہی تھی۔
''شہلا یہ کون ہے؟''
''بھابی کا کوئی رشتے دار ہے۔'' شہلا منہ بنا کر بولی۔ ''اور اکثر ہمارے گھر آتا رہتا ہے۔''
''اچھا!'' میں نے حیرت سے کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔
اس وقت میرا دوست اجمل آگیا۔ وہ مجھ سے کچھ نوٹس لینے آیا تھا۔ میں نے اسے اندر آنے کو کہا لیکن وہ بہت جلدی میں تھا۔ اسے چھوڑنے میں گلی کے نکڑ تک گیا۔

واپس آیا تو میری نظر بھابی کے کمرے کی نیم وا کھڑکی پر پڑی۔ اس کا ایک پٹ شاید ہوا سے تھوڑا سا کھل گیا تھا۔ میری آنکھوں نے جو منظر دیکھا وہ بہت حیران کن تھا۔ بھابی سگریٹ کے کش لگا رہی تھیں اور وہ نوجوان انتہائی بے تکلفی سے بیڈ پر نیم دراز تھا۔ وہ دونوں کسی بات پر ہنس بھی رہے تھے۔ دوسروں کی باتیں سننا مجھے بہت برا لگتا ہے لیکن اس دن تجسس سے مجبور ہو کر میں کھڑکی کے پاس چلا گیا۔
میرے کانوں میں اس لڑکے کی مکروہ آواز آئی۔
''کب آتا ہے تمہارا بے وقوف شوہر؟''
''وہ تو رات تک آتا ہے۔'' بھابی کے لہجے میں تحقیر تھی۔
''تم اطمینان سے بیٹھو میں تمہارے لیے چائے بناتی ہوں۔''
''بیٹھو میرے پاس۔'' لڑکے نے کہا۔ ''چائے تو میں کہیں بھی پی سکتا ہوں لیکن تم مجھے ہر جگہ نہیں مل سکتیں۔''
میں تلملا کر واپس اپنے کمرے میں آگیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کروں۔
شہلا نے مجھے غصے میں دیکھا تو بولی۔ ''آپ کیوں جان جلاتے ہیں بھائی، یہ تو روز کا معمول ہے۔ سراج آتا ہے اور بھابی اسے لے کر کمرے میں بند ہو جاتی ہیں۔''
مجھے اس وقت معلوم ہوا کہ اس لفنگے کا نام سراج ہے۔ میں نے بپھر کر کہا۔ ''سعد یہ بھابی اس گھر کی عزت ہیں وہ میرے بھائی کی عزت ہیں۔ میں اپنے گھر کی عزت کو یوں پامال نہیں ہونے دوں گا۔''
اس وقت کمرے سے بھابی کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں کچھ سوچے بغیر بھابی کے کمرے کی طرف بڑھا لیکن دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے زور سے دروازہ پیٹ ڈالا۔
بھابی نے دروازہ کھولا اور ناگواری سے بولیں۔
''کیا بات ہے سعید! تم دروازہ کیوں توڑ رہے ہو؟''
''بھابی! سراج سے کہیں کہ ابھی اور اسی وقت یہاں سے دفع ہو جائے ورنہ......؟''
''ورنہ کیا؟'' بھابی نے میری بات کاٹ دی۔
''ورنہ میں اس کے ہاتھ پیر توڑ دوں گا۔'' میں نے پھر کہا۔
''تم اسے ہاتھ تو لگا کر دکھاؤ۔'' بھابی نے بھی بپھر کر کہا۔ ''سراج میرا کزن ہے۔ وہ میرا مہمان ہے۔ تم کون

ہوتے ہو اس پر اعتراض کرنے والے؟"

اسی وقت سراج بھی کمرے سے باہر نکل آیا۔ اسے دیکھ کر میں آپے سے باہر ہو گیا اور اس کے چہرے پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا اور درشت لہجے میں کہا۔ "دفع ہو جا یہاں سے ورنہ یہیں دفن کر دوں گا۔"

سراج کو شاید یہ توقع نہیں تھی کہ میں اس پر ہاتھ چھوڑ دوں گا۔ وہ میرے جارحانہ رویے سے کچھ خوف زدہ بھی ہو گیا تھا۔

بھابی نے میرے منہ پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔ "تم نے میرے کزن پر ہاتھ اٹھایا۔ تمہارے گھر میں مہمانوں کی یہ ہی عزت ہے؟"

میں نے ان کی بات کا جواب دیے بغیر ایک مرتبہ پھر سراج کا گریبان پکڑ لیا۔

بھابی بری طرح چیخنے لگیں۔ امی گرتی پڑتی اپنے کمرے سے باہر نکل آئیں اور میرے منہ پر لگاتار کئی تھپڑ رسید کر دیے۔ شہلا بھی مجھے پیچھے گھسیٹ لائی۔

"بدبخت، کمینے، ذلیل!" امی نے کہا۔ "تو بھابی سے بدتمیزی کر رہا ہے؟"

"تم تو رہنے ہی دو۔" بھابی نے نہایت گستاخی سے امی کو مخاطب کیا۔

"ساری آگ تو تم نے اور تمہاری اس چہیتی اور آوارہ بیٹی نے بھڑکائی ہے۔"

"بھابی!" میں نے چیخ کر کہا۔ "اپنی زبان کو لگام دو ورنہ میں یہ بھی بھول جاؤں گا کہ تم میری بھابی ہو۔"

موقع غنیمت جان کر سراج وہاں سے کھسک گیا۔

"کیا کرے گا تو، مجھے مارے گا؟" بھابی چیخ کر بولیں۔ "آ اپنا یہ ارمان بھی پورا کر لے۔ آنے دے اپنے چہیتے بھائی کو آج میں اس سے دو ٹوک بات کروں گی۔"

بھابی بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے میں گھس گئیں۔

امی بھی مجھے دھکیلتی ہوئی میرے کمرے میں لے آئیں اور بولیں۔ "سعید بیٹا! تو نے تو آج دیکھا ہے یہ تو روز کا معمول ہے۔ میں تو خود اسے بیاہ کر لائی تھی اس لیے سجاد سے کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

"لیکن امی! اس میں تو ہماری ہی بے عزتی ہے۔ آپ کے خاموش رہنے سے مسئلہ تو حل نہیں ہوگا۔ میں آج خود بھائی سے بات کروں گا۔"

رات کو سجاد بھائی آئے تو مجھ سے پہلے ہی بھابی نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں کہ سعید نے میرے کزن کو دھکے دے کر یہاں سے نکال دیا۔ اس کے ساتھ مار پیٹ کی اور تمہاری اماں خاموشی سے یہ تماشا دیکھتی رہیں۔ میں اب اس گھر میں نہیں رہوں گی۔"

سجاد بھائی بپھرے ہوئے کمرے سے باہر نکلے اور چیخ کر بولے۔ "سعید!"

میں فوراً ان کے پاس پہنچ گیا اور بولا۔ "جی سجاد بھائی!"

"تم نے سراج کو مارا، اپنی بھابی سے بدتمیزی کی؟"

میں نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

"میری بات کا جواب دو۔" سجاد بھائی بپھر کے بولے "میں نے تیری تعلیم میں، تجھے اچھا آدمی بنانے میں دن رات محنت کی تو نے مجھے اس کا یہ صلہ دیا۔"

"سجاد بھائی! میں......"

"مت کہہ مجھے بھائی۔" سجاد بھائی نے مجھے روک دیا۔ "اپنی بھابی سے معافی مانگو۔"

میں نے امی کی طرف دیکھا۔ انہوں نے آنکھوں سے اشارہ کیا کہ معافی مانگ لو۔

میں جھجکتا ہوا آگے بڑھ گیا اور بھابی سے بولا۔ "مجھے معاف کر دیں آئندہ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

اس دن کے بعد سے بظاہر بات ختم ہو گئی۔ سراج بھی اب نہیں آتا تھا۔ بھابی اکثر اپنے گھر چلی جاتی تھیں۔ پھر وہ بالکل پہلے کی طرح ہو گئیں۔ انہوں نے امی سے بدتمیزی کرنا بھی چھوڑ دی اور ہم سے پہلے کی طرح ہنسی مذاق کرنے لگیں۔

میرے سالانہ امتحان میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ میں دن رات محنت کر رہا تھا۔

اس دن بھی میں پڑھنے میں مصروف تھا کہ بھابی میرے کمرے میں آگئیں اور بولیں۔ "سعید میرا ایک کام کرو گے؟"

"جی ہاں، بولیے بھابی!" میں نے کتاب رکھتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے سگریٹ لا دو۔" انہوں نے سو روپے کا نوٹ میری طرف بڑھایا۔

"سگریٹ!" میں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ "سگریٹ پینے والا کون آ گیا بھابی؟"

"کوئی نہیں۔" بھابی مسکرائیں۔ "میں ہی کبھی کبھی پی

لیتی ہوں۔'' انہوں نے کہا۔

''آپ سگریٹ پیتی ہیں؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

مجھے ایک دم وہ منظر یاد آ گیا جب بھابی سگریٹ کے کش لگا رہی تھیں اور سراج بیڈ پر نیم دراز تھا۔ ''سجاد بھائی کو معلوم ہے؟'' میں نے ہنس کر پوچھا۔ میں جانتا تھا کہ سجاد بھائی کو سگریٹ سے بے انتہا چڑ ہے۔ وہ تو سگریٹ پینے والوں کو بھی اچھا نہیں سمجھتے تھے۔

''ہاں سجاد کو معلوم ہے۔'' بھابی نے کہا لیکن ان کے لہجے سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ غلط بیانی سے کام لے رہی ہیں۔

میں نے بھابی سے پیسے لیے اور انہیں سگریٹ کا پیکٹ لا دیا۔

کچھ دیر بعد وہ پھر میرے کمرے میں آئیں ان کے ہاتھ میں دو سگریٹ اور ایک لائٹر تھا۔ وہ بے تکلفی سے میرے بیڈ پر بیٹھ گئیں اور سگریٹ سلگا لیا۔ میں اس وقت کوئی بدمزگی نہیں چاہتا تھا اس لیے خاموش رہا۔ وہ ہنس کر بولیں۔ ''سعید! تم بھی ایک کش لگا کر دیکھو۔''

''بھابی! مجھے تو معاف رکھیں۔'' میں نے کہا۔

''ارے کیا لڑکیوں کی طرح شرماتے ہو۔'' انہوں نے بے تکلفی سے کہا اور سگریٹ زبردستی میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ میں نے دل پر جبر کر کے سگریٹ کا ایک کش لیا۔

دھواں حلق میں جاتے ہی مجھے بہت زور کا پھندا لگا۔ میں کھانسنے لگا لیکن حیرت انگیز طور پر مجھے سرور بھی محسوس ہوا۔ بھابی نے پھر سگریٹ میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس مرتبہ میں نے ذرا طویل کش لیا اور دھواں اپنے حلق میں اتار لیا۔ تیسرا کش لیتے ہی مجھے ہر طرف رنگ ہی رنگ نظر آنے لگے۔

بھابی ہنستی ہوئی وہاں سے چلی گئیں۔ میں سگریٹ کے سرور میں گم وہاں بیٹھا رہا۔ پھر میں وہیں لیٹ کر سو گیا۔

دوسرے دن مجھ سے پڑھائی نہ ہو سکی۔ مجھے پھر سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی۔ میں گھر سے باہر نکل گیا اور دکان سے دو سگریٹ خرید لیے۔ کچھ فاصلے پر جا کر میں نے ایک سگریٹ سلگا لیا۔ میں نے اس کے کئی گہرے گہرے کش لگائے لیکن مجھے وہ مزہ نہیں آیا جو بھابی کے سگریٹ میں آیا تھا۔ میں پے در پے دو سگریٹ پی گیا۔ میرے حلق میں خراشیں پڑنے لگیں لیکن مجھے بالکل مزہ نہیں آیا۔ میں نے سوچا شاید بھابی کے پاس کوئی خاص سگریٹ تھے لیکن

سگریٹ تو یہ بھی تھی۔ پیکٹ تو میں خود لے کر آیا تھا۔ میں جھنجلا کر گھر واپس آ گیا۔

میں پڑھنے بیٹھا تو پڑھائی میں بھی میرا دل نہ لگا۔ بھابی سے سگریٹ مانگنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

اچانک میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور بھابی اندر آ گئیں۔ ان کے ہاتھ میں سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر تھا۔ میری آنکھوں میں انہیں دیکھ کر رنگ ہی رنگ لہرانے لگے۔

بھابی نے بہت ادا سے پوچھا۔ ''سعید! سگریٹ پیو گے؟''

میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں! کبھی کبھی سگریٹ پینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

بھابی نے سگریٹ نکال کر مجھے دے دیا۔ وہ سگریٹ کچھ عجیب سی تھی۔ مڑی تڑی۔ میں نے اس پر غور کرنے کی بجائے اسے ہونٹوں میں پکڑ لیا۔ بھابی نے لائٹر جلایا اور میرا سگریٹ سلگا کر خود بھی سگریٹ سلگا لی۔

میں نے پہلا ہی کش اتنا طویل لیا کہ مجھے کھانسی آ گئی۔

''صبر سے کام لو سعید۔'' بھابی نے کہا۔

میں نے دوسرا کش لیا اور اس کا سرور میری رگ رگ میں اتر گیا۔ مجھے پھر ہر طرف رنگ ہی رنگ دکھائی دینے لگے۔ ایسا لگا جیسے میں رنگوں کی پھوار میں نہا رہا ہوں۔ میرا وجود بہت ہلکا پھلکا ہو گیا تھا اور گویا میں فضا میں اڑ رہا تھا۔

اس وقت بھابی بھی مجھے بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ وہ خود بھی شاید آپے میں نہیں تھیں۔ وہ اٹھ کر میرے نزدیک آ بیٹھیں۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ ایک جھٹکے سے میرے اوپر آ گریں۔

میرے لاشعور میں کہیں یہ احساس تھا کہ یہ سب کچھ غلط ہو رہا ہے اور ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ میں ہمت کر کے اپنی جگہ سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ سگریٹ اب بھی میرے ہاتھوں میں تھی۔ وہ تو شکر ہے کہ امی یا شہلا نے سگریٹ میرے ہاتھوں میں نہیں دیکھی۔ میں گھر سے باہر نکل گیا اور سگریٹ دو تین کش میں ختم کر دی۔

گھر سے کچھ فاصلے پر پیپل کا ایک بہت گھنا درخت تھا۔ محلے والوں نے اس کے نیچے ایک چبوترا بنا لیا تھا۔ دن بھر وہاں بچے کھیلتے تھے اور شام کو محلے کے بڑے بوڑھے بیٹھ کر آپس میں باتیں کرتے تھے۔ وہ گویا ایک طرح کی چوپال تھی۔

میں اس چبوترے پر جا بیٹھا۔

تھوڑی دیر میں وہاں مسرور آ گیا۔ وہ محلے کا بدنام ترین لڑکا تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ نہ صرف نشہ کرتا ہے بلکہ جوا کھیلتا ہے اور اکثر چوری بھی کر لیتا ہے۔ شریف لڑکے اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کتراتے تھے۔

وہ چبوترے پر آ کے بیٹھا تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور بولا۔ ”بیٹھو بادشاہ، ہم اتنے بھی برے نہیں ہیں۔“

”نہیں اب میں جاؤں گا۔“ مجھے اپنی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

مسرور نے چونک کر غور سے میری آنکھوں میں دیکھا اور بولا۔ ”ارے واہ یار! تو بھی اپنا ساتھی نکلا۔“

میں اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے میرے پاؤں ربڑ کے ہوں۔ قدم میں رکھتا کہیں تھا پڑتا کہیں تھا۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ اس وقت زیادہ تر لوگ دفتروں میں ہوتے ہیں۔ گلی میں بالکل سناٹا تھا ورنہ کوئی مجھے اس حالت میں دیکھ لیتا تو نہ جانے کیا سمجھتا۔

میں گھر میں داخل ہوا اور جیسے تیسے اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ بھابی وہاں سے جا چکی تھیں۔

میں بیڈ پر لیٹا تو مجھے ایسا لگا کہ میرا بیڈ اڑن کھٹولے میں تبدیل ہو گیا ہے اور بادلوں میں پھر رہا ہے۔

میں بہت دیر تک ہواؤں میں اڑتا رہا اور خود بہ خود ہنستا رہا۔ پھر نہ جانے کب مجھے نیند آ گئی۔

میری آنکھ رات کو کھلی۔ شہلا مجھے جھنجوڑ رہی تھی۔

”بھائی اٹھو آج کتنا سو رہے ہو تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

اس کے جھنجوڑنے پر میں اٹھ بیٹھا۔ میرا جسم بری طرح ٹوٹ رہا تھا۔

”کھانا کھا لو۔ سجاد بھائی کب سے تمہارے انتظار میں بیٹھے ہیں۔“

”میں کھانا نہیں کھاؤں گا شہلا۔“ میں نے کہا۔ ”بس تو مجھے ایک کپ گرما گرم چائے لا دے۔“

”کھانا کیوں نہیں کھاؤ گے؟“ شہلا نے آنکھیں نکالیں۔

”میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“ میں نے بہانہ بنایا۔ اس وقت کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

ڈاکٹر انعام الحق جاوید

اردو، پنجابی، شاعر، افسانہ نگار، نقاد اور محقق۔ وہ فیصل آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ 1976ء میں ایم اے اردو، 1978ء میں ایم اے پنجابی کے امتحانات پاس کیے اور 1986ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ ابتداء میں اکادمی ادبیات پاکستان اور پھر مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس کے ساتھ ساتھ لکھنے لکھانے کا شغل بھی جاری رکھا۔ تصانیف میں اجو کی کہانی (چھ کہانیوں کا مجموعہ)، پنجابی ڈراما پرکھاں۔ بہت مشہور ہے۔ اجو کی کہانی بی اے کے نصاب میں شامل ہے۔ پرکھاں پر انہیں پاکستان رائٹرز گلڈ انعام ملا۔ روزنامہ نوائے وقت میں گاہے گاہے کالم بھی لکھتے ہیں۔

مرسلہ: آمنہ بخاری۔ ملتان

شہلا چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد سجاد بھائی وہاں آ گئے اور بولے۔ ”سعید تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے کھانا کیوں نہیں کھا رہے؟“

”سجاد بھائی! شاید مجھے بدہضمی ہو گئی ہے۔“ میں نے کہا۔

”تو پھر ڈاکٹر سے دوا لے کر کیوں نہیں آئے؟“ انہوں نے تشویش سے کہا۔ ”تمہارے امتحان سر پر ہیں اور تم طبیعت خراب کر کے بیٹھے ہو۔“

”اب میری طبیعت ایسی بھی خراب نہیں ہے سجاد بھائی۔“ میں نے کہا۔

”اپنی صحت کا......“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ ان کی نظریں میرے بیڈ پر ایک جگہ جمی ہوئی تھیں۔

میں نے گھبرا کر اس طرف دیکھا۔ وہاں میری کتابوں پر سگریٹ کی راکھ پڑی تھی۔ ان کے چہرے پر ناگواری کا تاثر آیا۔ پھر انہوں نے خود پر قابو پا لیا اور بولے۔ ”اپنی صحت کا خیال رکھو سعید۔“ یہ کہہ کر وہ میری طرف دیکھے بغیر چلے گئے۔ جہاں سگریٹ کی راکھ گری تھی وہاں بھابی بیٹھی تھیں۔ میں نے اٹھ کر اچھی طرح میز جھاڑا اور اپنی کتابیں دوبارہ سلیقے سے رکھ دیں۔

دوسرے دن دس بجے کے قریب اجمل آ گیا۔ آج ہم دونوں کا ایک ساتھ پڑھنے کا پروگرام تھا۔

میں اس کے ساتھ پڑھائی میں لگ گیا۔ اس دوران

میں کئی دفعہ میرا دل چاہا کہ میں بھابی سے سگریٹ لے آؤں لیکن پھر اجمل کی وجہ سے اپنے ارادے سے باز رہا۔

ہم دونوں شام تک پڑھتے رہے۔ بس تھوڑی دیر کے لیے کھانے کا وقفہ کیا تھا۔ پھر پڑھائی میں لگ گئے تھے۔

چار بجے کے قریب کمرے کا دروازہ کھلا اور بھابی نے اندر جھانکا۔ اجمل نے جلدی سے انہیں سلام کیا۔

بھابی نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''بھئی آج تو بہت پڑھائیاں ہو رہی ہیں کیا سب کچھ آج ہی پڑھ لو گے؟''

''بھابی! ابھی تو ہم نے پڑھنا شروع کیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''اچھا بھئی خوب دل لگا کر پڑھو۔'' یہ کہہ کر بھابی چلی گئیں۔ ایک دفعہ پھر میرے دل میں یہ خواہش بیدار ہوئی کہ بھابی سے ایک سگریٹ مانگ لوں لیکن میری ہمت نہ پڑی۔

اجمل جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ سجاد بھائی آ گئے۔ اجمل نے انہیں بھی سلام کیا۔

''وعلیکم السلام! بھئی تمہیں دیکھ کر دل خوش ہو جاتا ہے۔'' سجاد بھائی نے کہا۔ ''اس طرح کے محنتی لڑکے مجھے اچھے لگتے ہیں۔''

''بس بھائی جان' دعا کریں کہ ہم امتحان میں اچھے نمبروں سے پاس ہو جائیں۔''

''میں تو ہر وقت دعائیں کرتا ہوں۔'' سجاد بھائی نے کہا۔

اجمل اپنی کتابیں سمیٹ کر رخصت ہو گیا۔ اس نے دوسرے دن آنے کا وعدہ کیا تھا۔

اس کے جانے کے بعد سجاد بھائی میرے بیڈ پر بیٹھ گئے۔ پھر وہ نرم لہجے میں بولے۔ ''سعید! تم سگریٹ کب سے پینے لگے؟''

انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ میرے بیڈ پر سگریٹ کی راکھ دیکھ چکے تھے۔ سجاد بھائی جھوٹ سے بھی بہت چڑتے تھے۔ میں نے نظریں جھکا کر کہا۔ ''سجاد بھائی! میں کبھی کبھار سگریٹ پی لیتا ہوں۔''

''سگریٹ پینے کی عادت اسی طرح پڑتی ہے۔'' انہوں نے کہا۔ ''ابھی سے سگریٹ اور پان کی لت لگ گئی تو تمہاری صحت تباہ ہو جائے گی۔''

''سجاد بھائی! میں آئندہ سگریٹ کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔'' میں نے خلوص دل سے کہا۔

ان کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ مسکرا کر بولے۔ ''مجھے تم سے یہی امید تھی، ابھی خوب محنت سے پڑھو اور اپنا مستقبل بناؤ۔'' انہوں نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کمرے سے چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد میں نے ٹھان لیا کہ اب سگریٹ کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔

پھر اجمل روز ہی آنے لگا۔ مجھے سگریٹ کا خیال تو آیا لیکن میں نے سختی سے اسے ذہن سے جھٹک دیا۔

پھر ہمارے امتحان شروع ہو گئے۔ میں پڑھائی میں ایسا مصروف ہوا کہ سگریٹ تو دور کی بات ہے مجھے کھانے پینے کا ہوش بھی نہیں تھا۔

میں آخری پیپر دے کر نکلا تو بہت خوش تھا۔ میرے تمام پرچے اچھے ہوئے تھے۔ اجمل کے بھی سب پرچے اچھے ہوئے تھے۔ اس خوشی میں ہم چائے پینے کے لیے ایک ہوٹل میں بیٹھ گئے۔

میں چائے پی رہا تھا کہ ایک میلا کچیلا لڑکا ہمارے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''یار سعید! میں نے دو دن سے کھانا نہیں کھایا ہے کچھ پیسے دے دو۔''

میں نے سوچا کہ یہ لڑکا مجھے کیسے جانتا ہے۔ میں نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا تو مجھے دھچکا سا لگا۔ وہ ساجد تھا۔ میں نے پھر اسے غور سے دیکھا کہ ممکن ہے یہ ساجد سے ملتا جلتا کوئی لڑکا ہو لیکن وہ ساجد ہی تھا۔ وہ اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ پڑھنے میں بھی اچھا تھا۔ کالج میں اس نے ہمارے ساتھ ہی داخلہ لیا تھا۔ پھر اچانک ہی وہ غائب ہو گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ لوگ وہاں سے کہیں اور چلے گئے ہیں۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اجمل نے کہا۔ ''سعید! اسے کچھ مت دینا۔ یہ ابھی جا کر ان پیسوں کی ہیروئن خرید لے گا۔''

''ہیروئن؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''کیسی ہیروئن؟''

اس زمانے میں نشے کی یہ لعنت نئی نئی ہمارے ملک میں متعارف ہوئی تھی۔ ''تم نہیں جانتے کہ ہیروئن کیا ہوتی ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ میں صرف ایک ہیروئن کو جانتا تھا وہ فلمی ہیروئن تھی۔

ساجد بہت غور سے ہماری باتیں سن رہا تھا۔ اجمل نے اسے جھڑک دیا۔ ”چلو تم یہاں سے جاؤ۔“ وہ بے چارگی سے ہمیں دیکھتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

”یار ہیروئن ایک بہت خوف ناک نشہ ہے۔“ اجمل نے بتایا۔ ”یہ پاؤڈر کی شکل میں ملتا ہے اور نشہ کرنے والے اسے سگریٹ کی تمباکو میں ملا کر پیتے ہیں۔“

”تم یہ سب کیسے جانتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”میرے ایک کزن جناح اسپتال کی لیبارٹری میں کام کرتے ہیں۔ ہیروئن کے بارے میں انہوں نے مجھے بتایا ہے۔“ اجمل نے کہا۔

”اسے سگریٹ میں ملاتے کیسے ہیں؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

”یار ہیروئن پینے والے سگریٹ لے کر اس کی تمباکو نکال لیتے ہیں۔ پھر ہیروئن کا پاؤڈر اس میں اچھی طرح ملا کر اسے دوبارہ سگریٹ میں بھر لیتے ہیں۔ اس کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کی بو نہیں ہوتی اس لیے کسی کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ پینے والا صرف سگریٹ پی رہا ہے یا ہیروئن؟“ پھر وہ ہنس کر بولا۔ ”یار تم اتنا کیوں کرید رہے ہو؟“

”کچھ نہیں میں تو صرف اپنی معلومات کے لیے پوچھ رہا تھا لیکن ساجد کو کیا ہوا۔ یہ تو بہت اچھا لڑکا تھا۔“

”یہ ہی تو میں تمہیں بتا رہا ہوں، ہیروئن کا عادی ایک سگریٹ پی کر خود کو ہوا میں اڑتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ یہ لت ایک دفعہ لگ جائے تو پھر بہت مشکل سے چھوٹتی ہے۔ نشہ کرنے والے کو نہ اپنی عزت کا خیال رہتا ہے نہ گھر والوں کی عزت کا۔ اسے صرف اور صرف نشہ چاہیے ہوتا ہے۔ ساجد کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ یہ گھر میں چھوٹی موٹی چوریاں کرتا تھا۔ پھر ایک دن اس نے زیورات پر ہاتھ صاف کر دیا۔ ایک دفعہ اپنے والد کی گاڑی کی بیٹری نکال کر کباڑیے کو اونے پونے بیچ دی۔ ان ہی حرکتوں کی وجہ سے اس کے گھر والوں نے اسے گھر سے نکال دیا۔“

اجمل کی باتیں سن کر میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ کیا بھابی مجھے ہیروئن پلا رہی تھیں۔ وہ میرا مستقبل تاریک کرنا چاہتی تھیں؟

”کیا سوچنے لگے سعید؟“ اجمل نے کہا۔ ”تمہاری چائے بھی ٹھنڈی ہو گئی۔“

”یار میں ساجد ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کا تو مستقبل تباہ ہو گیا۔“

”مستقبل نہیں اس کی پوری زندگی تباہ ہو گئی۔ میرے کزن بتا رہے تھے کہ اس نشے کا عادی زیادہ زندہ نہیں رہتا۔ ہیروئن بہت تیزی سے اسے موت کے منہ میں پہنچا دیتی ہے۔“

اس لمحے مجھے بھابی سے نفرت سی محسوس ہوئی میں گھر پہنچا مگر میری آنکھوں کے سامنے بار بار ساجد کا چہرہ آ جاتا تھا۔ پھر میں سو گیا۔ میں کئی راتوں سے مسلسل جاگ رہا تھا۔ اس لیے سویا تو پھر رات ہی کی خبر لایا۔

دوسرے دن مجھے کوئی کام نہیں تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ میں ساجد کے گھر جاؤں گا اور اس کے بھائی سے معلوم کروں گا کہ ساجد کو یہ لت کہاں سے لگی۔ اس کا چھوٹا بھائی بھی اسکول میں ہمارے ساتھ ہی پڑھتا تھا۔ وہ ہم سے ایک کلاس پیچھے تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح ساجد کو اس نشے سے بچا لوں۔

میں ناشتا کر کے فارغ ہوا ہی تھا کہ بھابی کمرے میں داخل ہوئیں اور ہنس کر بولیں۔ ”شکر ہے سعید تمہاری صورت تو نظر آئی۔“

انہیں دیکھ کر میرے ذہن میں پھر نفرت کی لہر اٹھی لیکن میں نے خود پر قابو پا لیا اور بولا۔ ”بھابی! امتحان کے زمانے میں تو مجھے خود اپنی صورت نظر نہیں آتی۔“

”اب تو تم امتحان سے فارغ ہو گئے۔ اب کیا ارادہ ہے؟“

”میں اب مقابلے کا امتحان دوں گا۔“ میں نے کہا۔

”او ہو، تو یہ ارادے ہیں۔“ بھابی ہنس کر بولیں۔ ”میرا خیال ہے کہ اب تم کچھ دن آرام بھی کرو گے؟“

”ہاں بھابی! اب کچھ دن تو کسی کتاب کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

”سگریٹ پیو گے؟“ انہوں نے جھک کر راز داری سے پوچھا۔ پھر اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر مڑی تڑی سگریٹیں نکالیں اور بولیں۔ ”لو عیش کرو۔“

میں سگریٹ انہیں واپس کرنے والا تھا لیکن پھر کچھ سوچ کر سگریٹ اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا اور بولا۔ ”یہ سگریٹ میں بعد میں پیوں گا۔ ابھی تو اجمل آنے والا ہے۔“

”اب کیوں آ رہا ہے اجمل!“ بھابی نے ناگواری سے پوچھا۔ ”اب تو امتحان بھی ختم ہو گئے ہیں۔“

”ہمارا ایک دوست بیمار ہے۔ اسے دیکھنے جائیں

گے۔" میں نے کہا اور بھائی کو کمرے میں چھوڑ کر خود باہر نکل گیا۔

میں نے سگریٹ بہت احتیاط سے جیب میں رکھی اور ساجد کے گھر چلا گیا۔ اس کا بھائی واجد گھر میں ہی موجود تھا۔ وہ بھی کچھ دن پہلے امتحان سے فارغ ہوا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔ "سعید بھائی! آج آپ کیسے بھول پڑے؟"

"میں ساجد سے ملنے آیا ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ ایک دم افسردہ ہو گیا اور بولا۔ "ساجد بھائی اب یہاں نہیں رہتے؟"

"یہاں نہیں رہتے؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "تو پھر کہاں رہتے ہیں؟"

"پتا نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"واجد! مجھے بتاؤ کہ ساجد کہاں ہے؟ میں نے اس کے بارے میں بہت غلط باتیں سنی ہیں۔ مجھے سرے سے ان باتوں کا یقین ہی نہیں آیا اس لیے خود یہاں چلا آیا۔"

"آپ نے جو کچھ سنا ہے وہ درست ہے سعید بھائی۔" واجد نے کہا پھر اس نے تفصیل سے بتایا کہ ساجد کو ہیروئن کی لت کیسے لگی۔ کالج میں کچھ غلط قسم کے لڑکوں سے اس کی دوستی ہو گئی تھی۔ ان لوگوں نے اسے بھی ہیروئن کی لت لگا دی۔ پھر اس نے وہی باتیں بتائیں جو اجمل پہلے مجھے بتا چکا تھا۔

"اب وہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ان کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ کہیں بھی پڑ جاتے ہیں۔ ابو نے علاج کے لیے دو دفعہ انہیں اسپتال میں داخل بھی کرایا لیکن دونوں بار وہ وہاں سے نکل بھاگے۔ اب بھی وہ کسی گندے نالے یا فٹ پاتھ پر پڑے ہوں گے یا پھر پیسے مل گئے تو سہراب گوٹھ، عیسیٰ نگری یا بنارس کے علاقے میں ہوں گے۔ ہیروئن تو وہیں سے ملتی ہے۔"

میں وہاں سے اٹھ کر ساجد کی تلاش میں نکل گیا۔ میرے ذہن میں بار بار اس ساجد کا چہرہ آ جاتا تھا جو بہت خوش پوش اور خوش شکل تھا۔ جس کا مستقبل بہت تابناک تھا۔ میں ٹہلتا ہوا اس ہوٹل کی طرف چلا گیا جہاں گزشتہ روز ساجد ملا تھا۔

اچانک وہ مجھے نظر آ گیا۔ وہ ایک راہ گیر سے کچھ کہہ رہا تھا۔ اس زمانے میں ہیروئن کے عادی بہت کم تھے۔ لوگوں کو ان کے بارے میں زیادہ معلوم بھی نہیں تھا۔ اس لیے وہ مانگنے والے پر ترس کھا کر اسے کچھ نہ کچھ دے دیا کرتے تھے۔ اس راہ گیر نے بھی ساجد کو ایک روپیا دے دیا تھا۔

وہ پیسے لے کر آگے بڑھا تو میں نے اسے آواز دی۔ اس نے مڑ کر مجھے دیکھا پھر آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا میری طرف آ گیا۔

"ساجد! کھانا کھاؤ گے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے جلدی جلدی سر ہلایا اور بولا۔ "ہاں یار بہت بھوک لگ رہی ہے۔ تم ایسا کرو مجھے کچھ پیسے دے دو۔ میں کھانا کھا لوں گا۔"

میں نے جیب سے پیسے نکالنے کے بہانے سگریٹ نکال لی۔ پھر جلدی سے دوبارہ جیب میں رکھ لی۔ میں نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ سگریٹ میں نے غلطی سے نکال لی ہو۔

"وہ......وہ سگریٹ کیسی ہے سعید؟"

"یار بڑی مشکل سے لایا ہوں۔ میں نے دس روپے کی خریدی ہے۔"

"دس روپے کی؟" وہ حیرت سے بولا۔ "سعید کسی نے تمہیں لوٹ لیا۔ اس سگریٹ کی قیمت دو روپے سے زیادہ نہیں ہے۔" پھر وہ چونک کر بولا۔ "تم......تم کب سے......"

"بس یار! مجھے بھی یہ لت لگ گئی ہے۔"

"میں تمہیں وہ جگہ دکھاؤں گا جہاں سے یہ سگریٹ بہت آسانی سے مل جاتی ہے اور صرف دو روپے میں۔ اگر تین روپے خرچ کرو تو تمہیں اس پاؤڈر کی پڑیا بھی مل سکتی ہے۔ اس میں کم سے کم چار سگریٹ تیار ہو سکتی ہیں۔"

"مجھے تو یہ شبہ ہے کہ کسی نے مجھے بے وقوف بنا دیا۔ پھر اس سگریٹ میں سرے سے کچھ ملایا ہی نہ ہو۔" پھر میں نے اس سے کہا۔ "تم سگریٹ پیو گے؟"

"ہاں لاؤ۔" اس نے کہا۔

میں نے وہ سگریٹ اسے دے دی۔ وہ وہیں کچھ فاصلے پر ایک جگہ بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا لی۔ وہ پہلا کش لگا کر بولا۔ "یار مال تو بہت زبردست ہے تم نے یہ کہاں سے لی ہے؟"

"مجھے ایک دوست نے دس روپے میں دی ہے۔" اس نے کہا۔

ساجد نے میری طرف دیکھتے ہی دیکھتے پوری سگریٹ پھونک دی اور جھوم کر بولا۔ "یار زبردست چیز تھی۔ بہت دن بعد اتنا مزہ آیا ہے۔"

’’ساجد! تم یہ نشہ چھوڑ نہیں سکتے ؟‘‘

’’میں تو بہت کوشش کرتا ہوں سعید لیکن یہ نشہ ایک دفعہ منہ کو لگ جائے تو پھر نہیں چھوٹتا۔‘‘ پھر وہ سنجیدگی سے بولا۔ ’’سعید! میں تم سے یہ ہی کہوں گا کہ تم خود کو اس نشے کا عادی مت بناؤ ورنہ زندگی برباد ہو جائے گی۔‘‘

’’مجھے اس کی بات پر حیرت ہوئی ایک ایسا شخص جو مجھے نشہ نہ کرنے کی تلقین کر رہا تھا وہ خود اس نشے کے بغیر نہیں رہ سکتا۔‘‘

میں کچھ دیر اس کے پاس بیٹھا رہا۔ پھر دوسرے دن اس ہوٹل پر ملنے کا وعدہ کر کے اٹھ گیا۔

دوسرے دن اجمل نے مجھے بتایا کہ ساجد نشے کی جھونک میں سڑک پار کرتے ہوئے ایک گاڑی سے ٹکرا گیا۔ گاڑی والا اسے کچل کر فرار ہو گیا ساجد نے موقع پر ہی دم توڑ دیا۔

ساجد کی موت کا مجھے بہت صدمہ ہوا اور بھابی کے خلاف نفرت مزید بڑھ گئی۔

دو دن بعد وہ پھر سگریٹ لے کر میرے پاس آگئیں۔ اس دن میں پھٹ پڑا۔ ’’بھابی! نشے کی یہ سگریٹ دیتے ہوئے آپ کو ذرا سی شرم نہیں آتی۔ آپ چاہتی ہیں کہ میں بالکل ناکارہ ہو جاؤں اور وقت سے پہلے مر جاؤں؟‘‘

’’میں کیوں چاہوں گی؟‘‘ بھابی نے تڑخ کر کہا۔ ’’تم تو خود خوشامدیں کر کے سگریٹ مانگتے تھے۔‘‘

’’اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ مجھے زہر دے رہی ہیں اور خود بھی پی رہی ہیں۔‘‘ میں نے کہا۔

’’میں اتنی پاگل نہیں ہوں سعید کہ خود اپنے ہاتھوں سے زہر پیوں گی۔ میں نے خود یہ نشہ کبھی نہیں کیا۔ تم نے میری توہین کی ہے سراج کی بے عزتی کی تھی۔ اس بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے سراج نے مجھے یہ سگریٹ لا کر دی تھی کہ سعید کو اس کا عادی بنا دو، بہت پڑھا کو بنتا ہے اس کی ساری پڑھائی دھری کی دھری رہ جائے گی۔‘‘

’’آپ...... آپ اس حد تک بھی گر سکتی ہیں۔‘‘ میں نے نفرت سے کہا۔ ’’میں آئندہ آپ سے بات بھی نہیں کروں گا۔‘‘

’’تو میں کون سی مری جا رہی ہوں تم سے بات کرنے کو؟‘‘ بھابی نے کہا اور پیر پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئیں۔

اس کے بعد انہوں نے واقعی مجھ سے بات نہیں کی۔ میں نے بھی پروا نہیں کی۔

مقابلے کے امتحان کی تیاری کے ساتھ ساتھ میں نے یونیورسٹی میں داخلہ بھی لے لیا تھا۔ میں پھر اپنی پڑھائی میں مصروف ہوگیا۔

میں نے بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر کچھ رقم جمع کی تھی اور پرانی سی ایک موٹر سائیکل خرید لی تھی۔ اب میں زیادہ بچوں کو پڑھا سکتا تھا۔ ڈیفنس اور کلفٹن کے علاقوں میں آسانی سے جا سکتا تھا۔ وہاں ٹیوشن فیس بھی اچھی ملتی تھی۔ ایک دن میں یوں ہی سجاد بھائی کی دکان کی طرف چلا گیا۔ مجھے دکان میں کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ شاید سجاد بھائی کہیں قریب ہی گئے تھے۔ ابھی موٹر سائیکل کھڑی کر کے دکان کی طرف بڑھا تو مجھے کاؤنٹر کے پیچھے سجاد بھائی نظر آئے۔ وہ فرش پر چادر بچھائے لیٹے تھے۔ زیادہ حیرت اور صدمے کی بات یہ تھی کہ ان کے ہاتھ میں سلگتی ہوئی سگریٹ تھی۔ انہوں نے ابھی تک مجھے نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے ایک بھرپور کش لیا۔ دھواں چھوڑتے ہوئے ان کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ انہوں نے جلدی سے سلگتی ہوئی سگریٹ فرش پر پھینک دی اور مجرموں کی طرح سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

میں انہیں مزید شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے کچھ کہے بغیر وہاں سے آگیا۔ پھر دانستہ میں نے کئی دن تک سجاد بھائی کا سامنا نہیں کیا۔ کاش میں ان کی طرف سے اتنا بے نیاز نہ ہوتا۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ وہ صرف سگریٹ پینے لگے ہیں۔ یہ تو مجھے کئی مہینے بعد معلوم ہوا کہ سجاد بھائی ہیروئن کے عادی ہوگئے ہیں۔

اس وقت تک دکان تباہ ہو چکی تھی اور ان کی حالت بھی ساجد جیسی ہورہی تھی۔

پھر وہ شدید بیمار ہوگئے۔ میں نے انہیں اسپتال میں داخل کرا دیا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ ہیروئن کے نشے نے انہیں اندر سے کھوکھلا کر دیا ہے اور ان کے دونوں پھیپھڑے ناکارہ ہوگئے ہیں۔

ایک دن سجاد بھائی نے خاموشی سے ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لیں۔ ان کے بعد بھابی ایک ہفتے بھی وہاں نہیں رہیں۔ دکان تو سجاد بھائی خود ہی تباہ کر چکے تھے۔ بچا کھچا سامان دکان کے مالک نے کرائے کی مد میں ضبط کر لیا تھا۔

یہ انکشاف تو بعد میں ہوا کہ بھابی اپنے کزن سراج کو پسند کرتی تھیں لیکن سراج نکما تھا اس لیے ان کے والدین نے ان کی شادی سجاد بھائی سے کردی لیکن انہوں نے بھی اس شادی کو دل سے قبول نہیں کیا۔ انہوں نے جان بوجھ کر ایسی حرکتیں کیں کہ سجاد بھائی انہیں طلاق دے دیں لیکن وہ تو اتنے معصوم تھے کہ کچھ سمجھ ہی نہ سکے۔ امی سمجھتی تھیں لیکن وہ سجاد بھائی کے سامنے زبان نہیں کھول سکتی تھیں۔

پھر بھابی نے سجاد بھائی کو ہیروئن کی لت لگا دی۔ اس کا مشورہ بھی انہیں سراج ہی نے دیا ہوگا۔

گھر کے حالات خراب ہوئے تو میں نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بینک میں ملازمت کر لی۔ پھر اپنی محنت سے ترقی کرتا ہوا اس عہدے پر پہنچ گیا۔ اس دن کے بعد سے مجھے سگریٹ سے نفرت ہوگئی ہے۔ مجھے تو اس کا دھواں بھی گراں گزرتا ہے۔ کوئی سگریٹ سلگاتا تھا تو سجاد بھائی اور ساجد کے چہرے میری نظروں میں آجاتے تھے پھر مجھے سگریٹ پینے والوں ہی سے نفرت ہوگئی۔

☆......☆

دوسرے دن میں آفس میں بیٹھا اپنے کام میں مصروف تھا کہ محمود آگیا اور بولا۔ ”سر! میں نے اکاؤنٹ سیکشن سے بقایاجات کلیئر کرالیا ہے۔ اگر میری کوئی اور بات بھی آپ کو بری لگی ہو تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔“

وہ بتانے لگا تو میں نے کہا۔ ”مسٹر محمود۔“

اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔

”بیٹھیے۔“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔ پھر مسکرا کر بولا۔ ”زیادتی تو میں نے آپ کے ساتھ کی تھی۔ آپ کہیں نہیں جارہے ہیں۔ میں نے آپ کو دوبارہ ملازمت پر بحال کر دیا ہے۔ بس میری ایک ہی گزارش ہے کہ......“

”میں سمجھ گیا سر۔“ محمود نے جلدی سے کہا۔ ”آئندہ میں سگریٹ کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔ یہ میں وعدہ کرتا ہوں۔“

”وعدہ آپ مجھ سے نہیں بلکہ خدا سے کریں محمود صاحب۔“ میں نے کہا اور انٹرکام پر مسز نورین کو رابطہ کر کے کہا۔ ”ذرا میرے آفس میں آئیے۔“ محمود مسکراتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

میں اب اپنے اس پاگل پن پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ سگریٹ سے نفرت کرنا، دھوئیں سے ناگواری محسوس کرنا الگ بات ہے لیکن سگریٹ پینے والوں سے نفرت کرنا بہت غلط ہے۔ میں ہر نوجوان کو یہی نصیحت کروں گا کہ خدارا سگریٹ سے بچیں کیوں کہ سگریٹ ہی نشے کی پہلی سیڑھی ہوتی ہے۔

صحیح طریقہ

محترم چیف ایڈیٹر
السلام علیکم!
اپنی بے وقوفی کی داستان میں خود ہی سنانا چاہتا ہوں۔ پلیز اسے پڑھ کر ہنستے ہوئے ڈسٹ بن میں مت پھینک دیجیے گا۔ یہ دوسروں کے لیے بھی عبرت بھری ہے۔ کم سے کم پڑھنے والے ضرور ہوشیار ہو جائیں گے اور میری بے وقوفی کا اعادہ نہیں ہو پائے گا۔

شریف الدین
(فیصل آباد)

بات صرف اتنی تھی کہ میں نے اس لڑکی سے محبت کا اظہار کردیا تھا۔

اظہار کرنے کا یہ طریقہ میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ جب کوئی لڑکی پسند آجائے تو اس سے اظہار کرنے میں دیر نہ لگاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ تم سوچتے رہ جاؤ اور اظہار کا شرف کسی اور کو حاصل ہو جائے۔ طریقہ بہت آسان تھا کہ اس کے پاس پہنچ کر اس کی خدمت میں گلاب کا پھول پیش کرتے ہوئے اس سے کہو۔ ”اے حسن کی

رانی، بہاروں کی ملکہ تو اگرچہ گلاب کے اس پھول سے کہیں زیادہ خوب صورت اور نازک ہے اس کے باوجود میں یہ پھول اس لیے پیش کررہا ہوں کہ یہ کم بخت تجھے دیکھ دیکھ کر شرما تا رہا ہے۔'' یہ تو ہوا پہلا قدم۔ اس کے بعد لکھا تھا کہ اگر پہلے قدم میں کامیابی حاصل ہو جائے تو پھر دوسرا قدم اٹھاؤ اور دوسرا قدم یہ تھا کہ اس کا ہاتھ تھام لو۔ اس کے بعد محبت اسٹارٹ ہو جائے گی۔

احتیاط یہ رکھو کہ قدموں میں گڑبڑ نہ ہو۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ دوسرا قدم پہلے اٹھا لو۔

لہٰذا میں اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ دوسرا قدم پہلے اٹھا لیتا۔ اس لیے میں نے اس لڑکی کو دیکھتے ہی یہ سوچ لیا کہ میں اس سے اپنی محبت کا اظہار کر کے رہوں گا۔

وہ محلے کی لڑکی تھی۔ محلے کی لڑکیوں کے ساتھ عشق کرنے کا فائدہ بھی ہے اور نقصان بھی۔ فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر نوبت مار پیٹ کی آجائے تو محلے والے محلے کا لحاظ کر کے کم مارتے ہیں۔ اور نقصان یہ ہے کہ اگر محبت کامیاب ہو جاتی ہے تو پھر محلے میں بدنامی ہونے لگتی ہے۔ خیر یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی۔

میں نے وہ کتاب ایک ٹھیلے والے کے پاس سے لی تھی۔ میں وقت گزاری کے لیے یوں ہی کتابوں کو الٹ پلٹ رہا تھا کہ وہ کتاب دکھائی دے گئی۔ بہت پرانی کتاب تھی۔ خستہ حال اس سے اس کی قدامت کا اندازہ ہو رہا تھا۔

ٹھیلے والا شاید شناسا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے میرے ہاتھ سے کتاب لے لی۔ ''رہنے دو صاحب یہ کتاب تمہارے لیے نہیں ہے۔''

''تو پھر کس کے لیے ہے؟''

''یہ بہت مستند اور مانی ہوئی کتاب ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اس پر عمل کرنے والا آج تک ناکام نہیں ہوا۔ باپ دادا کے زمانے سے میرے پاس چلی آرہی ہے۔''

''تو پھر یہ میرے لیے کیوں نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''صاحب! اصل بات ہے عقیدے کی۔ یقین کی۔ بھروسے کی۔ تمہارے چہرے سے نہیں لگ رہا کہ تم اس کتاب پر بھروسا کرو گے۔ اس لیے کوئی اور کتاب دیکھ لو۔ یہ دیکھو یہ ہے یوگنڈا کی جغرافیائی تبدیلی پر کتاب بہت زبردست ہے۔''

''تم رہنے دو یوگنڈا کو مجھے اس سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ تم اس کی قیمت بتاؤ۔''

''دیکھو ویسے تو یہ کتاب تمہارے حوالے کرتے ہوئے بہت دکھ ہوگا۔ لیکن چلو تمہاری خاطر...... اس کے تین سو روپے دے دو۔''

''تین سو اتنی خستہ کتاب کے۔''

''دیکھو میں نے کہا تھا نا کہ یہ کتاب تمہارے لیے نہیں ہے۔'' ٹھیلے والے نے طنز سے کہا۔

مجھے ٹھیلے والے کے اس انداز پر تاؤ آ گیا تھا۔ میں نے تین سو نکال کر اس کے حوالے کیے اور وہ کتاب اس سے خرید لی۔

کتاب میرے حوالے کرتے ہوئے اس کے تاثرات کچھ ایسے تھے۔ جیسے اس کا کوئی عزیز فوت ہو گیا ہو۔ گھر آکر میں نے جلدی جلدی پوری کتاب ختم کر دی۔ اس میں محبت حاصل کرنے کے ایک سو دو طریقے بتائے گئے تھے۔ ان میں سب سے اچھا طریقہ مجھے گلاب کے پھول والا لگا تھا۔ ویسے باری باری اور طریقے بھی آزمائے جا سکتے تھے۔

اب تلاش تھی ایک عدد ایسی لڑکی کی جس کی خدمت میں گلاب کا پھول پیش کیا جائے۔ اس سلسلے میں سکندر شاہ کی خدمات لینی پڑیں۔

وہ بندہ اس قسم کے موقعوں پر کام آیا کرتا تھا۔ محلے کی لڑکیوں کے بارے میں اس کی معلومات قابلِ رشک تھیں۔ ان کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے اسے کتاب کا راز تو نہیں بتایا لیکن یہ ضرور کہا۔ ''بھائی سکندر میرے لیے کوئی لڑکی ڈھونڈ دو۔''

''شادی کے لیے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں بھائی! شادی سے پہلے میں محبت کے تجربے سے گزرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ہوں، اب سمجھا'' سکندر مسکرایا۔ پھر کچھ سوچنے لگا۔ کچھ دیر بعد میری طرف دیکھا۔ ''کام بن گیا تیرا۔ بندے بھائی کی لڑکی کو پکڑ لے۔''

بندے بھائی محلے کے ایک بندے کا نام تھا۔ وہ کسی زمانے میں آٹے کی چکی چلایا کرتا تھا۔ پھر اس نے وہ کام چھوڑ دیا تھا۔ اس کے دو جوان بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ جس کو میں نے یوں ہی سرسری طور پر دیکھا ہوا تھا۔ سکندر شاہ اس لڑکی کی بات کر رہا تھا۔

"وہ لڑکی کیسی ہے۔" میں نے پوچھا۔

"بہت اچھی کہ نہ جانے اس بندے کے گھر میں کیسے پیدا ہوگئی۔" سکندر نے کہا۔ "آج کل فارغ ہی ہے۔"

"میں نے تو سنا تھا کہ کسی اسکول میں پڑھاتی ہے؟"

"ابے محبت سے فارغ کی بات کر رہا ہوں۔" سکندر تڑخ کر بولا۔ "اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ اس کا مکمل ریکارڈ ہے میرے پاس۔ نہ تو اس کی زندگی میں پہلے کوئی آیا تھا اور نہ آج تک آیا ہے۔ لگتا ہے قسمت نے اسے تیرے ہی لیے بٹھا رکھا ہے۔"

"یار تو پھر شروع ہو جاؤں۔" میں نے پوچھا۔

"اور کیا۔ اس میں کیا پوچھنا ہے۔ اس میں کیا دیر کرنی ہے۔"

پھر مجھے کتاب کی لائن یاد آگئی۔ جس میں لکھا تھا کہ اگر کوئی لڑکی پسند آجائے تو اس سے اظہار کرنے میں دیر نہ لگاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ تم سوچتے رہ جاؤ اور اظہار کا شرف کوئی اور حاصل کرلے۔

"ٹھیک ہے یار، تو میں کل ہی ٹرائی کرتا ہوں۔"

"اور مجھے رپورٹ ضرور دیتے رہنا۔"

اب گلاب کے پھول کا بندوبست کرنا تھا۔ اس کے لیے پڑوس کے لان کے پودے کام میں آجاتے۔ پڑوسی نے اپنے لان میں گلاب کے کئی پودے لگا رکھے تھے۔ جن پر گلاب کے حسین پھول کھلے رہتے۔

دوسری صبح میں بہت جلدی اٹھا۔ کتاب کے جملوں کو یاد کیا۔ پڑوسی کے لان سے گلاب کا ایک پھول توڑا اور اسٹاپ کی طرف چل پڑا۔ جہاں وہ لڑکی جس کا نام عالیہ تھا اسکول کی بس پکڑنے کے لیے آیا کرتی تھی۔

کچھ دیر بعد آتی ہوئی دکھائی دے گئی۔ آج میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اچھی خاصی خوب صورت لڑکی تھی۔ سکندر شاہ نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ بندے جیسے آدمی کے گھر کیسے پیدا ہوگئی تھی۔

وہ لڑکی آکر کھڑی ہوئی۔ میں نے اپنے آپ کو حوصلہ دیا۔ اپنی ہمت بندھائی اور اس لڑکی کے سامنے جاکر کھڑا ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتی میں نے پھول اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کتاب کی لائنیں بولنا شروع کردیں۔

"اے حسن کی رانی، بہاروں کی ملکہ تو اگرچہ گلاب کے اس پھول سے کہیں زیادہ خوب صورت اور نازک ہے۔ اس کے باوجود یہ پھول اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ یہ کم بخت تجھے دیکھ دیکھ کر شرماتا ہے۔"

کچھ دیر تک تو اس کی سمجھ ہی نہیں آیا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ پھر سمجھ آتے ہی اس نے شور کرنا شروع کردیا۔

"بے شرم، بے ہودہ انسان، لعنت ہو تیری شکل پر۔ ڈوب مر، شرم نہیں آتی اس طرح محلے کی لڑکیوں سے بکواس کرتے ہوئے۔"

اس دوران چونکہ کچھ اور لوگ بھی اسٹاپ پر جمع ہو چکے تھے۔ اس لیے انہوں نے میری ٹھکائی کرنے میں ایک لمحے کی دیر نہیں لگائی۔ وہ خدمتِ خلق سمجھ کر مجھے مار رہے تھے اور ثواب دارین حاصل کرتے جا رہے تھے۔ اچھا ہوا کہ انہوں نے مجھے پولیس کے حوالے نہیں کیا۔ بس تھوڑی بہت مار پیٹ کر چھوڑ دیا۔

میں لنگڑاتا اور کراہتا ہوا گھر پہنچا تھا۔ کپڑے پھٹ چکے تھے۔ دونوں آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور پورا جسم بری طرح درد کر رہا تھا۔

پتا نہیں کیا کمی رہ گئی تھی جو یہ ٹوٹکا کام میں نہیں آیا تھا۔

ابھی میں اپنی چوٹوں کی سینکائی کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہونے لگی۔ شاید وہ اپنے باپ اور خاندان والوں کو لے آئی تھی۔

کوئی دوسرا راستہ ہوتا تو میں اس طرف سے بھاگ نکلتا لیکن ایک ہی دروازہ تھا اس لیے مجبوراً مجھے دروازہ کھولنا پڑ گیا۔ سکندر شاہ دروازے پر تھا۔

"کیا دیکھنے آیا ہے بھائی۔" میں نے کراہتے ہوئے پوچھا۔

"یار مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی۔" اس نے کہا۔ "میں یہ سمجھا تھا کہ وہ لڑکی فارغ ہے۔ لیکن وہ فارغ نہیں ہے۔ اس کی منگنی ہو چکی ہے اور جس سے محبت کی تھی اسی سے منگنی ہوئی ہے۔ یہ مجھے کل رات ہی پتا چلا۔ تم یہ بتاؤ تم نے ابھی تک اس سے اظہار تو نہیں کیا نا؟"

"خدا کے بندے تو میرا یہ حال دیکھ رہا ہے؟" میں نے تقریباً روتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں دیکھ رہا ہوں۔ تم شاید کہیں چھت وت سے گرے ہو۔" اس نے کہا۔

"ابے لعنت ہو تیرے سمجھنے پر۔ یہ اسی اظہار کی وجہ سے حال ہوا ہے۔"

"بہت افسوس ہوا سن کر لیکن بھائی تم نے بھی تو اتنی جلدی کردی۔ صبح ہی پہنچ گئے۔ ایک دو دن کنفرم تو

کر لیتے۔"

"اب کیا کنفرم کرتا تم پر تو آنکھیں بند کر کے بھروسا تھا۔" میں نے کہا۔

"ہاں یار! پہلی بار غلطی ہوئی ہے مجھ سے اور وہ خاندان بھی تو کم بخت اتنا گھنا ہے کہ منگنی کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔"

"اچھا بس اب زیادہ دل مت جلاؤ کم بختوں نے دشمن سمجھ کر مار لگائی ہے۔"

"یار پروا مت کرو۔ اگلی بار بالکل کنفرم نیوز دوں گا۔ ابھی محلے میں بہت سی ہیں۔"

بہرحال ایک بات تو واضح ہوگئی تھی کہ اس کتاب کے ٹوٹکوں میں خرابی نہیں ہے۔ خرابی تو ہماری طرف سے ہوئی تھی۔ کتاب کے پہلے ہی صفحے پر لکھا تھا کہ یہ تمام ٹوٹکے فارغ لڑکیوں کے لیے ہیں۔ جو پہلے انگیج ہو چکی ہیں ان پر آزمانے کی کوشش نہ کریں۔

بہرحال میں نے اب کتاب کے دوسرے ٹوٹکے کی طرف توجہ دی اور وہ بھی ایک ہفتے کے بعد۔ کیوں کہ ایک ہفتے تک تو میں اپنی سینکائی ہی کرتا رہا تھا۔ ایک ہفتے کے بعد ایک بار پھر سکندر شاہ کی طرف دیکھنا پڑ گیا۔

"یار اس بار جو میں نے اپنے یار کے لیے لڑکی ڈھونڈی ہے۔ وہ بالکل فارغ ہے۔" اس نے کہا۔ "میں خود جانتا ہوں پہلے کئی برسوں سے اس کو دیکھ رہا ہوں۔ وہ کسی کے ساتھ نہیں ہے۔"

"بھائی کس کی بات کر رہے ہو۔" میں نے پوچھا۔

"صمد بھائی کی بیٹی۔" اس نے محلے کے دکاندار کا نام بتایا۔ "تم خود جانتے ہو کتنی خوب صورت ہے۔"

"لیکن وہ تو گونگی ہے۔" میں نے کہا۔

"تو کیا ہوا۔ اگر اس سے شادی ہو جائے تو زندگی کتنی آرام سے گزرے گی۔ تمہاری الٹی سیدھی حرکتوں پر کوئی بولنے والا ہی نہیں ہوگا۔"

"بکواس مت کرو۔" میں چڑ کر بولا۔ "کسی اور کا بتاؤ۔"

"تو پھر ماسٹر گلفام کی لڑکی کو پکڑ لو۔" سکندر نے کہا۔ "وہ پڑھی لکھی خوب صورت اور سمجھدار لڑکی ہے۔ وہ اگر تمہیں مل جائے تو پھر تمہارے مزے آجائیں گے۔"

"ہاں وہ صحیح رہے گی۔" میں نے گردن ہلا دی۔ "لیکن کیسے اپروچ کروں۔"

"وہ جو رحیم برگر والا ہے نا۔ وہ ہر شام اس کے برگر کھانے ضرور جاتی ہے۔" سکندر نے بتایا۔ "پتا نہیں کیا شوق ہے لیکن تمہارے لیے بہترین موقع اس وقت ہوگا جب وہ برگر کھا رہی ہوگی۔ پھر تم جو چاہو اس سے کہہ سکتے ہو۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "میں کل ہی پکڑتا ہوں اس کو۔"

اس کتاب میں ایک زبردست ٹوٹکا تھا۔ کتاب لکھنے والے نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ یہ ٹوٹکا یکدم کام کرتا ہے۔ بشرطیکہ سلیقے سے کیا جائے۔

اور وہ ٹوٹکا یہ تھا کہ جس لڑکی سے محبت کرنی ہو۔ اس کو مٹھائی دم کر کے کھلا دو۔ ایک سو ایک مرتبہ ایک وظیفہ پڑھنا تھا۔ وظیفہ بھی بہت مختصر تھا۔ پانچ منٹ میں پڑھا جا سکتا تھا۔

اب یہ کھلانے والے کی کاریگری تھی کہ وہ کس بہانے سے کھلاتا ہے۔

چونکہ یہ ہر حال میں کرنا تھا۔ اس لیے میں ایک پاؤ برفی پر وہ وظیفہ دم کر کے رحیم برگر والے کے پاس پہنچ گیا۔ بلکہ انتظار کرتا رہا کہ وہ لڑکی ٹھیلے پر آئے تو میں مٹھائی کا پیکٹ کھولوں۔

کچھ ہی دیر بعد وہ ٹھیلے پر آگئی۔ یہاں تک سکندر شاہ کی انفارمیشن بالکل صحیح جا رہی تھی۔ اس کے آتے ہی میں نے مٹھائی کا پیکٹ کھولا اور اس لڑکی سے براہ راست مخاطب ہونے کی بجائے رحیم سے مخاطب ہوا۔ "یہ لو رحیم چاچا۔ تم بھی چکھ لو۔"

"یہ کیا ہے بھائی؟" رحیم نے پوچھا۔

"تبرک ہے عراق سے آئی ہے۔" میں نے کہا۔

میں اس وقت چلبلا کر رہ گیا جب اس کم بخت رحیم نے برفی کا اچھا خاصا بڑا سا ٹکڑا اٹھا کر اپنے منہ میں رکھ لیا تھا۔ بہرحال جتنی بھی بچی تھی وہ میں نے اس لڑکی کی طرف بڑھا دی۔ "یہ لو بی بی! تم بھی لے لو۔ تبرک ہے۔ ثواب ملے گا۔"

"سوری میں برفی نہیں کھاتی۔" اس نے برا سا منہ بنا کر بتایا۔ "میں نے زندگی میں سوائے گلاب جامن کے کبھی کچھ نہیں کھایا۔"

"لاؤ بھائی اب یہ مجھ ہی کو دے دو۔" رحیم نے کہا۔

"رہنے دو چاچا۔ تم لے چکے ہو۔ یہ کسی اور کو دے دوں گا۔"

لڑکی برگر کھا کر واپس چلی گئی اور میں بچی ہوئی برفی خود کھا کر گھر چلا آیا۔ دوسرے دن جب میں نے سکندر کو بتایا تو وہ مجھے مبارک باد دینے لگا۔ ''بھائی مبارک ہو تم تو کامیاب ہو گئے۔''

''اب کہاں کامیاب ہوا ہوں۔''

''یہ کامیابی نہیں تو اور کیا ہے۔ اس نے اشارہ دے دیا ہے کہ وہ گلاب جامن کھاتی ہے۔ ورنہ یہ بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ صاف انکار کر دیتی۔ گلاب جامن بتانے کی کیا ضرورت تھی۔''

''اوہ میں نے تو اس طرح سوچا ہی نہیں تھا۔'' میں نے کہا۔

''ہاں اس لیے کہتے ہیں کہ ایسے معاملات میں صرف جذبات سے نہیں بلکہ عقل سے بھی کام لے لیا کرو۔'' اس نے کہا۔ ''اب اس کے پاس گلاب جامن لے کر جاؤ۔''

''یار برفی تو عراق سے آچکی ہے۔ اب گلاب جامن کہاں سے آئی ہو گی۔''

''کہنا یہ بھی عراق سے آئی ہے۔''

''پتا نہیں عراق میں گلاب جامن ہوتے ہیں یا نہیں۔''

''ابے وہ کون سا ریسرچ کرنے چلی جائے گی۔'' سکندر نے کہا۔ ''برفی بھی تو نہیں ہوتی۔''

''ٹھیک ہے سمجھ گیا۔''

دوسرے دن میں نے گلاب جامن خریدے اور رحیم برگر والے کے ٹھیلے کے پاس پہنچ گیا۔ پتا نہیں اس لڑکی کو برگر کا کیا چسکا تھا کہ وہ پھر موجود تھی۔

میں نے پروگرام کے مطابق گلاب جامن کا ڈبہ رحیم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ لو رحیم چاچا۔ ایک گلاب جامن اٹھا لو۔ تبرک ہے۔ یہ بھی عراق سے آیا ہے۔''

اس بار اس لڑکی نے مسکراتے ہوئے اس طرح میری طرف دیکھا جیسے اس کی سمجھ میں آ گیا ہو کہ میں یہ سب کیوں کر رہا ہوں۔ رحیم نے ایک گلاب جامن اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ میں نے پھر ڈبہ لڑکی کی طرف بڑھا دیا۔ ''یہ لیں بی بی ایک آپ بھی لے لیں۔ تبرک ہے۔''

''جی نہیں شکریہ۔'' لڑکی منہ بنا کر بولی۔ ''ہم دوسرے مسلک کے لوگ ہیں۔ اس قسم کے تبرک نہیں کھاتے۔''

''یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔'' میں جھلا اٹھا۔ ''اتنی محنت سے تو تبرک آیا ہے۔''

''تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہے۔'' لڑکی بھنا کر بولی۔ ''زبردستی کیوں کھاؤں۔''

میں جل بھن کر واپس آ گیا۔ کم بخت اس کتاب کا کوئی ٹوٹکا کام ہی نہیں آ رہا تھا۔ ویسے اس میں بے چارے مصنف کا بھی کوئی قصور نہیں تھا۔ میں ہی شرائط پر پورا نہیں اتر رہا تھا تو ٹوٹکے کیا کام آتے۔

دوسرے دن میں پھر اس ٹھیلے والے کے پاس پہنچ گیا

جس سے میں نے محبت والی کتاب لی تھی۔ وہ بھی بلا کا قیافہ شناس تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی میری طرف ایک کتاب بڑھا دی۔ ”یہ لو بابو، تمہارے مطلب کی کتاب ہے۔ پنڈت موہن داس جھانسی والے کی کتاب ہے۔“

”تمہیں کیسے معلوم کہ یہ کتاب میرے مطلب کی ہے۔“ میں نے ناراض ہوتے ہوئے پوچھا۔

”ارے بابو جی دن بھر لوگوں سے واسطہ رہتا ہے۔ دیکھتے ہی سمجھ جاتا ہوں کہ کس کو کس قسم کی کتاب چاہیے۔ لگتا ہے دل پر چوٹ کھائی ہے تم نے؟“

”ہاں بھائی کچھ ایسی ہی بات ہے۔“ میں بھی اب کھل گیا تھا۔

”تو بس۔ یہ سمجھو کہ یہ کتاب تمہارے ہی لیے ہے۔“ اس نے کہا۔

”لیکن اس میں ہے کیا۔“

”آنکھوں کی قوت سے کسی کو بھی اپنی طرف کھینچ لینے کے طریقے۔“ اس نے بتایا۔ ”بس پندرہ پندرہ دنوں کی مشقیں بتائی گئی ہیں۔ یہ کرلو اس کے بعد تماشا دیکھو۔ کسی کو بھی دور سے متوجہ کر سکتے ہو۔ تعویذ گنڈے وغیرہ کا چکر ہی نہیں ہے۔“

یہ کتاب کام کی معلوم ہوتی تھی۔ کسی کو مٹھائی کھلانا یا کسی کو تعویذ وغیرہ باندھنا تو اپنے بس کا روگ نہیں تھا۔ بس دور سے دیکھا اور کام بن گیا۔ میں نے اس قسم کی ترکیبوں اور قوت کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اس کو شاید ہپناٹزم کہتے ہیں۔

”چلو تمہارے کہنے سے یہ کتاب میں لے جارہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”بتاؤ کتنے پیسے دے دوں۔“

”پانچ سو روپے۔“ اس نے کہا۔

”کیا بات کررہے ہو۔ اتنی خستہ اور پرانی کتاب کے پانچ سو روپے؟“

”اس کتاب کی قیمت پر مت جاؤ۔“ اس نے کہا۔ ”اس کی تاثیر دیکھنا۔ پنڈت موہن داس جھانسی والا کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ وہ اس فن کا ماہر تھا۔ ہندوستان سے لے کر یورپ تک اس کی دھوم مچی ہوئی تھی۔“

”اچھا چلو دے دو۔“ میں نے کہا۔

میں کتاب لے کر گھر آگیا۔ پنڈت موہن داس جھانسی والے نے آنکھوں میں بے پناہ قوت پیدا کرنے کے کئی طریقے لکھے تھے۔ شمع بینی سے لے کر آئینہ بینی تک۔

”شمع بینی کا طریقہ یہ بتایا تھا کہ کم از کم آدھ گھنٹے تک موم بتی کی لو کو دیکھتے رہیں۔ اس کے بعد جب آنسو نکلنے لگیں تو آنکھیں دھو کر پھر بیٹھ جائیں اور کم از کم روزانہ پندرہ دنوں تک ایک گھنٹے روز کی پریکٹس کریں۔ اس کے بعد انسان تو انسان پرندے تک کھنچے چلے آئیں گے۔“

واہ اگر ایسا تھا تو کمال ہی ہو جاتا۔

اس رات میں نے پریکٹس شروع کردی۔ پچیس روپے والی بڑی موم بتی خرید کر لے آیا تھا اور رات کے وقت کمرے میں بند ہو کر شمع بینی شروع کردی۔

پانچ منٹ کے بعد ہی حالت خراب ہونے لگی تھی۔ آنکھوں میں بے پناہ جلن ہو رہی تھی۔ دس منٹ کے بعد تو بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔ پندرہ منٹ کے بعد آنکھوں سے بری طرح آنسو بہنے لگے۔ ہدایت کے مطابق میں نے ٹھنڈے پانی کے چھپکے مارے اور دوبارہ کمر کس کے بیٹھ گیا۔ ایک گھنٹا تو پورا کرنا ہی تھا۔

ایک گھنٹے کے بعد تو ہوش ہی اڑ گئے تھے۔ آنکھوں میں اتنی جلن ہونے لگی تھی جیسے مرچیں ڈال دی گئی ہوں۔ بہت ہی سخت پریکٹس تھی لیکن یہ پریکٹس پورے پندرہ دنوں تک کرنی تھی۔

لیکن صرف ایک ہفتے کے بعد آنکھیں کسی کام کی نہیں رہیں۔

دونوں آنکھیں سوج کر کپا بن گئی تھیں۔ ایک صبح جب سو کر اٹھا تو بہت دیر تک کچھ دکھائی ہی نہیں دیا اور بہت دیر بعد جو نظر بھی آیا تو وہی موم بتی کی جلتی ہوئی لو۔ جیسے آنکھوں کے آگے موم بتی ابھی تک جل رہی ہو۔ میں نے پھونک مار کر اس لو کو بجھانے کی کوشش کی لیکن وہ موم بتی جلتی ہی رہی۔ لیکن وہ کم بخت گل ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

کچھ دیر بعد دھیرے دھیرے نظر آنا شروع ہوگیا۔ وہ میرا کمرا تھا۔ میرا بستر تھا۔ الماری تھی۔ میز تھی اور میز پر وہی

کتاب رکھی ہوئی تھی۔ پنڈت موہن داس جھانسی والے کی کتاب لیکن مصیبت یہ تھی کہ آنکھوں کے سامنے وہ موم بتی اب تک روشن تھی۔

میں پھونک مار مار کر بے حال ہو گیا لیکن کیا مجال جو ذرا سی بھی بجھی ہو۔ پتا نہیں اس ٹھیلے والے نے کون سی کتاب پکڑا دی تھی۔

کمال یہ تھا کہ میں جہاں بھی جاتا وہ موم بتی میری نگاہوں کے سامنے ہی رہتی۔ جیسے فضا میں معلق ہو کر میرے ساتھ ساتھ چلی آرہی ہو۔

اسی عالم میں سکندر سے ملاقات ہو گئی۔ میں اس وقت بازار سے پھونکیں مارتا ہوا موم بتی کو بجھانے کی کوشش کرتا ہوا چل رہا تھا کہ سکندر میرے سامنے آ گیا۔ وہ مجھے جنونیوں کی طرح پھونکیں مارتے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

"ارے بھائی کیا ہوا ہے تمہیں۔ خیریت تو ہے نا۔" اس نے پوچھا۔

"یار سکندر میں سب کچھ بتا دوں گا۔ پہلے یہ موم بتی بجھا دے۔" میں نے کہا۔

"کون سی موم بتی۔"

"یہی جو میرے سامنے جل رہی ہے۔ کم بخت گل ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ اس کو بجھا دے بھائی۔ پھر کہیں اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

"کیا ہو گیا ہے تمہیں، یہاں تو کوئی موم بتی نہیں ہے۔"

"سکندر مذاق مت کرو۔ بجھا دو اس کو۔ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

"میرا خیال ہے کہ تم پاگل ہو ہی گئے ہو۔"

میں نے اس کے تبصرے پر دھیان دیے بغیر موم بتی کو گل کرنے کی کوششیں تیز کر دیں۔ سکندر مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھتا ہوا ایک طرف چلا گیا تھا۔

"اب کیا کروں۔ ایسا تو نہیں کہ میں پاگل ہو گیا ہوں۔ نظر آنے والی موم بتی میرا واہمہ ہی ہو۔ ورنہ میرے علاوہ کسی اور کو دکھائی کیوں نہیں دیتی۔"

مجھے تو اس کم بخت کتابوں والے نے مروا دیا تھا۔ نہ میں پنڈت موہن داس جھانسی والے کے چکر میں پڑتا نہ میرا یہ حال ہوتا۔

میں اس وقت کہیں اور جانے کے لیے نکلا تھا لیکن غصے میں بھنایا ہوا ٹھیلے والے کے پاس پہنچ گیا۔ وہ موم بتی اس وقت بھی میرے ساتھ ہی تھی۔

وہ ٹھیلے والا مجھے دیکھتے ہی خوش ہو گیا۔ "آؤ بابو آؤ، میں جانتا تھا تم ضرور آؤ گے۔"

"تم نے میرے ساتھ کیا کر دیا ہے؟" میں نے غصے سے پوچھا۔

"میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ ویسے بات کیا ہے؟"

"یہ تم نے موم بتی میرے پیچھے کیوں لگا دی ہے۔" میں نے پوچھا۔ "میری تو زندگی عذاب کر دی ہے اس نے۔ ہر وقت میرے ساتھ چپکی رہتی ہے۔ اس وقت بھی سامنے جل رہی ہے۔"

"اوہو میں سمجھ گیا۔" اس نے گردن ہلائی۔ "لگتا ہے پنڈت موہن داس جھانسی والے کی کسی ترکیب پر عمل کر لیا ہے تم نے۔"

"ہاں میں نے شمع بینی کی پریکٹس کی تھی۔ اس کے بعد میرا یہ حال ہو گیا۔"

"کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے ٹھیلے پر سے ایک کتاب اٹھا کر میری طرف بڑھا دی۔ "جاؤ یہ لے جاؤ۔"

"اب یہ کیا ہے۔"

"یہ مہاراج برج نارائن پونا والے کی لاجواب کتاب ہے۔" اس نے بتایا۔ "جو لوگ پنڈت موہن داس جھانسی والے کی کتاب پر عمل کر کے پاگل ہو جاتے ہیں۔ اس کتاب کو پڑھ کر ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ اس کتاب میں مہاراج نے ٹھیک ہونے کے ایک سو نو طریقے بتائے ہیں۔"

اب معاملہ میری برداشت سے باہر تھا۔ میں نے پنڈت، مہاراج اور اس ٹھیلے والے کو درجنوں گالیاں سنائیں اور وہاں سے واپس آ گیا۔

اب کئی مہینوں کے بعد میں ٹھیک ہو گیا ہوں۔ وہ موم بتی غائب ہو گئی ہے اور میں سیدھے طریقے سے شادی کرنے کی سوچ رہا ہوں۔

اور ان تمام تجربات سے گزرنے کے بعد جو سبق ملا ہے وہ بہت قیمتی ہے اور میں آپ سے بھی شیئر کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ خدا کے لیے ایسی کتابوں کے چکر میں نہ پڑیں۔ محبت اس طرح حاصل نہیں ہوتی۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے دوسرے طریقے ہیں۔ جو میں نے ایک کتاب میں لکھ دیے ہیں جو بہت جلد مارکیٹ میں آنے والی ہے۔
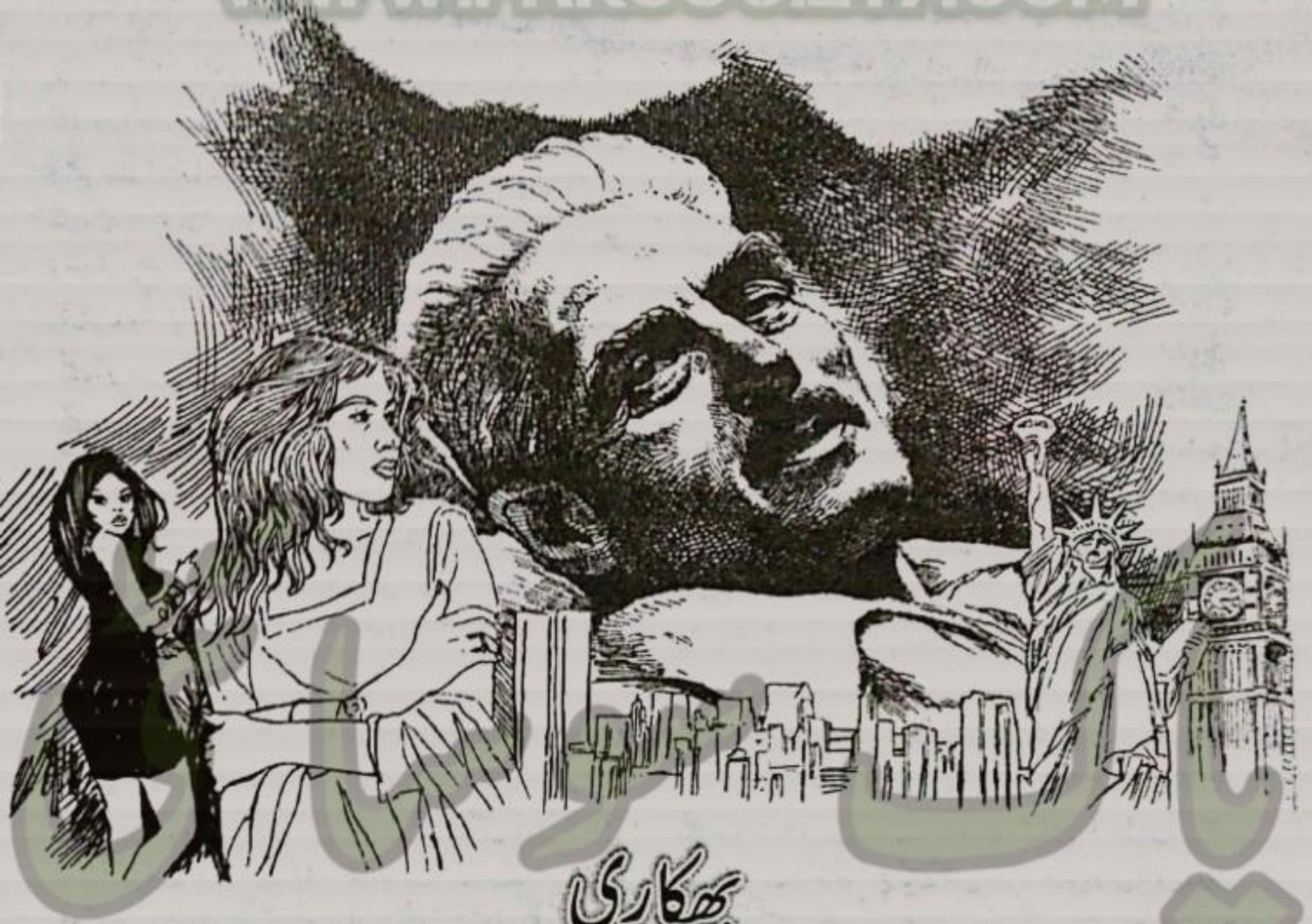
بھکاری

راوی :سلمان

محترم ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم!

اس بار میں اپنے ایک واقف کار کی حالاتِ زندگی کے ساتھ حاضر ہوں۔ اس کی حالاتِ زندگی کئی معنوں میں سبق آموز ہے اسی لیے میں نے سوچا کہ اسے قارئین سرگزشت کے لیے مرتب کردوں۔

حسن رزاقی
(ایبٹ آباد)

رات کا کھانا جلدی جلدی ختم کرنے کے بعد میں نے ماموں کی موٹر سائیکل اٹھائی اور اسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔ رات مجھے اسپتال میں گزارنا تھی، ماموں کو دل کا دورہ پڑا تھا جس کے بعد انہیں اسپتال میں داخل کرادیا تھا۔ جب تک وہ اسپتال میں رہتے ان کی راتوں کی دیکھ بھال میری ذمہ داری تھی۔

مجھے ماموں نے پالا تھا۔ میری ذات پر ان کے بڑے احسانات تھے۔ تقسیم ہند کے وقت جب میرے ماں اور

باپ کو میری آنکھوں کے سامنے بربریت کا نشانہ بنا کر ختم کر دیا گیا تو میرے دل میں اس کی دہشت بیٹھ گئی تھی۔ میری آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ میری عمر صرف آٹھ سال تھی اور یہ سانحہ میں نے گھر سے تھوڑی ہی دور رکھے بھوسے کے ڈھیر سے دیکھا تھا۔ اماں ہی نے جلد بازی میں مجھے ڈھیر میں چھپا دیا تھا اور اسی وقت حملہ ہو گیا تھا۔ بلوائی قیامت ڈھا کر چلے گئے تھے مگر مجھ میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ میں باہر نکلتا۔ وہ تو میری زندگی تھی کہ بلوچ رجمنٹ مسلمانوں کے محلے میں مدد کے لیے آ گئی۔ ان کے ساتھ میرے ماموں بھی تھے۔ ان کو دیکھ کر میں باہر نکلا تو وہ مجھے سینے سے لگا کر پاکستان لے آئے اور میری پرورش کرنے لگے۔

میرے تمام اخراجات ماموں کے ذمہ تھے۔ ان کی اپنی آمدنی بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ مشکل سے ہم سب کا گزارہ ہوتا۔ جب میں کالج میں داخل ہوا تو میں نے ٹیوشن پڑھانا شروع کر دیا تاکہ ماموں پر مزید بوجھ نہ بنوں۔

خدا کا شکر کہ ماموں سرکاری ملازم تھے۔ ان کو علاج کی اور اسپتال کی سہولت حاصل تھی۔ ورنہ اتنا خرچا برداشت کرنا ہمارے بس میں نہ تھا۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو ممانی نے اطمینان کا سانس لیا اور گھر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ بے چاری صبح سے یہاں بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھیں۔

کرسی پر بیٹھے بیٹھے میری آنکھ جھپک گئی تھی۔ کسی کی آہٹ سے کھل گئی۔ سامنے نرس کھڑی تھی۔ ”ان کا ای سی جی لینا ہے۔“ اس نے ماموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو سو رہے تھے۔

میں نرس کی طرف دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اس کے چہرے میں کچھ ایسا تاثر تھا جو اپنی طرف کھینچتا تھا۔ وہ کوئی غیر معمولی حسین نہ تھی۔ قبول صورت ضرور تھی۔ غور کیا تو لگا کہ یہ اس کی آنکھوں کی غیر معمولی رنگت اور بناوٹ تھی جس نے اس کی آنکھوں کو اس کے چہرے کا سب سے نمایاں جز بنا دیا تھا۔ یہ رنگت نہ بھوری تھی اور نہ ہی سبز۔ ان دونوں رنگوں کی ملاوٹ سے یہ کچھ اور ہی رنگ بن گیا تھا جو آنکھوں کا عام رنگ نہ ہونے کے سبب اس کی آنکھوں کو اس قدر نمایاں کر رہا تھا۔

”جی یہ تو سو رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”کوئی بات نہیں۔ یہ ای سی جی کے بعد پھر سو جائیں گے۔“ وہ ای سی جی لے کر چلی گئی اور میں اس کی آنکھوں کی رنگت میں کھویا رہا۔

اگلی رات ماموں کی طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ میں نرس کو بلانے نرسنگ اسٹیشن کی طرف بھاگا۔ ہیڈ نرس اور کل والی نرس نے آ کر ماموں کو سنبھالا۔ جب ان کی طبیعت سنبھل گئی تو یہ دونوں واپس نرسنگ اسٹیشن چلی گئیں۔

میں کمرے میں بیٹھے بیٹھے اکتا گیا تھا۔ باہر نکل کر ٹہلتے ٹہلتے نرسنگ اسٹیشن کے سامنے سے گزرا۔ تو وہی نرس وہاں اکیلی موجود تھی۔ میں نے اس سے باتیں کرنی شروع کر دیں۔ اس کا نام زاہدہ تھا۔ چند ماہ پہلے ہی اس نے اپنی ٹریننگ مکمل کی تھی۔ اب یہاں کام کر رہی تھی۔ جتنے دن ماموں اسپتال میں رہے میری قریباً روز زاہدہ سے ملاقات ہوئی۔ ماموں کے اسپتال سے فارغ ہونے تک زاہدہ سے میری اچھی خاصی دوستی ہو چکی تھی جو ماموں کے اسپتال سے خارج ہونے کے بعد بھی جاری رہی۔ آہستہ آہستہ یہ دوستی پسندیدگی میں بدلی پھر چاہت میں۔

بی کام کرنے کے بعد نوکری کرتے ہوئے مجھے ایک سال سے اوپر ہو چکا تھا۔ زاہدہ سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو زندگی کا ہمسفر بنانا چاہتے تھے۔ بات آگے بڑھانے کے لیے ممانی کا تعاون درکار تھا۔ ان سے ذکر کیا تو پوچھنے لگیں۔ ”کون سی والی نرس، وہی جس کی آنکھیں عجیب سی ہیں۔“

”جی وہی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مگر اس کی آنکھیں عجیب سی نہیں ہیں صرف ان کا رنگ مختلف ہے ان رنگوں سے جو ہمارے یہاں پائے جاتے ہیں۔ اس لیے وہ آنکھیں دوسری آنکھوں سے نمایاں دکھائی دیتی ہیں۔“

”بہرحال۔“ ممانی نے کہا۔ ”کل مٹھائی لے آنا میں اس کے گھر والوں سے بات کروں گی۔“

اگلے روز ممانی وہاں سے واپس آئیں تو بہت خوش تھیں کہنے لگیں۔ ”مبارک ہو سلمان میاں۔ تمہاری بات پکی کر آئی ہوں۔ اب میرے حصے کی مٹھائی بھی تم کو لانا پڑے گی۔“

ماموں کی بیٹیوں نے شادی بیاہ کی رسمیں شروع کر دیں۔ ممانی کپڑوں وغیرہ کی تیاری میں لگی ہوئی تھیں۔ مجھے اپنے لیے الگ گھر کی تلاش تھی۔ ایسے گھر کی جس کو میری جیب برداشت کر سکے۔ میں جھنجلا جاتا کہ کیوں میرے پاس اتنے وسائل نہیں کہ میں اپنے ارمان پورے کر سکوں۔ اپنی خواہش کے مطابق گھر کرائے پر لے سکوں۔ یہ محرومیاں کب تک میرے ساتھ رہیں گی۔ بڑی مشکل سے ڈھونڈھ ڈھانڈ کر ایک گھر کا دو کمروں والا حصہ ملا جس کا کرایہ میں ادا

کر سکتا تھا۔

میں نے یہ گھر کرائے پر لے لیا۔ کچھ بنیادی قسم کا فرنیچر اور دیگر گھریلو سامان بھی خرید لیا۔ بیڈروم سیٹ وغیرہ زاہدہ کو جہیز میں ملنے والا تھا۔ گھر کسی نہ کسی طرح رہنے کے قابل بنایا جاسکتا تھا۔

پھر وہ دن بھی آگیا جب زاہدہ میری زندگی میں داخل ہو گئی۔ دوست کی گاڑی ادھار لے کر اس کو پھولوں سے سجایا۔ اس مانگے کی گاڑی میں، میں زاہدہ کو ماموں کے گھر لے آیا۔ میرے اپنے پاس تو موٹر سائیکل بھی نہ تھی۔ یہ ایک اور محرومی تھی۔ ماموں کے گھر تین دن گزار کر میں اور زاہدہ اپنے گھر منتقل ہو گئے۔

زاہدہ کو پا کر مجھے پہلی دفعہ محسوس ہوا کہ زندگی کیا ہوتی ہے۔ مجھے سورہ نساء کی اس آیت کی صداقت کا احساس ہوا کہ ہم نے عورت اور مرد کو ایک دوسرے سے سکون حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا۔ زندگی میں پہلی بار میں سکون کی دولت سے آشنا ہوا۔ مگر چند دن بعد پھر مجھے اپنی محرومیوں کے احساس نے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ میرے پاس شاندار گھر کیوں نہیں ہے۔ مجھے اور زاہدہ کو بس میں کیوں سفر کرنا پڑتا ہے۔ صرف یہی نہیں میری تو زندگی کا آغاز ہی محرومیوں سے ہوا تھا۔ میں نے اپنے ماں باپ کا اپنی آنکھوں کے سامنے خون ہوتے دیکھا۔ ماموں نے ماں باپ کی کمی کو پورا کیا۔ حتیٰ الامکان ہر طرح میرا خیال رکھا۔ مجھے تعلیم دلوائی لیکن ماموں ماں کی ممتا کا بدل نہیں ہے۔ میں ماموں سے اس طرح سے ضد نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی بات نہیں منوا سکتا تھا۔ جس طرح اپنی ماں کے سامنے مچل کر اس سے اپنی ضد منوا سکتا تھا۔ میرے ساتھ یہ محرومیاں کیوں تھیں اگر میں ماں باپ کو کھو چکا تھا تو کیا یہ بھی ضروری تھا کہ میں دنیا کی آسائشوں سے بھی محروم رہوں۔ لوگ لمبی لمبی چمکتی ہوئی گاڑیوں میں گھومیں اور میں صرف انہیں دیکھتا رہوں۔ یہ انصاف نہیں ہے۔ میں اس حصار کو توڑنا چاہتا تھا۔ یہ میری ذہنی کیفیت کا تقاضا تھا۔ مجھے اس محرومیوں کے چکر سے نکلنا ہو گا مگر اس کا کوئی راستہ نہ تھا۔ پھر ایک راستہ نکل آیا۔ مجھے یہ راستہ میرے دوست نثار نے سمجھایا تھا۔ وہ بھی میری طرح غربت کی چکی میں پس رہا تھا پھر وہ انگلستان چلا گیا۔ جہاں وہ خوش تھا۔ اس نے خود اپنے خط میں مجھے بتایا تھا کہ وہ وہاں کتنا خوش تھا۔ میں بھی انہی زنجیروں کو توڑ کر انگلستان جا سکتا تھا۔ اس کا ذکر میں نے زاہدہ سے کیا۔

زاہدہ کا ردِ عمل حوصلہ افزا نہ تھا۔ ”آپ کیوں اپنا وطن چھوڑ کر دیارِ غیر میں بسنا چاہتے ہیں؟“

”اپنی محرومیوں کو دور کرنے کے لیے دولت کمانے کے لیے۔“ میں نے جواب دیا۔

”آپ کو کون سی محرومی ہے۔ خدا کا دیا ہمارے پاس سب کچھ ہے۔ صحت ہے۔ ایمان ہے۔ ہم دونوں برسر روزگار ہیں۔ آپ کو اور کیا چاہیے؟“

”آرام آسودگی جو مجھے یہاں نہیں مل سکتا۔ میں اس ملک میں بھکاری بن کے نہیں رہ سکتا۔“

ہم دونوں دیر تک بحث کرتے رہے۔ نہ زاہدہ میرے نکتہ نظر کو سمجھ پائی نہ ہی میں اس کے نکتہ نظر کو سمجھ پایا۔ میرا انگلستان جانے کا عزم مصمم تھا۔ چند دن بعد میں نے پھر زاہدہ سے ذکر چھیڑا۔ وہ اپنے موقف پر جمی رہی۔

”مسلمان پر واجب ہے کہ وہ دارالکفر سے ہجرت کر کے دارالایمان آجائے۔ آپ اس کا الٹ کر رہے ہیں۔ میں وہاں نہیں جاؤں گی۔“

”تم زاہدہ کے ساتھ ساتھ عابدہ و ساجدہ کیوں بن گئی ہو۔ کہاں یہ حکم ہے کہ میں انگلستان نہیں جا سکتا۔“

”کچھ بھی ہو۔ میں اپنا ملک اپنے ماں باپ کو نہیں چھوڑوں گی۔“

”مجھے چھوڑ دو گی۔“

”اگر کبھی آپ نے یہ شرط لگائی تو آپ کی شرط پوری کر دوں گی۔“

معاملہ حل ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ اسی شش و پنج میں کئی دن گزر گئے۔ انگلستان جانے کا بھوت میرے سر سے نہیں اتر سکتا تھا۔ مجھے کچھ کرنا تھا۔ زاہدہ نے کہا تھا کہ اگر میں نے کبھی ”مجھے“ چھوڑنے کی شرط لگائی تو وہ اس کو پورا کر دے گی۔ میں نے زاہدہ کے اس بے معنی جملہ کو بیساکھی بناتے ہوئے طلاق کے کاغذ تیار کروا لیے۔ کمال عشق ہے دیوانہ ہو گیا ہوں میں۔ یہ کس کے ہاتھ سے دامن چھڑا رہا ہوں میں۔

میں گھر میں داخل ہوا تو میرا رویہ اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ زاہدہ نے اس کو نوٹ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ”خیریت تو ہے۔ آپ کے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں۔“

مجھ میں زاہدہ کو حقیقت بتانے کا حوصلہ نہ تھا مگر پھر Mr Hyde کی خباثت Dr Jakal کی نیک طینت

پر غالب آگئی۔ ''تم نے کہا تھا نا کہ اگر کبھی میں نے اپنے چھوڑنے کی شرط لگائی تو تم اس کو پورا کر دو گی؟''

''میں نے کہا ضرور تھا مگر وہ غصے میں کہا گیا ایک بے معنی جملہ تھا جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے آپ اتنی سی بات کو لے کر اپنا دل نہ دکھائیں۔'' زاہدہ کو اب بھی میرے دل کے دکھنے کی فکر تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں نے خباثت کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔

''دل دکھانے کی بات نہیں۔ میں نے تمہاری خواہش پوری کر دی ہے۔'' میں نے طلاق نامہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' اس نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر میرے ہاتھ سے طلاق نامہ لے کر پڑھا۔ اس نے اپنا سر تھام لیا۔ ''ایک بے ضرر بے معنی جملے کی اتنی بڑی سزا؟'' وہ تیورا کر صوفے پر گر پڑی۔

میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میں نے جلدی سے جگ میں پانی لا کر اس کے منہ پر چھڑکا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہوش میں آگئی۔ پہلے تو وہ اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کہاں ہے کیا کر رہی ہے۔ پھر وہ ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے کمرے کی طرف بھاگی اور کمرا اندر سے بند کر لیا۔ میں دروازہ پیٹتا رہ گیا مگر بے سود۔ اندر سے رونے اور چیخنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ پھر یہ آوازیں آنا بند ہو گئیں۔

دو ڈھائی گھنٹے بعد زاہدہ کمرے سے برآمد ہوئی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ ہاتھ میں ایک اٹیچی کیس تھا۔ رخ باہر جانے والے دروازہ کی طرف تھا۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''آپ سے مطلب۔ آپ تو مجھ سے اپنا تعلق ختم کر چکے ہیں۔'' اس کا ضبط قابلِ دید تھا۔ میری ساری کمینگی کے باوجود اس نے مجھ سے زبان تک نہیں لڑائی۔ میں ابھی بھی اس کے لیے آپ تھا۔ تم نہیں تھا۔ میں نے کس ہیرے کو کھو دیا تھا، وہ بھی اپنے ہاتھوں؟

''تعلق ختم ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں تم کو رات کے اندھیرے میں بھٹکنے کے لیے تنہا چھوڑ دوں۔'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو روکنا چاہا۔

''مت لگائیے مجھ کو ہاتھ۔ آپ میرے لیے نامحرم ہو چکے ہیں۔''

''میں اس کو تقریباً گھسیٹتا ہوا کمرے میں لے گیا۔ وہاں لے جا کر جھٹکے سے پلنگ پر بٹھا دیا۔ اس کے ہاتھ سے اٹیچی کیس لے کر اس کو کھول کر اس کے اندر کی ساری چیزیں پلنگ پر الٹ دیں۔ پھر میں نے اپنی ضرورت کی چند چیزیں اٹیچی کیس میں ٹھونسیں۔ ''اگر کسی کو اس گھر سے رات کے اندھیرے میں جانا ہے تو وہ میں ہوں تم نہیں۔'' یہ کہہ کر میں دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس کی سسکیوں کی آوازیں میرا پیچھا کرتی رہیں۔ میرے قدم روکتی رہیں۔''

میں کہیں اور جانے کی بجائے اپنی حماقت میں ماموں کے گھر پہنچ گیا۔ ماموں کا پہلا سوال تھا۔ ''زاہدہ کہاں ہے تم اٹیچی کیس کے ساتھ یہاں اکیلے کیا کر رہے ہو۔''

زاہدہ نے نہ صرف یہ کہ اسپتال میں ماموں کی بے انتہا خدمت کی تھی بلکہ یہ بھی کہ جب وہ اس گھر کی بہو بن کر آئی تھی تو اس نے اپنے رویے اور اپنی محبت سے ماموں کا دل جیت لیا تھا۔ ماموں شاید اس کو مجھ سے بھی زیادہ اہمیت دینے لگے تھے۔ میرے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ مجھے ہر بات اگلنی پڑی۔ ماموں کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اس پر ایک رنگ آرہا تھا۔ ایک جا رہا تھا وہ اپنا دل تھامے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ ممانی ان کے پیچھے بھاگیں۔ مجھے ڈر ہوا کہ ماموں کو کہیں پھر سے ہارٹ اٹیک نہ ہو جائے۔ میری دونوں ماموں زاد بہنوں کی آنکھوں میں میرے لیے سوائے نفرت کے کچھ نہ تھا۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ میں ڈرائنگ روم میں گم صم اکیلا بیٹھا رہ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ماموں کمرے سے برآمد ہوئے۔ انہوں نے شیروانی پہن رکھی تھی۔ ہاتھ میں چھڑی تھی۔ وہ چھڑی کو ٹیک کر میرے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ میں بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''تم نے جو حرکت کی ہے۔'' ماموں نے کہنا شروع کیا۔ ''وہ صرف کوئی اسفل السافلین ہی کر سکتا ہے۔ تم نے دولت حاصل کرنے کی چاہ میں انسانیت کی قدر کو پامال کر دیا لیکن اس میں شاید کچھ قصور میرا بھی ہے۔ تمہاری تربیت میں نے کی ہے۔ انسانیت کی کسوٹی پر تمہاری ناکامی میری تربیت کی ناکامی ہے۔ خدا جانے مجھ سے کہاں کوتاہی ہو گئی۔'' ماموں بولتے بولتے تھک چکے تھے۔ کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ گئے۔ ان کی سرزنش جاری رہی۔ ''تمہارا قصور ناقابلِ معافی ہے۔'' ماموں پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''میں زاہدہ کے پاس جا رہا ہوں۔ نہ جانے میری بچی پر کیا قیامت گزر رہی ہو گی۔'' ان کی آواز بھرّا رہی تھی۔ مگر ابھی ان کو میری سزا سنانا باقی تھا۔ ''آج سے اس گھر کے دروازے

پر غالب آگئی۔ ''تم نے کہا تھا نا کہ اگر کبھی میں نے اپنے چھوڑنے کی شرط لگائی تو تم اس کو پورا کر دوگی؟''

''میں نے کہا ضرور تھا مگر وہ غصے میں کہا گیا ایک بے معنی جملہ تھا جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے آپ اتنی سی بات کو لے کر اپنا دل نہ دکھائیں۔'' زاہدہ کو اب بھی میرے دل کے دکھنے کی فکر تھی۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ میں نے خباثت کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔

''دل دکھانے کی بات نہیں۔ میں نے تمہاری خواہش پوری کردی ہے۔'' میں نے طلاق نامہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' اس نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر میرے ہاتھ سے طلاق نامہ لے کر پڑھا۔ اس نے اپنا سر تھام لیا۔ ''ایک بے ضرر بے معنی جملے کی اتنی بڑی سزا؟'' وہ تیورا کر صوفے پر گر پڑی۔

میرے اوسان خطا ہوگئے۔ میں نے جلدی سے جگ میں پانی لا کر اس کے منہ پر چھڑکا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہوش میں آگئی۔ پہلے تو وہ اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کہاں ہے کیا کر رہی ہے۔ پھر وہ ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے کمرے کی طرف بھاگی اور کمرا اندر سے بند کرلیا۔ میں دروازہ پیٹتا رہ گیا مگر بے سود۔ اندر سے رونے اور چیخنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ پھر یہ آوازیں آنا بند ہوگئیں۔

دو ڈھائی گھنٹے بعد زاہدہ کمرے سے برآمد ہوئی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ ہاتھ میں ایک اٹیچی کیس تھا۔ رخ باہر جانے والے دروازہ کی طرف تھا۔

''کہاں جارہی ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''آپ سے مطلب۔ آپ تو مجھ سے اپنا تعلق ختم کرچکے ہیں۔'' اس کا ضبط قابلِ دید تھا۔ میری ساری کمینگی کے باوجود اس نے مجھ سے زبان تک نہیں لڑائی۔ میں ابھی بھی اس کے لیے آپ تھا۔ تم نہیں تھا۔ میں نے کس ہیرے کو کھو دیا تھا، وہ بھی اپنے ہاتھوں؟

''تعلق ختم ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں تم کو رات کے اندھیرے میں بھٹکنے کے لیے تنہا چھوڑ دوں۔'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو روکنا چاہا۔

''مت لگائیے مجھ کو ہاتھ۔ آپ میرے لیے نامحرم ہو چکے ہیں۔''

''میں اس کو تقریباً گھسیٹتا ہوا کمرے میں لے گیا۔ وہاں لے جا کر جھٹکے سے پلنگ پر بٹھا دیا۔ اس کے ہاتھ سے اٹیچی کیس لے کر اس کو کھول کر اس کے اندر کی ساری چیزیں پلنگ پر الٹ دیں۔ پھر میں نے اپنی ضرورت کی چند چیزیں اٹیچی کیس میں ٹھونسیں۔ ''اگر کسی کو اس گھر سے رات کے اندھیرے میں جانا ہے تو وہ میں ہوں تم نہیں۔'' یہ کہہ کر میں دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس کی سسکیوں کی آوازیں میرا پیچھا کرتی رہیں۔ میرے قدم روکتی رہیں۔''

میں کہیں اور جانے کی بجائے اپنی حماقت میں ماموں کے گھر پہنچ گیا۔ ماموں کا پہلا سوال تھا۔ ''زاہدہ کہاں ہے تم اٹیچی کیس کے ساتھ یہاں اکیلے کیا کر رہے ہو۔''

زاہدہ نے نہ صرف یہ کہ اسپتال میں ماموں کی بے انتہا خدمت کی تھی بلکہ یہ بھی کہ جب وہ اس گھر کی بہو بن کر آئی تھی تو اس نے اپنے رویے اور اپنی محبت سے ماموں کا دل جیت لیا تھا۔ ماموں شاید اس کو مجھ سے بھی زیادہ اہمیت دینے لگے تھے۔ میرے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ مجھے ہر بات اگلنی پڑی۔ ماموں کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اس پر ایک رنگ آرہا تھا۔ ایک جارہا تھا وہ اپنا دل تھامے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ ممانی ان کے پیچھے بھاگیں۔ مجھے ڈر ہوا کہ ماموں کو کہیں پھر سے ہارٹ اٹیک نہ ہو جائے۔ میری دونوں ماموں زاد بہنوں کی آنکھوں میں میرے لیے سوائے نفرت کے کچھ نہ تھا۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ میں ڈرائنگ روم میں گم صم اکیلا بیٹھا رہ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ماموں کمرے سے برآمد ہوئے۔ انہوں نے شیروانی پہن رکھی تھی۔ ہاتھ میں چھڑی تھی۔ وہ چھڑی کو ٹیک کر میرے سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔ میں بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

''تم نے جو حرکت کی ہے۔'' ماموں نے کہنا شروع کیا۔ ''وہ صرف کوئی اسفل السافلین ہی کرسکتا ہے۔ تم نے دولت حاصل کرنے کی چاہ میں انسانیت کی قدر کو پامال کردیا لیکن اس میں شاید کچھ قصور میرا بھی ہے۔ تمہاری تربیت میں نے کی ہے۔ انسانیت کی کسوٹی پر تمہاری ناکامی میری تربیت کی ناکامی ہے۔ خدا جانے مجھ سے کہاں کوتاہی ہوگئی۔'' ماموں بولتے بولتے تھک چکے تھے۔ کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ گئے۔ ان کی سرزنش جاری رہی۔ ''تمہارا قصور ناقابلِ معافی ہے۔'' ماموں پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''میں زاہدہ کے پاس جارہا ہوں۔ نہ جانے میری بچی پر کیا قیامت گزر رہی ہوگی۔'' ان کی آواز بھرا رہی تھی۔ مگر ابھی ان کو میری سزا سنانا باقی تھا۔ ''آج سے اس گھر کے دروازے

تمہارے لیے بند ہیں۔ صرف آج کے لیے ہی نہیں ہمیشہ کے لیے۔''

ماموں اپنے آنسو مجھ سے چھپاتے ہوئے زاہدہ کے پاس جانے کے لیے گھر سے باہر نکل گئے۔ میں زاہدہ کے ساتھ ساتھ اس شفیق ہستی کو بھی کھو چکا تھا جو مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھی۔ ماموں جا چکے تھے۔ میں بھی بوجھل دل اور بوجھل قدموں کے ساتھ گھر سے باہر آ گیا۔

رات میں نے اپنے ایک دوست کے گھر گزاری۔ پانچ چھ دن بعد میں لندن جانے والے جہاز میں بیٹھا تھا۔ میرا احساسِ جرم میرے ساتھ تھا۔

☆......☆

ہوائی جہاز میں سفر کرنے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔ فلائیٹ پہلے دبئی جاتی تھی وہاں سے پیرس پھر لندن۔

دبئی کا ائرپورٹ بہت چھوٹا سا تھا۔ کراچی کا ائرپورٹ اس کے مقابلے میں بہتر لگتا تھا۔ ائرپورٹ کی عمارت میں تین چار ڈیوٹی فری دکانیں تھیں جو الیکٹرونک کے سامان سے اور کیمروں وغیرہ سے بھری تھیں۔ قیمتیں بہت کم مگر میرے پاس ان کو خریدنے کے لیے فالتو رقم نہ تھی۔ دبئی کے مقابلے میں پیرس کا ائرپورٹ شاندار تھا۔ بارہ چودہ گھنٹے کے سفر کے بعد ہم لندن پہنچ چکے تھے۔ امیگریشن سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو نثار کو اپنا منتظر پایا۔

نثار کے پاس اپنی سواری نہ تھی اس کے گھر جانے کے دو راستے تھے یا تو ہم ٹیکسی پکڑ لیں یا پھر ائرپورٹ کی بس کا استعمال کریں۔ اس وقت تک ٹیوب ٹرین شہر سے ائرپورٹ تک نہیں جاتی تھی۔

شہر جانے والی بسیں ائربس کہلاتی تھیں۔ ان کے دو تین مختلف نمبر تھے۔ A-1، A-2 وغیرہ۔ ہم A-1 میں سوار ہو گئے۔ یہ بس وکٹوریہ اسٹیشن جاتی تھی۔ بس ائرپورٹ کی حدود سے باہر نکلی تو اپنے خوابوں کے شہر لندن کو دیکھ کر مایوسی ہوئی۔ میرے تخیل میں لندن وہ جنت نظیر شہر تھا جہاں ہر چیز جگمگاتی ہوگی۔ بڑے بڑے شاندار گھر ہوں گے جن کے آگے بڑے بڑے لان ہوں گے۔ یہاں کے گھروں کا تو حال ہی دوسرا تھا۔ چھوٹے چھوٹے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے گھر آسمان پر کہر۔ عجیب مایوس کن سا پیش کر رہا تھا نثار کی رہائش گاہ دیکھ کر مایوسی اور بڑھ گئی۔

نثار نے ایک کمرا کرائے پر لے رکھا تھا۔ یہ ایک بوسیدہ پچاسوں سال پرانی تین منزلہ عمارت تھی۔ ہر منزل پر چھ یا سات چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ دیواروں پر سیلن، ہر منزل پر صرف ایک غسل خانہ۔ صبح صبح اس منزل پر رہنے والا ہر کرائے دار اس کو اپنے مقررہ وقت پر ہی استعمال کر سکتا تھا۔ کھانا اگر بنانا ہو تو اس کے لیے بیسمنٹ میں جانا پڑتا تھا۔

''نثار کا کمرا اتنا چھوٹا تھا کہ ایک پلنگ بچھانے کے بعد مشکل سے چلنے پھرنے کی جگہ بچتی۔ یہ پہلا دھچکا تھا جو مجھے لگا۔ کیا میں نے اسی جنت کے لیے ماموں کی ناراضی مول لی تھی۔ زاہدہ کا دل دکھایا تھا۔

دوسرا دھچکا نثار کی نوکری تھی۔ نثار کو یہاں کام کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ غیر قانونی طور پر ایک چمڑا صاف کرنے والی کمپنی میں کام کر رہا تھا جو ایک افریقی باشندے کی ملکیت تھی جس نے برطانوی شہریت لے رکھی تھی۔ اس کے پاس کام کرنے والے زیادہ تر لوگ غیر قانونی طور پر لندن میں رہ رہے تھے۔ وہ ان کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر ان کو بہت کم اجرت دیتا تھا۔

نثار نے لندن کے بارے میں جو کچھ مجھے بتایا تھا اس میں کوئی سچائی نہ تھی۔ مجبوری تھی۔ میں نے بھی اس فیکٹری میں کام کرنا شروع کر دیا۔ مجھے لندن آئے ہوئے ایک مہینے سے اوپر ہو چکا تھا میں طے نہیں کر پا رہا تھا کہ لندن میں رہوں یا واپس پاکستان چلا جاؤں مگر واپسی کے ٹکٹ کے پیسے بھی نہ تھے۔

ایک شام میں فیکٹری سے واپس آ رہا تھا کہ میری نظر ایک نوکری کے اشتہار پر پڑی جو سامنے والے بیڈ اینڈ بریکفاسٹ ہوٹل کی دیوار پر چسپاں تھا۔ ہیلپ وانٹڈ نوکری کے لیے ایسے امیدوار کی ضرورت تھی جو حساب کتاب رکھنے کا تجربہ رکھتا ہو۔ اکاؤنٹنسی کے بنیادی اصولوں سے واقفیت رکھتا ہو۔ کام کے اوقات شام کے تھے۔

میں ہوٹل کے دفتر میں داخل ہو گیا جہاں ہوٹل کے مالک سے ملاقات ہوئی۔ یہ پرتاب سنگھ نامی سکھ تھے جن کا تعلق حسن ابدال سے تھا۔ سنگھ صاحب اور ان کی بیگم تقسیم ہند کے چند سال قبل ہی لندن آ کر یہاں بس گئے تھے۔ شروع شروع میں چھوٹی موٹی معمولی نوکریاں کر کے پیسے جمع کیے پھر اس ہوٹل کی عمارت خرید کر اس میں ہوٹل کا کام شروع کر دیا۔

نوکری مجھے مل گئی۔ اب میں دونوں نوکریاں کر رہا تھا۔ صبح فیکٹری میں، شام کو ہوٹل میں۔ مگر میں لندن یہ معمولی نوکریاں کرنے نہیں آیا تھا۔ میرا اصل ہدف چارٹرڈ اکاؤنٹنسی کرنا تھا۔ کچھ عرصہ بعد میں نے اپنے ہدف کی طرف بڑھنے

کے لیے فیکٹری کی نوکری چھوڑ دی۔ کچھ دنوں بعد میں نے اپنا ہدف حاصل کرلیا لیکن سنگھ صاحب کی نوکری نہیں چھوڑی۔ اب میں رہتا بھی ہوٹل کی نچلی منزل کے ایک کمرے میں تھا۔ میں سنگھ صاحب کا اعتماد حاصل کر چکا تھا۔ اپنے فالتو وقت میں ان کے دوسرے کام بھی کر دیتا۔ سنگھ صاحب عمر کے اس دور میں پہنچ چکے تھے جہاں آدمی کام کم اور آرام زیادہ پسند کرتا ہے۔ سنگھ صاحب نے ساری زندگی کرتوڑ محنت کی تھی۔ وہ ہوٹل بیچ کر حسن ابدال جاکر باقی زندگی گوردوارے کی خدمت میں گزارنا چاہتے تھے۔ میں اس ہوٹل کو سنگھ صاحب سے خریدنے کے بارے میں سوچنے لگا مگر اتنے پیسوں کا بندوبست کہاں سے ہوگا۔ سنگھ صاحب کے پاس دو تین خریدار موجود تھے جو مناسب قیمت پر ہوٹل خریدنا چاہتے تھے۔ میں نے سوچا کہ مجھے سنگھ صاحب سے بات کرنا چاہیے، شاید کوئی صورت نکل آئے۔

سنگھ صاحب کو ہوٹل کے پچاس ہزار پاؤنڈ چاہیے تھے۔ دس ہزار پاؤنڈ نقد، چالیس ہزار پاؤنڈ بینک سے قرض مل سکتے تھے۔ میرے پاس صرف پانچ ہزار پاؤنڈ جمع ہو سکے تھے اس رقم سے ہوٹل کا سودا نہیں ہوسکتا تھا۔ مزید پانچ ہزار پاؤنڈ بینک سے لینا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے کہ ہوٹل سے اتنی آمدنی نہیں ہوسکتی تھی کہ پینتالیس ہزار پاؤنڈ کا قرضہ بمعہ سود واپس کیا جاسکے۔

سنگھ صاحب میرے مہربان اور محسن تھے۔ میری مایوسی دیکھ کر انہوں نے ایک آفر دی۔ ”تم پانچ ہزار پاؤنڈ ابھی دے دو باقی پانچ ہزار میں تم کو قرض دے دوں گا بغیر سود کے۔ ادائیگی پانچ سال میں پہلی قسط ایک سال بعد شروع ہوگی۔“

میں نے سنگھ صاحب کے ہاتھ چوم لیے۔ ہوٹل میرا ہو چکا تھا۔ مجھے اپنی نوکری جاری رکھنا تھا کہ اس کے بغیر قرضے کی اقساط ادا نہیں ہوسکتی۔ میں دفتر سے واپس آنے کے بعد ہوٹل کی دیکھ بھال کرتا۔ صبح کے لیے میں نے نثار کو اپنے ساتھ رکھ لیا۔ ہوٹل کی صفائی اور ناشتا وغیرہ کا انتظام جینی کے سپرد تھا۔ ہم تینوں ہوٹل کے بیسمنٹ میں ہی اپنے اپنے کمروں میں رہتے تھے۔ میں صبح صبح ناشتا کر کے دفتر کے لیے روانہ ہو جاتا۔ صبح اندھیرے منہ اٹھ کر ناشتا بنانا اور اس کو پروسنا جینی کے ذمہ تھا۔

ایک صبح میں منہ ہاتھ دھو کر تیار ہو کر ناشتا کرنے گیا تو ناشتے کے کمرے میں ہو کا عالم تھا۔ لائٹیں بجھی ہوئی تھیں۔ چولہا ٹھنڈا تھا۔ جینی انتہائی محنت اور مستعدی سے کام کرتی تھی۔ ضرور اس کی طبیعت خراب ہوگی۔ ورنہ وہ اتنی بے پروائی نہیں کر سکتی تھی۔ میں جینی کی خیریت پوچھنے اس کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ اندر سے سسکیوں کی آواز آرہی تھی۔ میں نے گھبرا کے دروازہ کھٹکھٹایا۔ جینی نے دروازہ کھولا۔ وہ شب خوابی کے لباس میں ملبوس تھی۔ رومال سے ناک صاف کر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ لال ہو رہی تھیں۔

”خیریت۔“ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”کیا ہوا تم کیوں اس قدر پریشان ہو۔“

اس نے میرے کاندھے پر سر رکھ کر بھوں بھوں رونا شروع کر دیا۔ ”ٹونی شادی کر رہا ہے۔“ ٹونی اس کا بوائے فرینڈ تھا۔

”تو اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ تم کو تو خوشی سے ناچنا چاہیے تم بھی اس سے شادی کرنا چاہ رہی تھیں۔“

”وہ مجھ سے نہیں کسی اور سے شادی کر رہا ہے۔“ اب بات میری سمجھ میں آئی۔

میں نے دفتر سے چھٹی کی۔ نثار نے اور میں نے مل کر ناشتے کا کام سنبھالا۔

پہلا سال کچھ اونچ نیچ کے ساتھ گزر گیا۔ دوسرا سال شروع ہو چکا تھا۔ اب مجھے سنگھ صاحب کے پیسوں کی ادائیگی بھی کرنا تھا اگر گرمیوں کا سیزن اچھا گزر گیا تو خیر ہے۔ ورنہ مشکلات کا سامنا تھا ہوٹل کی قسطیں ادا نہیں ہوسکتی تھیں۔ گرمیاں تو اچھی گزریں مگر سردیوں نے مار دیا۔ ہوٹل میں ٹھہرنے والے نہ ہونے کے برابر تھے۔ جینی اور نثار اس کڑے وقت میں کام آئے۔ جنوری اور فروری میں انہوں نے بغیر تنخواہ کے کام کیا۔ سال گزر گیا۔ ہوٹل بھی بچ گیا تھا۔

پچھلے دو سال میں، میں اور جینی ایک دوسرے کے بہت قریب آچکے تھے۔ اتنا قریب کہ ہم دونوں شادی کے خواہش مند تھے مگر جینی مسلمان ہونے کے لیے تیار نہیں تھی۔ میرے اصرار پر اس نے مجھ سے سوال کیا۔ ”کیا تم میری خاطر کرسچن ہو جاؤ گے؟“ ظاہر ہے میرا جواب نفی میں تھا۔

”تو پھر میں تمہاری خاطر مسلمان کیسے بن جاؤں۔“

ہماری شادی ہوگئی۔ دو دفعہ۔ ایک دفعہ چرچ میں ایک دفعہ مسجد میں، مولوی صاحب کے سامنے۔ وہ اپنے مذہب پر میں اپنے۔

ہنی مون کے لیے ہم لوگ ’ہنی مون‘ کے دارالخلافہ نیاگرا فالس روانہ ہوگئے۔ براستہ نیویارک، امریکا کی دنیا ہی کچھ

اور تھی۔ انگلستان مجھے امریکا کے آگے گاؤں نظر آنے لگا۔

نیویارک سے نیاگرا فالس ہم لوگ بذریعہ کار گئے۔ کیا گاڑیاں تھیں کیا سڑکیں تھیں کیا جگہ تھی۔ میرا دل امریکا میں اٹک گیا۔ رہنا ہے تو اس دنیا میں رہنا چاہیے۔

نیاگرا فال دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک حصہ امریکا کے پاس ہے دوسرے کا مالک کینیڈا ہے۔ کینیڈا کے حصے میں جو نیاگرا فال کا ٹکڑا آیا ہے۔ اس کی شکل گھوڑے کی نعل جیسی ہے۔ اصل نیاگرا فال یہی ہے۔ اس کے آگے امریکا کے نیاگرا فال کی کوئی حقیقت نہیں ہے جہاں پانی ایک سپاٹ چادر کی صورت گرتا ہے۔

ہمارے پاس برطانیہ کے پاسپورٹ تھے کینیڈا کے نیاگرا فال جانا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ جانے کا راستہ بھی بہت سہل تھا۔ کینیڈا اور امریکا کے نیاگرا فال کو ایک درمیانے سائز کا پل ملاتا ہے جس کا نام پیس برج ہے۔ ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پیدل چلتے ہوئے پیس برج کو پار کر کے کینیڈا کے نیاگرا فال میں داخل ہو چکے تھے۔ شام تک ہم وہاں رہے پھر امریکا واپس آگئے اور پھر امریکا سے لندن مگر امریکا میرے ذہن پر اپنا نقش چھوڑ چکا تھا۔ یہاں پر جو مال و دولت میں کما سکتا تھا۔ اس کا انگلستان میں تصور بھی نہیں تھا۔ دولت کے پجاری کو اس کی دیوی مل گئی تھی۔ اب میری تمام تر توجہ امریکا جا کر وہاں مال و دولت سمیٹنے پر مرکوز ہو چکی تھی۔ میرا چین ایک دفعہ پھر کھو چکا تھا۔ لندن کے ہوٹل کا مالک بننا میرے لیے کافی نہ رہا تھا۔

جینی اُمید سے تھی۔ اب ہمارے سامنے وہ سوال تھا جس پر ہم نے کوئی توجہ نہ دی تھی۔ آنے والی زندگی کا مذہب کیا ہوگا۔ ہم اس کا نام کیا رکھیں گے۔ مسلمانوں والا نام کہ کرسچن والا۔ جینی کا اصرار تھا کہ آنے والا یا آنے والی اپنا مذہب خود منتخب کرے گا یا کرے گی۔ لیکن نام کا مسئلہ پھر بھی باقی تھا۔ آنے والی زندگی ایک پھول جیسی بیٹی تھی۔ اس کا نام ہم نے ایسا چنا جو مسلمانوں اور کرسچن دونوں کے یہاں قابل قبول تھا۔ ہم نے اس کا نام صوفیہ رکھ دیا کم از کم ایک مسئلہ تو حل ہوا۔

صوفی دو سال کی ہو چکی تھی۔ ٹوٹی پھوٹی زبان میں باتیں کرنے کی کوشش کرتی۔ اس کے آنے سے ہماری زندگی میں بہاریں آگئی تھیں۔

پانچ سال پورے ہو چکے تھے۔ ہوٹل کا قرضہ اور سنگھ صاحب کا قرضہ سب ادا ہو چکے تھے۔ پچھلے پانچ سالوں میں پراپرٹی کی قیمتیں لندن میں کئی گنا بڑھ چکی تھیں میں ہوٹل کو اچھے داموں بیچ کر امریکا جا سکتا تھا جہاں مزید مال و دولت میرا انتظار کر رہے تھے۔ میری ہوس کی کوئی حد نہ تھی۔

نثار ہم لوگوں کو چھوڑنے ائرپورٹ آیا تھا۔ پچھلے سات آٹھ سال کے دکھ اور سکھ ہم نے ایک ساتھ بانٹے تھے۔ رخصتی کے وقت بغلگیر ہوتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں مگر میری آنکھوں میں صرف امریکا کے خواب تھے۔ امکانات کی جنت۔ دی لینڈ آف اپرچونٹیز زیادہ دولت۔ زیادہ پیسا۔ زندگی کی ہر محرومی پیروں تلے روندی جا سکتی ہے۔ امریکا وہ جگہ ہے جہاں ایک گھسیارے کا بیٹا بھی اپنی محنت اور جانفشانی سے ملک کا صدر بن سکتا ہے۔ یہاں ایک دن ایسا بھی آئے گا جب امریکا کا صدر ایک سیاہ فام حبشی ہو گا۔ جس کے آباؤ اجداد کو افریقا سے پکڑ کر زنجیروں میں جکڑ کر امریکا کی غلاموں کی منڈیوں میں نیلام کیا گیا ہوگا۔ لیکن مجھے امریکا کا صدر نہیں بننا تھا۔ مجھے صرف امیر سے امیر تر بننا تھا۔ یہی میرا گوہر مقصود۔ میری زندگی کا مقصد اولین تھا۔

☆......☆

امریکا میں میری آمد نیویارک شہر میں ہوئی تھی۔ ائرپورٹ سے ہوٹل کی بکنگ کروا کر ہم ہوٹل پہنچ چکے تھے۔ ہوٹل شہر کے مرکزی حصہ میں تھا۔ سردیوں کا موسم تھا۔ کرسمس کا زمانہ تھا۔ رات کے وقت ہر طرف مینا بازار لگا ہوتا۔ نیویارک میں جتنی برف ایک ہفتے میں دیکھ لی لندن میں اتنی برف پوری سردیوں میں بھی پڑتے نہیں دیکھی تھی۔

کاروبار شروع کرنے سے پہلے میں مارکیٹ کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ مناسب تھا کہ میں فی الحال کچھ دن نوکری کرلوں جب مارکیٹ کے حالات سمجھ میں آجائیں تب کاروبار شروع کروں۔ نوکری مجھے بفلو شہر میں ملی۔ میں وہاں منتقل ہوگیا۔ وہاں گھر بھی خرید لیا۔ پیسا اگر بینک میں رکھا جائے تو اس کی قیمت گھٹ جاتی ہے۔ اس کا رواں رہنا، سرکولیشن میں رہنا ضروری ہے۔ میں نے ایک گھر کرائے پر اٹھانے کے لیے خرید لیا اور باقی پیسا اسٹاک مارکیٹ میں لگا دیا۔

بفلو شہر نیویارک کی ریاست میں واقع ہے۔ یہاں کی سردی مجھے تنگ کر رہی تھی۔ سنا تھا کہ جنوبی کیلی فورنیا موسم کے لحاظ سے نیویارک سے بدرجہ بہتر ہے۔ چھ مہینے بعد جب مجھے ایک ہفتے کی چھٹی ملی تو میں جینی اور صوفی کو لے کر لاس اینجلز کا جائزہ لینے وہاں پہنچ گیا جینی کو اور مجھے ہم دونوں کو یہ جگہ بے انتہا پسند آئی، خاص طور سے کی دیلی جو لاس انجلز

کے مضافات میں واقع ہے۔ ہم نے یہاں منتقل ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ بفلو کے دونوں گھر کرائے پر اٹھا دیئے نیویارک میں دوسرا گھر خرید لیا۔

اب میرا نوکری کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ آج تک کوئی آدمی صرف نوکری کے زور پر دولت مند نہیں بنا ہے۔ اس کے لیے ذاتی کاروبار ضروری ہے۔ امریکا میں بیسیوں طرح کی فرنچائز مل سکتی تھیں۔ میں نے ایک آئس کریم کی فرنچائز خرید لی۔ اس کے مالک بھی مسٹر اور مسز سنگھ کی طرح ایک عمر رسیدہ میاں بیوی تھے۔ جواب ریٹائرمنٹ کی زندگی گزارنا چاہتے تھے۔ آئس کریم کا کاروبار میرے لیے بالکل نیا تھا۔ جینی کو اور مجھے دن رات محنت کر کے اس کے اسرار و رموز سمجھنے پڑے۔ صوفی اب اسکول جانے لگی تھی۔ جب تک صوفی اسکول میں ہوتی جینی اسٹور میں کام کرسکتی تھی۔ صوفی کے اسکول کی چھٹی سے ایک گھنٹا پہلے وہ گھر چلی جاتی۔ مجھے اپنے ساتھ دو لڑکیوں کو پارٹ ٹائم نوکر رکھنا پڑا۔

ایک سال اسی طرح نکل گیا۔ تین گھر، آئس کریم کا اسٹور اور اسٹاک مارکیٹ کی سرمایہ کاری میری دولت کی ہوس کو بجھانے کے لیے کافی نہ تھے۔ مجھے اور چاہیے تھا۔ دولت جمع کرنا ایک بیماری ہے جو لاعلاج ہے اس کا خاتمہ صرف اس وقت ہوتا ہے جب اس کا مریض اپنی آخری آرام گاہ میں پہنچ کر سانس لینا بند کرچکا ہوتا ہے۔ میں ابھی سانس لے رہا تھا۔

میں نے جو آئس کریم کی فرنچائز لی تھی وہ ایک چلتا ہوا اسٹور تھا۔ اس کے لیے مجھے تین لاکھ ڈالرز بطور گڈول ادا کرنا پڑے تھے۔ اب کمپنی ایک نیا اسٹور کھول رہی تھی۔ اس میں گڈول کا جھگڑا نہیں تھا۔ یہ اسٹور مجھے صرف ایک لاکھ ڈالر میں مل سکتا تھا۔ میں نے یہ اسٹور خرید لیا۔ نیا اسٹور چلانا اس کے لیے گاہک پیدا کرنا انتھک محنت کی ضرورت ہے۔ یہاں پھر جینی کام آئی اس کی دن رات کی محنت سے اس اسٹور نے دن دونی رات چوگنی ترقی کی۔ اب مجھے نئے اسٹور کا چسکا لگ چکا تھا۔ میں نے وقت کے ساتھ ساتھ چار اسٹور اور خرید لیے ہر طرف سے پیسا آرہا تھا۔ ہن برس رہا تھا۔ مجھے اپنا گھر پنجرہ محسوس ہونے لگا۔ میں نے ایک چھ ایکڑ زمین خرید لی کہ میں اس پر ایک شاندار گھر بناؤں گا۔ جینی اس کی مخالف تھی۔ اس کو میری دولت اور جائداد کی ہوس سے وحشت ہونے لگی تھی۔ وہ کئی دفعہ اس کا اظہار کر چکی تھی۔

جینی کی تمام تر مخالفت کے باوجود میں نے تین آدمیوں کے لیے سات بیڈ روم کا گھر بنایا جس کے تین حصے تھے۔ ایک حصہ میرا اور جینی کا، ایک صوفی کا اور ایک مہمانوں کے لیے۔ جینی کا اصرار تھا کہ صوفی کا بیڈ روم ہمارے بیڈ روم کے ساتھ ہونا چاہیے لیکن میں صوفی کو رہنے کے لیے صرف ایک بیڈ روم ہی نہیں بلکہ ایک مکمل سوئٹ دینا چاہتا تھا۔ میرے پاس پیسے کی کمی تھوڑی ہی تھی۔ صوفی مجھ سے اور دور ہوگئی۔

گھر بنانے کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے تعمیراتی کام سے پورے طور پر واقفیت ہوگئی۔ میرے لیے مزید پیسا کمانے کی راہ ہی نہیں بلکہ شاہراہ کھل گئی تھی۔ میں نے بڑے پیمانے پر تعمیراتی کام شروع کردیا۔ آئس کریم اسٹور کے لیے مینیجر ملازم رکھ لیے۔ جینی کو اب اسٹور کا کام سنبھالنے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ میری دولت سے متنفر ہوتی جارہی تھی مگر میں اس کی بے وقوفی کی بنا پر اپنے حوصلے پست نہیں کرسکتا تھا۔ ہم لوگ الگ الگ بیڈ روم میں سونے لگے۔ صوفی اپنے حصے میں رہتی تھی۔ میں اتنا مصروف ہوگیا تھا کہ مہینوں میں اس کے حصے کی طرف نہ جاسکتا تھا۔ ہماری ملاقات زیادہ تر کھانے کی میز پر ہوا کرتی تھی۔ مجھے صحیح طرح سے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ صوفی کہاں پڑھ رہی ہے۔ کیا پڑھ رہی ہے۔ مجھے کام سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ تھک جاتا تھا۔

ایک شام میں جلدی گھر آگیا تھا۔ صوفی کے سوئیٹ کے پاس سے گزرا تو باتوں کی آواز آئی۔ میں نے صوفی کے بیڈ روم کے دروازے پر ہولے سے دستک دی کوئی جواب نہ پاکر میں نے دروازہ کو دھکا دیا۔ اندر کا منظر دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ صوفی ایک نوجوان کی بانہوں میں...... دنیا و مافیہا سے بے خبر...... جھول رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر صوفی کے گال پر ایک زوردار تھپڑ لگایا اور اس لڑکے کو کالر سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے بیرونی دروازے سے باہر نکل کر اس کی کمر پر لات ماری۔ صوفی بیرونی دروازہ پر آچکی تھی۔

”آپ کو کوئی حق نہیں ہے میرے دوست سے اس طرح کا سلوک کرنے کا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ دروازہ سے باہر جانے کے لیے بڑھی۔ میں نے اس کو بالوں سے پکڑ کر کھینچا اور اس کے گال پر ایک اور تھپڑ رسید کیا۔ ”خبردار جو اس دروازے سے باہر قدم نکالا۔“

”آپ کون ہوتے ہیں مجھے روکنے والے۔“ اس نے

غصے سے کہا۔

''میں تمہارا باپ ہوں۔ تم میرے حکم کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھا سکتیں۔''

''بڑھا سکتی ہوں۔ اب میں بالغ ہوں آپ کے حکم کی پابند نہیں ہوں اگر آپ مجھے نہیں جانے دیں گے تو میں پولیس کو فون کردوں گی۔'' تم اس وقت تک خود مختار نہیں ہو سکتیں جب تک تم سولہ سال کی نہ ہو جاؤ۔''

جینی ہنگامے کی آواز سن کر وہاں آچکی تھی۔ اس نے کہا۔ ''صوفی سولہ سال کی ہو چکی ہے۔ اگلے دو مہینے بعد اس کی اٹھارویں سالگرہ ہے۔ آپ کو اگر اپنی دھن دولت اپنی جائیداد اور اپنے بینک اکاؤنٹ سے فرصت ہو تو آپ کو پتا چلے کہ آپ کی بیٹی اور بیوی کہاں ہیں، کیا کر رہی ہیں۔''

جینی کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

''میں جارہی ہوں۔'' صوفی نے اعلان کیا۔ ''میں ایڈورڈ سے شادی کروں گی۔''

ایڈورڈ وہی منحوس تھا جس کو میں نے ابھی دھکے دے کر اپنے گھر سے نکالا تھا۔

''اگر تم نے اس چوکھٹ سے باہر قدم نکالا تو پھر کبھی یہاں واپس مت آنا۔'' میں غصے اور رنج سے دیوانہ ہو رہا تھا۔

''نہیں آؤں گی۔'' صوفی نے دوٹوک جواب دیا۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ جینی بیڈروم میں جا چکی تھی۔ اس کو میرے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں تھی۔

اگلے روز بھی رات دیر سے گھر واپس آیا۔ ایک نئی ڈیل پر کام کر رہا تھا اگر یہ معاملہ طے ہو جاتا ہے تو میں کم سے کم تین چار ملین ڈالر کا منافع اپنے نام کر سکتا ہوں۔ جینی کے بیڈروم میں روشنی تھی میں وہاں چلا گیا۔

''میں چند دن کے لیے لندن جارہی ہوں۔''

''ضرور جاؤ جانِ من، کب جارہی ہو؟''

''کل بکنگ کروا کر بتاؤں گی۔''

میں بہت تھک گیا تھا۔ اپنے بیڈروم میں سونے چلا گیا۔

جینی اپنا لندن کا پروگرام پکا کر چکی تھی۔ آج پیر کا دن ہے۔ وہ جمعرات کو جائے گی۔ مجھے جمعرات کی شام کو اس کو ائرپورٹ چھوڑنے جانا تھا۔ ہم لوگ ائرپورٹ جانے کے لیے تیار تھے کہ میری سیکریٹری کا فون آیا۔ ڈیل کے کاغذات تیار تھے۔ مجھے فوراً دفتر پہنچنا تھا۔ میں نے جینی کو بتایا تو اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار تھے۔

''خفا مت ہو میری جان۔ اس کے بدلے میں تم کو ایسا ڈائمنڈ رنگ دوں گا کہ رچرڈ برٹن نے ایلزبتھ ٹیلر کو نہ دیا ہوگا۔''

جینی کی ناگواری میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ ''رچرڈ برٹن نے ایلزبتھ ٹیلر کو ایک اور تحفہ بھی تو دیا تھا۔''

''کون سا؟'' میں نے اشتیاق کے ساتھ پوچھا۔

''طلاق۔'' جینی نے مختصر سا جواب دیا اور ٹیکسی بلانے کے لیے ٹیلی فون کرنے اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ گئی۔

''ہنہ۔'' میں نے اپنے دل میں سوچا۔ ''اپنی بات منوانے کے لیے عورتوں کے پاس دو ہی حربے ہیں۔ آنسو یا طلاق کی دھمکی۔ واپس آئے گی تو دماغ صحیح ہو چکا ہوگا۔''

میں دفتر روانہ ہو گیا۔ ڈیل میری منتظر تھی۔ تین چار ملین ڈالر کا دل خوش کن خیال بڑا دلکش لگ رہا تھا۔

تین ہفتہ لندن میں گزار کر جینی واپس گھر آچکی تھی۔ کھانے کی میز پر میں نے اس کو ڈیل کے دستخط ہو جانے کی خوش خبری سنائی۔

''مبارک ہو۔'' اس نے کہا۔ ''اب تم اپنا رچرڈ برٹن والا وعدہ پورا کرو۔''

''کیوں نہیں۔'' میں نے فخریہ کہا۔ ''تم جا کر انگوٹھی خرید لو۔ میں چیک بھجوا دوں گا۔''

''مجھے انگوٹھی نہیں چاہیے۔''

''پھر کیا چاہیے؟'' میں نے پوچھا۔

''دوسرا تحفہ۔''

''وہ کیا۔''

''طلاق۔'' جینی طلاق کو نہیں بھولی تھی۔ وہ مجھے رچرڈ برٹن کے حوالے سے کیے گئے ایک بے معنی جملے کا پابند کرنا چاہتی تھی۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ ایک دن میں نے بھی زاہدہ کو اس کے ایک بے ضرر بے معنی جملہ کے عوض طلاق کے تحفہ سے نوازا تھا۔ صرف اپنے مذموم مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے۔ اپنی بے جا خواہشات کی تکمیل کے لیے میں نے اس پیکرِ وفا کی چاہت، محبت، ایثار ہر چیز کو پس پشت ڈال دیا تھا۔

''طلاق تم کو کس بنیاد پر چاہیے۔ تمہارے پاس دنیا جہان کی ہر آسائش موجود ہے۔ میں نے تم کو ہر وہ چیز دی ہے جس کی ایک عورت خواہش کر سکتی ہے۔''

''تم نے صرف مجھے مادی چیزیں دی ہیں۔ عورت کو مادی چیزوں کی اتنی خواہش نہیں ہوتی جتنی توجہ، محبت اور

غصے سے کہا۔

''میں تمہارا باپ ہوں۔ تم میرے حکم کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھا سکتیں۔''

''بڑھا سکتی ہوں۔ اب میں بالغ ہوں آپ کے حکم کی پابند نہیں ہوں اگر آپ مجھے نہیں جانے دیں گے تو میں پولیس کو فون کر دوں گی۔'' ''تم اس وقت تک خود مختار نہیں ہو سکتیں جب تک تم سولہ سال کی نہ ہو جاؤ۔''

جینی ہنگامے کی آواز سن کر وہاں آ چکی تھی۔ اس نے کہا۔ ''صوفی سولہ سال کی ہو چکی ہے۔ اگلے دو مہینے بعد اس کی اٹھارویں سالگرہ ہے۔ آپ کو اگر اپنی دھن دولت اپنی جائیداد اور اپنے بینک اکاؤنٹ سے فرصت ہو تو آپ کو پتا چلے کہ آپ کی بیٹی اور بیوی کہاں ہیں، کیا کر رہی ہیں۔''

جینی کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

''میں جا رہی ہوں۔'' صوفی نے اعلان کیا۔ ''میں ایڈورڈ سے شادی کروں گی۔''

ایڈورڈ وہی منحوس تھا جس کو میں نے ابھی دھکے دے کر اپنے گھر سے نکالا تھا۔

''اگر تم نے اس چوکھٹ سے باہر قدم نکالا تو پھر کبھی یہاں واپس مت آنا۔'' میں غصے اور رنج سے دیوانا ہو رہا تھا۔

''نہیں آؤں گی۔'' صوفی نے دوٹوک جواب دیا۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ جینی بیڈروم میں جا چکی تھی۔ اس کو میرے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں تھی۔

اگلے روز بھی رات دیر سے گھر واپس آیا۔ ایک نئی ڈیل پر کام کر رہا تھا اگر یہ معاملہ طے ہو جاتا ہے تو میں کم سے کم تین چار ملین ڈالر کا منافع اپنے نام کر سکتا ہوں۔ جینی کے بیڈروم میں روشنی تھی میں وہاں چلا گیا۔

''میں چند دن کے لیے لندن جا رہی ہوں۔''

''ضرور جاؤ جانِ من، کب جا رہی ہو؟''

''کل بکنگ کروا کر بتاؤں گی۔''

میں بہت تھک گیا تھا۔ اپنے بیڈروم میں سونے چلا گیا۔ جینی اپنا لندن کا پروگرام پکا کر چکی تھی۔ آج پیر کا دن ہے۔ وہ جمعرات کو جائے گی۔ مجھے جمعرات کی شام کو اس کو ائرپورٹ چھوڑنے جانا تھا۔ ہم لوگ ائرپورٹ جانے کے لیے تیار تھے کہ میری سیکریٹری کا فون آیا۔ ڈیل کے کاغذات تیار تھے۔ مجھے فوراً دفتر پہنچنا تھا۔ میں نے جینی کو بتایا تو اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار تھے۔

''خفا مت ہو میری جان۔ اس کے بدلے میں تم کو ایسا ڈائمنڈ رنگ دوں گا کہ رچرڈ برٹن نے ایلزبتھ ٹیلر کو نہ دیا ہو گا۔''

جینی کی ناگواری میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ ''رچرڈ برٹن نے ایلزبتھ ٹیلر کو ایک اور تحفہ بھی تو دیا تھا۔''

''کون سا؟'' میں نے اشتیاق کے ساتھ پوچھا۔

''طلاق۔'' جینی نے مختصر سا جواب دیا اور ٹیکسی بلانے کے لیے ٹیلی فون کرنے اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ گئی۔

''ہنہ۔'' میں نے اپنے دل میں سوچا۔ ''اپنی بات منوانے کے لیے عورتوں کے پاس دو ہی حربے ہیں۔ آنسو یا طلاق کی دھمکی۔ واپس آئے گی تو دماغ صحیح ہو چکا ہو گا۔'' میں دفتر روانہ ہو گیا۔ ڈیل میری منتظر تھی۔ تین چار ملین ڈالر کا دل خوش کن خیال بڑا دلکش لگ رہا تھا۔

تین ہفتہ لندن میں گزار کر جینی واپس گھر آ چکی تھی۔ کھانے کی میز پر میں نے اس کو ڈیل کے دستخط ہو جانے کی خوش خبری سنائی۔

''مبارک ہو۔'' اس نے کہا۔ ''اب تم اپنا رچرڈ برٹن والا وعدہ پورا کرو۔''

''کیوں نہیں۔'' میں نے فخریہ کہا۔ ''تم جا کر انگوٹھی خرید لو۔ میں چیک بھجوا دوں گا۔''

''مجھے انگوٹھی نہیں چاہیے۔''

''پھر کیا چاہیے؟'' میں نے پوچھا۔

''دوسرا تحفہ۔''

''وہ کیا۔''

''طلاق۔'' جینی طلاق کو نہیں بھولی تھی۔ وہ مجھے رچرڈ برٹن کے حوالے سے کیے گئے ایک بے معنی جملے کا پابند کرنا چاہتی تھی۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ ایک دن میں نے بھی زاہدہ کو اس کے ایک بے ضرر بے معنی جملہ کے عوض طلاق کے تحفہ سے نوازا تھا۔ صرف اپنے مذموم مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے۔ اپنی بے جا خواہشات کی تکمیل کے لیے میں نے اس پیکرِ وفا کی چاہت، محبت، ایثار ہر چیز کو پس پشت ڈال دیا تھا۔

''طلاق تم کو کس بنیاد پر چاہیے۔ تمہارے پاس دنیا جہان کی ہر آسائش موجود ہے۔ میں نے تم کو ہر وہ چیز دی ہے جس کی ایک عورت خواہش کر سکتی ہے۔''

''تم نے صرف مجھے مادی چیزیں دی ہیں۔ عورت کو مادی چیزوں کی اتنی خواہش نہیں ہوتی جتنی توجہ، محبت اور

عزت کی ہوتی ہے۔"

"میں نے تم کو یہ سب چیزیں بھی دی ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"اچھا۔" اس نے جواباً کہا۔ "تو یہ بتاؤ کل میں نے کون سے کپڑے پہنے تھے۔ ان کا رنگ ہی بتا دو۔"

"وہ......وہ۔" میں نے کہا۔ "واقعی مجھے کچھ یاد نہ تھا کہ اس نے کون سے کپڑے پہنے تھے۔"

جینی نے دوسرا وار کیا۔ "ہم پچھلی دفعہ کب ایک ساتھ باہر کھانا کھانے گئے تھے۔"

"مجھے نہیں یاد تھا۔"

"تین سال پہلے۔" جینی نے کہا۔ "کیا تم اب بھی کہتے ہو کہ تم میرے اوپر توجہ دیتے ہو۔"

"میں اپنی خطا مانتا ہوں۔ میں اس کمی کو پورا کردوں گا۔ وعدہ کرتا ہوں۔"

"وقت گزر چکا ہے۔ مجھے طلاق چاہیے۔"

"کیوں چاہیے۔"

"اس لیے کہ میں ٹونی سے شادی کر رہی ہوں۔"

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ "کون ٹونی۔ وہی نیچ ذات جس نے تم کو چھوڑ کر کسی اور سے بیاہ رچا لیا تھا۔"

"ہاں وہی اب وہ بدل چکا ہے۔ اپنے کیے پر شرمسار ہے۔"

"میں مر جاؤں گا مگر طلاق نہیں دوں گا۔"

"میں عدالت سے رجوع کروں گی۔"

عدالت نے نہ صرف یہ کہ جینی کی طلاق کی درخواست اس کے حق میں کر دی بلکہ میرے آدھے اثاثے بھی اس کے نام کرنے کا حکم دیا۔ میرے سینے پر سانپ لوٹ گیا۔ جس دولت کو کمانے کے لیے میں نے اپنی زندگی بیچ دی۔ ماموں کو ناراض کیا۔ زاہدہ اور جینی کو گنوایا اپنی جان جگر بیٹی صوفی سے ہاتھ دھوئے اس کے آدھے حصے پر اب وہ نیچ اور کمین ٹونی حکمرانی کرے گا لیکن میرے پاس عدالت کا حکم ماننے کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا۔

اس غم نے مجھے مار دیا۔ میں نے دفتر جانا چھوڑ دیا۔ جس مینیجر کو مشورے کی ضرورت ہوتی وہ میرے پاس گھر آ کر مشورہ کر لیتا۔ میں عضو معطل ہو چکا تھا۔ ہر وقت کمرے میں بند رہتا۔ دو ہفتے اسی طرح گزر گئے پھر میں نے ایک فیصلہ کیا کہ میں باقی آدھے حصے سے بھی پیچھا چھڑا لوں گا۔ مجھے اس دولت سے نفرت ہو چکی تھی جو انسان سے اس کی انسانیت چھین لے۔

میں نے اپنی ذات کے لیے ایک گھر اور ضرورت بھر نقدی چھوڑی اور باقی تمام اثاثے اپنی جان سے پیاری گڑیا صوفی کے نام کر دی۔ یہ سب کچھ صوفیہ کے حوالے کرنے کے بعد میں امریکا کے دوزخ کو خیرباد کہہ دوں گا۔ پاکستان واپس چلا جاؤں گا۔ گھر کا جو کرایہ آئے گا اس سے پاکستان میں میرا گزارا ہو جائے گا۔

میں صوفیہ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرنا چاہتا تھا اور یہ بھی بتانا چاہتا تھا کہ جس گھر میں، میں رہتا ہوں اب وہ اس کے نام پر ہے وہ جب چاہے وہاں منتقل ہو سکتی ہے میں کل پاکستان کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔

میں نے صوفیہ کے دروازہ پر دستک دی۔ دروازہ کھول کر صوفیہ نے میری طرف حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبات سے دیکھا پھر بابا کہہ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ صوفیہ نے شاید پہلی بار مجھے ڈیڈی کی بجائے بابا کہہ کر پکارا تھا۔ میں نے صوفی سے الگ ہونا چاہا تو وہ مجھ سے اور زور سے چمٹ گئی۔ "مجھے اپنے سے الگ نہ کریں بابا میں اس سینے سے لگنے کے لیے کب سے تڑپ رہی ہوں۔ آپ نے مجھے بالکل بھلا دیا۔ پلٹ کر میری خبر تک نہ لی۔"

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی جب سے وہ گھر چھوڑ کر گئی تھی۔ میں نے اس کو پلٹ کر پوچھا تک نہ تھا۔ جب بھی اس کی محبت سے بے چین ہو کر میں نے اس سے رابطہ کرنا چاہا۔ میری جھوٹی انا نے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا۔

"میں اپنے گناہوں کی معافی مانگنے آیا ہوں بیٹا۔ میں نے تم کو تمہاری اماں کو اور ہر اس شخص کو دکھ پہنچایا ہے جو مجھ سے قریب ترین تھا۔ میری آنکھیں کھل چکی ہیں۔ میں تمہارا مجرم ہوں۔"

اس نے میرے ہونٹوں پر اپنی انگلیاں رکھ دیں۔ "ایسا نہ کہیں بابا آپ کسی کے مجرم نہیں ہیں صرف میرے بابا ہیں۔" میری ساری کوتاہیوں کے باوجود باپ کا پیار اس کے دل سے نہیں گیا تھا۔

میں نے صوفیہ کو بتایا کہ میں نے سارے بقایا اثاثے اس کے نام کر دیے ہیں سوائے ایک گھر کے اور کل میں پاکستان چلا جاؤں گا۔

"یہ نہیں ہو سکتا بابا۔" ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے اس

نے میرے دونوں پاؤں پکڑ لیے۔" میں نے برسوں آپ کی توجہ کے لیے تڑپنے کے بعد آج آپ کو پایا ہے میں آج ہی آپ کو پھر سے کھونا نہیں چاہتی۔ میں آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گی۔ نہیں چاہیے مجھے مال و دولت جس نے میرے بابا کو مجھ سے برسوں جدا رکھا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

یہ میرے لیے بڑا صبر آزما وقت تھا میں سب کچھ برداشت کرسکتا تھا لیکن صوفی کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اس کو شانوں سے پکڑ کر اٹھایا وہ میرے سینے سے لگ کر بلک بلک کر رو رہی تھی۔ میری برداشت جواب دے چکی تھی۔ میری آنکھوں کا سیلاب اس کے اشکوں میں شامل ہوگیا۔ جب میرے جذبات کچھ قابو میں آئے تو میں نے اس کو آرام سے صوفے پر بٹھایا اور اس سے وعدہ کیا کہ اگر اس وقت وہ مجھے نہیں روکے گی تو میں جلد ہی پاکستان سے اس سے ملنے واپس آؤں گا مگر اس وقت مجھ میں یہاں رہنے کا یارا نہیں ہے۔ میں یہاں سے رسیاں تڑوا کر بھاگتے جانور کی طرح بھاگنا چاہتا ہوں۔

میں واپس جانے کے لیے اٹھا پھر صوفیہ کی طرف پلٹ کر اس سے کہا۔ "بیٹا میرے سر ایک احسان کردو۔"

وہ تڑپ اٹھی۔ "احسان کیسا بابا۔ آپ مجھ سے اس طرح التجا نہ کریں۔ آپ مجھے حکم دیں اگر میں نہ مانوں تو آپ مجھے تھپڑ مار کر اپنی بات منوالیں۔ میں آپ کے لیے سب کچھ کر سکتی ہوں۔ ایڈورڈ کو بھی چھوڑ سکتی ہوں۔"

میں ایک دفعہ صوفیہ کو تھپڑ مارنے کی غلطی کر چکا تھا۔ اس کی میں نے بھاری قیمت ادا کی تھی۔ اب میں خواب و خیال میں بھی اس کا تصور تک نہیں کرسکتا تھا۔

"نہیں بیٹا تم کو کسی کو چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے اس کی پیشانی پر پیار کرتے ہوئے کہا۔ "صرف میری ایک خواہش پوری کردو۔"

"آپ خواہش بتائیں بابا میں اس کو ضرور پورا کروں گی۔"

"مسلمان بن جاؤ۔" مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ اس کا کیا ردِعمل ہوگا۔ میں نے بڑی کوتاہی کی تھی کبھی اس کے مذہب یا لامذہب کو کوئی اہمیت نہ دی تھی۔ میرے دل کو اس کے جواب کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔

"ضرور بابا۔ میں ضرور آپ کی خواہش پوری کروں گی۔ آپ بتایئے مجھے کیا کرنا ہوگا۔"

بایزید دوم
(1447ء۔1513ء)

عثمانی سلطان محمد دوم کا بیٹا اور جانشین جس نے ترکوں کی محافظ عیسائی فوج ینی چری کی امداد سے اپنے بھائی کی بغاوت کو فرو کر کے تختِ عثمانی پر قبضہ کرلیا۔ بایزید ایک امن پسند سلطان تھا۔ اس نے ترکی سلطنت کو تو کچھ زیادہ وسعت نہیں دی البتہ ترکی تہذیب و تمدن کو خوب فروغ دیا۔ 1510ء میں اس کے بیٹوں سلیم اور احمد میں جنگ شروع ہوگئی۔ سلیم کے حامیوں نے بایزید کو تخت سے دست بردار ہونے پر مجبور کردیا اور اس کی جگہ سلیم ترکی کا سلطان بنا۔

بایزید یلدرم
(1347ء۔1403ء)

عثمانی سلطان (دورِ حکومت 1389ء۔1403ء)

اپنے باپ سلطان مراد اوّل کے قتل کے بعد سلطان بنا۔ جون 1389ء میں اس کی فوجوں نے بلغاریہ اور سربیا کے تمام علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ سربیا کے بادشاہ اسٹیفن نے اطاعت قبول کرلی اور اپنی بہن و سپنا کی شادی سلطان سے کردی۔ اس کے بعد فارس و شام کی سرحدات تک تمام چھوٹی بڑی ریاستوں کو جن پر ترک امراء حکمران تھے، تابع فرمان بنا لیا۔ 1394ء میں فرانس، انگلستان، اسکاٹ لینڈ، فلینڈرز، لمبارڈی، بوہیمیا، جرمنی اور آسٹریلیا کی متحدہ فوج کو نکوپول کے مقام پر شکست دی۔ 1397ء میں یونان پر حملہ کیا اور کورنتھ تک جا پہنچا۔ پھر بازنطینی سلطنت کے صدر مقام قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا۔ قریب تھا کہ شہر فتح ہوجائے کہ سلطان کو اناطولیہ پر تیمور لنگ کے حملے کی خبر ملی۔ 1402ء میں دونوں فوجوں کا مقابلہ انگورہ کے مقام پر ہوا اور بایزید گرفتار ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ تیمور نے بایزید کو ایک آہنی پنجرے میں قید کردیا تھا جسے ساتھ لیے پھرتا تھا۔ اسیری ہی میں اس ذی وقار بادشاہ نے وفات پائی۔

مرسلہ: نوید حسن۔ کراچی

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ صوفی کو گلے سے لگا لیا۔ میں نے اس کو وضو کرنے کا طریقہ بتایا۔ اس کے ساتھ مل کر کلمہ پڑھا۔ اس کو کلمہ کے معنی سمجھائے اور جلد پاکستان سے واپس آنے کا وعدہ کر کے باہر نکل آیا۔

گاڑی میں بیٹھ کر میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور گھر کا رخ کیا۔ اس گھر کی طرف جواب صوفیہ کا تھا یا شاید ایڈورڈ کا۔

جس دولت کو حاصل کرنے کے لیے میں نے اپنی عزیز ترین ہستیوں کو نظر انداز کیا تھا۔ گنوایا تھا ان کے دل توڑے تھے۔ ان کے حقوق کو پامال کیا تھا۔ اب وہ دولت دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ ایک حصے پر ٹونی کی حکمرانی تھی۔ دوسرے پر ایڈورڈ کی اجارہ داری میں پاکستان واپس پہنچا تو خالی ہاتھ تھا۔

☆......☆

پچھلے پچیس تیس سال کے دوران میں، میں نے پاکستان میں کسی سے رابطہ نہیں رکھا تھا۔ مجھے اپنے کسی بھی دوست یا رشتے دار کے بارے میں کوئی معلومات نہ تھیں کہ کون ہے اور کون نہیں ہے اور جو ہے وہ کہاں ہے۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ ماموں زندہ بھی ہیں یا نہیں ہیں اور اگر نہیں تو کیا اسی پرانے گھر میں ہیں۔ معلوم کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا۔ میں ٹیکسی میں بیٹھ کر ان کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

محلے کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ کوئی جگہ پہچان میں نہ آتی تھی۔ مشکل سے گھر ملا۔ میں نے گھنٹی بجائی تو ایک لڑکا باہر نکلا۔ میں نے ماموں کا پوچھا۔ اس کو کچھ پتا نہ تھا وہ اندر سے اپنی ماں کو بلا لایا۔ انہوں نے بتایا کہ ماموں ممانی دونوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ یہ گھر انہوں نے خرید لیا ہے۔ ماموں کی بیٹیوں کے متعلق ان کو کچھ معلوم نہ تھا۔

''آپ کون ہیں؟'' انہوں نے پوچھا۔ میں نے تفصیل بتا دی پھر واپس جانے کے لیے مڑا۔ پھر میرے قدم رک گئے۔ میں نے پلٹ کر ان خاتون سے ایک استدعا کی۔

''میرا لڑکپن اور جوانی اس گھر کے ایک کمرے میں گزرے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میں پانچ منٹ کا وقت اس کمرے میں گزار لوں۔''

وہ تذبذب میں پڑ گئیں۔ اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔ اس نے شانے اچکائے میں مایوس ہو کر لوٹنے لگا۔

''ٹھہریے۔'' خاتون نے مجھے روکا۔

''مجھے کیسے معلوم کہ آپ وہی ہیں جو آپ کہہ رہے ہیں۔''

میرا امریکی پاسپورٹ میرے کوٹ کی جیب میں تھا وہ میں نے ان کو نکال کر دکھایا۔ انہوں نے کچھ غیر یقینی نظروں سے اس کا معائنہ کیا پھر خدا معلوم کیا سوچ کر مجھے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔

''کون سا کمرا؟'' انہوں نے سوال کیا میں نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔

''صرف پانچ منٹ۔'' انہوں نے کہا۔ میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

''بالکل، صرف پانچ منٹ۔''

کمرے میں داخل ہوا تو ہر طرف پرانی یادیں بکھری پڑی تھیں۔ جیسے دروازے کے سامنے دیوار کے اوپر ماموں کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ میں نے بے اختیاری سے آگے بڑھ کر اس جگہ کو چوم لیا۔ اپنی آنکھیں اس جگہ رکھ دیں اور اس ہستی کو یاد کیا جس سے بڑھ کر مشفق ہستی میرے لیے کوئی نہ تھی اور جس کو میں اپنی حماقت اور نالائقی سے ناراض کر چکا تھا۔ اب ان کو منانے کا کوئی طریقہ نہ تھا۔ بائیں طرف نظر ڈالی تو دماغ میں چکا چوند مچ گئی۔ اسی جگہ وہ مسہری بچھی ہوئی تھی جس پر زاہدہ دلہن بن کر آئی تھی۔ جب میں نے اس کا گھونگھٹ اٹھایا تھا تو وہ میری باہوں میں سمٹ گئی تھی۔ حالانکہ ہم دونوں اس سے پہلے بیسیوں بار مل چکے تھے۔ گھنٹوں ساتھ گزار چکے تھے۔ زاہدہ کی یاد میرے دل میں ایک ٹیس بن کر اٹھی۔ ''خدا معلوم زاہدہ کہاں ہو گی۔'' میں نے اپنے آپ سے کہا۔

باہر آ کر میں نے خاتون کا شکریہ ادا کیا اور ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوٹل واپس آ گیا۔

اب تک میں زاہدہ کو بھلائے بیٹھا تھا مگر اب اس یادگار مسہری کو دیکھنے کے بعد زاہدہ کے بارے میں جاننے کے لیے میرا دل بے قرار ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا اسپتال جا کر معلوم کروں۔ شاید کچھ سن گن مل جائے۔ اسپتال پہنچ کر میں جھجکتے ہوئے نرسنگ اسٹیشن کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں پر ایک گول مٹول خاتون کو بیٹھے ہوئے پایا۔ شاید ہیڈ نرس ہوں گی۔ پوچھنے لگیں۔ ''آپ کو کیا کام ہے۔''

میں نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔ ''یہاں پر ایک نرس زاہدہ ہوتی تھیں۔''

''ہاں ہوتی تھیں۔'' ایک کرخت سا جواب ملا۔ پھر دوسرا سوال ''آپ کو ان سے کیا کام ہے؟''

میرے جواب دینے سے پہلے انہوں نے مجھے کچھ ٹپٹا کر دیکھا۔ پھر شاید پہچانتے ہوئے سوال کیا۔ ''تم سلمان ہو؟''

میں نے اثبات سر ہلا دیا۔ ان کا رویہ ایکدم بدل گیا۔

''تم نے زاہدہ کو زندہ درگور کر دیا۔ اب اس کو کون سا زخم دینے آئے ہو۔''

''آپ ہیں کون؟'' میں نے پوچھا۔ ''آپ کو کیا حق پہنچتا ہے کہ آپ مجھ سے اس طرح سے بات کریں۔''

ان کا جواب تھا۔ ''بالکل حق پہنچتا ہے۔ میں نعیمہ ہوں۔ تم نے مجھے پہچانا نہیں؟''

نعیمہ، زاہدہ کے ساتھ کام کرتی تھی اس کی بہترین سہیلی تھی مگر میں اس توپ کے گولے کو کسی طور نہیں پہچان سکتا تھا۔

نعیمہ اس قدر دبلی پتلی ہوتی تھی کہ اس کی ساتھی نرسیں اس کو ''پھر بری'' کہا کرتی تھیں۔ پھر بری اگر توپ کا گولہ بن جائے تو اس کو کیسے پہچانا جائے۔

''میں اس کو کوئی زخم دینے نہیں آیا۔ صرف اس کا حال دریافت کرنا چاہتا تھا۔''

''اس کا حال یہ ہے کہ اس نے تمہاری مالا جپتے جپتے اپنی زندگی تباہ کر لی۔'' پھر مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔ ''اور کچھ سننا چاہتے ہو؟''

''ہاں سننا چاہتا ہوں۔'' میں نے بھی درشتی سے کہا۔ ''مالا جپتے جپتے سے تمہارا کیا مطلب ہے۔ کیا اس نے دوسری شادی نہیں کی۔''

''نہیں کی۔'' نعیمہ نے جواب دیا۔ ''اگر میں اس کی جگہ ہوتی تو تم کو اپنی جوتی کی نوک پر رکھتی۔ تم اسی قابل ہو۔''

اب تک زاہدہ کے بارے میں جاننا ایک بے معنی تجسس تھا مگر یہ جاننے کے بعد کہ وہ اب تک میرے نام پر جی رہی ہے میں اس سے ملنے کے لیے بے چین ہو گیا۔

''نعیمہ۔'' میں نے خوشامد سے کہا۔ ''زاہدہ کہاں ہے مجھے اس کا پتا بتا دو۔''

''پتا تو کبھی نہیں بتاؤں گی۔ صرف اتنا بتا سکتی ہوں کہ وہ یہاں نہیں ہے۔ ایک نجی اسپتال میں کام کرتی ہے۔''

''سنگدل نہ بنو نعیمہ خدا کا واسطہ مجھے اس کا پتا بتا دو۔'' میں نے ہاتھ جوڑ لیے۔

''تمہارے منہ سے سنگدل کا لفظ اچھا نہیں لگتا۔ تم سے بڑا سنگدل اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ آئندہ یہاں مت آنا۔''

میرے لیے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں ہوٹل چھوڑ کر ایک کرائے کے فلیٹ میں منتقل ہو چکا تھا۔ اب میرے سامنے صرف ایک مشن تھا۔ زاہدہ کو ڈھونڈنا۔ میں پانچ چھ نجی اسپتالوں کے چکر لگا چکا تھا مگر قسمت نے ساتھ نہ دیا۔ اس شہر میں بیسیوں نجی اسپتال تھے، اس کو کہاں کہاں تلاش نہیں کیا۔ پھر ایک دن میں ٹھیلے پر پھل بیچنے والے سے پھل خرید رہا تھا۔ سامنے سے ایک عورت آتی دکھائی دی۔ اس کے خدوخال مانوس سے لگے لیکن چہرہ بالکل انجانا تھا مگر اس چہرے پر ایک چیز تھی جس کو میں پہچانتا تھا۔ یہ تھیں اس کی آنکھیں۔ میں ان آنکھوں کو لاکھوں آنکھوں کے درمیان بھی پہچان سکتا تھا۔ وہ عورت میرے نزدیک سے گزر کر سامنے والی عمارت کے اپارٹمنٹ میں داخل ہو گئی۔ میں پھل فروش کو چیختا چلاتا چھوڑ کر اس عورت کے پیچھے اس عمارت میں داخل ہو گیا۔ وہ اپنے پرس سے چابی نکال کر سامنے والے فلیٹ کا دروازہ کھول چکی تھی۔ میں تیز تیز چلتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔

''زاہدہ۔'' میں نے ہولے سے آواز دی۔ اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا شاید پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

''زاہدہ میں سلمان ہوں۔'' میں نے کہا۔

''سلمان!'' اس نے غیر یقینی انداز میں دہرایا۔

''کیا مجھے اندر نہیں بلاؤ گی۔'' اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

زاہدہ بہت بدل چکی تھی۔ مجھے زاہدہ کا وہ روپ یاد آ رہا تھا جب میں پہلے پہل اس کی محبت میں گرفتار ہوا تھا۔

اول اول کی محبت کا نشہ یاد تو کر۔ بے پیے بھی ترا چہرہ تھا گلستاں جاناں۔ مگر اب یہ گلستان وقت کی بھٹی سے گزر چکا تھا۔ اس میں وہ شادابی نہ رہی تھی لیکن مجھے اس چہرے کی شادابی سے اتنا واسطہ نہ رہا تھا۔ جتنا زاہدہ کی ہستی سے اس کے وجود سے تھا۔ اب بھی وہ میرے لیے سراپا گلستان تھی۔ میرے سامنے میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی کھڑی تھی۔

آج سے چند ہفتے پہلے جب میں نے زاہدہ کو تلاش کرنا شروع کیا تھا تو آج کے اس موقع پر زاہدہ سے کہنے کے لیے میرے پاس ہزار باتیں تھیں لیکن اس وقت میں ان ساری باتوں کو بھول چکا تھا۔ میں اس سے صرف اتنا کہہ سکا۔

''زاہدہ واپس آ جاؤ۔''

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔

''کہاں واپس آ جاؤں؟'' اس نے پوچھا۔ میں نے

جواب دیا۔ ''میری زندگی میں۔''
اس کو جھٹکا سا لگا۔ یہ بات اس کے لیے شاید غیر متوقع تھی۔
''نہیں۔'' زاہدہ نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ ''یہ نہیں ہو سکتا۔''
''کیوں نہیں ہو سکتا۔ میں بدل چکا ہوں۔ زندگی کا سبق حاصل کر چکا ہوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں آئندہ کبھی تمہاری ناقدری نہیں کروں گا صرف ایک دفعہ مجھے معاف کر دو۔''
''آپ کے بدلنے یا نہ بدلنے سے اس کا تعلق نہیں ہے۔ میرا مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا۔''
''کیسے نہیں دیتا۔ دیا ہے۔'' میں نے زور دیا۔ ''تمہارا دوسرا نکاح ہو جائے گا پھر طلاق لینے کے بعد ہم دوبارہ شادی کے بندھن میں بندھ جائیں گے۔''
''یہ ناممکن ہے۔'' اس کا جواب تھا۔
''کیوں ناممکن ہے۔''
''میں نے پچھلے پچیس سال سے اپنے آپ کو آپ کی امانت بنا کر رکھا ہے۔ مجھے کوئی اور ہاتھ نہیں لگا سکا۔ میں کسی اور کے نکاح میں جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔''
''کسی کو تم کو ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔''
''یہ نکاح اور طلاق کی کارروائی صرف کاغذ پر ہو گی۔ ہاتھ لگانے کا ذکر کہاں سے آ گیا۔'' میں نے اس کو سمجھایا۔
''یہ جائز نہیں ہے۔'' اس نے جواب دیا۔
''جائز کیوں نہیں ہے۔ کسی کو کیا اعتراض ہو گا۔''
''کسی کو اعتراض ہو یا نہ ہو مجھے اس کی پروا نہیں۔ یہ میرے مذہب کے خلاف ہو گا۔ آپ دنیا کو دھوکا دے سکتے ہیں لیکن میں خدا کو دھوکا نہیں دے سکتی۔''
''پھر ہم کیسے ملیں گے؟'' میرا سر چکرا رہا تھا۔
''ہم نہیں مل سکتے۔ ہمارے درمیان ایک کھائی ہے جس کو میں پار نہیں کر سکتی۔ خدا کے واسطے آپ یہاں سے چلے جائیے بیشتر اس کے کہ میرے قدم ڈگمگائیں اور میں اپنے آپ سے ہار مان جاؤں۔''
''میں نے سب کچھ کھو کر تم کو پایا ہے۔ اب میں واپس نہیں جا سکتا۔'' میں نے زور دیا۔
''آپ کو واپس جانا پڑے گا۔'' زندگی میں پہلی بار زاہدہ نے مجھ سے درشتی سے بات کی۔ ''جب میں نے آپ کے بغیر جینا سیکھ لیا تو آپ کو کیا حق ہے کہ آپ واپس آ کر میرا سکون مجھ سے چھینیں۔ اب مجھ میں ضبط کا یارا نہیں ہے۔ مجھے مزید مت آزمائیے۔ آپ کے ہاتھ جوڑتی ہوں خدارا لوٹ جائیے۔'' اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ میرے پاس کوئی چارہ نہ تھا میں زاہدہ کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا مگر میں جانے سے پہلے زاہدہ کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا۔
گو کہ اب میں دولت کا پجاری نہیں رہا تھا لیکن شاید صرف رسی جلی تھی بل نہیں گیا تھا۔ شاید میرے نزدیک ہر درد کا درماں پیسا تھا۔ ہر زہر کا تریاق پیسا تھا۔ میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر جتنے پیسے اس میں تھے نکال کر زاہدہ کی طرف بڑھائے۔ ''یہ رکھ لو۔'' میں نے کہا۔
زاہدہ کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ ''کس لیے رکھ لوں۔''
''تمہارے کام آئیں گے۔''
''مجھے آپ کے پیسے نہیں چاہئیں۔ میں بھکاری نہیں ہوں۔''
میں نے زاہدہ پر آخری حسرت بھری نظر ڈالی اور باہر نکل آیا۔ کس تمنا سے تجھ کو چاہا تھا کس محبت سے ہار مانی ہے۔

☆......☆

کسی نے مجھے گندی سی گالی دی۔ پھر بریک لگنے کی آواز آئی۔
''اندھا ہو گیا ہے۔ دیکھ کر نہیں چل سکتا۔ اگر گاڑی سے ٹکرا کر مر جاتا تو کون تیری موت کا ذمہ دار ہوتا۔'' یہ اس آدمی کی آواز تھی جس نے ابھی ابھی مجھے اپنی موٹر سائیکل کی زد میں آنے سے بچایا تھا۔
''معاف کر دو میرے بھائی۔'' میں نے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر اس سے کہا۔ ''غلطی ہو گئی اب دیکھ کر چلوں گا۔''
اس نے میری طرف حیرت سے دیکھا۔ پھر بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ''سارے پاگل یہیں مرنے آ گئے ہیں۔''
باقی سڑک میں نے دیکھ بھال کے پار کی۔
سر چکرا رہا تھا۔ دماغ سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب ہو چکی تھی۔ پیروں سے چلنے کی طاقت سلب ہو چکی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے زاہدہ کا ہیولا تھا۔ وہ میرے پیسے مجھے واپس کر رہی تھی۔ ''میں بھکاری نہیں ہوں۔''
زاہدہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ وہ بھکاری نہیں تھی۔ وہ تو دھن وان تھی۔ بھکاری تو میں تھا صرف اس کی ایک نظرِ التفات کا بھکاری۔
میں کسی نہ کسی طرح ڈگمگاتے ہوئے اپنے بکھرے ہوئے وجود کو سمیٹتے ہوئے فٹ پاتھ سے اٹھ کھڑا ہوا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چل پڑا۔ کس سمت قدم اٹھتے رہے تھے مجھے کوئی اندازہ نہ تھا۔

لمس

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم!
زیر نظر سرگزشت میری ایک سہیلی کی ہے۔ اس سرگزشت کی ایک کردار خود میں بھی ہوں اس لیے ایک ایک بات تفصیل سے لکھی ہے۔ یہ ذرا الگ قسم کی سرگزشت ہے اس لیے بغور پڑھ کر فیصلہ کریں گی ،اگر منتخب ہو جائے تو پلیز اطلاع ضرور دیجیے گا۔

ثوبیہ
(کراچی)

دروازے پر ہلکی دستک ہوئی۔
میں نے دروازہ کھول دیا۔ میرے سامنے فروزاں کھڑی تھی۔ میرے برابر کے کمرے میں رہنے والی ایک خوب صورت لڑکی جس کی عمر میرے اندازے کے مطابق بائیس اور پچیس کے درمیان ہوگی۔ یعنی مجھ سے تین چار سال بڑی۔
ہم جہاں رہتے تھے وہ ایک گرلز ہوسٹل تھا۔ اتنا بڑا تو نہیں تھا لیکن وہاں بہت آرام اور سکون تھا۔ ہاسٹل کی مالکہ

جن کو ہم میڈم مادھوری کہا کرتے بہت مہربان اور خوب صورت خاتون تھیں۔

کراچی میں اس قسم کے ریسٹ ہاؤسز اور گرلز ہوسٹل بہت سے ہیں۔ دوسرے شہروں سے لڑکیاں جاب کے لیے آتی ہیں یا یہاں انہیں اپنی تعلیم مکمل کرنی پڑتی ہے۔

ان کے لیے سب سے بڑی پرابلم یہی ہوتی ہے کہ وہ کہاں رہیں۔ ایک دو لڑکیاں کوئی فلیٹ کرائے پر لے کر نہیں رہ سکتی تھیں کیوں کہ حالات ہی ایسے تھے۔

اس لیے گرلز ہاسٹل لڑکیوں کی ترجیح ہوا کرتی تھی۔ ان کے والدین یا رشتے دار بھی آ کر، دیکھ بھال کر مطمئن ہونے کی کوشش کرتے تھے کہ ان کی لڑکیاں جس ہاسٹل میں رہ رہی ہیں وہاں کا ماحول کیسا ہے اور جب انہیں اطمینان ہو جاتا تو رہنے کی اجازت دے دی جاتی تھی۔

اس قسم کے ہاسٹلز عام طور پر پوش علاقوں میں ہوا کرتے ہیں۔ وہاں ہر طرح کا آرام ہوا کرتا ہے۔ بڑا سا کچن ہوتا ہے۔ کھانے بنانے، صفائی کرنے، چادریں بدلنے اور کپڑے دھونے والی عورتیں ہوتی ہیں۔ عام طور پر اس قسم کے مہنگے ہوسٹل کے ہر کمرے میں ایک چھوٹا سا ٹی وی سیٹ بھی ہوا کرتا ہے تاکہ لڑکیاں اپنی پسند کے پروگرام سے لطف اندوز ہو سکیں۔

میں بھی اس قسم کے ایک ہوسٹل میں رہا کرتی۔ میرا مسئلہ دوسرا تھا۔ میرا گھر اس شہر میں تھا میرے والدین بھی یہیں تھے اور میرے گھر میں مجھے ہر قسم کا آرام بھی تھا لیکن میرا کالج گھر سے میلوں دور تھا۔ ایک گاڑی تھی ابتدائی چند مہینوں تک تو اس پر آتی جاتی رہی۔

بڑا بھائی لے کر آیا کرتا اور مجھے ڈراپ کر کے وہ واپس چلا جاتا۔ پھر کالج کے بعد واپسی کا مسئلہ ہو جاتا تھا۔

اس لیے والدین نے کالج کی وین لگا دی۔ یہ بھی ایک محفوظ طریقہ تھا لیکن اس میں پرابلم یہ ہوتی تھی کہ وین والا جب دوسری لڑکیوں کو ڈراپ کرتا ہوا مجھے ڈراپ کرتا تو اس وقت تک مجھے کالج سے نکلے ہوئے دو گھنٹے ہو چکے ہوتے اور گھر والے الگ پریشان۔

ایک دن میری ایک کلاس فیلو راحیلہ نے مجھ سے پوچھا۔ ”ثوبیہ تم کس طرح آتی جاتی ہو۔“

”وین کے ذریعے یار، لیکن خوار ہو جاتی ہوں۔ آدھا وقت آنے جانے میں نکل جاتا ہے۔ پھر پڑھائی کیا خاک ہونی ہے۔ تھک کر بور ہو جاتی ہوں۔“

”شروع شروع میں میرے ساتھ بھی یہی پرابلم تھی یار، لیکن اب مزے ہی مزے ہیں۔ آرام سے اٹھتی ہوں، تیار ہوتی ہوں، وقت پر کالج پہنچتی ہوں اور کالج کے بعد ٹھیک دس منٹ کے بعد اپنے کمرے میں ہوتی ہوں۔“

”وہ کس طرح؟ کیا کوئی ہیلی کاپٹر خرید لیا ہے؟“

”نہیں یار، ہاسٹل۔“ اس نے بتایا۔ ”میڈم مادھوری کا ہاسٹل۔ کالج کے بالکل قریب آرام سے رہتی ہوں۔ تم بھی آ کر دیکھو تو سہی۔ تم کو وہاں کا ماحول اتنا اچھا لگے گا کہ تم گھر کو بھول جاؤ گی۔“

”یار، میں نے ہوسٹلز کے بارے میں کئی کہانیاں سنی ہیں۔“

”وہ سب بکواس ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”میڈم مادھوری کے ہاسٹل میں تو پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ اپنے اصولوں میں بہت سخت ہیں۔ کسی مرد کو آنے کی اجازت نہیں ہے۔ باپ اور بھائی سے ملاقات ہوتی ہے تو وہ بھی گیٹ سے باہر۔“

”کیا تم اپنے گھر نہیں جاتی ہو؟“ میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔

”کیوں نہیں جاتی۔ سنڈے، سنڈے کالج آف ہوتا ہے، جمعہ کی شام کو پاپا آ کر لے جاتے ہیں۔ دو دن خوب انجوائے کرتی ہوں سنڈے کی رات کو ہاسٹل پہنچا دیا جاتا ہے۔ یہ ہے میری روٹین۔ تم آؤ تو سہی۔ صرف دس منٹ کی واک ہے۔ نہ وین کا انتظار نہ ٹریفک کا چکر۔“

”ضرور آؤں گی۔“

”بلکہ ایسا کرو آج چھٹی کے بعد میرے ساتھ ہی چلو۔“

”کیسے چل سکتی ہوں، وین جو آ جاتی ہے۔“ میں نے بتایا۔

”ہاں یہ بھی ہے۔ ارے ہاں تیسرا بیڈ خالی ہے۔ اجازت لے کر چلتے ہیں۔“ اس نے کہا۔

اس طرح میں پہلی بار میڈم مادھوری کے ہوسٹل سے متعارف ہوئی تھی۔ وہ کالج سے صرف دس منٹ ہی کے فاصلے پر تھا۔ وہاں کا ماحول بھی مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ بے فکر ہنستی بولتی لڑکیاں۔ ایک دوسرے سے شرارتیں کرتیں لڑکیاں ایک طرف میوزیکل انسٹرومنٹ بھی رکھے تھے۔ کچھ لڑکیاں کیرم کھیل رہی تھیں۔

میڈم مادھوری مجھے بہت اچھی لگیں۔ نرم، مہربان لیکن اصول پسند۔ وہ وہاں مقیم لڑکیوں کو اپنی لڑکیاں کہا کرتیں اور ایسا ہی خیال کرتیں مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئی تھیں۔

اس ہوسٹل میں فروزاں سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ ایک بے دھڑک سی لڑکی جس نے بتایا کہ وہ کہیں جاب کرتی ہے اور گزشتہ کئی مہینوں سے اس ہوسٹل میں ہے۔

اس کی باتیں دل چسپ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بولڈ بھی تھیں۔ اس نے پہلی ملاقات میں مجھ سے کہا۔ ''یار تم مجھے بہت اچھی لگی ہو۔ پیاری پیاری سی، تو میں یہ چاہتی ہوں کہ تم بھی یہاں آجاؤ۔ خوب گزرے گی جب مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔''

''دو نہیں تین۔'' راحیلہ نے کہا۔

''اچھا بھائی تم بھی سہی۔ تم کو بھی برداشت کرلوں گی۔''

میں نے جب گھر جاکر اس ہوسٹل کے بارے میں بتاتے ہوئے اپنا ارادہ ظاہر کیا تو سب بہت حیران ہوئے۔ خاص طور پر امی۔ ''لڑکی کیا تم پاگل ہوگئی ہو جو گھر کی سہولت چھوڑ کر کسی ہاسٹل میں جاکر رہوگی۔''

''امی، وہاں بھی ہر قسم کی سہولت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور وہاں کا ماحول بہت اچھا ہے۔ آپ لوگ خود جاکر دیکھ لیں۔ دل خوش ہو جائے گا اور یہ بھی تو دیکھیں کہ وہاں رہنے سے کتنی آسانی ہو جائے گی۔ صرف مجھے نہیں بلکہ سب کو اور وہاں کا ماحول ایسا ہے کہ سب اپنے کام سے کام رکھتی ہیں میں اپنے کمرے میں پڑھتی رہوں گی۔''

مختصر یہ کہ ابو نے کہا کہ وہ جاکر دیکھنا چاہتے ہیں۔ پہلے ابو نے دیکھا۔ میڈم مادھوری سے ملے۔ پھر امی نے جاکر ملاقات کی اور مطمئن ہوکر واپس آگئیں۔

اور میں اپنا سامان لے کر اس ہوسٹل میں شفٹ ہو گئی۔ مجھے بھی ایک کمرا دیا گیا تھا۔ اس ہاسٹل میں کل آٹھ کمرے تھے۔ چار اوپر چار نیچے اور آٹھ ہی لڑکیاں رہتی تھیں۔ میڈم کے لیے ایک الگ کمرا تھا۔ وہی ان کا دفتر بھی تھا۔

پہلے دن ہی تمام لڑکیوں سے میرا تعارف ہوگیا تھا۔ سب ہی جاب کرنے والی یا کالج یونیورسٹی جانے والی تھیں۔ بہت اچھا اور دل چسپ ماحول تھا۔

پھر میری دوست راحیلہ وہاں موجود تھی۔ اس کی وجہ سے بہت ڈھارس بندھی رہتی تھی۔ فروزاں تھی۔ جس کی بے باک باتیں اچھی بھی لگتیں اور حیرت بھی ہوا کرتی۔

ایک بار فروزاں نے مجھے موبائل پر احمد سے باتیں کرتے ہوئے سن لیا۔ اسے یہ تو نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ دوسری طرف کون ہے لیکن میرے انداز نے چغلی کھائی تھی۔

جب میں نے فون بند کیا تو وہ میرے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ ''میری جان، کس سے باتیں ہو رہی ہیں؟'' اس نے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا۔

''اپنی ایک کزن سے۔'' میں نے جواب دیا۔

''دیکھو مجھ سے چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا اسٹائل بتا رہا تھا کہ دوسری طرف کوئی کزن نہیں بلکہ لڑکا ہے۔''

میں ہنس پڑی۔ ''ہاں یار! دوست ہے میرا۔ برسوں ہم ساتھ رہے ہیں۔ اس سے میری منگنی بھی ہوچکی ہے۔''

''آؤ میرے ساتھ۔'' اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''کمرے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔''

وہ مجھے اپنے کمرے میں لے آئی۔ میں پہلی بار اس کے کمرے میں آئی تھی۔ اس نے دیواروں پر کچھ تصویریں لگا رکھی تھیں۔ یہ تصویریں دنیا بھر کی مشہور ماڈل لڑکیوں اور اداکاراؤں کی تھیں۔

اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ میں ایسی کئی لڑکیوں کو دیکھ چکی ہوں لیکن مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ لڑکیاں عام طور پر لڑکوں اور مردوں کی تصویریں لگاتی تھیں۔ جب کہ اس کے کمرے میں صرف لڑکیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

''اس طرح کیا دیکھ رہی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''میں یہ دیکھ رہی ہوں کہ تمہاری دیواروں پر کسی مرد نے کوئی جگہ نہیں بنائی۔''

''اور بنا بھی نہیں سکتا۔''

''وہ کیوں؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''اس لیے کہ مجھے مردوں سے نفرت ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''مجھے گھن آتی ہے کسی مرد سے ملتے اور اس سے باتیں کرتے ہوئے۔''

''کیا؟'' میں واقعی حیران ہوگئی تھی۔ ''یہ کیا کہہ رہی

ہو تم؟“

”میں سچ کہہ رہی ہوں اور آج تمہیں اپنے اس راز میں شامل کر رہی ہوں۔ میں اپنے باپ اور بھائی کو بھی اس لیے برداشت کر رہی ہوں کہ وہ میری مجبوری ہے۔ ورنہ میں ان کو بھی نہ دیکھوں۔“

”فروزاں۔ یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟“ میں نے کہا۔ ”عورت اور مرد تو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔“

”کوئی لازم و ملزوم نہیں ہیں اگر عورت چاہے تو ساری زندگی مرد کے بغیر بھی گزار سکتی ہے۔ جس طرح میں نے سوچ رکھا ہے۔“

”کیا مطلب! کیا تمہیں شادی نہیں کرنی؟“ میں نے پوچھا۔

”ہرگز نہیں۔ میں شادی نہیں کروں گی اور ایک بات بتاؤں مشورہ دوں تمہیں۔ تم بھی شادی مت کرنا۔ چاہے کچھ ہو جائے۔ اپنی آزادی اور خود مختاری کو کسی اور کے حوالے کرنا کہاں کی عقل مندی ہے۔“

”فروزاں۔ تم کہاں کی باتیں کر رہی ہو۔ شادی تو ایک ضروری امر ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ شرعی تقاضا بھی ہے اور ہمارے معاشرے کا سب سے اہم پہلو بھی۔“

”ہوا کرے، مجھے تو شادی نہیں کرنی۔“

”سمجھ گئی۔ شاید کسی مرد نے تمہیں دھوکا دیا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ جب میں کسی کو قریب ہی نہیں آنے دیتی تو دھوکا کیسے دے سکتا ہے۔ خیر چھوڑو۔ میں تمہارے لیے چائے بناتی ہوں۔“

فروزاں نے جو باتیں کی تھیں میں اپنے کمرے میں آ کر بہت دیر تک سوچتی رہی۔ میں نے جب راحیلہ سے اس کا ذکر کیا تو اس نے بھی یہی کہا۔ ”ہاں یار لگتا تو یہی ہے کہ اسے مردوں سے چڑ ہے۔ کیوں کہ ایک دفعہ میں خود دیکھ چکی ہوں۔“

”کیا دیکھا ہے تم نے۔“

”میں ایک بار اپنے کزن شہاب کے ساتھ مارکیٹ گئی تھی۔ وہاں فروزاں سے ملاقات ہو گئی۔ تم نے شہاب کو دیکھا ہے کتنا چارمنگ اور خوش اخلاق انسان ہے۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ میں نے تائید کی۔

”اور فروزاں نے اس طرح ناک منہ بنا لیا کہ وہ بے چارہ شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ اکھڑی اکھڑی باتیں۔ درشت رویہ۔ بالآخر شہاب مجھے وہاں سے الگ لے کر چلا گیا۔“

”کمال ہے۔ عجیب نیچر ہے۔“

”سمجھ میں نہیں آتا کیا چکر ہے۔“ راحیلہ نے کہا۔ ”اس کے ساتھ کوئی کہانی بھی نہیں ہے۔ اگر کہانی ہوتی تو یہی سمجھا جاتا کہ واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ وہ تلخ ہو گئی ہے لیکن ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔“

”ہو سکتا ہے کہ وہ بتاتی نہ ہو۔“

”نہیں ایک بار میری ملاقات فروزاں کی بہن سے ہوئی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ تو شروع ہی سے ایسی ہے۔ اس کی دوستی صرف لڑکیوں سے ہے۔ لڑکوں کو تو وہ گھاس بھی نہیں ڈالتی۔ کہتی ہے کہ اسے شادی نہیں کرنی۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔“

”راحیلہ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی۔ کیوں کہ یہ ایک ان نیچرل بات ہے۔“ میں نے کہا۔

کچھ عرصے کے بعد راحیلہ ہوسٹل سے چلی گئی۔ اس کے والدین نے اس علاقے میں ایک گھر لے لیا تھا جب کہ میں وہیں ہاسٹل میں رہ گئی تھی۔

فروزاں اس دوران میں مجھ سے اور بے تکلف ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی وہ ایسی باتیں کرنے لگتی کہ اس کی باتیں سن کر حیرت ہوتی تھی۔

ایک رات وہ میرے کمرے میں آئی اور اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد پوچھنے لگی۔ ”ثوبیہ تو کیا تم نے شادی کا ارادہ کر ہی لیا ہے۔“

”ہاں بھئی، وہ تو ہونی ہے نا۔“ میں نے کہا۔

”کیوں ہونی ہے۔ شادی اتنی ضروری چیز تو نہیں ہے۔“

”کیسی بات کر رہی ہو۔ شادی کے بغیر زندگی کیسے گزر سکتی ہے؟“

”کیوں نہیں گزر سکتی۔ کیا ضروری ہے کہ مرد کو ڈھول بنا کر گلے میں لٹکا لیا جائے۔ شادی سے پہلے تو بالکل جاں نثار بنے رہتے ہیں لیکن شادی کے بعد ان کے تیور ایسے بدل جاتے ہیں کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ یہ خیال دل سے نکال دو تو زندگی بھر عیش کرو گی۔“

”فرزاں تمہارے خیالات دوسری لڑکیوں سے بالکل مختلف ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”پتا نہیں تم کس دنیا کی باتیں کرتی ہو۔“

''یہ سب اسی دنیا کی باتیں ہیں جانِ من۔'' اس نے کہا۔ ''اگر شادی کا اتنا ہی شوق ہے تو کیا ضروری ہے کہ کسی مرد سے شادی کی جائے۔''

''کیا مطلب؟'' میں بری طرح چونک پڑی تھی۔

''تو پھر؟''

''پھر یہ کہ تم کسی ہم جنس یعنی کسی لڑکی سے بھی شادی کر سکتی ہو۔'' اس نے کہا۔

میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے یہ کیسی بات کر دی تھی۔

''توبہ...... توبہ۔ فروزاں تم شاید پاگل ہو گئی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''ایسی باتیں کہانیوں فلموں میں تو ہو سکتی ہیں زندگی میں نہیں ہوتیں۔''

''آج کل زندگی میں بھی ہو رہی ہیں۔ تم کو اندازہ ہی نہیں ہے۔ یورپ اور امریکا میں تو یہ ٹرینڈ عام ہے۔ اب ہمارے یہاں بھی شروع ہو چکا ہے۔ میں تمہیں اس کی مثالیں دے سکتی ہوں۔''

''پلیز فروزاں، مجھے ایسی باتیں نہیں سننی۔'' میں نے ہاتھ جوڑ لیے۔ ''تم ایک خطرناک قسم کی شیطان ہو۔'' وہ ہنستی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔

یہ تو اس کا ایک رخ ہوا۔ دوسرا رخ یہ تھا کہ وہ انتہائی ہمدرد قسم کی لڑکی تھی۔ ہر ایک کی مدد کرنے کو حاضر۔ ایک بار میرے سر میں درد ہوا تو بہت دیر تک میرا سر دباتی رہی تھی۔ صرف میرا ہی نہیں بلکہ وہ ہاسٹل میں رہنے والی ہر لڑکی کا اسی طرح خیال رکھتی تھی۔

وہ ہر لحاظ سے اچھی تھی۔ خوب صورت، ہمدرد، خوش گفتار۔ بس اس کے مزاج کا یہ پہلو سمجھ سے باہر تھا۔ وہ بتایا کرتی کہ اس نے کسی کو کبھی اپنے قریب نہیں آنے دیا۔ اس لیے اس نے کسی سے دھوکا وغیرہ بھی نہیں کھایا تھا۔ بس اسے مردوں سے وحشت ہوتی تھی۔ اس لیے وہ شادی کے خلاف تھی۔

ایک بار اس کی ماں اس سے ملنے ہاسٹل آ گئی۔ اس وقت فروزاں کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ مجھے چونکہ فروزاں کی طرف سے کرید لگی ہوئی تھی۔ اس لیے اس کی ماں کو اپنے کمرے میں لے کر آ گئی۔

اس کی ماں ایک سنجیدہ باوقار لیکن غم زدہ نظر آنے والی خاتون تھی۔ اس نے مجھے اپنے دل کی بات بتا دی۔ ''بیٹا میں فروزاں کی طرف سے بہت فکر مند ہوں۔ اس کا کیا بنے گا۔''

''آنٹی فروزاں یہ کہتی ہے کہ وہ کبھی شادی نہیں کرے گی۔''

''ہاں اسی بات کا تو رونا ہے۔ یہی تو دکھ ہے۔'' اس کی ماں نے کہا۔ ''خدا جانے اس نے اپنے لیے کیا سوچ رکھا ہے۔ وہ ایسی کیوں ہوگئی ہے۔ وہ یہ اچھی طرح جانتی ہے کہ میں بیمار رہنے لگی ہوں۔ میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں لیکن وہ اپنی ضد پر اڑی ہوئی ہے۔''

''کیا اس کے لیے کوئی رشتہ ہے آنٹی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں ایک بہت اچھا رشتہ ہے۔ بیٹی تم اس کے ساتھ رہتی ہو۔ تم بھی اس کو سمجھاؤ کہ وہ اپنا یہ پاگل پن چھوڑ دے۔ دنیا کی دوسری لڑکیوں کی طرح اپنا گھر بسا لے اس میں سب کی بہتری ہے۔''

میں نے اس کی ماں کو یقین دلایا کہ میں اس پاگل لڑکی کو سمجھانے کی کوشش کروں گی۔ کچھ دیر بعد فروزاں ہاسٹل واپس آکر ماں کو اپنے کمرے میں لے گئی۔

اس رات میں نے جب فروزاں کو سمجھانے کی کوشش کی تو وہ بھڑک اٹھی۔ ''کیا ہو گیا ہے پوری دنیا کو شادی...... شادی...... شادی اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔ یار جب میں یہ سب سے کہہ چکی ہوں کہ مجھے شادی نہیں کرنی تو سب کیوں میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔''

''سب تمہارا بھلا چاہتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

اس نے عجیب نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم یہ بتاؤ کیا تم میرا بھلا چاہتی ہو۔''

''ظاہر ہے۔''

''اگر بھلا چاہتی ہو تو مجھ سے شادی کرلو۔'' وہ شرارت سے بولی۔

''فروزاں میرا خیال ہے کہ اب تم کسی پاگل خانے میں چلی جاؤ۔ تم وہاں صحیح رہو گی۔'' میں نے جل کر کہا۔

وہ بہت دیر تک ہنستی اور مجھ سے چھیڑ خانی کرتی رہی۔ عجب لڑکی تھی۔

میرے گھر میں احمد سے میری شادی کی کہانی شروع ہوگئی تھی۔ احمد کے گھر والے چاہتے تھے کہ شادی جلد ہو جائے۔ جب کہ میرا خیال تھا کہ میں اپنی تعلیم مکمل کرلوں۔

میں نے احمد سے اس سلسلے میں بات کی تو اس نے کہا۔ ''یار اس میں کیا پرابلم ہے۔ شادی کرلو۔ اس کے بعد پڑھتی رہنا۔''

''لیکن یہ تو سوچو کہ یہ میرا آخری سال ہے۔''

''تو کیا ہوا۔''

''ہوا یہ کہ شادی کے بعد مجھے تمہارے گھر آنا پڑ جائے گا اور تمہارے گھر میں ماشاء اللہ اچھے خاصے لوگ ہیں۔ میں اپنی پڑھائی کے لیے وقت کیسے نکالوں گی۔''

''اس کا بھی حل ہے میرے پاس۔'' احمد نے کہا۔

''بہت آسان۔''

''وہ کیا ہے؟''

''شادی کے ایک ہفتے کے بعد تم اس ہاسٹل میں چلی جانا جہاں رہ رہی ہو۔ ہفتے میں دو دن جس طرح اپنے گھر جاتی ہو۔ اس طرح میرے گھر آجایا کرنا۔ تمہاری تعلیم کے لیے میں اس قسم کی دوریاں برداشت کرلوں گا۔''

''یار! یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ کیا کہیں گے دنیا والے۔''

''دنیا والوں کو چھوڑو۔ جب ہم اور تم راضی ہیں ہم دونوں کے گھر والوں کو اعتراض نہیں ہوگا تو پھر کون ہوتے ہیں دنیا والے۔''

احمد نے اس انداز سے بات کی کہ مجھے ماننی پڑ گئی۔

اس نے اپنے اور میں نے اپنے گھر والوں کو راضی کرلیا تھا کہ میں شادی کے بعد اگلے امتحان کے لیے اس ہاسٹل میں رہوں گی۔

شادی کی تاریخ بھی طے ہوگئی۔ ہاسٹل کی لڑکیوں اور میڈم مادھوری کو جب پتا چلا کہ میری شادی ہونے والی ہے اور شادی کے بعد میں پھر اس ہاسٹل میں آجاؤں گی تو سب ہی بہت خوش تھیں۔ سوائے فروزاں کے کیوں کہ اس کو تو شادی ہی پسند نہیں تھی۔

ایک بار اس کی ماں پھر ہاسٹل آئی۔ اس بار وہ خاص طور پر میرے پاس آئی تھیں۔ اتفاق سے اس دن بھی فروزاں کہیں گئی ہوئی تھی۔ اس لیے انہیں مجھ سے باتیں کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

وہ میرے سامنے بیٹھ کر روتی رہی تھیں۔ ''بیٹا سمجھاؤ اس کو، میں بہت بیمار رہنے لگی ہوں۔ وہ کیوں اپنی اور ہماری جان کے پیچھے پڑی ہے۔ میں ایک ماں ہوں۔ کیا میرا دل نہیں چاہتا کہ اس کو دلہن بنتے دیکھوں۔''

''کیوں نہیں آنٹی لیکن اب اس کی ضد کا کیا کیا جائے۔''

''کوئی اسے سلیقے سے سمجھانے والا ہو تو شاید مان

جائے۔“

دوسرے دن جب میں نے فروزاں سے بات کی تو اس کا وہی جواب تھا۔ ”اول تو میں شادی نہیں کروں گی اگر ایسا سوچ بھی لیا تو ابھی نہیں۔“

فروزاں کا یہ کہنا بھی بہت تھا۔ میں نے اس کی ماں کو فون کرکے بتادیا کہ فروزاں تھوڑا تھوڑا شادی کے لیے تیار ہونے لگی ہے۔ ابھی اس پر دباؤ نہ ڈالیں۔

وہ بے چاری اتنا سن کر ہی خوش ہوگئی تھیں۔

میرے گھر میں شادی کی تیاریاں زور وشور سے شروع ہوگئیں۔ میں جب ہفتے میں دو دنوں کے لیے اپنے گھر جاتی تو طرح طرح کی مصروفیات شروع ہوجاتیں۔

میری رشتے کی بہنوں نے بہت پہلے سے ڈھولکی وغیرہ سنبھال لی تھی۔ گیت گائے جاتے۔ بلکہ یہاں تک ہوا کہ ایک بار میڈم مادھوری کی خواہش پر ہاسٹل میں بھی ڈھولکی ہوگئی۔

جس میں سب لڑکیوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ سوائے فروزاں کے۔ وہ سر درد کا بہانہ کرکے اپنے کمرے میں لیٹی رہی تھی۔

ڈھولکی ختم ہونے کے بعد میں غصے میں اس کے کمرے میں پہنچ گئی۔ ”فروزاں یہ سب کیا ہے۔ تم سے میری خوشی کہیں دیکھی گئی نا؟“

وہ خاموش رہی پہلا موقع تھا کہ وہ خاموش رہی تھی۔

میں بولے جارہی تھی۔ ”خدا کی بندی اگر تم کو شادی سے نفرت ہے، تم نہیں کرنا چاہتیں تو نہ کرو لیکن کسی کی خوشی میں تو شریک ہوجاؤ۔ اب کیا اس سے بھی پرہیز ہے۔“

اس نے کچھ نہیں کہا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔ میری ناراضگی فوراً ہی تحلیل ہوگئی۔

”ارے کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔ ”کیا میری بات بری لگی ہے؟“

”نہیں یار، یہ بات نہیں ہے۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”بس یوں ہی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اور تم یہ مت سمجھ لینا کہ مجھے تمہاری خوشی سے خوشی نہیں ہے، خدا تم کو مبارک کرے۔“

”میری جان تم ذرا شادی کے لیے تیار ہوجاؤ تو یہ خوشی تمہارے بھی حصے میں آجائے گی۔“

”بس یار پلیز۔ اب اس معاملے پر بات نہ کرو۔“

میں اسے اس کے حال پر چھوڑ کر اس کے کمرے سے باہر آگئی۔ اس لڑکی کے خلاف دل میں غصہ بھی تھا اور افسوس بھی ہورہا تھا۔

وہ اپنے آپ کو برباد کررہی تھی۔ اتنی اچھی لڑکی اور اس کے ذہن میں خناس سما گیا تھا۔

شادی میں پورا ہوسٹل آیا ہوا تھا سب نے بہت سے تحفے دیے۔ میڈم مادھوری اور دوسری لڑکیاں۔ فروزاں نے بھی تحفہ دیا تھا۔

اس نے میرے پاس آکر چپکے سے کہا۔ ”آخر کو منع کرنے کے باوجود پھنس گئیں نا؟“

میں مسکرادی۔

میں اپنے گھر سے رخصت ہوکر سسرال میں آگئی۔ احمد کے ساتھ بہت خوب صورت دن گزرتے رہے۔ وہ پیار کرنے اور خیال رکھنے والے تھے، یہ ثابت ہورہا تھا۔

اور شادی کے بعد پتا چلا کہ مرد اور عورت کے لیے شادی کیوں ضروری ہے۔ جسمانی امنگوں کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ مرد کا لمس عورت کے لیے اور عورت کا لمس مرد کے لیے اس کی ذہنی اور جسمانی صحت کے لیے کتنا ضروری ہوا کرتا ہے۔ کاش وہ بے وقوف فروزاں اس بات کو سمجھ پاتی۔

میں پندرہ دنوں کے بعد ایک بار پھر ہاسٹل آگئی۔ یہاں میرے اعزاز میں ایک خوب صورت تقریب بھی ہوئی۔ جس میں فروزاں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔

اس رات وہ میرے کمرے میں آکر میرے بستر پر نیم دراز ہوگئی۔ ”ہاں جانی اب بتاؤ کیسا رہا تجربہ؟“

”بہت خوب صورت بہت مدھر۔“ میں نے کہا۔ ”اس لمس کا کوئی نعم البدل ہی نہیں ہوسکتا۔ انسان ہواؤں میں اڑنے لگتا ہے۔ اس کے پورے بدن میں سرشاری شامل ہوجاتی ہے۔“

”ہوتی ہوگی۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔

”میری جان۔ اس لیے تو کہہ رہی ہوں کہ اب تم بھی مان جاؤ الو کی دم۔“ میں نے کہا۔

”نہیں یار! میں دس دفعہ کہہ چکی ہوں۔ مجھ سے یہ سب نہیں ہوگا۔ تم چاہے اپنے کتنے ہی تجربات بیان کرتی رہو۔“ وہ کمرے سے چلی گئی۔

وہی پہلے والا رویہ تھا۔ اب مجھے کیا پڑی تھی جب وہ خود ہی شادی نہیں کرنا چاہ رہی تھی تو میں اس پر دباؤ ڈالنے والی کون ہو سکتی تھی۔

لیکن ایسا ہوا نہیں۔ ایک بار پھر مجھے اس سے بات کرنی پڑی۔ وہ بھی اس کی ماں کی وجہ سے۔ وہ بے چاری میرے پاس آ کر بہت دیر تک روتی رہی تھی۔

ان کا کہنا تھا کہ یہ رشتہ نکل گیا تو پھر فروزاں ساری زندگی بیٹھی رہے گی۔

میں نے اس بار ذرا کھل کر اور ذرا سخت ہو کر فروزاں سے بات کی۔ ''آخر تم کیوں اپنی ماں کی زندگی کے پیچھے پڑی ہو۔ شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟''

''ثوبیہ! اب میں تمہیں ایک بات بتا دوں۔ میں ماں کو دکھ نہیں دینا چاہتی۔ اس لیے شادی نہیں کر رہی ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ اگر میں نے زبردستی شادی کر بھی لی تو دوسرے ہی دن مجھے طلاق ہو جائے گی۔'' اس نے کہا۔

''کیا بکواس کر رہی ہو۔ تم اس قسم کا وہم اپنے ذہن سے نکال دو۔ کر لو شادی۔ پھر دیکھ لینا زندگی کتنی خوب صورت ہو جاتی ہے۔''

وہ خاموش ہو کر سوچتی رہی۔ سوچتی رہی۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ ''او کے میں تیار ہوں۔''

یہ بہت بڑی خبر تھی۔

میں نے اسے گلے سے لگا لیا۔ اس کو سمجھاتی رہی۔ جب کہ وہ اس دوران بالکل خاموش رہی تھی۔

بہرحال فروزاں کی شادی بھی ہو گئی۔

ہم سب اس شادی میں شریک ہوئے تھے۔

فروزاں خوب صورت تو تھی ہی۔ دلہن بن کر وہ اور بھی خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس کا شوہر بھی بہت اچھا تھا۔ یہ اتفاق تھا کہ میں اس کے ولیمے میں شریک نہیں ہو سکی تھی۔

بہت دن گزر گئے۔ فون پر اس سے مختصر سی بات ہو جاتی۔ کیوں کہ میں اپنی پڑھائی میں بہت زیادہ مصروف ہو چکی تھی۔

تقریباً ایک مہینے کے بعد وہ اچانک ہاسٹل آ گئی۔

ہم سب اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے لیکن خود وہ بہت خاموش اور اداس اداس سی تھی۔ میں اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے کمرے میں لے آئی۔

''ہاں اب بتا کیسی گزر رہی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''گزرنا کیا ہے۔'' اس کے ہونٹوں پر ایک بے جان سی مسکراہٹ تھی۔ ''میں نے بتایا تھا نا کہ یہ شادی راس نہیں آئے گی۔''

''تو پھر ہوا کیا ہے؟''

''ہونا کیا ہے۔ طلاق ہو چکی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اور اس میں میرے شوہر کا کوئی قصور نہیں ہے۔''

''اوہ خدا'' میں نے اپنا سر تھام لیا۔ ''آخر کیوں اس نے کیوں طلاق دے دی۔ کیوں کیا اس نے ایسا۔''

''اس لیے کہ دنیا کا کوئی بھی مرد اس رویے کو برداشت نہیں کر سکتا۔ جو میرا ہے۔''

''خدا کے لیے فروزاں کھل کر بتاؤ کیسا رویہ؟''

''کاش میرے والدین اتنے سمجھ دار ہوتے۔ ان میں اتنی عقل ہوتی کہ وہ اس وقت مجھ پر دھیان دیتے جب مجھ میں ایسی علامات پائی گئی تھیں۔''

''کیسی علامات!''

''ثوبیہ! دنیا کا کوئی بھی شوہر یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی بیوی اس کے سامنے پتھر کی مورت بنی رہے۔ پتھر کے صنم سے سر تو ٹکرایا جا سکتا ہے اس سے محبت نہیں کی جا سکتی۔ میں کسی مرد کے کام کی نہیں ہوں۔''

''آخر کیوں، ایسی بھی کیا وجہ ہے۔''

''اس لیے کہ مجھ میں کوئی حس نہیں ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''یہ ایک جسمانی اور ذہنی خرابی ہے۔ میڈیکل کی سائنس میں اسے Impalpabla کہتے ہیں۔ یعنی کسی قسم کی کوئی حس نہیں۔ کوئی تحریک نہیں۔ یہ خرابی ٹشوز کی ہوتی ہے۔ خود سوچو جو عورت بالکل برف ہو اس سے کون مرد خوش رہ سکتا ہے یا اس سے نباہ کر سکتا ہے۔''

''تم نے یہ عجیب بات بتا دی۔''

''ہاں یار۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''میں اس مرض میں مبتلا ہوں۔ اس کا علاج برسوں ہوتا ہے۔ اس لیے میں شادی سے انکار کرتی آئی تھی۔''

وہ آہستہ آہستہ رونے لگی۔

اور میں یہ سوچ رہی تھی کہ ہمارے ملک میں بے شمار شادیاں کیا اس عارضے کی وجہ سے ناکام تو نہیں ہو جاتیں۔

کاش شادی سے پہلے والدین بیٹیوں کو جسمانی اور نفسیاتی طور پر چیک کروا لیں تو کتنا اچھا ہو۔

جل پری

محترمہ عذرا رسول

سلام تہنیت!

ایک سچا لیکن لاینحل و پُراسرار واقعہ آپ کے سامنے لارہی ہوں۔ یہ واقعہ خود میرے ساتھ نہ ہوتا تو شاید میں اسے دماغ کی سنک سمجھتی، یہ سو فیصد سچا واقعہ ہے۔

فائزہ

(کراچی)
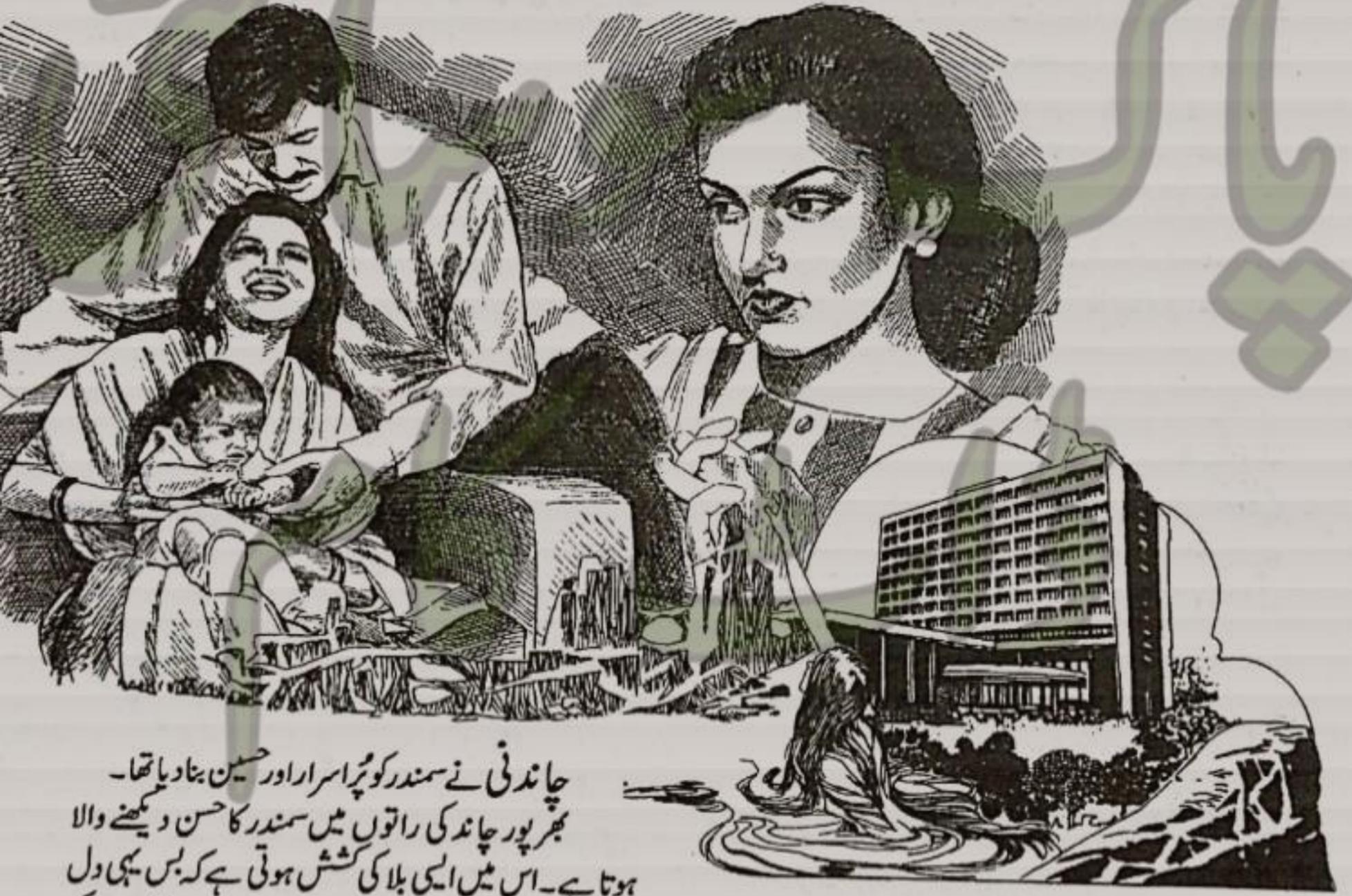
چاندنی نے سمندر کو پُراسرار اور حسین بنادیا تھا۔ بھرپور چاند کی راتوں میں سمندر کا حسن دیکھنے والا ہوتا ہے۔ اس میں ایسی بلا کی کشش ہوتی ہے کہ بس یہی دل چاہتا ہے کہ یا تو سمندر کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لو یا پھر اس کی آغوش میں چلے جاؤ۔

میں اکثر اپنے ٹیرس میں آکر بیٹھ جاتی، یہاں سے سمندر تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔

شادی کے بعد میں اور نوید یہیں آکر رہنے لگے تھے۔

سی ویو پر سامنے کی طرف کا ایک بڑا سا فلیٹ فروخت ہو رہا تھا۔ نوید نے وہی فلیٹ خرید لیا تھا۔

شروع شروع میں تو یہاں خوف سا محسوس ہوا کرتا۔ پھر آہستہ آہستہ عادی ہوتی چلی گئی۔ نوید کا اپنا بزنس تھا۔ وہ دفتر سے رات نو دس بجے تک آیا کرتے۔

اس دوران ملازمہ میرے ساتھ رہا کرتی۔ اس کے جانے کے بعد میں ہوا کرتی اور ٹیرس کے سامنے پھیلا ہوا مہیب سمندر۔

مجھے سمندر کے حوالے سے بہت سی کہانیاں یاد تھیں۔ ان کہانیوں میں پُراسرار جہاز بھٹکتے رہتے یا کوئی ویران جزیرہ کسی دیو کے قبضے میں ہوتا وغیرہ وغیرہ۔

شادی سے کچھ دنوں پہلے جب نوید نے مجھے بتایا کہ اس کا ارادہ سی ویو پر فلیٹ لینے کا ہے تو میں بھڑک اٹھی۔ ''واہ کیا بات ہے آپ کی۔ پورا شہر چھوڑ کر سمندر کی طرف فلیٹ لے رہے ہیں۔''

''تو کیا ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد تم وہاں کی ایسی عادی ہو جاؤ گی کہ شہر کی طرف آنے سے وحشت ہو گی۔''

''میں نے وہ علاقہ دن میں دیکھا ہے۔ وہاں تو دن میں بھی سناٹا رہتا ہے۔ رات میں تو اور بھی برا حال ہوتا ہو گا۔''

''وہاں کی رات بہت حسین ہوتی ہے۔ خاص طور پر چاندنی رات۔'' نوید نے کہا۔

''اور حفاظت کا کیا انتظام کیا ہے۔ آپ تو رات دیر سے آیا کریں گے۔''

''بہت زبردست انتظام ہے۔'' نوید نے کہا۔ ''سارے فلیٹس بہت بڑی باؤنڈری کے اندر بنے ہوئے ہیں۔ گیٹ پر مسلح گارڈز ہوتے ہیں۔ بغیر شناخت کے پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔''

نوید کی خواہش کے آگے میں خاموش ہو گئی۔

دن میں تو سی ویو لوگوں سے بھرا ہوا دکھائی دیتا۔ میلے کا سا سماں ہوتا تھا۔ ٹھیلے پر چیزیں فروخت ہو رہی ہیں۔ بچے غبارے اڑا رہے ہیں اونٹوں کی سواری کر رہے ہیں۔

کچھ عورتیں اور مرد سمندر کے پانی سے کھیلتے ہوئے آگے تک چلے گئے ہیں لیکن یہ ساری رونقیں شام تک ہوا کرتیں۔

مغرب کے بعد روشنیاں ہو جاتیں۔ نو دس بجے تک کچھ نہ کچھ لوگ نظر آ ہی جاتے۔ اس کے بعد گہری خاموشی اور سناٹا۔ صرف سمندر کی آوازیں جو نہ جانے کون سی کہانیاں سنا رہی ہوتیں۔

نوید اکثر رات دس کے بعد ہی آیا کرتے۔ اس دوران میں یا تو ٹی وی دیکھتی رہتی یا پھر ٹیرس میں آ کر بیٹھ جاتی۔

پھر جب نوید واپس آتے تو ہم دونوں کھانے سے فارغ ہو کر واک کرنے نکل جاتے۔ کبھی کبھی ہم ساحل تک بھی چلے جاتے۔

اس وقت سمندر اور بھی پُرکشش اور پُراسرار معلوم ہوتا۔ نوید نے ایک بات ٹھیک کہی تھی۔ ''فائزہ کچھ دنوں تک تم الجھی الجھی رہو گی۔ اس کے بعد اس علاقے سے تمہیں عشق ہو جائے گا اور تم شہر کی طرف جانا بھی پسند نہیں کرو گی۔''

کچھ دنوں کے بعد نوید کی یہ بات بالکل درست لگنے لگی تھی۔ میرا اب شہر کی طرف جانے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ اپنے والدین کے یہاں بھی آتی تو کچھ دیر کے لیے۔ عادت سی پڑ گئی تھی۔ یہاں کا سناٹا بھی اب بھلا لگنے لگا تھا۔

ایک رات ایک عجیب بات ہوئی۔ اس رات نو بجے کے قریب آفس سے نوید کا فون آیا۔ ''فائزہ! ملازمہ ہے یا چلی گئی؟'' نوید نے پوچھا۔

''وہ تو جا چکی۔ کیوں خیریت؟''

''ہو سکتا ہے کہ مجھے کچھ دیر ہو جائے۔'' نوید نے کہا۔ ''دفتر میں ایک ضروری میٹنگ چل رہی ہے باہر سے لوگ آئے ہوئے ہیں۔ صبح سویرے کی فلائٹ سے واپس چلے جائیں گے۔''

''کتنی دیر لگے گی۔''

''میرا خیال ہے کہ بارہ ایک بج جائے گا۔'' نوید نے بتایا۔

''کوئی بات نہیں۔ آپ اپنا کام دیکھیں۔'' میں نے کہا۔

''تم گھبراؤ گی تو نہیں؟''

''نہیں......نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں نے بتایا۔ ''اب مجھے یہاں ڈر ور نہیں لگتا۔''

''او کے دروازے بند رکھنا۔''

نوید سے باتیں کرنے کے بعد میں کچھ دیر ٹی وی دیکھتی رہی۔ پھر ٹیرس پر آ کر بیٹھ گئی۔ رات چاندنی کی وجہ

سے بہت خوب صورت ہو رہی تھی۔

سمندر سامنے پھیلا ہوا تھا جو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میلوں دور تک سفید چادر بچھا دی گئی ہو۔ ساحل بالکل ویران ہو چکا تھا۔ تفریح کے لیے آنے والے واپس جا چکے تھے۔

میں ٹیرس کی کرسی پر سمندر کی طرف آنکھیں لگائے بیٹھی تھی کہ اچانک ایک تیز قسم کی موسیقی سنائی دی۔ یہ بالکل مختلف موسیقی تھی جو سمندر کی طرف سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

کسی قسم کا ساز تھا۔ ایسا ساز جس کی آواز میں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ لہروں کی طرح آہستہ اور تیز ہوتی ہوئی جیسے کسی کو پکار رہی ہو۔ اس موسیقی میں کرب اور خوشی دونوں کا تاثر تھا۔

میں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ یہ آواز کہیں آس پاس کے کسی فلیٹ سے تو نہیں آ رہی لیکن ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ آس پاس کے فلیٹس میں سناٹا اور خاموشی تھی۔

اس موسیقی کی کشش میں کوئی شک نہ تھا۔ دل کھنچا جا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ اگر یہ کچھ دیر اور جاری رہی تو میں فلیٹ کی چھت سے کود کر سمندر میں جا گھسوں گی۔ کیوں کہ یہ دل نواز موسیقی سمندر ہی کی طرف سے آ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد سمندر میں کچھ دکھائی دیا۔

میں یہ بتا دوں کہ اس موسیقی کو سننے کے بعد بھی میں مبہوت ہو کر سمندر کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ اس لیے جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ نظر آ رہا تھا۔

سمندر کی سطح پر کوئی دوڑ رہا تھا، کوئی انسانی جسم۔ اتنے فاصلے سے اس کے خدوخال تو واضح نہیں تھے لیکن اس کے لمبے بال ہوا میں لہراتے ہوئے ضرور دکھائی دے رہے تھے۔

اس لڑکی یا جو بھی ہو۔ اس سے کچھ فاصلے پر کوئی اور بھی تھا۔ یہ انسانی خاکہ کسی مرد کا تھا جو اس لڑکی کا پیچھا کر رہا تھا اور وہ مرد بھی پانی کی سطح پر دوڑ رہا تھا۔

میں جیسے سحر زدہ سی ہو کر دیکھتی رہی۔ کچھ آگے جا کر اس لڑکی نے اچانک پانی میں غوطہ لگا دیا۔ اس کو دیکھتے ہی اس لڑکے نے بھی غوطہ لگایا اور دونوں میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

میں پھر بھی بیٹھی دیکھتی رہی۔ کسی نے کرسی سے باندھ کر رکھ دیا تھا۔ کچھ دیر بعد پانی کی سطح سے کچھ ہلچل ہوئی اور دونوں ہی ایک ساتھ دکھائی دینے لگے۔

دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور سطح پر دوڑتے پھر رہے تھے۔ جیسے اٹکھیلیاں کر رہے ہوں۔ پھر دونوں پانی میں غوطہ لگا گئے اور بہت دیر تک دکھائی نہیں دیے۔

اس دوران نوید کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔

وہ خواب جیسے اچانک ختم ہو گیا ہو میں نے جا کر دروازہ کھولا۔ اس وقت میرے چہرے کی رنگت شاید اڑی ہوئی تھی، اس لیے نوید نے سوال کیا۔ ”خیریت تو ہے تم پریشان کیوں ہو؟“

میں انہیں ایک دم سے بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے میں نے کہا۔ ”کوئی خاص بات نہیں۔ بس یوں ہی ایک ہارر موڈی دیکھ رہی تھی۔“

”مت دیکھا کرو ایسی موڈی۔“

ہم اندر آ گئے۔ نوید باہر ہی سے کھا کر آئے تھے۔ اس لیے ہم سونے کے لیے لیٹ گئے۔ پھر نہ جانے کیوں میں نے نوید کو کچھ نہیں بتایا۔ شاید اس طرح میں اپنے وہم یا جو بھی دیکھا تھا اس کو ایک بار اور آزمانا چاہتی تھی۔

دوسری رات کچھ بھی نہیں ہوا۔ نہ وہ عجیب موسیقی سنائی دی اور نہ ہی سطح پر کوئی دکھائی دیا۔ تیسری رات پھر وہی موسیقی۔

اس رات بھی نوید دیر سے آنے والے تھے۔ میں ٹیرس پہ تھی کہ میں نے وہ پُراسرار اور دل کش موسیقی سنی جو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ اس کے بعد پھر وہ دونوں سطح پر دکھائی دے گئے۔

اس بار دونوں الگ الگ نہیں بلکہ ساتھ ساتھ تھے۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سطح پر اٹھکیلیاں کرتے پھر رہے تھے۔ کبھی پانی میں غوطہ بھی لگا جاتے۔ اس کے بعد پھر دکھائی دینے لگتے۔

پتا نہیں شاید یہ میرا وہم تھا یا کچھ اور کہ ایک بار ایسا لگا جیسے انہوں نے اتنے فاصلے سے مجھے دیکھ لیا ہو اور میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا ہو۔

اب ان کے بارے میں میرے احساسات کچھ مختلف تھے۔ پہلی رات خوف سا محسوس ہوا تھا لیکن اب دل چسپی اور ہمدردی سی محسوس ہونے لگی تھی۔

میں نے اپنے طور پر یہ اندازہ تو لگا لیا تھا کہ یہ دونوں

شاید انسان نہیں ہیں تو پھر کون ہو سکتے تھے؟ کن سی مخلوق تھی۔

انسان تو اس طرح سمندر کی سطح پر اتنی آسانی کے ساتھ دوڑتا تو نہیں پھرتا۔ تو پھر کون تھے یہ۔ جب مجھ سے برداشت نہیں ہوا تو ایک دن میں نے نوید سے اس کا تذکرہ کر دیا۔

میری بات سن کر وہ زور سے ہنس پڑا۔ ''جانتی ہو اسے کیا کہتے ہیں؟''

''تم بتاؤ۔'' میں جل کر بولی۔

''ایوژن، واہمہ کی بہت مضبوط شکل۔'' اس نے کہا۔

''تم چونکہ چاندنی رات میں سمندر کو دیکھتی ہو اس لیے پانی میں چاندنی بہت مختلف روپ میں دکھائی دیتی ہے۔ جب کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ صرف ہماری نظر کا دھوکا ہوتا ہے۔''

''تو پھر ایک ہی جیسی لڑکی اور ایک ہی جیسا لڑکا کیوں دکھائی دیتے ہیں۔''

''اس لیے کہ تمہارا واہمہ اتنا مضبوط ہو چکا ہے کہ اس نے ان دونوں کو ایک خاص شکل میں ڈھال دیا ہے۔ تم بار بار کسی اور کو نہیں بلکہ اپنے واہمے کو دیکھتی رہتی ہو۔''

اب نوید سے اس موضوع پر بحث کرنی بے کار تھی۔ اس لیے میں خاموش ہو گئی۔ ''نوید نے شاید میری خفگی محسوس کر لی تھی۔ اس لیے اس نے ہنس کر کہا۔ ''ارے تم تو ناراض ہو گئیں۔ چلو ایسا کرتے ہیں آج رات میں کہیں نہیں جارہا۔ میں تمہارے ساتھ ہی ٹیرس میں بیٹھتا ہوں۔''

''کوئی ضروری تو نہیں ہے کہ وہ نظر آ ہی جائیں۔'' میں نے کہا۔

''ٹرائی کرنے میں کیا حرج ہے اور ویسے بھی آج بھی چاندنی رات ہے۔ رات میں سمندر بہت خوب صورت دکھائی دے گا۔ ہوسکتا ہے کہ تمہارے مہمان آ ہی جائیں۔''

ہم واقعی نو بجے کے بعد ٹیرس میں آ کر بیٹھ گئے۔ میں دل ہی دل میں دعا کرتی رہی کہ خدا کرے کہ میری بات سچ ثابت ہو جائے۔ وہ موسیقی پھر سنائی دے۔ وہ دونوں پھر نظر آ جائیں لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔

رات ایک بجے کے قریب نوید نے کہا۔ ''بھائی اب تک تو کچھ نہیں ہوا۔ اب جاؤ جا کر سو جاؤ۔ صبح تمہیں چیک اپ کے لیے بھی جانا ہے۔''

یہ وہ زمانہ ہے جب میں ماں بننے جارہی تھی اور مہینے میں دو بار چیک اپ کے لیے جانا پڑتا تھا۔

میں بد دل ہو کر کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔

دوسری صبح چیک اپ کے لیے گئی۔ سب کچھ نارمل تھا۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ دو مہینوں کے بعد میں ماں بن جاؤں گی اور میں نے بھی یہی حساب لگا رکھا تھا۔

ایک ہفتے کے بعد ایک عجیب بات ہوئی بالکل مختلف۔ اس بار کوئی موسیقی تو سنائی نہیں دی لیکن سمندر کی طرف سے کوئی آتا ہوا محسوس ہوا۔

جیسے باقاعدہ پانی پر چلتا ہوا ساحل کی طرف آرہا ہو۔ میں حیرت، خوف اور دلچسپی کے ساتھ اس کی طرف دیکھتی رہی۔

قریب آنے پر وہ واضح ہوتا گیا۔ یہ وہی تھی۔ وہی لڑکی حالانکہ میں نے اس کو پہلے اتنے قریب سے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی اس کے خدوخال میرے لیے آشنا تھا۔ اس کے باوجود احساس ہو گیا تھا کہ یہ وہی ہے۔

اور حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ بے لباس تھی۔ پہلے جب وہ دکھائی دیا کرتی تھی میں نے کبھی اس کے لباس وغیرہ پر غور نہیں کیا تھا۔ صرف اس کے لانبے بال لہراتے ہوئے دکھائی دیا کرتے۔ اس بار بھی اس کے بال لہرا رہے تھے اور وہ بے لباس تھی۔

وہ قریب آتی چلی گئی۔ میں دلچسپی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کسی قسم کا خوف نہیں تھا۔ صرف دلچسپی تھی اور تجسس تھا۔

وہ فلیٹس کی باؤنڈری کے پاس آ کر دیوار کے نزدیک بیٹھ گئی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ کیا تھا یہ سب کون تھی وہ؟

عجیب بات یہ تھی کہ مجھے حیرت یا خوف نہیں بلکہ تجسس تھا۔ میں یہ دیکھنا چاہ رہی تھی کہ وہ کون ہے اور غیر معمولی طور پر سمندر سے باہر کیوں آ گئی ہے۔

اچانک میں نے رونے کی آواز سنی۔ یہ آواز اس طرف سے آرہی تھی۔ جس طرف وہ آ کر بیٹھی تھی۔ وہ اس کی آواز تھی۔

وہ سسکیاں لے رہی تھی اور اس آواز میں بلا کی عنایت تھی۔ نغمگی تھی۔ میں بے چین ہو گئی۔ وہ چاہے جو بھی ہو کسی مصیبت میں تھی۔

نہ جانے کیوں میرا دل اس کی طرف کھنچا جارہا تھا۔ ایک خیال آ رہا تھا، کیا میں اس کے کسی کام آ سکتی ہوں۔ اب اس بے چاری کے جسم پر تو لباس بھی نہیں تھا۔

خدا جانے وہ کون سا جذبہ تھا کہ میں نے ایک بڑی سی چادر اٹھائی اور اپنے فلیٹ سے باہر آگئی۔ چونکہ ہمارا بلاک چہار دیواری کے گیٹ کے پاس ہی تھا۔ اس لیے میں گیٹ سے باہر آگئی۔ گیٹ کے محافظوں نے دیکھا تو تھا لیکن کسی نے کوئی سوال نہیں کیا۔

گیٹ سے باہر آکر میں نے اس طرف چلنا شروع کیا جہاں وہ لڑکی آکر بیٹھی تھی۔ وہ جگہ گیٹ سے کچھ فاصلے پر تھی۔ شاید اس لیے گیٹ کے محافظ اس کی آواز نہیں سن پائے تھے۔

جب کہ میرا ٹیرس اس دیوار کے سامنے تھا۔

میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ آگے بڑھتی چلی گئی۔

اس وقت میں بالکل خوف زدہ نہیں تھی۔ بلکہ کسی کی مدد کرنے کا جذبہ مجھے آگے آگے لیے جا رہا تھا۔ میں نے پھر اس کی سسکیاں سنیں۔

دیوار کے ساتھ جھاڑیاں تھیں وہ ان جھاڑیوں کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اس جگہ سے کچھ فاصلے پر ایک کھمبا تھا جس کے بلب کی بہت کم روشنی اس جگہ تک پہنچ رہی تھی۔ میں نے اس کے باوجود اس کو دیکھ لیا تھا۔

وہ گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوئی سسکیاں لے رہی تھی۔

میں جھجکتی ہوئی آہستہ آہستہ اس کے پاس پہنچ گئی۔ میری آہٹ سن کر اس نے اپنا چہرہ اٹھایا۔

او خدا! میں تو اس کو دیکھ کر مبہوت ہو گئی تھی۔ کیا حسین چہرہ تھا۔ وہ کھڑی ہو گئی۔ اس نے کچھ کہا لیکن اس کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ نہ جانے کون سی زبان تھی لیکن اتنا ضرور احساس تھا کہ اس کی آواز میں بے پناہ نغمگی تھی۔ ایسی دل کش آواز میں نے شاید ہی سنی ہو۔

میں نے چادر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اشارہ کیا کہ وہ اس سے اپنا جسم چھپا لے۔ اس کی بے پناہ خوب صورت آنکھیں حیرت سے میری طرف دیکھتی رہیں۔

میں نے دوبارہ اشارہ کیا۔ پھر خود اپنے جسم پر چادر لپیٹ کر اسے یہ بتایا کہ چادر کس طرح لپیٹتے ہیں۔ اس نے پھر میرے اشارے کو سمجھتے ہوئے اپنے بدن پر چادر لپیٹ لی۔

اب وہ میرے ساتھ چل سکتی تھی۔ میں نے اشارہ کیا کہ میرے ساتھ چلے۔ اس وقت میرے ذہن میں کچھ بھی نہیں تھا کہ میں اسے اپنے ساتھ کیوں لے جا رہی ہوں۔ یا وہ کہیں مجھے کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ میں بس یہ چاہتی تھی کہ کسی طرح اسے پناہ دوں۔

نہ جانے کس طرح میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ اسے پناہ کی ضرورت ہے اور میں اسے پناہ دے سکتی ہوں۔ میں نے اشارہ کیا کہ وہ میرے ساتھ چلے۔

اس نے میرے اشارے پر میرے ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ خدایا کیا چال تھی اس کی۔ جیسے بادلوں کے درمیان چل رہی ہو۔ میں نے اتنی دل کش چال بھی کبھی نہیں دیکھی ہو گی۔

میں اسے چہار دیواری کے گیٹ کے پاس لے آئی۔ خوش قسمتی سے محافظ اس وقت اپنی کوٹھڑی میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ اس لیے کسی نے ہم دونوں کو نہیں دیکھا اور میں اسے اپنے فلیٹ تک لے آنے میں کامیاب ہو گئی۔

وہ فلیٹ میں آکر اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے یہ سب کچھ اس کے لیے بالکل نیا اور حیرت انگیز ہو۔ اس نے پہلی بار کمرے، صوفے اور دیگر چیزیں دیکھی ہوں۔

اس نے کمرے میں آکر یا تو خود چادر اتار دی یا کسی طرح اتر گئی۔ بہر حال جو بھی ہوا میرے لیے ایک حیرت انگیز تجربہ تھا۔

کیا حسن تھا اس کا کہ میں کم از کم الفاظ میں نہیں بتا سکتی۔

ایک تو اس کے جسم کی رنگت ایسی تھی جیسے سونے کے پانی میں دودھ اور شہد کی آمیزش کر دی گئی ہو۔ میں نے اتنی خوب صورت جلد زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی۔

اس کے بال لانبے اور سیاہ تھے اور اس کی آنکھیں گہرے سمندر کی طرح نیلی تھیں۔ کتابی چہرہ، پتلے پتلے ہونٹ، مختصر یہ کہ اس کا حسن اتنا پاگل بنا دینے والا تھا کہ مجھے یہ خوف ہونے لگا کہ اگر نوید اس کو دیکھ لیتے تو شاید اس کے ہو کر رہ جاتے۔

وہ بالکل انسان ہی تھی۔ ایک مکمل اور لاجواب انسانی جسم اور خدوخال رکھنے والی۔

میں اسے اپنے ساتھ لے تو آئی تھی لیکن اب کیا کرتی کہاں رکھتی اس کو۔ میں اسے نوید کی نگاہوں سے چھپانا چاہتی تھی۔

میں نے اس کی گری ہوئی چادر اٹھا کر دوبارہ اس کے جسم پر ڈال دی اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا ہاتھ چھو کر ایک کرنٹ سا لگا تھا۔ کیسی حرارت اور زندگی تھی اس کے لمس

میں۔

فلیٹ میں ایک بڑا کمرا اسٹور روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ میں اس کا ہاتھ تھام کر اس کمرے کی طرف لے آئی۔

میں نے ایک طرف پڑی ہوئی ایک دری اٹھا کر فرش پر بچھا دی اور اشارہ کیا کہ وہ اس پر لیٹ جائے۔ اس نے میرا اشارہ نہیں سمجھا۔ پھر میں نے دری پر لیٹ کر بتایا کہ اس طرح لیٹا جاتا ہے۔

اس نے میرا اشارہ سمجھ لیا اور دری پر جا کر لیٹ گئی۔ اس کے لیٹ جانے کے بعد میں اس کمرے سے باہر آ گئی۔ میں نے باہر سے کمرے کا دروازہ بند کر دیا تھا۔

کچھ دیر بعد نوید بھی آ گئے۔ چونکہ گھر میں کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں تھی اس لیے انہوں نے بھی کچھ نہیں کہا۔ معمول کے مطابق ہم نے کھانا کھایا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کیں پھر کمرے میں چلے گئے۔

مجھے اس بات کی طرف سے تو اطمینان تھا کہ نوید اسے دیکھ نہیں سکیں گے کیوں کہ اسٹور روم کی طرف وہ جاتے ہی نہیں تھے۔ خدشہ صرف اس بات کا تھا کہ وہ لڑکی کہیں رونا نہ شروع کر دے۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا اور رات بے چینی کے ساتھ سہی لیکن گزر گئی۔ صبح نوید کے جانے کے بعد میں نے اسٹور روم کا دروازہ کھول دیا۔

وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی جس طرح میں نے اسے لیٹنے کا اشارہ کیا تھا۔ بالکل اسی پوزیشن میں۔ میں اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

دن کی روشنی اس کا بے مثال حسن واضح طور پر سامنے آیا تھا۔ وہ قدرت کی صناعی کا شاہکار تھی۔ میں اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اگر وہ سج دھج کر بازار کی طرف نکل جائے تو لوگ اس کو دیکھ کر پاگل ہو جاتے۔

وہ انسانی حسن میں نہیں تھی وہ آسمان سے اتری ہوئی پری کی طرح تھی۔

میں نے ایک جوڑا کرتہ شلوار نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا کہ وہ اسے پہن لے۔ اس نے پہلے تو کچھ نہیں سمجھا تھا۔ پھر بڑی مشکلوں سے مختلف اشارے کر کے اسے سمجھایا اور کپڑے پہننے میں اس کی مدد بھی کی۔ اوخدا کپڑے پہن کر تو وہ اور بھی نکھر آئی تھی۔

”کاش اگر میں مرد ہوتی تو تم سے شادی کر لیتی۔“

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ظاہر ہے اس نے میری بات نہیں سمجھی ہوگی لیکن وہ مسکرا دی۔ کیا خوب صورت دانت تھے باریک مسکراہٹ تھی جیسے بجلی سی چمک گئی ہو۔

میں اس کا ہاتھ تھام کر اسے کچن میں لے آئی۔ وہ میری دریافت تھی۔ میں نے تنہائی کا ایک ساتھی پا لیا تھا۔ وہ قدرت کا تحفہ تھی اور جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا قدرت کے اس شاہکار کو اوروں کی نگاہوں سے بچا کر رکھنا تھا۔

میں نے اس کے اور اپنے لیے ناشتا بنانا شروع کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ چولہے کی آگ دیکھ کر خوف زدہ ہو گئی تھی۔ اس کے تاثرات یہی بتا رہے تھے پھر وہ دور کھڑی ہو کر دیکھتی رہی۔ چولہے کے پاس نہیں آئی۔

میں نے ناشتا بنا کر کچن کی میز پر رکھ دیا۔ ”چلو ناشتا کر لو۔“ میں نے کہا۔ ”تم رات سے بھوکی ہو۔“

وہ میری طرف دیکھتی رہی، کاش ہم ایک دوسرے کی زبان سمجھ سکتے۔ میں نے سلائس کھا کر بتایا کہ کس طرح کھایا جاتا ہے۔ میرا اشارہ سمجھ کر اس نے بھی ایک سلائس اٹھا لیا۔ کھاتے وقت وہ بہت برا سا منہ بنا رہی تھی۔

اس نے کسی نہ کسی طرح سلائس تو کھا لیا تھا لیکن چائے نہیں پی سکی۔

میں چائے پینے کے دوران اس سے بات کرتی رہی۔ ”خدا جانے تم کون ہو۔ تمہارا تعلق خدا کی کس مخلوق سے ہے۔ انسان بھی ہو یا نہیں۔ سمندر میں رہتی ہو، تمہارا نام کیا ہے۔ تمہاری زبان کیا ہے۔ میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ لیکن تم میں بلا کی کشش ہے۔ میرا دل تمہاری طرف کھنچا چلا آتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اسی طرح میری دوست بن کر رہو۔ ایک بات بتا دوں۔ مجھے تم سے کوئی ڈر نہیں لگتا۔ بلکہ محبت سی محسوس ہوتی ہے۔ اس وقت بھی جب تم پانی میں اپنے ساتھی کے ساتھ نظر آئی تھیں اور اس وقت بھی۔“

اس نے کچھ کہا۔ میں تو اس کی آواز کی نغمگی میں کھو گئی تھی۔ جیسے گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ اس نے کیا کہا تھا وہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔

اس کی زبان بھی بالکل نامانوس تھی۔ شاید زمین پر بسنے والی کوئی قوم ایسی زبان نہیں بولتی ہوگی۔ کیا بھید تھا اس کا تعلق کس قوم سے تھا۔ وہ کون سی مخلوق تھی۔

دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ میں ایک زوردار پریس کانفرنس

کروں جس میں سارے اخبارات اور چینلز والے موجود ہوں اور ان کے سامنے بڑے فخر کے ساتھ اس کو پیش کردوں۔

مجھے یقین تھا کہ اس کے سامنے آتے ہی پوری دنیا میں تہلکہ مچ جائے گا۔ سائنس دان، اسکالر سب کے سب دوڑے چلے آئیں گے۔ اس کی دریافت بہت بڑی خبر بن کر پوری دنیا میں پھیل جائے گی۔ اس پر ریسرچ کی جائے گی۔

اس نے کچھ غوں غاں کی۔ نہ جانے وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی۔

پھر میں سمجھ گئی۔ وہ کچن میں موجود بڑے سے فش ایکوریم کی طرف اشارہ کررہی تھی۔ جس میں رنگ برنگی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔

وہ کرسی سے اٹھ کر ایکوریم کے پاس آگئی۔ وہ ان مچھلیوں کو دیکھ کر بہت خوش ہورہی تھی۔ پھر اس نے مجھ سے مخاطب ہوکر کچھ بولنا شروع کردیا۔

میں اتنا ضرور سمجھ گئی تھی کہ وہ یہ بتا رہی تھی کہ وہ بھی ان مچھلیوں کے ساتھ سمندر کے نیچے رہتی ہے۔ یہ مچھلیاں اس کی دوست ہیں۔ اس کے ساتھ ہی رہتی ہیں۔

یا خدا! کاش میں کسی طرح یہ جان سکتی کہ وہ کون ہے۔ کیا نام ہے اس کا۔ اگر وہ کوئی سمندری مخلوق ہے تو ایسی خوب صورت مخلوق اب تک انسانوں کی نگاہوں سے اوجھل کیوں رہی۔

حیران کرنے والی ایک بات یہ بھی تھی کہ اس کی ایک ناک تھی۔ انسانوں کی طرح۔ جب کہ سمندروں میں رہنے والی مخلوق کے سانس لینے کا سسٹم مختلف ہوا کرتا ہے۔ اس کا مکمل جسم بالکل انسانوں کی طرح تھا۔

میں اسے اپنے کمرے میں لے آئی۔

ڈاکٹرز کے مشورے کے مطابق میں نے اپنے کمرے میں خوب صورت بچوں کی بڑی بڑی تصویریں لگا رکھی تھیں۔

یہ ایک نفسیاتی اور ذہنی ری ایکشن ہوا کرتا ہے۔ آنے والا بے بی بھی ویسا ہی ہوتا ہے۔ جیسی تصویر اس کی ماں کے دھیان میں ہو۔

وہ ان بچوں کی تصویروں کو بہت دلچسپی سے دیکھنے لگی۔ پھر اس نے اس طرح میری طرف دیکھا جیسے معلوم کرنا چاہتی ہو کہ یہ کون ہیں۔

میں نے مسکرا کر کہنا شروع کیا۔ ”خدا جانے تمہارے یہاں کیا سسٹم ہو۔ لیکن جہاں تک میرا سوال ہے تو میں ماں بننے جارہی ہوں۔ ماں اور بچہ سمجھتی ہو؟“ میں نے اس کو سمجھانے کے لیے اپنی قمیض کا دامن اوپر اٹھا دیا۔

وہ آگے بڑھی۔ وہ میرے پیٹ پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ ایک بار، دو بار، تین بار پھر کچھ کہنے لگی۔ میں اس کو یہ سب کرتے ہوئے دیکھتی رہی۔

پھر اس نے میرے پیٹ سے اپنا ایک کان لگا دیا۔ پھر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اس کے بعد ایک طرف ہٹ گئی۔ اس کا یہ سارا عمل پُراسرار تھا۔

پھر ہم اس کمرے سے باہر آگئے۔ ملازمہ کے آنے کا وقت ہورہا تھا۔ میں اسے دوبارہ اسٹور روم میں لے آئی۔ اب وہ جان چکی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔

وہ فرش پر بچھی ہوئی دری پر لیٹ گئی۔ میں نے باہر آکر اسٹور روم کا دروازہ بند کردیا۔

ملازمہ نے آکر اپنا کام شروع کردیا اور میں اس کے بارے میں سوچتی رہی۔

خدا جانے اس کے جسم کا اندرونی سسٹم کیا تھا؟ کیا خوراک لیتی ہوگی؟ دوسری انسانی ضروریات بھی ہوتی ہیں۔ خدا جانے اس کے ساتھ ایسے مرحلے تھے یا نہیں۔

بے شمار سوالات لیکن جواب کچھ بھی نہیں۔ کون جواب دیتا۔

ملازمہ کام کرنے کے بعد واپس چلی گئی۔ میں اس کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ وہ اکیلی کیوں تھی، اس کا ساتھی کہاں چلا گیا تھا۔

وہ سمندر سے باہر کیوں آگئی تھی۔ کیا وہ اپنے قبیلے سے بچھڑ گئی تھی یا اسے نکال دیا گیا تھا؟ کیا ہوا تھا اس کے ساتھ؟ اور وہ موسیقی کیسی تھی جو ان کے آنے پر سنائی دیتی تھی۔

او خدا یہ سب سوچ سوچ کر میں تو پاگل ہونے لگی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ سب سے بڑا خوف اس بات کا تھا کہ اگر نوید نے اس کو دیکھ لیا تو پھر کیا ہوگا۔

جب اس کا حسن کسی عورت کو پاگل کرسکتا تھا تو نوید تو مرد تھے۔

ملازمہ کے جانے کے بعد میں پھر اسٹور روم میں آگئی۔ وہ اسی طرح لیٹی ہوئی تھی جس طرح میں چھوڑ گئی تھی۔ مغرب ہوچکی تھی۔ میں نے اسے اشارہ کیا کہ وہ باہر آجائے۔

میں اسے ٹیرس سے یہاں لے آئی۔ یہاں میں نے اس کے لیے کھانے پینے کی کچھ چیزیں لا کر رکھ دی تھیں۔

میں نے اشارہ کیا کہ وہ کچھ کھالے۔
لیکن اس نے سوائے پانی کے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔
اس دوران اندھیرا ہو چکا تھا۔ وہ سمندر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہی سمندر جو شاید اس کا وطن تھا۔ وہ اچانک ہی بے قرار ہوگئی تھی۔ کرسی سے کھڑی ہوگئی۔
اس نے سمندر کی طرف اشارہ شروع کردیا جیسے سمندر کی طرف جانا چاہتی ہو۔ اس وقت ساحل پر کم ہی لوگ تھے۔ عام طور پر چھٹیوں کے دنوں میں ساحل بھرا رہتا ہے۔
میں نے اشارہ کیا کہ وہ چادر لپیٹ لے۔ اپنے آپ کو چھپالے۔ پھر سمندر کی طرف چلتے ہیں۔ میں نے اسے چادر لاکر دی۔ بلکہ خود ہی اسے چادر میں لپیٹ بھی دیا تھا۔
''آؤ میرے ساتھ آجاؤ۔'' میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
ہم فلیٹس کی باؤنڈری سے باہر آگئے۔ کسی نے ہماری طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہم اس جگہ آگئے جہاں روشنی تھی اور یہاں ساحل پر بنے ہوئے چائے کے Huts بھی نہیں تھے۔
ہم دونوں ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئے۔
وہ سمندر کی طرف دیکھ کر نہ جانے کیا کیا بولتی رہی۔ پتا نہیں وہ مجھے کیا سمجھانا چاہتی تھی۔ پھر اچانک کچھ ہوا۔
وہی موسیقی، وہی اپنی طرف کھینچ لینے والی موسیقی۔
ایسا لگا جیسے سمندر کے سینے سے نکل کر فضاؤں میں پھیلتی جارہی ہو۔ کسی اور نے محسوس کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن میں سن رہی تھی اور وہ سن رہی تھی۔
اس کا اضطراب یہ بتا رہا تھا کہ وہ موسیقی اسے بے چین کررہی ہے۔ وہ اچانک کھڑی ہوئی۔ اس نے مجھے بھی ہاتھ تھام کر کھڑا کردیا اور مجھے بھینچ لیا۔ وہ میرے ماتھے اور میری پیشانی کو چوم رہی تھی بار بار۔ ایک جنون کی کیفیت میں۔
پھر اس نے ایک جھٹکے سے اپنی چادر اتار کر ایک طرف پھینک دی۔ اپنا لباس اتار دیا اور دوڑتی ہوئی سمندر کی طرف چلی گئی۔ موسیقی بھی بہت تیز ہوگئی تھی۔ اس کے بال ہوا میں لہرا رہے تھے اس نے بہت دور جاکر میری طرف دیکھا۔ اپنا ہاتھ لہرایا اور غوطہ لگا گئی۔ شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

وہ سمندر کا تحفہ تھی اور سمندر نے اسے واپس بلالیا تھا۔
میں بہت بوجھل دل سے اپنے فلیٹ میں واپس آگئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میرا اس کا برسوں کا ساتھ رہا ہو۔
اس کے اس طرح جانے کے بعد ایک خلا سا محسوس ہونے لگا تھا۔
پھر دن گزر گئے۔
اس کے بعد نہ وہ دکھائی دی اور نہ ہی وہ موسیقی سنائی دی اور ایک دن میرے یہاں میری بچی پیدا ہوئی۔
او خدا! میں تو اپنی بچی کو دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ ویسا ہی بے مثال حسن، جیسا اس کا تھا۔ ویسی ہی رنگت، ویسی ہی خوب صورت نیلی آنکھیں۔ پورے اسپتال میں دھوم مچ گئی تھی۔ نوید تو ایسا خوب صورت تحفہ پا کر خوشی سے نہال ہو رہے تھے۔
ہم بچی کو لے کر فلیٹ واپس آگئے۔ میں سوچتی تھی کہ اس لڑکی کا حسن میری بچی میں کیسے آگیا۔ شاید اس نے جو میرے پیٹ پر ہاتھ پھیرا تھا یا کچھ بولتی رہی تھی یا پتا نہیں کیا کیا تھا۔
میں چاہتی تھی کہ سب کو بتادوں کہ میری بچی کے بے مثال حسن کے پیچھے کیا کہانی ہے لیکن کس کو یقین آتا؟
بہر حال اب میری بچی بارہ تیرہ برس کی ہوچکی ہے۔ اس کا حسن دیکھنے والوں کو حیران کرکے رکھ دیتا ہے اور ہاں ہم نے سی ویو کا وہ فلیٹ چھوڑ دیا ہے۔
اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب فائزہ (میری بچی) پانچ سال کی تھی تو ایک رات اس نے مجھ سے ایک عجیب بات کی۔
''مما آپ سن رہی ہیں نا؟''
''کیا بیٹا!''
''میوزک۔ سمندر کی طرف سے آرہی ہے۔ یہ کیسی میوزک ہے مما۔''
''نہیں بیٹے مجھے تو کچھ سنائی نہیں دے رہا۔''
''لیکن میں تو سن رہی ہوں مما۔ وہ چاہتا ہے کہ میں سمندر میں جاکر دیکھوں۔''
''میرے خدا!'' میں کانپ کر رہ گئی۔
اور دوسرے ہی دن سے میں نے نوید سے ضد کرنی شروع کردی کہ وہ سی ویو کا فلیٹ چھوڑ دیں۔ ہم نے شہر میں ایک فلیٹ لے لیا اور وہاں شفٹ ہوگئے۔
میں اب اتنے دنوں کے بعد یہ کہانی لکھ رہی ہوں۔ مجھے اس کی پروا نہیں ہے کہ کسی کو یقین آئے یا نہ آئے۔ لیکن اتنا ضرور بتادوں کہ خدا کی بے شمار مخلوق ہیں ان میں سے بہت سوں کا تعلق سمندر سے ہے۔ (اس سلسلے میں مشہور کتاب ...Aftardeth دیکھی جاسکتی ہے)

بے ثمر مسافت

زویا اعجاز

جناب ایڈیٹر
السلام علیکم
اپنی ایک واقف کار کی حالات زندگی بشکل کہانی ارسال خدمت ہے۔ اُمید ہے دیگر کہانیوں، افسانوں کی طرح یہ بھی آپ کو پسند آئے گی۔

زویا اعجاز
(لاہور)

لیکچر اسٹارٹ ہوئے آدھا گھنٹا ہونے کو تھا مگر میرے برابر کی سیٹ ابھی بھی خالی تھی۔ دس منٹ بعد حاضری شیٹ کا عمل شروع ہونے والا تھا جس میں لگنے والا کوئی بھی سرخ مارک ہم سب کو اچھا خاصا مہنگا ثابت ہوتا تھا۔ انہی سوچوں میں غلطاں میرا دھیان ایک بار پھر گھڑی کی سوئیوں کی طرف ہو گیا تھا۔ چند سیکنڈز گزرے تو کلاس روم کے دروازے سے آواز ابھری ”مے آئی کم ان سر“۔ ٹیچر نے رک کر ذرا خفگی سے نووارد کو دیکھا اور اپنے مخصوص انداز میں گویا

ہوئے۔''آج آپ پھر لیٹ ہوگئیں۔آپ کو وقت کی پابندی کبھی کسی نے سکھائی ہی نہیں یا یہاں آپ محض وقت گزاری کے لیے آتی ہیں؟''

کلاس روم میں لڑکیوں کی طنزیہ ہنسی کے ترنم سے اس کے چہرے پر چھائی برداشت کی سرخی اور آنکھوں میں نمی صاف محسوس ہو رہی تھی۔خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔''سوری سر! آئندہ احتیاط کروں گی''اور خاموشی سے میرے برابر والی خالی جگہ پر بیٹھ گئی۔

میں نے دھیمے لہجے میں اس سے پوچھا'' کیا ہوا آج؟''

وہ سر جھکا کر بولی۔''اس ٹائم اردو بازار اور داتا گنج بخش مزار کے پاس اتنی ٹریفک ہوتی ہے کہ بہت وقت ہوتی ہے آنے میں۔''

میں نے اسے پُرسکون ہونے کے لیے ہاتھ پر تھپکی دی اور لیکچر کی طرف متوجہ ہوگئی۔

یہ بی ایڈ ٹیچرز ٹریننگ کی پندرہ روزہ ورکشاپ کا آٹھواں دن تھا۔دوپہر دو بجے سے شام ساڑھے پانچ بجے تک کلاس میں بلاناغہ حاضری ہم سب کے لیے لازم تھی۔آدھے گھنٹے بعد بریک کا اعلان کر دیا گیا اور تھکاوٹ سے چور مستقبل کی ٹیچرز کینٹین کا رخ کرنے لگیں۔میں نے اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور ساتھ جانے کے لیے استفسار کیا تو وہ نرمی سے مسکرا کر بولی۔''آج کی ڈانٹ نے پیٹ اتنا بھر دیا ہے کہ اور کچھ کھا لیا تو ایسیڈیٹی ہی نہ ہو جائے۔''

میں اس کے تمام بہانوں سے واقف تھی۔ساڑھے تین گھنٹے کی اس ٹریننگ کلاس میں وہ محض دو بار جی بھر کر پانی پی کر اکتفا کرتی تھی۔

☆......☆

میری اس سے پہلی ملاقات اس ورکشاپ سے بھی پہلے فرسٹ سمسٹر کے ایگزامز کے دوران ہوئی تھی۔اس دن پہلا پیپر تھا اور سبھی لڑکیاں پہلے دن کی وجہ سے جلدی آئی تھیں مگر اس دن بھی وہ ہال میں داخل ہونے والی سب سے آخری لڑکی تھی۔ہمارا رول نمبر سوئے اتفاق آگے پیچھے ہی تھا۔میں کافی دیر سے اسی سوچ میں تھی کہ جانے کون بے پروا ہے جو ابھی تک آئی ہی نہیں۔اگر کوئی اوسط سے کم ذہانت کی ہوئی تو تین گھنٹے مجھے زچ کر کے رکھے گی لیکن سیاہ عبایا اور سیاہ اسکارف سلیقے سے لیے وہ کافی تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔خاموشی اور اداسی اس کے وجود سے منعکس تھی لیکن ایک بے نام سی کشش تھی جو اس کے وجود سے نظریں ہٹنے نہیں دیتی تھیں۔لوگوں کے چہرے اور آنکھیں پڑھنے کا میرا ازلی شوق ہے۔سو میں اس سے نظریں ہٹا ہی نہ سکی۔کافی اسرار نظر آئے تھے مجھے اس میں۔وہ اپریل کا آخری عشرہ تھا۔اور لاہور اس وقت اچھی خاصی تپش اختیار کر لیتا ہے۔ہال میں اِدھر اُدھر بکھری سب لڑکیاں ایک سے بڑھ کر ایک دیدہ زیب جوڑوں میں ملبوس تھیں۔مگر اس نے گرمی کے باوجود عبایا پہن رکھا تھا۔چند ہی منٹوں بعد ممتحن نے پرچوں کی تقسیم شروع کر دی۔جب اس کی سیٹ پہ پہنچی تو تیوریاں چڑھا کر بولی۔''بی بی! کمرۂ امتحان میں عبایا اور اسکارف کی اجازت نہیں ہے۔اتار کے رکھو اس کو باہر۔''

وہ بولی''کیوں؟ میں نے کوئی خودکش جیکٹ پہن رکھی ہے اس کے نیچے جو آپ کو راہی عدم کر دے گی۔''

ممتحن اپنی سلطنت میں یہ گستاخی کیسے برداشت کر سکتی تھی؟ اس نے شالیمار ایکسپریس کی طرح نان سٹاپ صلواتیں سنانی شروع کر دیں اور آخر اس کو یہ حکم ماننے ہی بنی۔اس وقت پورے ہال کی توجہ کا مرکز بن چکی تھی وہ۔لیکن مجال ہے اس کے چہرے سے کسی بھی تاثر کا اظہار ہو۔کاٹن کے قدرے پرانے لیکن صاف ستھرے جوڑے میں وہ باقی سب سے الگ معلوم ہو رہی تھی۔ایک سحر تھا اس کی شخصیت میں جو اسے انفرادیت عطا کرتا تھا۔پیپر شروع ہوا تو سب ہی دھڑا دھڑ کاغذ کا شکم بھرنے میں مصروف ہو گئے۔گاہے بگاہے میری نظر اس کی طرف پڑ جاتی تھی۔لیکن وہ انتہائی روانی سے لکھنے میں مگن نظر آتی۔پیپر ختم ہونے کے بعد میں اس کے پیچھے ہی باہر نکلی۔وہ کاریڈور میں اپنا عبایا اور اسکارف پہن رہی تھی۔میں نے اس سے اس کا نام دریافت کیا تو وہ کہنے لگی۔''حاضری شیٹ چار سے پانچ دفعہ آپ کے پاس آئی تھی۔کیا نام نہیں دیکھا تھا آپ نے میرا؟''

میں ذرا خجل ہوئی اور بولی۔''جی نازیہ! دیکھ لیا تھا''۔

وہ ہلکے سے تبسم سے گویا ہوئی۔''اٹس او کے! میرا مقصد آپ کو شرمندہ کرنا نہیں تھا۔''

مین گیٹ تک پہنچتے ہی مجھے میرا بھائی نظر آ گیا اور میں واپسی کے سفر کے لیے روانہ ہو گئی۔مگر وہ مجھے اکیلی ہی جاتی

نظر آئی۔ اگلے تمام پرچے بھی رسمی سلام دعا کے ساتھ گذرتے گئے اور امتحانات کی روایت کے عین مطابق ہم نے دورانِ امتحان باہمی تعاون کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ آخری پیپر سے فارغ ہوتے ہی میری خواہش تھی کہ میں اس سے کوئی رابطہ نمبر لے لوں مگر اس دن وہ بے حد عجلت میں تھی۔ میں اس سے بات کا آغاز کرنے لگی تو اسی اثنا میں اس کی نظر گیٹ پر کھڑے ایک شخص کی طرف پڑی۔ وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر کہنے لگی ''میرا بیٹا کچھ بیمار ہے۔ میری ساس کی طرف چھوڑا تھا اس کو۔ میں چلتی ہوں اب۔ میرے شوہر انتظار کر رہے ہیں میرا۔ اللہ حافظ۔''

اس کے شوہر کی جھلک نے مجھے حیران کیا تھا پینتیس سے متجاوز، متورم آنکھوں اور قدرے رف حلیے میں وہ شخص نازیہ کے بالکل برعکس تھا۔ نازیہ اپنے شوہر کے ساتھ چلی گئی لیکن میرے ذہن میں کافی سوال چھوڑ گئی۔ اس وقت تک ذہن میں یہی ملال تھا کہ جانے اس سے ملاقات ہوگی یا نہیں؟

☆......☆

فرسٹ سمسٹر کے رزلٹ کے بعد پندرہ روزہ ورکشاپ کا آغاز ہو گیا اور مجھے نازیہ کو اپنی ہی کلاس میں دیکھ کر بہت خوشگوار حیرت ہوئی۔ وہ تین ماہ کے اس عرصہ میں قدرے کمزور معلوم ہو رہی تھی۔ اور اس کی خاموشی مزید گہری ہو گئی تھی۔ تیسرے روز سابقہ شناسائی کی بدولت وہ قدرے تذبذب سے میرے ساتھ بیٹھنے پر آمادہ ہوگئی۔ ورنہ دو دن تو وہ سب سے پچھلے ڈیسک پر بالکل الگ تھلگ نظر آئی تھی۔ وہ ہمیشہ مقررہ وقت سے بیس یا پچیس منٹ لیٹ ہی ہوتی تھی۔ اس دن کی ڈانٹ نے اس کو بہت اپ سیٹ کیا ہوا تھا۔ میں نے اس سے استفسار کیا۔ ''نازیہ! خیریت تو ہے اتنی دیر کیوں ہو جاتی ہے آپ کو؟''

وہ اپنے خیالات سے چونک کر بولی ''بس! میرا گھر یہاں سے بہت دور ہے۔ ایک گھنٹا تو آرام سے لگ جاتا ہے یہاں راوی روڈ آتے ہوئے۔''

میں نے کہا۔ ''تو جلدی نکل آیا کریں آپ گھر سے۔''

اس نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کوئی بزرگ بچے کی نادانی پر اسے دیکھتا ہے۔ پھر بولی ''میں ایک پرائیویٹ اسکول میں جاب کرتی ہوں۔ وہاں چھٹی ایک بجے ہوتی ہے یہاں دو بجے کیسے پہنچوں؟''

میں نے ذرا الجھ کر پوچھا ''آپ کے شوہر کیا کرتے ہیں؟ اور آپ کا بیٹا کس کے پاس ہوتا ہے؟''

اس کی سحر طراز آنکھوں سے نمی جھلکنے لگی اور بولی ''میرا بیٹا اب اس دنیا میں نہیں رہا وہ اسی روز شام کو انتقال کر گیا تھا۔''

مجھے شاک سا لگا۔ میں مزید سوال پوچھنا چاہتی تھی مگر اس نے یکدم بات پلٹ دی ''کل ہماری پریزنٹیشن ہے ناں؟ تیاری ہو گئی آپ کی؟''

میں نے بھی زیادہ کریدنا مناسب نہ سمجھا اور کہا ''بس گزارا ہی ہے۔''

پریزنٹیشن دینا اس ورکشاپ کا لازمی حصہ تھا۔ ہر روز چھ لڑکیوں کا گروپ باری باری اپنے تیار کردہ اسباق کی تمام کلاس اور ٹیچرز کے سامنے پیشکش کرتا تھا۔ یہ کام کٹھن تو نہ تھا لیکن کچھ سینیئر کلاس ممبرز کی ہوٹنگ اور ٹیچرز کی برے کی طرح چھیدتی نگاہوں نے اسے سب کے لیے جوئے شیر بنا رکھا تھا۔ کئی لڑکیوں کی عدم اعتماد اور ٹیکنیکل خامیوں کی بدولت اچھی خاصی عزت افزائی ہو چکی تھی۔ اگلے دن کی کلاس میں نازیہ پر بھی کی اچھی خاصی توجہ مرکوز تھی اس کو اتنی دفعہ وارننگ ملنے کی وجہ سے اس کا تاثر ایک غیر ذمہ دار اور لا ابالی ٹیچر کا تھا سب پر۔ لیکن جب اس نے پریزنٹیشن دینی شروع کی تو اس کے پُراعتماد انداز، خوبصورت لب و لہجے اور اپنے سبجیکٹ پر مکمل گرفت کی وجہ سے ساری کلاس کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔ اِکا دُکا مقامات پر کچھ عمر رسیدہ ممبرز نے اسے اپنے سوالات سے پریشان کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے کمال مہارت سے انہیں بغلیں جھانکنے پر مجبور کر دیا۔ یہ اس دن کی بہترین پریزنٹیشن تھی۔ تالیوں کی گونج میں جب وہ واپس اپنی سیٹ پر آکر بیٹھی تو اس کی آنکھیں خوشی سے دمک رہی تھیں۔ میں نے بھی دل کھول کر اسے سراہا۔ کچھ دیر بعد بریک میں اس کا خوشی سے دمکتا چہرہ ماند پڑ گیا۔ بیگ کے اندر ایک خانے کو ٹٹولتی وہ کافی روہانسی لگ رہی تھی۔ میرے بہت اصرار پر اس نے بتایا '' آج اسکول سے تنخواہ ملی تھی آج ہاف ڈے تھا تو اسکول سے گھر چلی گئی تھی میں اور......'' وہ بات کرتے کرتے یکدم رک گئی۔ اور موبائل سے کال ملائی رابطہ ہوتے ہی تیزی سے بولی۔ ''عمیر! میرے بیگ سے پیسے......''

میں چونکہ نزدیک ہی بیٹھی تھی اس لیے موبائل اسپیکر سے آنے والی آواز مدھم سے انداز میں بخوبی سمجھ آرہی تھی۔

"ہاں! میں نے لیے تھے کیوں شور مچا رہی ہو؟ گھر آ کر نہیں کر سکتی تھی بات؟"

وہ نڈھال سے لہجے میں بولی "عمیر! بتا تو دیتے واپسی کا کرایہ اسی میں سے نکالنا تھا میں نے۔"

جواب ملا۔ "یاد نہیں رہا مجھے" اور فون بند ہو گیا۔

وہ خالی خالی نظروں سے موبائل کو دیکھتی رہی اور یکدم سر جھکا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیسے دلاسہ دوں۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو ایکدم چونک گئی اور آنسو پونچھ کر بولی۔ "سوری" یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئی۔ منہ دھو کر خود کو پہلے کی طرح سنبھالے بریک ختم ہونے کے بعد اندر آئی۔ میں نے پوچھا۔ "آر یو اوکے ناؤ" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے کہا "اب گھر کیسے جاؤ گی؟"

وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ "ٹانگوں سے۔ اور کیسے؟"

میں ہکا بکا رہ گئی "خدا کا خوف کرو نازیہ۔ ایک گھنٹے کی ٹرانسپورٹ کی مسافت تم پیدل طے کرو گی۔"

وہ تلخی سے بولی "ہاں! کر لوں گی۔ مر نہیں جاؤں گی۔"

میں نے اس وقت اسے مزید کچھ کہنا مناسب خیال نہ کیا اور اپنے بھائی کو میسج کر دیا کہ واپسی پہ بائیک کی بجائے گاڑی لے آنا۔ آف ہوتے ہی وہ غصے سے اپنی چیزیں بیگ میں پٹخنے لگی اور دروازے کی طرف روانہ ہوئی تو میں نے اسے بازو سے پکڑا اور کاریڈور میں کونے میں لے گئی۔ اس کی متورم آنکھوں میں دیکھ کر کہا "نازیہ! میں جانتی ہوں تم بہت مضبوط اعصاب کی حامل ہو۔ میں نہیں جانتی کہ تمہیں کن حالات اور مسائل کا سامنا ہے۔ مجھے غلط مت سمجھنا مجھے تمہاری ذاتی زندگی میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ مگر آئی ایم سوری! میں تمہیں اکیلی اس طرح جانے نہیں دوں گی۔ تم پلیز اپنے شوہر سے ایک بار بات کرو اگر وہ تمہیں لینے آ سکیں۔"

وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی "نہیں آئیں گے وہ زویا۔ بائیک بیچ دی ہوئی ہے انہوں نے۔ اب پلیز کوئی سوال نہ کرنا مجھ سے۔" میں نے ذرا توقف سے کہا "اوکے! نہیں کرتی۔ مگر تمہیں میں ڈراپ کر دوں گی۔"

اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے تو میں نے فوراً کہا "فکر نہ کرو۔ بائیک نہیں گاڑی پر جائیں گے۔"

کافی حیل و حجت کے بعد اس نے یہ کہہ کر ہتھیار ڈال دیے "زویا! میں اتنی مہربانیوں کے قابل بالکل نہیں ہوں۔ اور نہ اتنی قابل رحم ہوں جتنا تم سمجھ رہی ہو۔"

مجھے کافی اچنبھا ہوا اس کی یہ بات سن کر۔ میں نے کہا "اس بارے میں پھر فیصلہ کر لیں گے۔ ابھی تو چلو۔"

رستے میں ہم نے زیادہ بات نہیں کی۔ اس کے گھر تک پہنچ کر اس کا موبائل نمبر لیا۔ اس نے اندر چلنے کے لیے بہت اصرار کیا مگر میں نے سہولت سے ٹال دیا۔

اگلے دن مجھے اس کا انتظار ہی رہا۔ لیکن وہ نہیں آئی۔ میں نے بریک کے دوران کئی مرتبہ کال کی اسے مگر جواب ندارد۔ کچھ دیر بعد اس کا میسج موصول ہوا کہ "طبیعت بہت خراب ہے آج نہیں آؤں گی میں"۔

اس سے اگلے دن ہفتہ وار تعطیل تھی۔ اس سے ملاقات سوموار کو ممکن ہوئی۔ حسب معمول وہ ڈھائی بجے کے بعد کلاس میں آئی۔ اس کی رنگت میں زردی نمایاں تھی۔ سوئے اتفاق اس روز ہمارے ٹرینر چھٹی پر تھے۔ ہیلپر ٹیچر ہمارے سبق کی پڑتال کرنے لگیں۔ ہم دونوں کے اسباق پہلے سے پڑتال شدہ تھے سو ہم پانچ منٹ بعد پانی پینے کی غرض سے باہر آ گئے۔ نازیہ نے کہا "اس فلور کے کسی پرسکون گوشے میں چلتے ہیں۔ میرا دم گھٹ رہا ہے یہاں۔"

ہم کاریڈور کے انتہائی کونے میں پڑے بینچ پر بیٹھ گئے۔ جنگلے سے باہر کی ٹریفک اور اس سے بھی پرے مینار پاکستان کا پر وقار منظر نمایاں تھا۔ میں نے نازیہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "طبیعت اب کیسی ہے؟" اس نے بتایا کہ "ٹیوشن اسٹوڈنٹس کی فیس ملی ہے۔ یہ چند دن کوئی مشکل نہیں ہو گی۔" پھر تلخی سے بولی "شکر کروں گی جب یہ ٹریننگ سیشن ختم ہو گا۔ شہر کے دوسرے کونے میں آنے جانے سے چھٹکارا ملے گا۔"

میں کافی حیران تھی کہ وہ اسکول جاب، ٹیوشن اور پھر گھریلو ذمہ داریاں کیسے نبھا رہی ہے؟ میری اس حیرانی پر وہ کہنے لگی "بی۔ ایڈ اسی لیے تو کر رہی ہوں کہ کسی سرکاری ادارے سے وابستہ ہو سکوں۔ ٹیوشنز سے نجات مل جائے گی۔"

میں نے نرمی سے پوچھا "کیوں لاد رکھا ہے اتنا بوجھ خود پر؟"

نازیہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "میری لاکھ کوششوں

اور اداکاری کے باوجود تم میرے بارے میں کافی جان چکی ہو۔ میں بھی اب دل پہ دھرا بوجھ اٹھائے تھک چکی ہوں۔''

میں نے اسے بولتے رہنے دیا۔ اس نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں اپنی زندگی کے مخفی گوشے عیاں کرنے شروع کیے۔

میرا نام نازیہ خان ہے۔ ہمارا تعلق ایبٹ آباد کے ایک گاؤں سے ہے۔ سارا خاندان ددھیال اور ننھیال وہیں مقیم ہے۔ میرے دادا جان کو ستر کی دہائی میں لاہور آنے کا شوق چرایا۔ پڑھے لکھے تو بالکل نہیں تھے لیکن کسی بھی حلال کام کو باعث عار نہیں سمجھتے تھے۔ یہاں انہوں نے ہر طرح کی محنت کی اور پھر بعد میں بیوی بچوں کو بھی بلوالیا۔ میری دو پھپھیاں اور تین چچا تھے۔ تھوڑا وقت اور گزرا تو اپنے حصے کی کچھ زمینیں بیچ کر انارکلی میں گرم شالوں اور کپڑوں کی دکان کھول لی۔ جو ان کی لگن اور محنت سے خوب پھلنے پھولنے لگی۔ اچھے وقتوں میں ایک تین منزلہ گھر بھی بنوالیا گیا۔ دادا جان خود تو تعلیم یافتہ نہیں تھے لیکن لاہور آکر انہیں تعلیمی محرومی کا احساس بخوبی ہو چکا تھا۔ لہٰذا انہوں نے اولاد کے پڑھنے پر کوئی قدغن نہ لگائی۔ تاہم روایات کے زیر اثر بیٹیوں کو مڈل کے بعد بیاہ دیا گیا۔ سب کی شادیاں ایبٹ آباد ہی میں طے ہوئی تھیں۔ میرے بابا جان مکرم خان اور ایک چچا اسلم خان نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ میرے بابا جان کی شادی بھی ان کے ننھیال میں ہوئی۔ خاندان سے باہر شادی انتہائی مجبوری کے عالم میں کی جاتی تھی۔ بی جان بھی تعلیم سے بے بہرہ تھیں۔ اور صرف قرآن پاک پڑھنا جانتی تھیں۔ ایک تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ شادی شدہ جوڑے میں جو ذہنی تفاوت ہوتا ہے وہ میرے والدین میں بھی تھا لیکن میری بی جان نے بہت سمجھداری کا ثبوت دیا انہوں نے اولاد سے متعلقہ فیصلوں کا کلی اختیار بخوشی بابا جان کے سپرد کر دیا۔ یوں ہمارا گھر اس کشمکش سے بالکل محفوظ رہا جس میں چچا جان کا گھر تھا۔ وہاں چچی زرینہ اپنی مرضی اور روایتی پختون طریقے سے اولاد کو ڈھالنا چاہتی تھیں۔ یہ سوچ قطعی غلط نہ تھی لیکن لاہور جیسے شہر میں تعلیمی پسماندگی سے بقا بہت مشکل مرحلہ تھا۔

خیر وقت گزرتا گیا۔ ہم چار بہن بھائی تھے اور ہم اپنے تمام کزنز سے بہت منفرد تھے۔ بابا جان نے کبھی لڑکے اور لڑکی کی تعلیم میں تمیز نہ کی۔ میں سب سے بڑی تھی۔ پھر عاصم، آئزہ اور نعمان۔ ہم بھی بہترین اداروں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ایبٹ آباد صرف تعطیلات کے دوران ہی جایا کرتے تھے۔ وہ ہمارے لیے صرف ایک ہل اسٹیشن تھا۔ جن تعیشات کے ہم عادی تھے اس کی وجہ سے وہاں طویل قیام ہمارے بس کا روگ بالکل نہیں تھا۔ نانی اماں، ممانیوں اور خالاؤں کی مقابلہ کرتی تنقیدی نظروں سے ہم جلد ہی اوب جاتے تھے۔ کھانے پینے، سونے جاگنے، اٹھنے بیٹھنے ہر معاملے میں ہم ان کی نظروں کا فوکس ہوتے تھے۔ بابا جان نے جہاں ہماری تعلیم میں کوئی کمی نہ رکھی تھی وہیں بی جان نے ہم دونوں بہنوں کو گھریلو امور کی طرف سے بھی رعایت نہ دی تھی۔ میں پہلوٹھی کی اولاد ہونے کے ناطے والدین کی بہت لاڈلی تھی۔ میری ہر بات مانی جاتی تھی۔ میٹرک تک میں نے گرلز اسکول اور گرلز اکیڈمی میں تعلیم حاصل کی اس کے بعد چند ایک اعتراضات کے باوجود بابا جان نے مجھے گرلز کالج میں داخلہ دلوادیا۔

میں خان ہاؤس کی وہ پہلی لڑکی تھی جس نے یہ اعزاز حاصل کیا تھا۔ میٹرک کرتے ہی خاندان سے کئی رشتے آئے مگر بابا جان نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ فی الحال نازی پڑھے گی۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ ابھی وہ صرف یکسوئی سے تعلیم حاصل کرے گی۔ والدین کے لاڈ پیار، اپنی خوبصورتی اور اہمیت نے میری ذات کو ایک مقناطیسی اعتماد بخشا تھا۔ ہر میدان میں سب سے آگے ہوتی تھی۔ اتنی کامیابیوں نے مجھے اس دنیا کے مہلک ترین نشہ کی لت میں مبتلا کر دیا، ذاتی تعریف کا نشہ۔ کالج لائف کیا اسٹارٹ ہوئی۔ کامیابیوں اور شہرت کا ایک نیا در وا ہو گیا۔ یہاں بھی سب میرے گرویدہ ہوتے چلے گئے۔ لیکن سرکاری کالجز کا حال تمہیں معلوم ہی ہوگا۔ یہاں پڑھائی کا تناسب دیگر سرگرمیوں کی نسبت بہت کم ہوتا ہے۔ میتھس، اسٹیٹس اور اکنامکس جیسے مضامین کے لیے مجھے کوچنگ کلاسز کی لازمی ضرورت تھی۔ بابا جان نے انتہائی اعتماد کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے ایک ایوننگ اکیڈمی میں داخل کروا دیا جہاں کو ایجوکیشن تھی۔ اور ٹیچرز بھی تیس اور چالیس کی دہائی میں موجود پروفیسرز اور لیکچررز۔ یہ دنیا میرے لیے بالکل انوکھی تھی۔ چچا زاد بھائیوں اور دیگر کزنز وغیرہ سے کبھی کوئی پردہ نہیں رہا تھا لیکن یہاں داخلے کے وقت بابا جان نے مجھے حجاب لینے کا پابند کر دیا۔ جو اس وقت میں نے بخوشی قبول کر لیا۔

اکیڈمی رنگ و بو کا ایک نیا جہان تھی۔ ایسا جہان جسے میں نے کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔ لڑکیاں فیشن پریڈ کے شرکا کی

طرح جدید تراش کے ملبوسات میں نظر آتی تھیں۔ لیکن اس بات سے قطع نظر وہاں کا تعلیمی نظام بھی بہترین تھا۔ ابتدا میں میری دال وہاں بالکل نہ گل سکی۔ میرے شاندار اکیڈمک ریکارڈ کی چمک بھی یہاں ماند پڑ گئی تھی کیونکہ وہاں مجھ سے زیادہ ذہین طلبہ بھی موجود تھے۔ اپنی ذات کا یوں پس منظر میں جانا مجھے کیسے گوارا ہوتا؟ نا معلوم طریقے سے میرے اندر حسد کے جذبات پیدا ہونے لگے۔ میں کسی کو خود سے آگے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ دن رات محنت کی اور اپنی ایک نمایاں پوزیشن قائم کر لی۔ غیر محسوس طریقے سے میرا ڈریسنگ اسٹائل بھی تبدیل ہوتا گیا۔ لیکن یہ شوق صرف گھر پر ہی پورا ہوتا تھا۔ کالج میں یونیفارم اور اکیڈمی میں حجاب آڑے آتا تھا۔ دو سال لگ گئے مجھے اپنا آپ منوانے میں۔ گریجویشن کے لیے بھی بابا جان نے اسی گرلز کالج اور اکیڈمی میں رہنے پر زور دیا۔ گریجویشن لیول پر مقابلہ پہلے سے زیادہ بڑھ گیا تھا اور میرے حاسدانہ جذبات بھی۔ مجھے ٹاپ پر رہنا تھا، کسی بھی حال میں۔ یہ میری ضد بن چکی تھی اب۔ کلاس کا ماحول پہلے سے زیادہ لبرل تھا۔ ٹیچرز اور اسٹوڈنٹس میں ہنسی مذاق بھی چلتا تھا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی باہمی گفتگو پر بھی کوئی پابندی نہ تھی۔ انٹر کی طرح یہاں بھی میرے حجاب کو لے کر کافی ہوٹنگ ہوتی تھی۔ میری ضد اور خود نمائی کا جذبہ کافی سرکش ہو چکا تھا۔ پڑھائی میں اپنی قابلیت انٹر کے مارکس کی بدولت سب پر ثابت کر ہی چکی تھی میں۔ اب اور بھی بہت کچھ درکار تھا۔ اس وقت میں نے اپنی روایات سے پہلی بغاوت کی۔ گھر سے تو حجاب میں آتی تھی مگر اکیڈمی آکر اتار دیتی تھی۔ اس کے بعد مجھ میں اور باقی طالبات میں کوئی فرق نہ رہتا تھا۔ میرا لباس ان سے بڑھ کر قیمتی اور اسٹائلش ہوتا تھا۔ میری مقبولیت کا گراف یکدم ہی بڑھ گیا تھا۔ لڑکیوں کی آنکھوں میں رشک وحسد اور لڑکوں کی آنکھوں میں ستائش کے جذبات مجھے بہت پر جوش رکھتے تھے۔ کئی زاہد خشک قسم کے اساتذہ بھی مجھ سے کافی نرمی کا برتاؤ کرتے تھے۔ بس یوں سمجھ لو ہر طرف میں ہی چھائی ہوئی تھی۔ کلاس کے لڑکوں سے بھی میں ایک باوقار طریقے اور رکھ رکھاؤ سے رسمی بات چیت رکھی ہوئی تھی۔ اس سے صنف مخالف کی دلچسپی مجھ میں مزید بڑھتی تھی۔ لیکن ایک بات کا حوصلہ ابھی تک مجھ میں پیدا نہ ہو سکا تھا۔ دیگر کلاس فیلوز کی طرح میں بھی کالج ''بنک'' نہیں کر سکی تھی۔ شاید اس کی وجہ آئزہ تھی جو اسی کالج میں انٹر آرٹس کی طالبہ تھی۔ اس کی اکیڈمی مجھ سے مختلف تھی۔ اس کے ذریعے یہ خبر گھر تک پہنچ سکتی تھی۔ میرا کوئی بھی غیر محتاط قدم بابا جان اور بی جان پر میری پس پردہ حرکات آشکار کر سکتا تھا۔ پھر میرا جو حشر ہوتا اس کا تصور ہی محال تھا۔ اسی آنکھ مچولی میں گریجویشن مکمل ہو گیا۔ رزلٹ کے انتظار میں گھر پر ہی وقت گزرنا تھا۔ اسی اثنا میں آئزہ انٹر اور نعمان میٹرک کے امتحانات کے بعد فارغ تھے۔ عاصم کو پڑھائی کا بالکل شوق نہیں تھا وہ میٹرک کے بعد دوست کے ساتھ مل کے نیٹ کیفے چلا رہا تھا اور بابا جان سرکاری ملازمت کرتے تھے۔ کافی عرصہ بعد سب کو تعلیمی فراغت ایک ساتھ ملی تھی۔ بی جان نے ایبٹ آباد جانے کا پروگرام بنا لیا۔ وہاں قیام کے بعد صحیح معنوں میں اپنے مستقبل کا سوچ کر بہت ہول اٹھے۔ کالج لائف نے مجھے ضرورت سے زیادہ آزاد خیال بنا دیا تھا۔ لہٰذا وہاں کے روایتی ماحول میں ایک ماہ رہنا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔ نانی اماں نے بی جان کے لتے لینے شروع کر دیئے کہ کب کرو گی نازی کی شادی؟ ایک سے بڑھ کر ایک رشتہ موجود ہے خاندان میں۔ مگر تم لوگوں کی عقل تو لاہور کے پانی نے خراب کر رکھی ہے۔ ہماری برادری میں سولہ سے سترہ سال تک لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی تھی۔ اس لحاظ سے میں کافی عمر گزار چکی تھی مگر خاندان میں موجود رشتوں کا سوچ سوچ کر مجھے غش پڑنے لگتے تھے۔ ایک ماہ جیسے تیسے گزرا لاہور آ کر بی جان نے میری شادی کے لیے بابا جان پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ بابا جان اس معاملے پر تو متفق تھے لیکن خاندان کے لڑکوں سے بھی خوب واقف تھے۔ اسی لیے ٹال مٹول سے کام لیتے تھے۔ رزلٹ آنے تک خاندان سے باہر کے بھی کئی رشتے آئے مگر کبھی کم تعلیم اور کبھی معاشی حیثیت آڑے آ جاتی۔ میرا رزلٹ بہت شاندار آیا۔ بابا جان نے ذرا سی پس و پیش کے بعد مجھے یونیورسٹی میں داخلے کی اجازت دے دی۔ وہ اپنی اولاد کو تعلیم کے زیور سے بھرپور آراستہ کرنا چاہتے تھے۔ یونیورسٹی کے ماحول نے میری ازلی خود نمائی کے جذبے کو اسقدر تیزی سے پروان چڑھایا کہ میں خود بھی حیران تھی۔ میرا نفس اب کسی منہ زور گھوڑے کی طرح بے لگام اور میرے قابو سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ ستائش میری کمزوری بن چکی تھی اور آزادی میری منزل۔ یونیورسٹی کے کئی لڑکوں سے دوستی بھی ہوئی۔ مگر کوئی بھی مجھے مطلوبہ منزل تک پہنچا نہ سکی۔ لیکچرز بنک کرنے کی عادت بھی اسی دور میں پڑ چکی تھی۔ لاہور کا وہ کون سا

ریسٹورینٹ ہوگا جو میں نے اپنی کلاس فیلوز کے ساتھ نہ دیکھا ہو۔ موبائل فون کی کمی شدت سے محسوس ہوتی تھی۔ اور کئی دنوں کی محنت کے بعد میں نے موبائل بھی لے لیا۔ میری ہر وہ کامیابی جو اپنی روایات سے ہٹ کر ہوتی تھی اس کا سبب صرف یہ ہوتا تھا کہ میں انتہائی ٹھنڈے دماغ، منطقی دلائل اور شیریں بیانی سے اپنی بات منوالیا کرتی تھی۔ زبان کی چاشنی قدرت کا بہت بڑا عطیہ تھا میرے لیے۔ دو سال خوب مزے کیے۔ میں نے اپنی سرگرمیاں بہت ہی ہوشیاری سے مخفی رکھی ہوئی تھیں۔ کبھی کوئی ایسا غیر محتاط قدم نہیں اٹھایا تھا جس سے مجھے ملنے والی آزادی خطرے میں پڑتی۔ اس کا اثر خاندان کی باقی لڑکیوں کے لیے بہت مثبت رہا اور اعلیٰ تعلیم کے دروازے ان پر بھی کھلتے گئے۔ خاندان میں اپنے طلبگار امیدواروں اور ان کی ماؤں کو میں نے شیریں زبان سے ایسے چرکے دیئے تھے کہ اب وہ میرے سائے سے بھی بدکتے تھے۔ وقت کے ساتھ بابا جان اور چچا جان کی سوچ بھی مزید وسیع ہو رہی تھی۔ چچی زرمینہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے دو بچوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ چھوٹی بیٹی ارم نے گریجویشن کے بعد پڑھائی ترک کر دی اور چچا جان نے اپنے ایک بہترین دوست کے کہنے پر ارم کو اس دوست کے اسکول میں ٹیچنگ کی اجازت دے دی، ان کی رائے یہ تھی کہ عملی زندگی میں انسان مسائل و مشکلات کا حل زیادہ بہتر طور پر سیکھتا ہے۔ میں اس موقع پر کیسے پیچھے رہتی۔ میں نے بھی بابا جان کو منانا شروع کر دیا۔ بی جان اور عاصم اس بات کے سخت مخالف تھے لیکن بابا جان نے مشروط ہامی بھر لی کہ کچھ عرصہ بعد جاب ترک کر دوں گی۔ میں نے جھٹ اقرار کر لیا۔ میں ارم کے اسکول میں جاب کرنے کا رسک کبھی نہیں لے سکتی تھی۔ لہٰذا ایک ایسے ادارے کا انتخاب کیا جو بابا جان اور بھائیوں کے لیے آوٹ آف وے تھا۔

بی جان نے میرے لیے رشتہ ڈھونڈنے کی مہم جاری رکھی خاندان میں تو میری حکمت عملی کے باعث اب میرا رشتہ ہونا ناممکن تھا۔ خاندان سے باہر بھی میری منزل کوئی ایسا شخص تھا جو مجھے میرے طریقے سے جینے دے۔ اور ایسا ہی ایک شخص مجھے عمیر کی صورت میں نظر آیا۔

عمیر کی فیملی نے ہمارے محلے میں نئی رہائش اختیار کی تھی۔ یہ خاصی ماڈرن فیملی تھی جن کی خواتین خاصے دھڑلے سے باہر گھوم پھر لیا کرتی تھیں۔ ان کے سونے جاگنے کی کوئی

روٹین نہ تھی۔ خاصا مادر پدر آزاد ماحول تھا۔ اسکول سے واپسی پر عمیر اکثر اپنے گھر سے باہر یا بائیک پر آتے جاتے نظر آیا کرتے تھے۔ عمیر نے مجھے صرف حجاب میں دیکھا تھا لیکن مجھے ان کی دلچسپی محسوس ہو گئی تھی۔ چند دن بعد میں چھت پر کسی کام سے گئی تو عمیر بھی اپنی چھت پر موجود تھے۔ ان کا گھر سامنے والی لائن میں دو گھر چھوڑ کر تھا۔ چند منٹ بعد انہوں نے ایک پتھر پر لپیٹ کر اپنا نمبر مجھے پھینکا۔ تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے میں نے نمبر اٹھا تو لیا لیکن کال نہیں کی۔ ایک ہفتہ میں نے خوب سوچ بچار کے بعد اپنے طور پر عمیر کو فائنل کر لیا۔ جب میں نے انہیں کال کی تو انہوں نے اس ایک ہفتے میں اپنی بے تابیوں کا خوب اظہار کیا۔ لیکن یہاں میرے اندازے میں کافی غلطی ہو گئی۔ عمیر مجھ میں انٹرسٹڈ تو تھے لیکن صرف دوستی کی حد تک کیونکہ وہ غیر برادری سے تھے اس بات کا تو پہلے سے علم تھا لیکن ان کی منگنی شدہ ہونے کا علم نہ تھا۔ میری انا کو زبردست ٹھیس پہنچی۔ میں نے ہمیشہ ہر کسی کو تسخیر کیا تھا۔ تو ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ جس شخص کی طرف میں خود بڑھی تھی اس کو کسی اور کا ہو جانے دیتی۔ یہ وقت انتہائی تحمل مزاجی سے کام لینے کا تھا۔ سو میں نے یہی کیا۔ دھیرے دھیرے اپنے ترکش کے تیر استعمال کیے اور عمیر کے حواس اپنے قابو میں کرنے شروع کر دیئے۔ وہ اپنے گھر میں سب سے چھوٹے تھے۔ دو بھائی شادی شدہ تھے اور بہن کی شادی بھی عنقریب متوقع تھی۔ دو ماہ بعد عمیر نے مجھ سے ملنے کی فرمائش کی جو میں نے کسی قدر حیل وحجت کے بعد مان لی۔ ہم ایک ریسٹورینٹ میں ملے۔ وہ مکمل طور پر میرے سحر میں جکڑے جا چکے تھے۔ انہوں نے بالآخر اعتراف محبت کر لیا۔ اس ملاقات کے اختتام پر انہوں نے مجھے پرپوز کر دیا۔ میں نے بڑی معصومیت سے ان سے پوچھا۔ ”عمیر! آپ شاید اپنی منگنی بھول رہے ہیں“ انہوں نے بڑے یقین سے کہا ”ہمارے گھر میں کوئی کسی کے معاملے میں دخل اندازی نہیں کرتا۔ مریم سے منگنی بھی اپنی پسند سے کی تھی۔ مگر تم سے مل کر محبت اور پسندیدگی میں فرق جانا ہے۔ کاش تم مجھے پہلے مل گئی ہوتیں۔ تمہارا خیال رگوں میں خون کی طرح گردش کرتا ہے۔ ہر گھڑی تمہارا ہی چہرہ حواسوں پر چھایا رہتا ہے۔“

اپنی تعریف سننا تو ویسے ہی میری کمزوری تھی اس خمار میں یہ بھی فراموش کر بیٹھی کہ مریم سے ان کی منگنی پسندیدگی اور کسی انفیر کا نتیجہ تھی۔ اور اب منگنی ٹوٹنے کے بعد اس لڑکی پر کیا بیتے گی؟ اصل مسئلہ تو ہماری طرف سے ہونا تھا۔ عمیر کا غیر برادری سے تعلق میری فیملی کے لیے کوئی چھوٹی بات نہ ہوتی۔

عمیر نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا ایک ہفتے بعد ان کی والدہ رشتہ لے کر آ گئیں۔ حسب توقع بی جان نے موقع پر ہی بڑی سہولت سے انکار کر دیا۔ ان کا بھائیوں کے ساتھ مشترکہ کاروبار تھا۔ والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ بابا جان اور بھائیوں کو جب عمیر کے رشتے کی بابت معلوم ہوا تو کافی سخت ردِعمل دیا۔ عاصم بہت ہی گرم مزاج اور جوشیلا تھا۔ اسی نے سب سے زیادہ ایشو بنایا کہ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں ان لوگوں کو یہاں آئے ہوئے۔ اور رشتہ لے آئے ہیں۔ بابا جان کے سمجھانے پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہ ہو رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ان لوگوں کی سرگرمیاں کافی مشکوک ہیں۔ سارا دن تو یہ تمام بھائی گھر میں پڑے رہتے ہیں۔ برائے نام ایک دکان کھول رکھی ہے لیکن ان کے ٹھاٹ باٹ اس دکان سے کبھی پورے نہیں ہو سکتے۔ یہ سن کر میرا بھی ماتھا ٹھنکا۔ میں نے چند دن بعد عمیر سے ملاقات کی اور عاصم کے سوالات ان کے سامنے رکھے۔ انہوں نے بڑے اطمینان سے میرے تمام خدشات باطل کر دیئے اور بتایا کہ ان لوگوں کو ننھیال کی طرف سے کافی جائیداد ملی ہوئی ہے۔ لہٰذا معاشی تنگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے اس کے بعد ہمیشہ ان سے الگ کام شروع کرنے کا اصرار جاری رکھا۔ عمیر نے بیرون ملک سیٹل ہونے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں نے اس فیصلے کی مکمل توثیق کی۔ عمیر کافی متلون مزاج تھے یہ خامی مجھے اس وقت بھی بہت کھٹکتی تھی لیکن اپنے خوابوں کی تعبیر کے بدلے مجھے یہ خامی زیادہ گراں نہیں گزرتی تھی۔ ہمارے افیئر کو ایک سال سے زائد عرصہ بیت چکا تھا۔ میرے لیے آنے والے رشتوں کی بیل عمیر کے تعاون سے کبھی منڈھے نہیں چڑھی تھی۔ مگر جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا عمیر کے رویے میں ذرا اکتاہٹ آنے لگی۔ ان کی والدہ دو بار مزید رشتہ لائی تھیں مگر مثبت جواب نہ مل سکا۔ عاصم ان کے بار بار آنے سے کافی مشکوک ہو چکا تھا کوشش کے باوجود اسے میری انوالومنٹ کا کوئی ثبوت نہ مل سکا۔ پریشان تو میں بھی اب کافی تھی میری عمر 24 کا ہندسہ عبور کر چکی تھی۔ خاندان والے اب کھل کے باتیں بنانے لگے تھے۔ ارم کی منگنی بھی اس کے خالہ زاد سے ہو چکی تھی۔ آئزہ کے لیے بھی کئی رشتے موجود تھے مگر میری وجہ سے اس کی راہ بھی کھوٹی ہو رہی تھی۔ ان سب حالات سے تو میں نمٹ

لیتی۔مگر عمیر کی اکتاہٹ میرے لیے زیادہ چیلینجنگ تھی۔جن خوابوں میں رنگ بھرنے کے لیے میں نے اتنے پاپڑ بیلے تھے انہیں ادھورا کیسے چھوڑ دیتی۔خود غرضی اور بے حسی میرے لیے کوئی مشکل بات نہ تھی۔انسانوں کی حیثیت میرے لیے ٹشو پیپرز سے زیادہ نہ تھی۔عمیر نے اب پبلک پلیس سے ہٹ کر ملنے کی فرمائشیں شروع کر دی تھیں۔یہ میرے لیے کافی مشکل مرحلہ تھا۔لیکن اپنے خوابوں سے دستبرداری بھی قبول نہ تھی۔خود نمائی، تعریف اور آزادی کی ہوس نے مجھے ایسا جکڑ رکھا تھا کہ میں نے کئی بار عمیر کے سفلی جذبات کو بھی ایک حد میں رہ کر تسکین دی۔جانتی ہوزویا! یہ نفس بہت سرکش چیز ہے اسے ایک بار من مانی کرنے دو یہ انسان کو اشرف المخلوقات کے درجے سے گرا دیتا ہے، میں بھی اسی انتہا پر پہنچ چکی تھی۔اپنی عزت نفس، خودداری اور شرم وحیا کا مجھے ذرا بھی پاس نہ رہا تھا۔مجھے بس اپنے جذبات کی تسکین درکار تھی۔نفس کی من مانیاں قابو کرنا مجھ جیسی کم ظرف کے بس میں نہ رہا تھا۔تعطیلات گرما تھیں۔عمیر سے ملاقاتوں کا سلسلہ رک چکا تھا۔وہ کافی دنوں سے ملنے کے لیے زور دے رہے تھے۔بی جان کی منت سماجت کر کے میں نے ایک فرینڈ کی طرف جانے کا بہانہ کیا۔مگر عاصم بے وقت گھر آ گیا۔اور کہنے لگا مجھے چائے بنا دو۔پھر میں تمہیں چھوڑ آؤں گا۔مجھے اپنا پروگرام کھٹائی میں پڑتا نظر آ رہا تھا۔میں اس قدر کم ظرف ہو چکی تھی کہ میں نے چائے میں دو نیند کی گولیاں ملا دیں۔عاصم کے سر میں پہلے ہی درد تھا وہ سونے چلا گیا۔اور میں عمیر سے ملنے چل دی۔وہ دن میری زندگی میں بہت بڑا طوفان لایا تھا۔ہم دونوں کے جذبات کا لاوا اب ہر حد پار کر چکا تھا۔اس وقت پشیمانی کا احساس تو بہت ہوا لیکن میرا ضمیر مجھے زیادہ دیر ملامت نہ کر سکا۔اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا۔عمیر سے شادی اب میری مجبوری بن چکی تھی۔کورٹ میرج کر کے خاندان سے علی الاعلان بغاوت کا مجھ میں حوصلہ نہ تھا۔گھر والے میرے رشتے کو لے کر بہت پریشان تھے اب۔میری ہم عمر لڑکیاں تین تین بچوں کی مائیں بن چکی تھیں۔بی جان کو عارضہ بلڈ پریشر لاحق ہو چکا تھا۔بابا جان بھی بہت مضمحل رہنے لگے تھے۔کچھ عرصہ گزرا تو عمیر نے ایک انوکھی راہ سجھائی۔ان کے ایک دوست کے کسی عامل بابا سے روابط تھے۔جو من پسند شادیوں کی گارنٹی دیتا تھا۔عمیر نے مجھ سے کہا کہ وہ تیس ہزار مانگ رہا ہے۔کاروباری حالات کچھ خراب ہیں وہ صرف دس ہزار ارینج کر سکتے ہیں باقی رقم اگر میں مہیا کر دوں تو ہماری شادی آسانی سے ہو جائے گی۔میری عقل پر مکمل پردے پڑے ہوئے تھے۔میں نے بلا جھجک رقم دے دی۔اور ان سے اس عامل کا نام تک نہ پوچھا۔عمیر نے مجھے کچھ تعویذ لا دیئے جو میں نے گھر والوں کو پلانے شروع کر دیئے۔دو ماہ بعد عمیر نے مزید بیس ہزار کا مطالبہ کر دیا۔ان کی جاب اور بیرون ملک سیٹل ہونے کے دعوے ابھی تک التوا کا شکار تھے۔مرتی کیا نہ کرتی میں نے یہ مطالبہ بھی پورا کر دیا۔اس وقت علم ہوا کہ میں اپنے گھر والوں کو کالے علم کے تعویذ پلا رہی تھی۔اس علم کی نحوست اور نجاست تو کیا پوری ہوتی میرے گناہوں کی سزا کا وقت شاید آ چکا تھا۔عمیر سے شادی کی مشروط ہامی بھر لی گئی۔جس کے مطابق عمیر نے الگ گھر کرائے پر لے لیا۔مجھے تو مانو ہفت اقلیم کی دولت مل گئی تھی۔میرا غرور، بے حسی اور خود غرضی اپنے عروج پر تھی۔عمیر نے جاب سے ریزائن دینے سے فی الحال منع کر دیا۔شادی کے بعد اپنی جیت کے نشے اور من چاہی زندگی کے سرور نے مجھے ہر چیز سے بیگانہ کر رکھا تھا۔لیکن عمیر کے ذاتی کاروبار سے متعلق لاابالی رویئے کو برداشت کرنا اب میرے لیے مشکل تھا۔میں ہر روز ان سے الگ کاروبار کا اصرار کرتی تاکہ میں بھی جاب چھوڑ سکوں لیکن وہ ٹال دیتے تھے۔بس اپنی دکان پر دن میں ایک دو بار چکر لگا آتے تھے۔تب ایک دن اچانک ان کو بڑے جیٹھ باسط کا فون آیا کہ دکان پر چھاپا پڑا ہے۔میں حیران تھی کہ یہ اچانک کیا افتاد آن پڑی ہے۔عمیر افراتفری میں مجھے سسرال چھوڑ کر اپنے بھائی کے ساتھ چلے گئے۔اس دن یہ جان کر میرے قدموں تلے سے زمین نکلی کہ ان کا غیر قانونی شراب اور منشیات کا کاروبار تھا۔اور وہ سب خود بھی اس لت میں مبتلا تھے۔ننھیال کی جائداد وغیرہ سب ایک ڈھکوسلا تھا۔اپنی دکان کی آڑ میں وہ یہ کاروبار بڑی کامیابی سے چلا رہے تھے۔اکل حرام ان کے لیے معمولی بات تھی۔اور اس کے اثرات ان سب کی اخلاقی پسماندگی کی صورت میں عیاں تھے۔گھر کی نوکرانیوں اور دوسری عورتوں سے تعلقات ان کے لیے کوئی بڑا ایشو نہ تھے۔میری جیٹھانیوں سے جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ اپنے شوہروں کی آسانی کے لیے ان کے کاروباری سرپرستوں کے ہاتھوں کئی مرتبہ پامال ہوئی ہیں تو اس دن احساس ہوا کہ اپنی خواہشات کی تتلیوں کے اندھا دھند تعاقب نے مجھے کس جہنم میں لا پھینکا تھا۔اس رات عمیر سے میرا پہلا جھگڑا ہوا۔وہ اتنے سال مجھے بڑی آسانی سے بیوقوف بناتے رہے

تھے۔ میرا غصے اور طیش سے برا حال تھا اس سے زیادہ یہ احساس کچوکے لگا رہا تھا کہ اگر میری جاب نہ ہوتی تو وہ بھی اپنے بے ضمیر بھائیوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے میری خوبصورتی اور جوانی کیش کرواتے۔ عمیر نے اس روز دوٹوک الفاظ میں میرے سامنے دو راستے رکھے۔ پہلا یہ کہ میں اسی طرح جاب کر کے گھر چلاتی رہوں بصورت دیگر وہ میرا متنی استعمال کریں گے۔ طلاق کی صورت میں ان کی انتقامی کارروائی سے بچنا میرے لیے ناممکن تھا۔ ان کے وسیع تعلقات کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوتا کہ وہ قانون کی دست برد سے آج تک محفوظ تھے۔ والدین سے کس منہ سے مدد مانگتی۔ بابا جان کا انتقال ہو چکا تھا۔ میری شادی کو لے کر جو لے دے خاندان میں ہوئی تھی اس کے بعد بھائیوں کے در پر جا کر رہنا بھی ممکن نہ تھا۔ عاصم پہلے ہی مجھ سے بہت کھنچا ہوا رہتا تھا اس کو یقین کی حد تک شبہ تھا کہ شادی میں میری رضامندی بھی تھی۔ میں نے اپنے تئیں محفوظ راستہ تلاش کیا اور اپنی جاب جاری رکھی۔ عمیر کی فطری کمینگی اب مکمل سامنے آچکی تھی۔ انہوں نے کبھی تنکا نہ توڑا تھا۔ لگی بندھی ملازمت کرنا تو بہت دور کی بات تھی۔ دکان سے ملنے والے اخراجات سے ان کی نشے کی علتیں پوری ہو پاتی تھیں۔ میں نے رحمانی رستے سے منہ موڑ کر گمراہی کا جو رستہ اختیار کیا تھا۔ اور ببول کی جو فصل اپنے لیے بڑے چاؤ سے بوئی تھی اس کے کاٹنے کا وقت اب آچکا تھا۔ محبت تو کبھی ہم دونوں میں تھی ہی نہیں۔ ہم دونوں ہی نظریہ ضرورت کے تحت ایک دوسرے کے قریب آئے تھے۔ مجھے آزادانہ طرز زندگی درکار تھی اور عمیر کو عیاشی اور کمانے سے دستبرداری۔ مجھے میرا ابھی بہت خوب جوڑ ملا تھا اس دوران میرا بیٹا پیدا ہوا۔ لیکن تب بھی عمیر کو ترس نہیں آیا۔ میں نے بمشکل دو ماہ کی چھٹی لی سکول انتظامیہ سے۔ اس دوران گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے ٹیوشن بھی شروع کرنی پڑی۔ کسی فرینڈ نے مشورہ دیا کہ بی ایڈ کر کے سرکاری ادارے میں اپلائی کروں تو بہت سہولت رہے گی۔ میں نے یہ دردسر بھی مول لے لی۔ میرا بیٹا بیمار رہنے لگا۔ میں اس کو ساس کے پاس چھوڑ کر پیپر دینے آتی تھی۔ مگر میرے سیاہ اعمال کا تاوان میرے ننھے سے جگر گوشے کو بھی ادا کرنا پڑا۔ ڈائیریا سے وہ اپنی زندگی ہار بیٹھا۔ وہ میری زندگی کا کٹھن ترین وقت تھا۔ اولاد کا دکھ سب سے بڑی آزمائش ہوتی ہے انسان کے لیے۔ میرا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا مگر میں موت جیسی آسانی نہ پا سکی۔ ابھی بہت کچھ جھیلنا باقی ہے۔ میں نے زندگی میں ہمیشہ محبتیں اور آسائشیں پائی تھیں۔ مگر اب مکافات عمل کے زیر اثر مجھے محض تذلیل اور دھتکار ملتی ہے۔ میری روح اس مسافت سے تھک چکی ہے۔ عورت جتنا مرضی کما لے، گھر چلا لے۔ یہ کام اس کے لیے بنایا ہی نہیں گیا تو اس کو انجام دینے میں وہ کیسے سکون پا سکتی ہے؟ عورت کی کمائی میں کبھی وہ برکت نہیں ہوتی جو مرد کے حصے میں آتی ہے۔ جلد ہی کرائے کا گھر چھوڑ دیں گے ہم اور سسرال میں شفٹ ہو جائیں گے۔ تھوڑا تو سکون ملے گا اخراجات کی مد میں۔ کوئی کام کرنے والی بھی نہیں رکھ سکتی میں۔ عمیر کی فطرت سے خوب واقف ہوں۔ میرا لائف اسٹائل میری ڈریسنگ، ناز نخرے سب میری خواہشات کے مرقد میں مدفن ہو چکے ہیں۔ وہ عبایا جو میں نے بڑی حقارت سے اتار پھینکا تھا آج وہ میری مجبوری بن چکی ہے۔ میرا بھرم اسی سے قائم ہے اب۔ اپنی لگی بندھی تنخواہ میں وہ تمام عیاشیاں اب خواب بن چکی ہیں۔ میرا غرور، خودغرضی سب خاک میں مل چکے ہیں مگر معافی کا ورا بھی بہت دور ہے۔

☆......☆

نازیہ کے الفاظ اور زبان اب مکمل ساکت تھے باہر شام ہو چکی تھی اور ایسی ہی شام نازیہ کی آنکھوں میں اترتی دکھائی دے رہی تھی۔ میرا دل تاسف اور صدمے کے جذبات سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے اسے بہت تسلی تشفی دی مگر وہ شکستہ انداز میں بولی "اپنے گناہوں کا بوجھ تو مجھے ڈھونا ہی ہے۔ بس دعا کرنا مجھ سیاہ کار کے حق میں۔"

ورکشاپ آف ہو چکی تھی کچھ سیکنڈز بعد وہ اٹھی اور کہنے لگی چلتے ہیں اب۔ دو روز بعد ورکشاپ کا اختتام ہو گیا۔ اور کچھ عرصہ بعد ایگزامز بھی ہو گئے لیکن اس بار نازیہ کے مضامین مجھ سے مختلف تھے لہٰذا اس سے ملاقات نہ ہو پائی۔ نازیہ سے رابطہ کی بہت کوشش کی مگر اس کا نمبر بند ملتا تھا۔ دو ماہ بعد رزلٹ آیا۔ نازیہ کا رول نمبر انٹرنیٹ پر چیک کرنے سے معلوم ہوا کہ اس کے حسب معمول بہت اچھے نمبر آئے تھے۔ میں اس کے گھر بھی گئی ایک بار مگر معلوم ہوا کہ وہ لوگ وہاں سے جا چکے تھے۔ میرے ذہن میں اکثر اس کا خیال آتا ہے اور اس کی معافی کے لیے بہت دعائیں بھی کرتی ہوں۔ جانے اس کی بے ثمر مسافت زندگی میں کب ختم ہو گی؟ اور وہ کب تک اپنے گناہوں کا تاوان ادا کرتی رہے گی؟
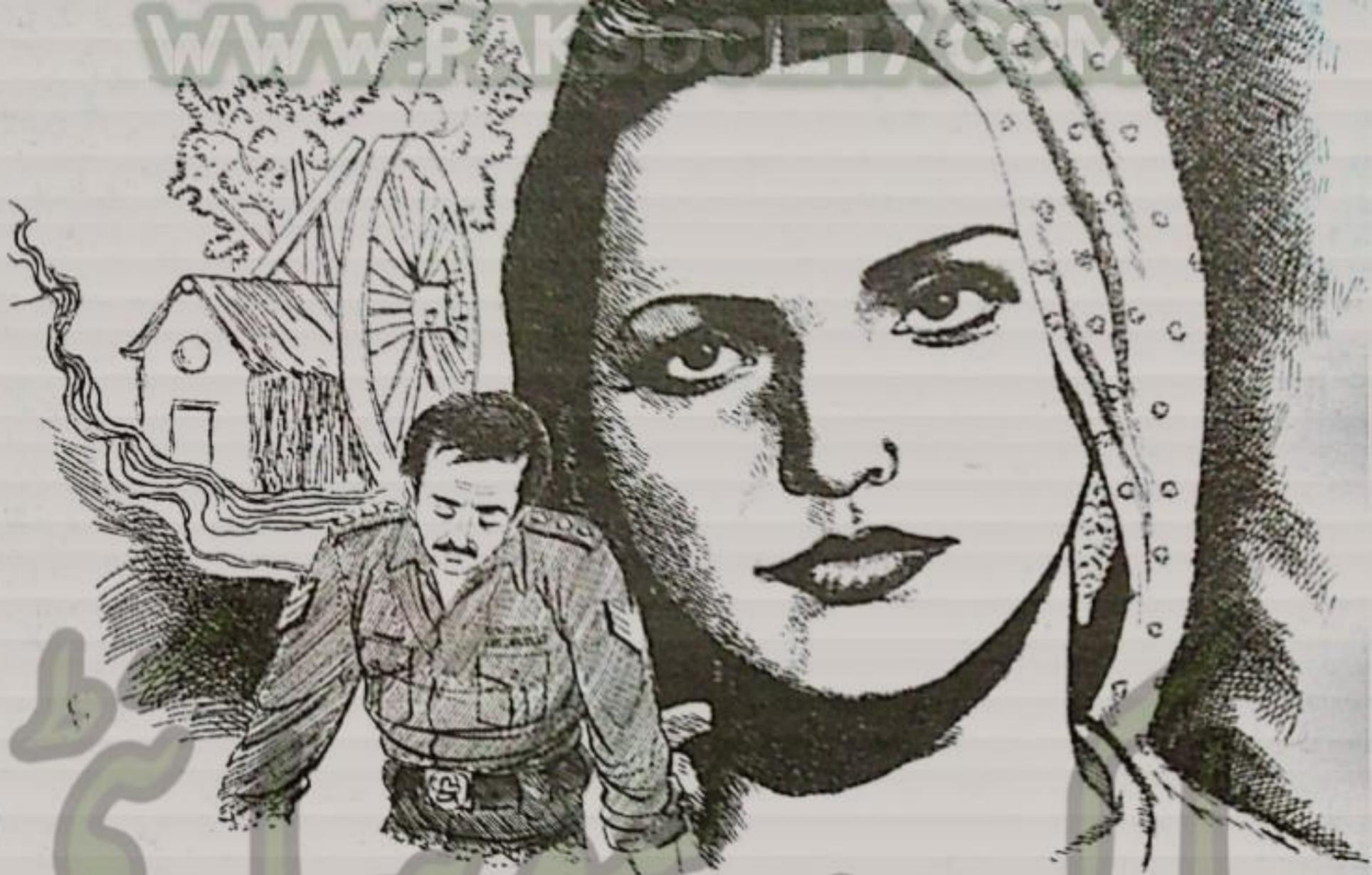
تیسرا سبق

محترم معراج رسول
السلام علیکم
میں محکمہ پولیس سے وابستہ ہوں اور یہ واقعہ خود میرا ہے۔ میں نے اپنی زندگی کا یہ واقعہ صرف اس لیے لکھا ہے کہ لوگ سبق حاصل کریں۔
فہیم نوید
(کراچی)

ہماری نگاہیں بہت تیز ہوتی ہیں۔ یہ کہا جائے کہ ہماری ٹریننگ ہی ایسی ہوتی ہے کہ ہم پہچان لیتے ہیں کہ کون کیا ہے۔

وہ لڑکی مجھے اس شہر میں اجنبی دکھائی دے رہی تھی۔ سہمی ہوئی، ہر قدم پر چلتی ہوئی اس طرح رکتی جاتی جیسے اسے کسی کے تعاقب کا خوف ہو۔

وہ آس پاس کے مناظر کو بھی بہت حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا بیگ تھا۔ اس نے

میرے دیکھتے دیکھتے روڈ کراس کیا۔ لیکن روڈ کراس کرنے کے انداز نے ہی یہ بتا دیا تھا کہ وہ کسی چھوٹی سی جگہ سے پہلی بار اتنے بڑے شہر میں آئی ہے۔

شہر کی لڑکیوں میں جو خود اعتمادی پائی جاتی ہے وہ اس میں نہیں تھی۔ اس نے اگرچہ خود کو چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ اس کے باوجود احساس ہو رہا تھا کہ وہ جوان اور خوب صورت لڑکی ہے۔

شہر کے بپھرے ہوئے سانڈ قسم کے غنڈے ایسی لڑکیوں کی تاک میں رہتے ہیں اور اس لڑکی کو بچانا میرا فرض بنتا تھا۔ اس لیے میں بھی روڈ کراس کرکے اس کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اس وقت رانجھے جنرل اسٹور کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی تھی۔

"لڑکی۔" میں نے بارعب لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ "کون ہو تم؟ کہاں سے آئی ہو؟"

اس نے مجھے دیکھا۔ میری وردی کو دیکھا اور بری طرح سہم گئی۔

"گھبراؤ نہیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "تم اس طرح یہاں گھومتی رہیں تو تمہارے ساتھ کیا کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔ بتاؤ مجھے کیا نام ہے تمہارا؟"

"بانو۔" اس نے جواب دیا۔ اس وقت بھی اس نے اپنے چہرے کو چھپا رکھا تھا۔

"کہاں سے آئی ہو۔" میں نے اپنے لہجے کی سختی برقرار رکھی تھی۔

"وہ......وہ میں یہیں رہتی ہوں۔"

"جھوٹ مت بولو۔ بتاؤ کہاں سے آئی ہو؟"

"شہداد......شہداد پور سے۔" اس نے بتایا۔

"یہاں کس کے پاس آئی ہو۔ کہاں جا رہی ہو؟"

"اپنے کزن کے پاس۔" اس نے بتایا۔ "اس نے کہا تھا کہ رانجھے جنرل اسٹور کے پاس کھڑی ہو جانا میں آکر لے جاؤں گا۔"

"کیا تم نہیں جانتیں کہ تمہارا کزن کہاں رہتا ہے؟"

"نن......نہیں۔" اس نے گردن ہلا دی۔ اب وہ بہت گھبرائی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس کی فکر ہونے لگی تھی۔ اس لیے میں نے اس سے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ تم اپنے کزن کا کچھ دیر اور انتظار کرلو اور ہاں یہاں سے آگے نہیں جانا۔ تمہارے لیے تو بہت خطرہ ہے۔"

میں اس سے ذرا فاصلے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔

اب میں اپنے بارے میں بتا دوں۔ میرا نام فہیم ہے۔ فہیم نوید، پولیس سب انسپکٹر۔ میں اس شہر میں اکیلے ہی رہتا ہوں۔ والدین کسی اور شہر میں ہیں۔ ابھی تک شادی نہیں ہوئی اور مظلوموں کے لیے میرے دل میں سافٹ کارنر بھی ہے۔

میں شاعری بھی کرتا ہوں۔ اسی لیے رنگوں اور پھولوں سے محبت بھی ہے۔ میرے ساتھی پولیس والے میرا مذاق بھی اڑایا کرتے ہیں۔ "یار تجھے کس نے پولیس میں آنے کا مشورہ دیا تھا۔ جا کر کسی اسکول میں بچوں کو پڑھانا شروع کردے۔ وہی تیرے لیے بہتر رہے گا۔"

"کیوں کیا میں پولیس والا نہیں لگتا۔"

"میری جان پولیس والے اتنے نرم مزاج نہیں ہوا کرتے۔ تھوڑی سختی کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ یہ مجرم لوگ تو تجھے حلوہ سمجھ کر کھا جائیں گے۔"

بہرحال وہ اسی قسم کی باتیں کیا کرتے اور میں ان کی باتیں سن کر بھی اپنی روش پر قائم رہتا۔ کیا کرتا، میری فطرت ہی کچھ ایسی تھی۔

اس لیے اس تنہا لڑکی کو دیکھ کر بے چین ہو گیا تھا اور اس کے بارے میں جو اندازے لگائے تھے وہ صحیح ثابت ہوئے تھے۔

وہ اس شہر میں اجنبی تھی۔ وہ ایک چھوٹے شہر سے یہاں آئی تھی اور شاید یہ محبت وغیرہ کا چکر تھا اس لیے اس نے اپنا گھر چھوڑ دیا تھا۔ یہ کہنا چاہیے کہ وہ گھر سے بھاگ کر آئی تھی اور جس نے اس کو یہاں بلایا تھا وہ یا تو خود غائب ہو چکا تھا یا کسی وجہ سے آیا نہیں تھا۔

لڑکی بہت سہمی ہوئی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھے جا رہی تھی۔ آس پاس گزرتے ہوئے لوفر قسم کے لوگ اس پر آوازیں بھی کس رہے تھے۔ جس سے اس کی پریشانی میں اضافہ ہی ہو رہا ہوگا۔

پھر میں نے ایک شخص کو اس کی طرف آتے ہوئے دیکھا۔

وہی شاید اس کا کزن تھا۔ کیوں کہ وہ لڑکی اس کو دیکھ کر خوش ہو گئی تھی۔ اس شخص نے اس لڑکی سے کچھ باتیں کیں اور اس کی باتوں کے انداز نے میرے ذہن میں گھنٹیاں سی بجا دیں۔

میں اس شخص کو جانتا تھا۔

وہ باتیں کرنے کے دوران ایک ہاتھ سے اپنے ایک کان کو مسلتا رہتا تھا۔ اس قسم کی حرکات وسکنات کا مشاہدہ بھی ہماری ٹریننگ کا حصہ ہوا کرتا تھا۔

میں اس کی شکل تو بھول گیا تھا لیکن اس کی یہ عادت مجھے یاد رہی تھی۔ وہ ایک بار میرے تھانے میں لایا گیا تھا۔

وہ کسی گاؤں سے کسی لڑکی کو ورغلا کر شہر لایا تھا اور اسے چند ا کے یہاں فروخت کرنے والا تھا کہ وہ لڑکی کسی طرح اس کے چنگل سے بھاگ نکلی تھی۔

اس نے تھانے آکر پناہ لی تھی اور اس شخص کا ٹھکانا بتایا تھا جس پر اس کی گرفتاری بھی عمل میں آئی تھی۔ پھر نہ جانے کیوں اس کی ضمانت ہوگئی تھی۔

اس قسم کے ناسوروں کی ضمانت بہت جلد ہوجایا کرتی ہے۔ یہ کم بخت کبھی اپنی مکمل سزا کو نہیں پہنچتے اور آزاد ہو کر دوبارہ اپنی حرکتوں پر آجاتے ہیں۔

اس بار بھی وہ اس بے چاری لڑکی کے ساتھ یہی کھیل کرنے جارہا تھا کہ میں اچانک ان دونوں کے قریب پہنچ گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ سٹپٹا گیا تھا۔ ''کیوں یہاں کیا کھیل چل رہا ہے۔'' میں نے اپنے لہجے کو سخت بناتے ہوئے پوچھا۔ ''کہاں بیچے گا اس کو لے جاکر، کس سے سودا کیا ہے اس کا؟''

''دیکھیں یہ...... یہ میرا کزن ہے۔'' اس لڑکی نے کہا۔

''تم خاموش رہو بے وقوف، یہ لڑکیوں کا دلال ہے۔ دوبار پہلے بھی اس جرم میں جیل جاچکا ہے۔''

''سر میں تو...... میں تو اس سے...... میں تو ادھر سے گزر رہا تھا۔ یہ مجھ سے کسی کا پتا پوچھنے لگی تھی۔'' اس شخص نے بہانہ بنانے کی کوشش کی۔

وہ لڑکی بے یقین سی ہوکر اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

''تم لوگوں کو بھی فروخت ہونے کا شوق لگا رہتا ہے۔'' میں نے کہا۔ پھر اس کی طرف دیکھا۔ ''بتا کب آیا ہے جیل سے؟''

''پچھ...... لے...... پچھلے مہینے۔'' اس نے اٹکتے ہوئے جواب دیا۔

''کس اڈے پر اس کو بیچنا تھا۔''

''جی وہ......!''

میں نے ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کردیا۔ ''دفع ہوجا یہاں سے۔ آئندہ ایسی حرکت کی تو اتنی وارداتیں تیرے کھاتے میں لکھ دوں گا کہ زندگی بھر باہر نہیں آسکے گا۔''

میں اس وقت بات بڑھانے کی پوزیشن میں اس لیے نہیں تھا کہ اچھے خاصے لوگ جمع ہوچکے تھے اور خود لڑکی بھی شاید اس وقت اس کے خلاف کچھ نہیں بولتی۔ اس لیے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ کسی طرح اس لڑکی کو تو بچایا جائے۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔

وہ شخص اپنی جان چھوٹتے دیکھ کر فوری طور پر وہاں سے رخصت ہوگیا۔ میں نے ایک رکشا رکوایا اور لڑکی کو بیٹھ جانے کے لیے کہا۔

وہ اس وقت اتنی گھبرائی ہوئی اور خوف زدہ تھی کہ کسی مزاحمت کے بغیر رکشے میں بیٹھ گئی۔ میں نے رکشا والے کو اپنے فلیٹ کا ایڈریس بتا دیا تھا۔

وہ لڑکی میرے فلیٹ آکر بری طرح گھبرا گئی تھی۔

''یہ...... یہ آپ مجھے کہاں لے آئے ہیں؟''

''خاموش رہو۔'' میں نے اسے جھڑک دیا۔ ''سکون اور عافیت کی جگہ لے کر آیا ہوں۔ ورنہ اب تک چالیس پچاس ہزار میں بک چکی ہوتیں۔''

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

''نام کیا ہے تمہارا۔'' میں نے پوچھا۔

''نازیہ۔'' اس نے دھیرے سے جواب دیا۔

''جاؤ اپنے آپ کو سنبھالو۔'' میں نے کہا۔ ''وہ سامنے واش روم ہے۔ جاؤ جاکر منہ ہاتھ دھولو۔ میں جب تک تمہارے لیے چائے بناتا ہوں۔ چائے پی کر اپنے بارے میں بتانا۔''

وہ ابھی تک بے یقینی کی کیفیت میں تھی۔

جب میں نے دوبارہ کہا تو وہ واش روم چلی گئی۔ اس دوران میں میں نے اس کے لیے چائے تیار کرلی تھی اور کھانے پینے کی کچھ چیزیں بھی میز پر رکھ دی تھیں۔ وہ باہر آئی تو اس کی حالت میں واضح تبدیلی آچکی تھی۔

''بیٹھ جاؤ۔'' میں نے اشارہ کیا۔ ''مجھ سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

وہ خود کو سمیٹ کر ایک طرف بیٹھ گئی۔ میرے کہنے پر اس نے چائے کی پیالی اٹھالی تھی اور دوبارہ کہنے پر بسکٹ لینا شروع کردیے۔

''ہاں اب بتاؤ کہاں مل گیا تھا یہ؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے اپنی جو کہانی سنائی وہ وہی پرانی کہانی تھی جو

ہمارے ملک کی نہ جانے کتنی لڑکیوں کا مقدر ہوا کرتی ہے۔

ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ ماں کے انتقال کے بعد باپ نے دوسری شادی کر لی اور آنے والی ایک بے رحم اور سخت دل اور لالچی عورت نکلی۔

وہ اپنے کسی بھانجے بھتیجے سے نازیہ کی شادی کروانا چاہتی تھی۔ جب کہ نازیہ اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے انکار کیا تو ماں کے کہنے پر باپ اس پر سختیاں کرنے لگا۔ اس دوران مولا داد اس کے پڑوس میں اپنے کسی رشتے دار کے گھر آ کر رہنے لگا۔

یہ مولا داد ہی کمینہ تھا جو اس کو بھڑکا کر شہر لے آیا تھا۔ اس نے نازیہ کے حالات کسی طرح معلوم کر لیے اور اس کی مدد کے بہانے اس کے قریب ہو گیا۔

مختصر یہ کہ نازیہ اس کے بھڑکانے پر شہر چلی آئی تھی۔ اس نے بہت ہی خوب صورت خواب دکھائے تھے اس کو۔ یہ تھی اس کی کہانی۔

''سمجھ میں نہیں آتا کہ لڑکیاں اپنی آنکھوں پر پٹیاں کیوں باندھ لیتی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''انہیں اس بات کی پہچان ہی نہیں ہوتی کہ وہ جس کے ساتھ بھاگ رہی ہیں یا جس کے ساتھ زندگی گزارنے کی پلاننگ کر رہی ہیں وہ کیسا آدمی ہے۔''

''بس آنکھوں پر پٹی ہی بندھ گئی تھی۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے ایک کانٹے کو پھول سمجھ لیا تھا۔ پھر میرے پاس کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا۔ آپ بتائیں میں کیا کرتی۔ کس سے فریاد کرتی۔''

''اب کیا ارادہ ہے تمہارا؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' وہ پریشان ہو کر بولی۔ ''کہاں جاؤں، کیا کروں۔''

''یہ بتاؤ تمہارے غائب ہونے پر تمہارے گھر والوں نے کیا کیا ہوگا؟''

''کچھ بھی نہیں۔ باپ کو تو میری پروا ہی نہیں ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ عورت تھوڑا بہت ہنگامہ کر کے خاموش ہو گئی ہوگی اور کیا ہونا ہے۔''

''تمہارا کوئی رشتے دار وغیرہ نہیں ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''ایک خالہ ہیں۔ وہ لاہور میں رہتی ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''اماں کی زندگی تک وہ آیا کرتی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے بھی نہیں پوچھا۔''

''ان کے علاوہ۔''

''اور کوئی نہیں۔ ان ہی کے بیٹے بیٹیاں ہیں جو سب لاہور میں ہیں اور اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔ میری طرح بدنصیب کوئی نہیں ہے۔''

میں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ کیا کرنا چاہیے اس کا۔ اچھی لڑکی تھی۔ وقت نے اسے اس حال کو پہنچا دیا تھا۔

''اب میرا کیا بنے گا۔'' اس نے کچھ دیر بعد سوال کیا۔

''تمہیں سزا ملے گی۔'' میں نے کہا۔

''سزا؟'' وہ گھبرا گئی تھی۔

''ہاں تم نے گھر سے بھاگ کر ایک جرم کیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''حالات چاہے جیسے بھی رہے ہوں لیکن جرم پھر جرم ہی ہوتا ہے اور تم نے دیکھ لیا کہ میں پولیس کا ایک آفیسر ہوں۔ اس لیے قانون پر عمل کرنا میرا فرض بنتا ہے۔''

''جی...... جی ہاں۔'' وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی تھی۔ ''مجھ بدنصیب کو سزا تو ضرور ملنی چاہیے۔ میری قسمت ہی ایسی ہے بتاؤ کیا سزا دلواؤ گے مجھے۔''

''کھانے بنانے کی۔'' میں نے کہا۔

''کیا!'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''ہاں تمہاری یہی سزا ہوگی۔ تم میرے لیے دو چار دن کھانے بناؤ گی۔'' میں نے کہا۔ ''گھر کا کھانا کھائے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا ہے۔ کچھ آتا بھی ہے یا نہیں۔''

''کیوں نہیں آتا۔'' وہ پہلی بار مسکرائی تھی۔ ''سب کچھ آتا ہے۔''

''تو بس جلدی جلدی دیکھ لو کیا کیا چیزیں لانی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے کھانے بنانے کے لیے سارے برتن اور ضروری سامان موجود ہے ان کی پریشانی نہیں ہے۔''

''کیا آپ نے شادی نہیں کی یا......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

''اور کچھ نہیں...... بس شادی نہیں ہوئی۔'' میں نے کہا۔ ''بلکہ ایسا کرو۔ تم بھی میرے ساتھ چلو۔ دونوں مل کر سودا خریدیں گے۔''

وہ فوراً تیار ہو گئی۔

میں اسے لے کر قریب مارکیٹ کی طرف آ گیا۔ پہلی دفعہ کوئی لڑکی میرے ساتھ تھی اور میں کچھ خریداری کر رہا تھا۔ یہ بہت خوش گوار تجربہ تھا۔ بہت اچھا لگ رہا تھا اور خود

وہ بھی بہت دل چسپی اور شوق سے چیزیں لے رہی تھی۔ باقاعدہ مول تول کرتے، جھگڑے کرتے محسوس ہی نہیں ہورہا تھا کہ وہ کوئی ایسی لڑکی ہے جو اپنے گھر سے فرار ہو کر آئی ہے اور میرے لیے اجنبی ہے۔

ہم پرانے دوستوں کی طرح خریداریاں کر کے فلیٹ واپس آئے اور وہ کچن میں سامان سیٹ کرنے چلی گئی۔ مجھے کچھ دیر کے لیے اپنے تھانے تک جانا تھا۔ تاکہ ایک دو دن نہ آنے کی درخواست دے کر واپس آجاؤں لیکن الجھن یہ تھی کہ کیا میں اسے فلیٹ میں تنہا چھوڑ کر جاسکتا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ واپس آؤں تو یہ کہیں جا چکی ہو۔

میں نے جب یہی بات اس سے کی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''ٹھیک ہے۔ آپ کہیں نہ جائیں کیوں کہ آپ کو مجھ پر بھروسا نہیں ہوسکا ہے۔''

''ارے نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں خفیف سا ہو گیا تھا۔ ''تم آرام سے رہو۔ دروازہ اندر سے بند رکھنا۔ وہ سامنے ٹی وی ہے وہ ریموٹ ہے۔ میں بس دو چار گھنٹوں میں واپس آتا ہوں۔''

''ایک بات بتائیں۔ آپ مجھ پر بھروسا کیوں کرنے لگے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''یہی سوال تم سے ہے کہ تم کیوں بھروسا کرنے لگی ہو؟''

''اس لیے کہ میں ایک عورت ہوں اور عورت کی حِس ان معاملات میں بہت تیز ہوتی ہے۔ اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ کون اس کے لیے کیسا ثابت ہوگا۔''

''نازیہ۔ یہی کیفیت میری ہے۔'' میں نے کہا۔ ''خیر تم انتظار کرنا۔ میں جارہا ہوں۔''

''خدا حافظ۔'' وہ بہت اپنائیت سے بولی۔

میں نے تھانے پہنچ کر ضروری کام نمٹائے۔ دو دنوں کی چھٹی لی اور واپسی میں ایک مارکیٹ سے اس لڑکی کے لیے دو تین جوڑے بھی لے لیے۔ میں یہ دیکھ چکا تھا کہ وہ بے وقوف اپنے ساتھ کپڑے بھی نہیں لائی تھی۔

وہ بہت بے چینی سے میرا انتظار کررہی تھی۔ میں نے جب کپڑے اس کے سامنے رکھے تو وہ چہک اٹھی۔ ''او خدا، کتنے خوب صورت پرنٹس ہیں۔ کتنے خوب صورت کلرز ہیں۔ آج تک کسی نے میرے لیے اس قسم کی زحمت نہیں کی تھی۔''

''اور میں نے بھی آج تک کسی کے لیے اس قسم کی شاپنگ نہیں کی تھی۔'' میں نے کہا۔

''بس جلدی سے فریش ہو کر آجاؤ۔ کھانا تیار ہے۔''

اس نے کھانے بہت لذیذ بنائے تھے۔ پہلی بار میں اتنی خوشی اور گھریلو پن محسوس کررہا تھا۔ حالانکہ اس سے میرا کوئی رشتہ کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کے باوجود گھر میں اس کے ہونے کا احساس ہی توت دے رہا تھا۔

کھانے کے بعد میں نے اس سے کہا۔ ''جاؤ دوسرے کمرے میں جا کر سو جاؤ اور اندر سے دروازہ بند کرلینا۔''

''ایک بات تو بتائیں آپ میرے لیے یہ سب کیوں کررہے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''میں اپنا فرض ادا کررہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے جب تمہیں پہلی بار دیکھا تو اسی وقت اندازہ ہوگیا کہ تم کسی کے دھوکے میں آکر شہر تک آئی ہو۔ میں اس قسم کی بے شمار کہانیاں سن چکا ہوں اور بے شمار لڑکیوں کو دیکھ چکا ہوں اس لیے میں تمہارے پاس آیا۔ تاکہ تمہارے ساتھ اگر دھوکا ہورہا ہے تو اس دھوکے سے بچاسکوں۔''

''بس اتنی سی بات تھی۔'' اس نے کچھ عجیب نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''ظاہر ہے اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ خاموش ہوگئی۔ اس نے پھر برتن سمیٹے اور کچن میں رکھ آنے کے بعد میرے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ ''کیا کل صبح آپ مجھے واپس پہنچا دیں گے؟'' اس نے پوچھا۔ ''میرے لیے یہی بہتر ہے کہ میں اپنے گھر واپس چلی جاؤں۔''

''اور وہاں تمہارے ساتھ جو ہوگا اس کا کیا ہوگا؟''

''وہ میری قسمت۔ اب تک قسمت ہی کے ہاتھوں تو پریشان ہوتی آئی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ یہ تمہارا بہت مناسب فیصلہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہماری لڑکیوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔''

''بہت بہت شکریہ۔'' وہ کمرے کی طرف جانے لگی۔

''بات سنو۔'' میں نے اسے آواز دی۔

''جی فرمائیں۔'' وہ میری بات سننے کو رک گئی تھی۔

''میں تمہیں تمہارے گھر تک تو لے جاؤں گا لیکن واپسی میں تم میرے ساتھ ہوگی۔''

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں تمہیں تمہارے گھر والوں سے مانگنے کے لیے تمہارے ساتھ چلوں گا۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو۔"

اس کے چہرے پر کئی رنگ آگئے۔ یہ رنگ خوشی کے تھے۔ اس کے گہرے جذبے کے تھے۔ بے یقینی کے تھے اور اس کے ساتھ ہی اس نے رونا شروع کر دیا تھا۔ کسی بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔ "بے وقوف لڑکی۔ میں تو اس وقت سے تمہیں پسند کرنے لگا تھا۔ جب تمہیں پہلی بار دیکھا تھا اب یہ رونا دھونا بند کرو اور جا کر سو جاؤ۔ شاباش۔"

دوسری صبح بہت خوش گوار تھی۔

اس نے نہا کر میرے لائے ہوئے کپڑے پہن لیے تھے۔ ناشتا تیار کر لیا تھا۔ بالکل خیال رکھنے والی بیوی کی طرح۔ اس کے آنے سے میرے ویران فلیٹ میں زندگی چلی آئی تھی۔

ناشتے کے بعد چائے پینے کے دوران اس نے کہا۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم واپس نہ جائیں۔ میرا مطلب ہے آپ مجھے واپس نہ لے جائیں۔"

"وہ کیوں؟"

"نہ جانے کیوں ڈر سا لگ رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ مجھے واپس نہ آنے دیں۔ کسی بہانے روک لیں۔"

"نہیں ایسا نہیں ہو گا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں تمہیں لے جا رہا ہوں اور میں ہی واپس لاؤں گا۔"

"لیکن مجھے کیوں ڈر لگ رہا ہے۔"

"وہم ہے تمہارا۔" میں نے کہا۔ "تم ان لوگوں سے خوف زدہ ہو اس لیے تم پریشان نہ ہو۔ بس جلدی سے تیار ہو جاؤ۔"

"ایک بار پھر سوچ لیں۔ کیا میں یوں ہی نہیں رہ سکتی۔"

"نہیں نازیہ۔ اس میں بہت الجھنیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "میرا تعلق پولیس سے ہے اگر ان لوگوں نے رپورٹ لکھوا دی اور تم میرے پاس سے برآمد ہو گئیں تو ایک کہانی بن جائے گی۔ پولیس کے خلاف اسکینڈل بن جائے گا۔ ہاں تمہیں جا کر لے آؤں۔ عدالت میں تمہیں پیش کر دوں۔ عدالت تمہیں بالغ قرار دے کر اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کے لیے کہہ دے تو پھر کوئی الجھن نہیں ہو گی۔ تم خود مختار اور آزاد ہو گی جہاں چاہو اور جس کے ساتھ چاہو جا سکتی ہو۔"

"چلیں آپ کو یقین ہے تو میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔" اس نے کہا۔

ہم نے تیاری کی اور سفر کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہ بہت بجھے ہوئے دل کے ساتھ میرے ساتھ جا رہی تھی۔ میں نے اس کی یہ بات مان لی تھی کہ ہم پہلے اس کی ایک دوست کے گھر جائیں گے اور اس سے حالات معلوم کریں گے۔ وہ جو بتائے گی اس کے مطابق اس پر عمل کیا جائے گا۔

کئی گھنٹوں کے سفر کے بعد ہم اس کے شہر پہنچ گئے۔

بہت چھوٹا سا شہر تھا۔ جس طرح پاکستان کے دوسرے چھوٹے شہر ہوا کرتے ہیں۔

یہاں تو بڑے شہروں کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا۔ چھوٹے شہروں کا کہاں سے ہو گا۔ بہر حال ہم زینت کے گھر پہنچ گئے جو نازیہ کی سہیلی تھی۔

وہ نازیہ کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ دونوں بہت دیر تک ایک دوسرے سے لپٹ کر روتی رہی تھیں۔ زینت ہمیں اندر بیٹھک میں لے گئی تھی۔

سلیقے سے سجی ہوئی بیٹھک یہ بتا رہی تھی کہ زینت ایک سمجھدار لڑکی ہے۔ وہ بھی نازیہ کی ہم عمر ہی ہو گی۔

"نازیہ یہ کون ہیں؟" زینت نے خود پر قابو پاتے ہوئے میرے بارے میں پوچھا۔

"یہ بہت لمبی کہانی ہے زینت۔" نازیہ نے کہا۔ "اگر یہ صاحب میرے کام نہیں آتے۔ میری مدد نہیں کرتے تو خدا جانے میرا کیا حشر ہوتا۔"

بہر حال اس نے زینت کو ساری کہانی سنا دی کہ وہ کس طرح اس دھوکے باز کی باتوں میں آ کر کراچی گئی تھی اور کس طرح یہ پولیس والے صاحب مل گئے اور انہوں نے اس آدمی کو پہچان لیا۔ وہ لڑکیوں کا دلال تھا۔ پھر کس طرح میں ان پولیس والے کے ساتھ ان کے فلیٹ چلی گئی۔ انہوں نے کس طرح حوصلہ دیا اور یہاں تک لے کر آ گئے ہیں۔

زینت بہت حیران ہو کر پوری کہانی سنتی رہی تھی۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ۔" زینت نے مجھ سے کہا۔ "اس بدنصیب کی قسمت ہی ایسی ہے۔ ماں مر چکی ہے۔ سوتیلی ماں اپنے کسی بھانجے بھتیجے کی فکر میں ہے۔ باپ کو اس کی پروا ہی نہیں ہے۔ ایسے میں یہ ایک غلط قدم اٹھا

بیٹھی۔ نہ جانے اس کے ساتھ کیا ہو جاتا۔"
"ٹھیک کہتی ہو تم۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔
"ہمارے معاشرے میں اس قسم کی ہزاروں کہانیاں ہیں۔ لڑکیاں یوں ہی تباہ نہیں ہوتیں۔ ان کی تباہی کے پیچھے ان کے گھریلو حالات ہوتے ہیں۔"
"زینت میرے جانے کے بعد کیا ہوا؟" نازیہ نے پوچھا۔ "بابا نے شور ہنگامہ تو کیا ہوگا۔ پولیس میں تو رپورٹ کروائی ہوگی۔"
"کچھ بھی نہیں۔ اس نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔" زینت نے بتایا۔
"ارے وہ کیوں۔" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔
"انسپکٹر صاحب وہ اس لیے کہ اس بے چاری کا ہونا نہ ہونا برابر ہی ہے۔" اس نے بتایا۔ "انہوں نے یہی سوچا ہوگا کہ چلو خود ہی بھاگ گئی۔ جان چھوٹ گئی، ورنہ کچھ تو کرتے۔ کچھ بھی نہیں خاموش بیٹھے ہوئے ہیں۔ شاید محلے میں کسی کو بھی نہ معلوم ہو۔ میری بات اور ہے۔ میں تو بابا کو نازیہ کے بارے میں پوچھنے کو بھیجتی رہی تھی۔"
"تو تم سے کیا کہتے تھے؟" نازیہ نے پوچھا۔
"یہی کہ وہ اپنی کسی پھوپی کے پاس شہر گئی ہوئی ہے۔" زینت نے بتایا۔ "خیر یہ بتاؤ اب کیا ہوگا۔ کیا پروگرام ہے آپ دونوں کا؟"
"میرا پروگرام تو یہ ہے کہ میں نازیہ کو اپنانے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔" میں نے کہا۔
"یہ تو آپ بہت اچھا کام کریں گے۔" زینت خوش ہو کر بولی۔ "یہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ بس قسمت نے بھٹکا دیا تھا اس کو۔ آپ اس کا سہارا بن جائیں گے تو اس میں نئی زندگی آجائے گی۔ اس نے سوائے دکھ کے اور کچھ نہیں پایا ہے۔"
"اس لیے تو میں اس کو دکھوں کے بھنور سے نکالنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن ایسے نہیں قانونی طور پر۔ میں چاہتا ہوں کہ کم از کم اس کے والد سے ضرور ملاقات کر لوں۔ پھر ہنسی خوشی میں اس کا ہاتھ تھام لوں۔ کسی رکاوٹ کے بغیر۔ تاکہ بعد میں اس کے گھر والوں کی طرف سے کوئی الجھن نہ ہو۔"
"تو پھر ایسا کرتی ہوں میں نازیہ کے ابو کو یہاں بلا کر لے آتی ہوں۔ انہیں بالکل نہیں بتاؤں گی کہ کیا معاملہ ہے۔ کون آیا ہے۔"

کائنات

ہم سب جانتے ہیں کہ ہماری کائنات ہر گزرتے لمحے کے ساتھ پھیل رہی ہے اور اس سے انکار ممکن نہیں۔ یہ حقیقت بھی ناقابلِ تردید ہے کہ اس عمل کی رفتار مسلسل بڑھ رہی ہے مگر اس سے زیادہ کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ بیش تر سائنسدان اس کا الزام تاریک توانائی (بلیک ہول) پر دھر دیتے ہیں جو کہ ان کے مطابق ہماری کائنات میں جگہ جگہ موجود ہیں مگر ہم نہیں جانتے کہ ان کے اندر کیا ہے اور یہ کیا کام کرتے ہیں۔ اب کہا جا رہا ہے کہ اس کا جواب ممکنہ طور پر کوئنٹم کشش ثقل میں چھپا ہوا ہے مگر وہ بھی انسانی غلطی محسوس ہوتا ہے کیوں کہ سائنس کے اصولوں کے مطابق دیکھا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ کائنات خود اپنے اصولوں کی نافرمانی کر رہی ہے اور ہم بس یہ اندازہ ہی کر سکتے ہیں کہ ایسا کیوں رہا ہے۔

مرسلہ: احسان سحر۔ میانوالی

"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔" نازیہ نے بھی تائید کی۔ "تم چپکے سے ابا کو بلا کر لے آؤ اس عورت کو پتا نہ چلے۔ ورنہ وہ آفت کھڑی کر دے گی۔"
زینت، نازیہ کے باپ کو بلانے چلی گئی۔ اس دوران نازیہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ "خدا جانے وہ مانیں گے یا نہیں۔"
"کیوں نہیں مانیں گے۔" میں نے کہا۔ "ان سے سلیقے سے بات کی جائے گی تو مان ہی جائیں گے۔"
"ناراض تو بہت ہوں گے۔"
"ظاہر ہے۔ ناراض ہونا تو ان کا حق ہے۔ تم نے حرکت ہی ایسی کی تھی۔"
کچھ دیر بعد زینت ایک آدمی کو اپنے ساتھ لے کر آگئی۔ وہی نازیہ کا باپ تھا۔ وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے نازیہ کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر نازیہ روتی ہوئی اس سے جا کر

لپٹ گئی۔ ”مجھے معاف کردے بابا، معاف کردے۔ مجھ سے بہت بھول ہوگئی۔“

”پگلی تو نے مجھے بتا تو دیا ہوتا۔“ اس نے کہا۔ ”میں باپ ہوں تیرا۔ میں تجھے جہنم میں تو نہیں جھونک سکتا تھا۔“

”میں یہی سمجھی تھی بابا کہ تم میری شادی اس کمینے سے کردو گے۔ وہ اماں کا لاڈلا ہے۔ اس لیے میں گھر سے چلی گئی۔“

”ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ میں نے ماں بن کر پالا ہے تجھ کو۔ تجھ پر ظلم کیسے کرسکتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”خدا کا شکر ادا کریں کہ آپ کی بیٹی واپس آگئی ہے۔“ میں بول پڑا۔

”آپ کون ہیں جی؟“ اس نے پوچھا۔

نازیہ نے اسے میرے بارے میں بتادیا کہ میں نے کس طرح زینت کو بدمعاشوں سے بچایا۔ اسے پناہ دی اور اپنے ساتھ یہاں تک لے آیا ہوں۔

”آپ کی بڑی مہربانی جی۔“ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ”آپ نے تو مجھ پر احسان ہی کردیا ہے۔“

”چاچا! یہ بہت بڑے پولیس آفیسر ہیں۔“ زینت نے بتایا۔ ”اور یہ ہمیشہ کے لیے تمہاری نازیہ کو اپنا بنانا چاہتے ہیں۔“

”کیا!“ وہ خوش ہوگیا تھا۔ ”یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟ ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔“

”جی جناب بات یہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کی بیٹی نازیہ بہت اچھی لڑکی ہے جب کہ میں آپ کے سامنے ہوں۔ اب تک کوئی مناسب رشتہ نہیں مل سکا تھا۔ پھر نازیہ مل گئی ہے اور یہ احساس ہوگیا کہ میری زندگی میں جس کی کمی تھی وہ کمی اس لڑکی سے پوری ہوسکتی ہے۔ میں اس کو لے کر یہاں اپنے رشتے کی بات کرنے آیا ہوں۔“

”مجھے تو یقین نہیں آرہا ہے۔ ہم تو غریب لوگ ہیں ہمارے پاس ہے کیا۔“

”مجھے کچھ نہیں چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”خدا کا دیا سب کچھ ہے میرے پاس۔ بس آپ کی رضامندی چاہیے۔“

”بیٹا۔“ اس کی آواز فرط جذبات سے کانپ رہی تھی۔ ”میرے لیے اس سے بڑی بات اور کیا ہوگی میری بیٹی تو خوش قسمت نکلی کہ اسے تم جیسا آدمی مل گیا ہے۔“

”چاچا تو پھر جلدی سے مولوی کو بلوا کر دو بول پڑھوا دو۔“ زینت نے کہا۔ ”سب کچھ اس طرح ہو کہ چاچی کو پتا نہ چلے۔“

”کیا پاگل ہوگئی ہو۔ میری بیٹی اب ایسی گئی گزری بھی نہیں ہے کہ اس طرح گھر سے رخصت ہوگی۔ اس کی برات آئے گی اب مجھے چاچی واچی کسی کی پروا نہیں ہے۔ میں اپنی بیٹی کی خوشی میں خوش ہوں۔“

”بابا۔“ نازیہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔

”ہاں بیٹا۔“ اس نے نازیہ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”لعنت ہے ایسے باپ پر جو اپنی اولاد کی ایسی خوشی بھی پوری نہ کرسکے۔“ اس نے میری طرف دیکھا۔ ”آپ جائیں جی اور ٹھیک ایک ہفتے کے بعد آجائیں۔ کچھ بھی ہو رخصتی کرنی ہے۔ اب ایسا تو نہیں ہوسکتا کہ میں اپنی بیٹی کو خالی ہاتھ رخصت کردوں۔“

”دیکھیں میں نے کہا نا کہ خدا کا دیا سب کچھ ہے ہمارے پاس۔“

”آپ کا کہنا سرآنکھوں پر لیکن ایک باپ کو اس کا فرض ادا کرنے سے تو نہ روکیں۔“

اب اس کے بعد میں کیا کہہ سکتا تھا۔ ہمارے تو سارے اندیشے ہی باطل ثابت ہوگئے تھے۔ ہم نے کیا سمجھا تھا کہ یہ ہوگا۔ وہ ہوگا۔ ایک ہنگامہ کھڑا ہوجائے گا لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہورہی تھی۔

سب کچھ بہت نارمل انداز سے طے پاگیا تھا اور اس کی وجہ یہی تھی کہ چاہے کچھ بھی ہو وہ آدمی نازیہ کا باپ تھا۔ نازیہ اولاد تھی اس کی۔ ایک باپ نے اپنی بیٹی کے چہرے پر خوشی کے تاثرات دیکھ لیے تھے۔ اس نے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ اس کی بیٹی کہاں اور کس کے ساتھ خوش رہ سکتی ہے۔

نازیہ بھی بہت خوش اور مطمئن تھی۔

”آپ کتنے آدمیوں کی برات لائیں گے؟“ اس نے پوچھا۔

”ارے جناب برات کیسی، بس دو چار دوست ہوں گے اور کون ہوگا۔“ میں نے بتایا۔

”لیکن پھر اس شرط پر آئیں گے کہ آپ لوگوں کو دو چار دنوں تک یہاں رکنا ہوگا۔“ اس نے کہا۔ ”یہ ہماری روایت ہے۔ ہم براتیوں کو اتنی جلدی واپس نہیں جانے دیتے۔“

”آپ کی مرضی ہے۔ مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔“

سب کچھ خوش اسلوبی سے طے پا گیا۔ زندگی نے مجھے ایک سبق یہ بھی دیا ہے کہ اگر کسی کام کو کرنے کا ارادہ ہو تو قدم اٹھا لو۔ کامیابی یا ناکامی بعد کی باتیں ہیں۔

پولیس کی نوکری میں، میں نے یہی دو باتیں تو سیکھی تھیں۔ اول یہ کہ چہروں کو غور سے پڑھو۔ یہ چہرے انسان کے دل کے آئینہ ہوتے ہیں۔ اندر کی صورتِ حال بتا دیتے ہیں۔ نازیہ کے معاملے میں تو ایسا ہی ہوا تھا۔ میں نے اسے دیکھا اس کے چہرے کو غور سے پڑھا اور یہ اندازہ ہو گیا کہ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے اور میرا اندازہ بالکل صحیح نکلا۔

اور دوسرا سبق میں نے یہ سیکھا تھا کہ اگر کسی کام کے کرنے کا ارادہ باندھ لیا ہو تو اسے کر گزرو۔ اگر میں سوچتا ہی رہتا کہ نازیہ کے باپ کے پاس جاؤں یا نہ جاؤں تو یہاں تک نوبت ہی نہیں آتی۔ میں نے ایک قدم اٹھایا اور کامیاب ہو گیا۔

بہرحال نازیہ کو وہیں چھوڑ کر میں واپس آ گیا۔ اُمیدوں اور خوشیوں سے بھرا ہوا۔ نازیہ جیسی سمجھدار لڑکی میری زندگی کی ساتھی بننے والی تھی۔

میں نے بھی اس ایک ہفتے کے دوران اپنے طور پر کچھ تیاریاں کر لیں۔ نازیہ کے لیے جیولری اور دو چار قیمتی جوڑے خرید لیے۔

یہ ساری خریداری میں نے اپنی ایک پڑوسن کی مدد سے کی تھی۔ وہ بھی یہ جان کر بہت خوش ہوئی تھی کہ میں اپنی دلہن لانے جا رہا ہوں۔

ظاہر ہے ہر ایک کو یہ تو نہیں بتا سکتا تھا کہ نازیہ کون ہے اور کن حالات میں ملی ہے مجھے۔ بس یہی بتا تا رہا کہ کسی دور کے عزیز نے رشتہ لگوایا ہے۔

میں مقررہ تاریخ کو اپنے دو دوستوں کو لے کر نازیہ کے شہر پہنچ گیا۔ اس کی دوست زینت نے یہ کہا تھا کہ ہم سب سے پہلے اس کے گھر اتریں گے۔ پھر وہاں سے کچھ اور آدمی مل کر نازیہ کی طرف جائیں گے اس بار زینت کا شوہر نعیم بھی موجود تھا وہ بھی زینت ہی کی طرح ایک معقول اور ہمدرد انسان دکھائی دیا تھا۔

مہمانوں کا استقبال شربت سے کیا گیا۔ ہمیں بڑی عزت اور احترام کے ساتھ بیٹھک میں لے جا کر بٹھایا گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ زینت اور اس کا شوہر کچھ کہنا چاہتے ہیں کوئی ایسی بات جو میرے دوستوں کے سامنے شاید نہیں ہو سکتی تھی۔ میں ان کے اشارے کو سمجھ کر اس کمرے سے باہر آ گیا۔

’’آپ کے ساتھ تو بڑا دھوکا ہوا ہے جی۔‘‘ زینت نے کہا۔

’’کیسا دھوکا؟‘‘

’’آپ کے جانے کے بعد نازیہ کے باپ نے نازیہ کی شادی کہیں اور کر دی اور وہ لوگ اب یہاں سے جا چکے ہیں۔‘‘

’’کیا کہہ رہی ہو تم؟‘‘

’’ہاں جی، یہی ہوا ہے۔‘‘ زینت کے شوہر نے بھی تصدیق کی۔ ’’نازیہ کا باپ تو ایک نمبر کا کمینہ اور جھوٹا انسان نکلا۔‘‘

’’اور اس نے جو اتنی باتیں کی تھیں؟‘‘

’’وہ سب جھوٹی تھیں۔ مکاری تھی اس کی۔‘‘ زینت نے کہا۔ ’’آپ چاہیں تو خود جا کر دیکھ لیں۔‘‘

’’اب دیکھنے کو کیا رہ گیا ہے۔‘‘ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ’’بہرحال تم لوگوں کا شکریہ۔‘‘

’’ہمیں تو بہت افسوس ہے جی کہ آپ جیسے بھلے آدمی کے ساتھ ایسا دھوکا ہوا۔‘‘

’’نہیں اس میں افسوس کی کوئی بات نہیں ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’میری قسمت میں ایسا ہی تھا۔ اب میں اس بے چاری کے لیے صرف دعا ہی کر سکتا ہوں۔ وہ جہاں رہے خوش رہے۔‘‘

میرا دل ہی جانتا ہے کہ میں کس طرح وہاں سے واپس آیا تھا لیکن زندگی نے مجھے تیسرا سبق بھی سکھا دیا تھا۔ وہ سبق یہ تھا کہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ پولیس والے چہروں کو پڑھنا جانتے ہوں۔ بہت سے چہرے ایسے بھی ہوتے ہیں جو ذہین سے ذہین کو بھی الو بنا سکتے ہیں جس طرح میں بن گیا تھا۔

کئی برس گزر چکے ہیں۔ خدا جانے نازیہ کہاں اور کس حال میں ہو گی لیکن میں، اب تیسرا سبق لینے کے بعد پہلے سے کہیں زیادہ محتاط ہو گیا ہوں۔

اب اگر کوئی اس قسم کی لڑکی بھٹکتی ہوئی ملتی ہے تو اس کی مدد کے لیے بھی نہیں جاتا۔ خدا مجھے معاف کرے لیکن نازیہ کے باپ جیسے آدمیوں نے انسانوں پر سے میرا اعتماد ختم کر دیا ہے۔

محترم مدیر

سلام شوق

یہ روداد مجھے کچھ تعجب خیز لگی ہے اس لیے میں نے اسے خصوصی طور پر سرگزشت کے لیے لکھ لیا ہے۔ کیوں کہ سرگزشت میں صرف سچ بیانی چھپتی ہے۔

رزاق شاہد کوہلر
(پارک، ڈیرہ اسماعیل خان)

منظر دل کو موہ لینے والا تھا۔ چاروں طرف پھل دار درخت تھے جن پر ہمہ قسم کے پھل موجود تھے۔ وہاں پھولوں کی بہتات تھی۔ سورج پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا مگر اس کی تمازت میں چاند کی روشنی جیسی ٹھنڈک تھی۔ دھیمی دھیمی ہوا چل رہی تھی، ہوا کی اس سرسراہٹ میں ایک نغمگی تھی جو سماعتوں میں رس گھولتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔ یہ ایک نہایت ہی خوب صورت وادی تھی، اتنی حسین وجمیل کہ لگتا تھا جیسے جنت کا کوئی ٹکڑا اٹھا کر زمین پر رکھ دیا گیا

ہو۔ وہاں ایک چشمہ بھی رواں تھا۔ اس چشمے کا پانی اس قدر صاف وشفاف تھا کہ اس کی تہ میں سنہری ریت اور رنگ برنگے پتھروں کے ٹکڑے چمکتے ہوئے نظر آجاتے تھے۔ خوش آواز پرندے پھل دار درختوں پر چہک رہے تھے جب کہ قسم قسم کی رنگین تتلیاں پھولوں پر منڈلا رہی تھیں۔ اس قدر حسین پرندے اور رنگین تتلیاں وہ زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ سارا منظر اس کے لیے نیا تھا، بلکہ نیا کیا اس کے تصور سے بھی ماورا تھا۔

وہ سحر زدہ سا چشمے کے کنارے کھڑا تھا کہ ایسے ہی وقت چشمے کے دوسرے کنارے پر موجود پھولوں کی اوٹ سے ایک پری پیکر نمودار ہوئی جو سرتاپا سفید ریشمی لباس میں ملبوس تھی۔ وہ کچھ اس انداز میں چل رہی تھی جیسے ہوا میں تیر رہی ہو، بہ ظاہر وہ بڑے پُروقار انداز میں قدم اٹھا رہی تھی مگر اس کے پاؤں زمین کو چھوتے ہوئے محسوس نہیں ہو رہے تھے۔ وہ جو پہلے ہی فطرت کے حسین مناظر دیکھ کر سحر زدہ سا تھا، یہ منظر دیکھ کر پتھر کا بت بن کر رہ گیا۔ عورت چشمے کے کنارے پہنچ کر عین اس کے سامنے رک گئی۔ عورت کے حسین چہرے پر رنج وملال کے آثار تھے۔ جیسے وہ بہت تکلیف میں ہو۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے بے بسی جھلک رہی تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔ عورت کے آنسو دیکھ کر اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔ وہ اسے تسلی دینے کے لیے لب کشائی کرتا مگر اس کی آواز جیسے حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ اپنی پوری توانائی صرف کرنے کے باوجود وہ بول نہیں پایا۔ تب اس پر ایک بے بسی کی کیفیت طاری ہوگئی۔

عورت اگرچہ اس کی ہم عمر تھی مگر وہ اس کے حسن سے قطعی متاثر نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس وہ اپنے دل میں عورت کے لیے بے حد وبے حساب احترام کے جذبات محسوس کر رہا تھا۔ ایسے جذبات اس سے قبل اس نے کسی عورت کے لیے محسوس نہیں کیے تھے۔ وہ ان جذبات کو کوئی بھی نام دینے سے قاصر تھا۔

وہ عورت سے سوال کرنا چاہتا تھا، اس سے اس قدر ملول اور رنجیدہ ہونے کا سبب پوچھنا چاہتا تھا لیکن اس کی قوت گویائی سلب تھی۔ اپنی پوری کوشش کے باوجود وہ ایک لفظ بھی نہیں بول پایا۔ عورت کچھ دیر تک اس کے سامنے ٹھہری رہی اور پھر جیسے آئی تھی ویسے ہی پلٹ گئی۔ جب وہ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تو اس کی گویائی بھی پلٹ آئی۔ اس نے چیخ کر عورت کو روکنے کے لیے کہا مگر اس دوران وہ بہت دور جا چکی تھی۔ اس کی آواز شاید عورت کی سماعتوں تک نہیں پہنچ پائی مگر وہ مسلسل اسے پکارتا چلا گیا۔ ایک طرح سے اس پر ہذیانی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ لیکن وہاں اس کی چیخیں سننے والا کوئی نہیں تھا۔ نڈھال ہوکر وہ رونے لگا، روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔

☆......☆

”علی.... علی.... اٹھو.... یہ کیا بے ہودگی ہے..... نیند میں کسے پکار رہے ہو؟“ معاً اس کی سماعتوں سے ایک شناسا نسوانی آواز ٹکرائی اور پھر ایک ہاتھ نے اسے جھنجوڑ کر جگادیا۔

”وہ...... وہ..... کہاں گئی؟“ اس نے ایک دم اٹھ کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”کون کہاں گئی؟“ اس کی بیوی میمونہ نے ہنس کر پوچھا۔ ”کیا تم نے پھر وہی خواب دیکھا ہے؟“

”ہم.... میں نے اسے سچ دیکھا ہے...... لیکن مجھے سمجھ نہیں آتی کہ جب وہ میرے پاس آئی تو اس وقت میری قوت گویائی کیوں سلب ہوگئی؟“ اس نے پریشان کن انداز میں سوال کیا۔

”ہوش میں آؤ جناب عزت مآب علی صاحب! اس وقت تم اپنے بیڈروم میں ہو..... پھر تم نے اسے سچ کیسے دیکھ لیا؟“ میمونہ کے انداز میں جھنجلاہٹ اور جیلسی کی ملی جلی کیفیت تھی۔ وہ عورت تھی اور اپنے شوہر کو کسی غیر عورت کے لیے پریشان اور فکر مند نہیں دیکھ سکتی تھی۔

”ہاں.... شاید میں نے اسے خواب ہی میں دیکھا ہے..... مگر..... مگر وہ مجھ سے بولتی کیوں نہیں؟“ اس کے لہجے میں پریشانی تھی۔

میمونہ نے جل کر کہا۔ ”تمہیں اس کے نہ بولنے کی پریشانی کیوں ہے؟.... مجھ سے بولو ناں! میں مر تو نہیں گئی؟“

”بکواس مت کرو جاہل عورت۔“ وہ ایک دم بگڑ گیا۔

”ٹھیک کہتے ہو جناب۔“ میمونہ روہانسی ہوگئی۔ ”وہ خوابوں والی یقیناً مجھ سے زیادہ خوب صورت ہوگی ورنہ تم اس کے لیے یوں پریشان نہ ہوتے؟“

”تم پڑھی لکھی جاہل ہو..... وہ خواب ہے حقیقت نہیں ہے اور پھر میں اس کے لیے ایسے ویسے جذبات بھی

محسوس نہیں کرتا۔'' علی نے اپنی صفائی پیش کی۔ ''تم منفی انداز میں کیوں سوچتی ہو........ مثبت سوچا کرو۔''

''میں مثبت سوچتی رہوں اور تم اس ڈائن کے خواب دیکھتے رہو........ نہ جانے کون منحوس ہے؟''

علی کے دل پر ایک چوٹ سی لگی، اس کا جی چاہا کہ وہ میمونہ کے چہرے کو تھپڑوں سے لال کردے لیکن وہ غصہ پی گیا۔ اگر وہ ایسا کوئی قدم اٹھاتا تو سب اس پر ہنستے اور اس کا مذاق اڑاتے۔ یہ بات اسے کسی صورت منظور نہیں تھی۔ وہ اپنا اور میمونہ کا تماشا بنانا نہیں چاہتا تھا۔ تاہم اب وہ میمونہ کو غصے سے گھور کر رہ گیا۔

میمونہ نے کہا۔ ''میں جانتی ہوں کہ تمہیں مجھ پر غصہ آرہا ہے لیکن میں کسی صورت یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ میرا شوہر کسی غیر عورت کے خواب دیکھتا رہے۔''

''تعلیم یافتہ ہوکر جاہلوں والی باتیں مت کرو........ خواب کوئی اپنی مرضی سے نہیں دیکھتا۔ میں تو خود تنگ ہوں ان خوابوں سے........ مجھے پریشان کرکے رکھ دیا ہے ان خوابوں نے۔''

''خوابوں نے یا خوابوں والی نے؟'' اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''یہ دیکھ........'' وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ''مجھے پریشان نہ کرو، میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں........ خدا کے لیے چلی جاؤ یہاں سے، مجھے کچھ دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دو........ پلیز........''

''او کے۔'' وہ ناراض انداز میں دروازے کی طرف بڑھی مگر پھر پلٹ کر بولی۔ ''ناشتا لاؤں کیا؟''

''ابھی نہیں تھوڑی دیر کے بعد لانا۔''

''آفس کی دیر ہوجائے گی، آٹھ تو بج چکے ہیں۔''

''میں آج آفس نہیں جاؤں گا۔'' اس نے جواب دیا اور میمونہ بغیر کچھ کہے باہر نکل گئی۔

☆......☆
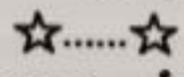
خوابوں نے محاورتاً نہیں، حقیقتاً علی کی زندگی میں زہر گھول دیا تھا۔ ابتدا میں تو وہ یہ خواب مہینے میں ایک دوبار ہی دیکھتا تھا۔ مگر پھر آہستہ آہستہ ان خوابوں میں تواتر آنے لگا تو اس کی پریشانی بڑھنے لگی۔ اب تو اسے خواب میں نظر آنے والی عورت پر غصہ آنے لگا تھا مگر وہ بے بس تھا۔ اس عورت کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ خوابوں کو بھی نہیں روک سکتا تھا۔ اسے کئی بار میمونہ کے سامنے شرمندہ ہونا پڑا۔ میمونہ اگرچہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی اور اس کی پریشانی کو سمجھتی تھی لیکن خواب میں اس کا کسی غیر عورت کو پکارنا اور پھر رونا میمونہ کو سخت ناپسند تھا۔ یہ اس کی نسوانیت کی توہین تھی جو اسے کسی صورت منظور نہیں تھی۔ وہ گاہے گاہے اس سے جھگڑنے لگی اور علی روز بروز چڑچڑا ہوتا چلا گیا حالانکہ ان دونوں کی شادی ایک طوفانی محبت کا نتیجہ تھی لیکن اب ان دونوں کے بیچ ایک دراڑ پڑنے لگی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے دور ہونے لگے تھے۔ چار سال قبل ہی تو ان کی بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی تھی۔ بڑی مشکلوں کے ساتھ اور اپنے بزرگوں سے لڑ جھگڑ کر انھوں نے ایک دوسرے کو پایا تھا مگر اب ان کی یہ جنونی محبت ہوا میں تحلیل ہوگئی تھی۔ البتہ اس جنونی محبت کی نشانی فیضان کی صورت میں ان کے پاس موجود تھی۔

ان کے روز روز کے جھگڑوں سے ننھا فیضان بھی متاثر ہورہا تھا لیکن اس طرف ان کا دھیان ہی نہیں جارہا تھا۔ فیضان ابھی بہ مشکل تین سال کا ہی تھا۔ ابھی تو وہ اچھی طرح بول بھی نہیں سکتا تھا، تاہم جب وہ دونوں ایک دوسرے پر چلاتے تھے تو فیضان رونے لگتا تھا۔ ''پاپا پاپا... ممی ممی'' پکارتا رہتا تھا لیکن اس معصوم کی پکار ان دونوں کی سماعتوں تک نہیں پہنچ پاتی تھی۔ دوبار میمونہ روٹھ کر اپنے میکے بھی جاچکی تھی۔ ہر بار اسے علی ہی منا کر لایا تھا، اس وعدے کے ساتھ کہ آئندہ وہ جھگڑا نہیں کرے گا مگر علی کے خواب دوبارہ انہیں لڑنے کے مواقع فراہم کردیتے تھے۔ یہ خواب نہیں تھے بلکہ عذاب تھے جنھوں نے اس کی ہنستی بستی زندگی میں زہر گھول دیا تھا۔

چھٹی کا دن تھا۔ چونکہ اس روز آفس نہیں جانا پڑتا تھا۔ اس لیے علی دیر گئے تک سویا رہتا تھا۔ میمونہ بھی جان بوجھ کر اسے نہیں جگاتی تھی۔ اس کی وجہ ایک تو ان کے تعلقات کی ناچاقی تھی اور دوسری وجہ علی کے خواب تھے، جو وہ اب تقریباً بلاناغہ دیکھنے لگا تھا۔ اس روز میمونہ نہ جانے کیا سوچ کر اسے اٹھانے کے لیے بیڈروم میں داخل ہوئی تو علی حسبِ معمول روتی ہوئی آواز میں اسی خوابوں والی عورت کو پکار رہا تھا۔ ''سنو........ پلیز رک جاؤ........ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں........ خدا کے لیے........ مجھے بتادو........ تم کون ہو........ کہاں سے آتی ہو........ پلیز رک جاؤ........ پلیز رک جاؤ........ پلیز رک جاؤ........'' آہستہ آہستہ علی کی آواز سسکیوں میں ڈھل گئی اور بدن لرزنے لگا۔

یہ منظر میمونہ کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ پل بھر میں اس کا خوب صورت چہرہ غصے کی شدت سے لال بھبوکا ہوگیا اور آنکھیں جیسے انگارے برسانے لگیں۔ وہ بے قابو ہوکر آگے بڑھی اور علی کو بے دردی کے ساتھ جھنجوڑ کر جگادیا۔

''م......میں شاید......پھر وہی خواب دیکھ رہا تھا۔'' وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔

''ہاں۔'' وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح غرائی۔ ''تم اسی کمینی کو کسی بھکاری کی طرح پکار رہے تھے لیکن اب میں یہ بے غیرتی مزید برداشت نہیں کروں گی......بتاؤ مجھے وہ کون ہے؟ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔''

''شٹ یور ماؤتھ۔'' وہ چلایا۔ ''میں تمہاری اس روز روز کی بکواس سے تنگ آچکا ہوں۔ اب اگر تم نے اس کے خلاف اپنی گندی زبان استعمال کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا......بہت سن چکا ہوں تمہاری بک بک۔''

''ایک بار نہیں سو بار کروں گی، تم کیا بگاڑ لوگے میرا؟'' وہ بھی چلائی۔ ''میں کسی ایرے غیرے کی بیٹی نہیں ہوں۔ یہ دھونس کسی اور پر چلانا سمجھے تم......میں اسے کتیا تو کیا بازاری اور طوائف......''

آخری الفاظ ابھی اس کی زبان پر ہی تھے کہ علی ایک جھٹکے......کے......ساتھ......اٹھا۔ اور پھر کمرا ''تڑاخ......تڑاخ......تڑاخ'' کی آواز سے گونج اٹھا۔ میمونہ کے رخسار پر پڑنے والے یہ طمانچے بہت زوردار تھے۔ اس کا دماغ جھنجھنا اٹھا جب کہ اس کے رخسار پر علی کی انگلیوں کے نشان ثبت ہوکر رہ گئے تھے۔ اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کا شوہر اس پر ہاتھ اٹھائے گا۔ چند لمحے تو وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے علی کی طرف دیکھتی رہی پھر اس کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔ وہ پلٹی اور دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

یہ سب کچھ اس قدر سرعت کے ساتھ وقوع پذیر ہوا تھا کہ علی سمجھ ہی نہ سکا۔ وہ کوئی نادیدہ قوت تھی جس نے علی کو یہ انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کردیا تھا ورنہ میمونہ پر ہاتھ اٹھانے کے متعلق تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ اس کی ذرا سی تکلیف بھی اس سے برداشت نہیں ہوا کرتی تھی......مگر آج اس نے تھپڑ مار مار کر میمونہ کا چہرہ لال کردیا تھا اور وہ بھی ایک انجان اور ان دیکھی عورت کی خاطر جس کا شاید کوئی وجود ہی نہیں تھا، جو صرف ایک خواب تھی۔ دوسرے ہی لمحے احساس ندامت اس پر غالب آگیا۔ اس نے اپنی دائیں ہتھیلی کو غور سے دیکھا اور پھر پاگلوں کی طرح کمرے کی پختہ دیوار پر مکے برسانے لگا۔

''کیوں......کیوں......کیوں کیا میں نے ایسا؟'' مکے برساتے ہوئے وہ ہذیانی انداز میں چلارہا تھا۔ ''میں......میں......یہ ہاتھ ہی توڑ ڈالوں گا جو میمونہ پر اٹھا تھا۔''

پختہ دیوار نے اس کے ہاتھ کو لہولہان کرڈالا تھا لیکن جب تک ہمت رہی وہ مکے برساتا رہا۔ اس کے بعد وہ نڈھال ہوکر وہیں گر گیا اور دبی دبی آواز میں رونے لگا۔

☆......☆

میمونہ بستر پر اوندھی لیٹی ہچکیوں میں رو رہی تھی کہ ایسے ہی وقت ان کی گھریلو ملازمہ رشیدہ کمرے میں داخل ہوئی اور پریشانی کے عالم میں بولی۔ ''بی بی جی! وہ صاحب اپنے کمرے میں بے ہوش پڑے ہوئے ہیں اور ان کا دایاں ہاتھ بھی بہت بری طرح زخمی ہے۔''

''کیا......کیا کہہ رہی ہو؟'' وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے تک تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھے۔''

''خود چل کر دیکھ لیں بی بی جی! میں سچ کہہ رہی ہوں۔'' ملازمہ نے جواب دیا۔

میمونہ بستر سے اتر کر ننگے پیر تقریباً دوڑتے ہوئے علی کے کمرے میں داخل ہوئی تو واقعی علی بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ اس نے فوراً علی کا سیل فون اٹھایا اور اپنے فیملی ڈاکٹر کا نمبر پنچ کرنے لگی۔ ''ہیلو......'' رابطہ ہوتے ہی وہ چلائی۔ ''پلیز ڈاکٹر صاحب! جلدی سے آجائیں......وہ......وہ علی اپنے بیڈروم میں بے ہوش پڑے ہیں اور ان کا دایاں ہاتھ بھی بری طرح زخمی ہے......پلیز جلدی کریں۔''

''اوکے مسز علی! ڈونٹ وری میں ابھی آرہا ہوں۔'' ڈاکٹر نے کہا اور رابطہ منقطع کردیا۔

ڈاکٹر کا کلینک ان کے گھر کے نزدیک ہی واقع تھا چنانچہ وہ پندرہ بیس منٹ کے اندر ہی وہاں پہنچ گیا۔ اس وقت تک علی بھی ہوش میں آچکا تھا۔ تاہم اس کے زخمی ہاتھ کا معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے بینڈیج کردی تھی۔ میڈیسن ڈاکٹر ساتھ لے کر آیا تھا۔ اس نے کچھ پین کلر اور کچھ زخم کو خشک کرنے والی ٹیبلٹس میمونہ کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تین روز تک بلاناغہ انہیں دیتی رہنا، انشاء اللہ یہ

جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ ویسے میں پوچھ سکتا ہوں کہ ان کے ہاتھ کا یہ حشر کس نے کیا ہے؟"

ڈاکٹر کا یہ سوال بالکل غیر متوقع تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی جواب دینے کی بجائے ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ گو کہ وہ ان کا فیملی ڈاکٹر تھا مگر وہ اسے اپنے نجی معاملات میں شریک کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ویسے بھی یہ معاملہ کچھ ایسا تھا کہ اگر وہ ڈاکٹر کو بتا دیتے تو پورے محلے میں علی بدنام ہو کر رہ جاتا اور یہ بدنامی انہیں کسی صورت قبول نہیں تھی۔ ان کا تعلق اپر کلاس سے تھا۔ سو وہ اپنے معاملات کسی کے ساتھ شیئر کرنا بہت معیوب سمجھتے تھے۔

ڈاکٹر نے انہیں کش مکش کا شکار دیکھا تو اپنائیت سے بولا۔ "آپ دونوں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور میں گزشتہ پانچ برسوں سے آپ کا فیملی ڈاکٹر چلا آرہا ہوں، فیملی ڈاکٹر کی حیثیت گھر کے ایک فرد جیسی ہوتی ہے۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہے تو آپ بلا جھجک مجھ سے شیئر کر سکتے ہیں۔ میں آپ کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کروں گا۔ حل نہ کر سکا تو تب بھی وہ مسئلہ مجھ تک محدود رہے گا۔"

علی نے ایک نظر میمونہ پر ڈالی اور بولا۔ "جاؤ ملازمہ سے چائے لانے کا کہہ دو، تب تک میں ڈاکٹر صاحب سے اپنا مسئلہ ڈسکس کرتا ہوں۔"

"ہاں اب بتائیں معاملہ کیا ہے۔ آپ بہت ڈسٹرب لگتے ہیں؟" میمونہ کے باہر نکلتے ہی ڈاکٹر نے سوال کیا۔

علی لمحہ بھر کے لیے کھو سا گیا یوں جیسے گزرے واقعات کی کڑیاں ترتیب دے رہا ہو، پھر سر جھکا کر بولا۔

"ڈاکٹر صاحب! میں بہت مطمئن اور پُرآسائش زندگی بسر کر رہا تھا مگر اب میرا اطمینان رخصت ہو چکا ہے اور یہ سب کچھ ایک خواب کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ یہ خواب بہت عجیب و غریب ہے۔ میں آپ کو اس خواب کے متعلق بتا بھی دوں تو تب بھی آپ اس پر یقین نہیں کریں گے بلکہ الٹا مجھے پاگل سمجھیں گے۔ ہنسیں گے مجھ پر۔"

"آپ بلا جھجک بتائیں۔" ڈاکٹر نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ "دنیا کا کوئی بھی ڈاکٹر اپنے مریض کا مذاق نہیں اڑا سکتا۔"

ڈاکٹر کے اصرار پر علی نے بلا کم و کاست اسے اپنے خوابوں کے متعلق بتا دیا۔ پھر بولا۔ "ان خوابوں نے میری زندگی میں زہر گھول دیا ہے، میری بیوی مجھ پر شک کرنے لگی ہے۔ اس کے اور میرے درمیان فاصلے پیدا ہونے لگے ہیں۔ ہم دونوں کے بیچ ہونے والے جھگڑوں کا اثر ہمارے بیٹے فیضان پر بھی پڑنے لگا ہے۔ میں ان خوابوں اور روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آچکا ہوں مگر خواب ہیں کہ میری جان ہی نہیں چھوڑتے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ میں کیا کروں؟..... نہ خوابوں پر میرا اختیار چلتا ہے اور نہ ہی میمونہ مجھ پر اعتبار کرنے کو تیار ہے۔"

"آپ کسی ماہر نفسیات سے رجوع کیوں نہیں کرتے؟" ڈاکٹر نے مشورہ دیا۔ "ایک بہت اچھے ماہر نفسیات میرے دوست ہیں، ان سے ٹائم لے لیتے ہیں۔ اللہ بہتر کرے گا یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔"

"نہیں ڈاکٹر صاحب۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"ماہر نفسیات تو اچھے خاصے انسان کو پاگل بنا دیتے ہیں یا پھر ایسی میڈیسن دیتے ہیں کہ انسان ان کا عادی بن کر رہ جاتا ہے۔ قبر تک یہ دوائیں انسان کے ساتھ رہتی ہیں......سوری میں اپنا تماشا نہیں بنا سکتا۔"

"یہ صرف کم فہم لوگوں کی رائے ہے۔ ہر ماہر نفسیات ایسا نہیں ہوتا اور ویسے بھی آج کل میڈیکل سائنس نے بہت ترقی کر لی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرا دوست ڈاکٹر فرقان حیدر آپ کا یہ مسئلہ چند دنوں میں حل کر دے گا۔ بہت قابل شخص ہے۔ اس کے کریڈٹ پر ایسے کیس بھی ہیں جو مکمل پاگل تھے مگر آج وہ نارمل زندگی جی رہے ہیں۔"

اسی دوران ملازمہ کی بجائے میمونہ خود چائے لے کر پہنچ گئی جس کے ساتھ ہلکے پھلکے لوازمات بھی تھے۔ اس نے چائے بنا کر ان دونوں کو پیش کی اور ساتھ ہی بسکٹ کی پلیٹ آگے سرکا دی۔

"مسز علی! اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟" ڈاکٹر نے گرم گرم چائے کی ایک چسکی لیتے ہوئے کہا۔ "خالی چائے ہی کافی تھی۔"

"دراصل علی نے ابھی ناشتا نہیں کیا ہے تو میں نے سوچا کہ چائے کے ساتھ کچھ کھانے کے لیے بھی ہونا چاہیے۔"

ڈاکٹر مسکرایا۔ "تو یوں کہیں ناں کہ شوہر نامدار کی خدمت ہو رہی ہے۔"

"نہیں اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ بھی کھا سکتے ہیں۔"

"ہاں..... ہاں ڈاکٹر صاحب لیجئے ناں۔" علی نے ایک پلیٹ ڈاکٹر کی طرف کھسکا دی۔

''نہیں بھئی نہیں، میں صرف ایک بار ناشتا کرتا ہوں اور خوب ڈٹ کر کرتا ہوں۔ اب لنچ سے پہلے کچھ بھی کھانے کی گنجائش نہیں ہے۔''

ڈاکٹر نے چائے ختم کرنے کے بعد اپنا بیگ اٹھایا اور اجازت طلب انداز میں بولا۔ ''اوکے علی صاحب! میں چلتا ہوں لیکن میری بات پر غور ضرور کیجیے گا۔''

☆......☆

علی اس وقت ماہر نفسیات ڈاکٹر فرقان حیدر کے سامنے بیٹھا تھا اور اسے اپنے مسئلے سے آگاہ کر رہا تھا۔ فرقان حیدر شہر کا مانا ہوا ماہر نفسیات تھا اور کئی پیچیدہ قسم کے کیس نمٹا چکا تھا۔ اس نے علی کی بات پوری توجہ اور دل جمعی کے ساتھ سنی تھی۔

''مسٹر علی! یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ خواب بھی انسان دیکھتے ہیں، میں بھی دیکھتا ہوں۔ بس آپ ان خوابوں کو سنجیدگی سے نہ لیا کریں' یہ خود بخود آپ کا پیچھا چھوڑ دیں گے۔ آپ ان کے متعلق سوچنا ہی چھوڑ دیں۔'' ساری تفصیل سننے کے بعد ڈاکٹر فرقان نے علی کو مشورہ دیا۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر میں گزشتہ دو ماہ سے مسلسل ایک ہی خواب دیکھتا آرہا ہوں۔ خواب کی ترتیب میں معمولی سا بھی رد و بدل نہیں ہوتا۔ وہی وادی، وہی نظارے، وہی چشمہ، وہی عورت، وہی میں..... حتیٰ کہ اس عورت کے جانے کے بعد میں جو الفاظ بولتا ہوں وہ بھی کبھی نہیں بدلے۔''

''اوکے۔'' ڈاکٹر نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ''کیا وہ عورت آپ کے لیے قطعی اجنبی ہے یا کچھ جانی پہچانی لگتی ہے۔''

''بالکل اجنبی ہے لیکن اسے دیکھ کر اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔''

''یاد کرنے کی کوشش کریں کچھ شکلیں انسان کے شعور میں محفوظ نہیں ہوتیں لیکن لاشعور میں موجود ہوتی ہیں۔''

''میں ایسی کوششیں کر چکا ہوں، ہمیشہ ناکامی ہوئی ہے۔''

''مجھے اپنے ماضی کے بارے میں کچھ بتائیں؟''

''میرے ماضی سے اس عورت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''یہ بات آپ اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟''

''کیوں کہ میرا ماضی عورت کے بغیر گزرا ہے۔''

''وہ کس طرح...... کیا آپ آسمان سے ٹپکے ہیں؟'' ڈاکٹر نے تحیر کے عالم میں پوچھا۔ ''بہن نہ سہی لیکن ماں تو ضرور ہوگی؟''

''ماں نے مجھے عالم نزع میں جنم دیا تھا۔''

''اوہ..... وری سیڈ۔'' ڈاکٹر نے افسوس کا اظہار کیا۔ ''امید ہے آپ نے مائنڈ نہیں کیا ہوگا۔ دراصل ہمیں مریضوں سے ایسے سوالات کرنا پڑتے ہیں، یہ ہماری پروفیشنل مجبوری ہے۔''

''کوئی بات نہیں ڈاکٹر صاحب' میں سمجھتا ہوں۔''

''اٹس اوکے..... ماں کے بعد آپ کی پرورش کس نے کی تھی؟''

''ابو نے۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''امپوسیبل۔'' ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مرد بھلا ایک شیر خوار بچے کی پرورش کس طرح کر سکتا ہے؟ اسے نہلانا دھلانا، فیڈ کرنا، اس کی گندگی صاف کرنا، یہ کوئی آسان کام تو نہیں ہیں، لازماً انہوں نے کسی آیا یا نرس وغیرہ کا بندوبست کیا ہوگا۔ ایک عورت کے بغیر یہ کیسے ممکن ہے؟''

''آپ بجا فرما رہے ہیں، بہر کیف اس ناممکن کو میرے ابو نے ممکن بنا دیا تھا۔''

''کیا وہ زندہ ہیں؟''

''جی...... وہ..... ہاں......'' وہ قدرے نروس ہو گیا پھر ایک دم سنبھل کر بولا۔ ''بالکل زندہ ہیں جی۔''

''واقعی آپ کے ابو ایک عظیم انسان ہیں۔'' ڈاکٹر نے توصیفی انداز میں کہا۔ ''ایسے عظیم انسانوں ہی کی وجہ سے تو یہ دنیا قائم ہے۔ رئیلی مسٹر علی! آپ بہت خوش قسمت انسان ہیں جسے اس قدر پیار کرنے والا باپ ملا ورنہ آج کے دور میں تو بچے اپنے باپ کی شکل دیکھنے کے لیے بھی ترستے رہتے ہیں۔ باپوں کو اتنی فرصت ہی نہیں۔''

''پلیز ڈاکٹر.....'' اس نے یوں قطع کلامی کی جیسے ڈاکٹر نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ ''میں یہاں اپنے ابو کی تعریف سننے کے لیے نہیں آیا۔''

''آئی ایم سوری۔'' ڈاکٹر نے نادم ہو کر کہا۔ ''مجھے آپ کی پرسنل لائف میں مداخلت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔''

''شکریہ ڈاکٹر۔''

''او کے۔'' ڈاکٹر مسکرایا۔ ''اب آپ کے مرض ہی کے متعلق بات ہوگی۔ یہ بتائیں کہ جب خواب کے دوران آپ کی قوت گویائی سلب ہوتی ہے تو اس وقت آپ کیا فیل کرتے ہیں۔ غصہ، جھنجلاہٹ یا مایوسی؟''

''بے حد مایوسی اور دکھ محسوس کرتا ہوں۔ اپنے تئیں بولنے کی بہت کوشش کرتا ہوں لیکن میری زبان تالو سے چپک کر رہ جاتی ہے۔ منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلتا۔ میں اپنی اس وقت کی کیفیت لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔''

''کبھی کسی سے محبت کی ہے؟''

''جی ہاں کی ہے اور اب وہ میری بیوی ہے۔'' اس نے بلا جھجک جواب دیا۔

''ٹھیک ہے مسٹر علی! فی الحال میں آپ کے لیے چند میڈیسن تجویز کر دیتا ہوں۔ امید ہے آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔'' اس کے بعد ڈاکٹر نے اپنے سامنے رکھے ہوئے پیڈ پر چند لائنیں گھسیٹیں اور پھر وہ کاغذ پیڈ سے کھینچ کر علی کی طرف بڑھا دیا۔

''شکریہ ڈاکٹر۔'' علی نے کاغذ لیتے ہوئے اجازت طلب انداز میں کہا اور ڈاکٹر سے ہاتھ ملا کر کلینک سے باہر آ گیا۔

☆......☆

ڈاکٹر فرقان حیدر کے علاج سے علی کو محض وقتی افاقہ ہوا تھا، اس کے بعد اسے دوبارہ وہی خواب تواتر سے دکھائی دینے لگے۔ میمونہ اور اس کی لڑائی روزانہ کا معمول بن گئی۔ وہ ایک دوسرے پر چیختے چلاتے رہتے۔ علی بیوی کے سامنے لاکھ اپنی مجبوری بیان کرتا مگر میمونہ عورت تھی، وہ اپنی نسوانیت کے ہاتھوں مجبور تھی۔ ان کی اس روز روز کی لڑائی نے آخر کار میمونہ کو گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ وہ روٹھ کر اپنے میکے جا بیٹھی۔ علی نے کچھ روز تو بالکل اس کی پروا نہ کی مگر پھر بیٹے کی محبت اس کے غصے پر غالب آ گئی۔ چنانچہ ایک روز وہ شام کے وقت اپنے سسرال پہنچ گیا۔ دراصل آج وہ جو کچھ بھی تھا تو محض اپنے سسر کی وجہ سے تھا۔ جس کمپنی میں وہ ایم ڈی کے عہدے پر کام کر رہا تھا اس کمپنی کے ستر فی صد شیئرز اس کے سسر کے تھے اور جس عالی شان کوٹھی میں رہتا تھا، وہ میمونہ کو جہیز میں گفٹ کی گئی تھی۔ علی کے پاس جو کچھ بھی تھا وہ اس کے سسر احتشام صاحب کا دیا ہوا تھا۔

احتشام صاحب اس وقت گھر میں موجود نہیں تھے تاہم علی کی ساس نے اس سے سرسری طور پر خیریت دریافت کرنے کے بعد اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا اور خود غائب ہو گئی۔ علی نے ساس کے رویے میں واضح تبدیلی محسوس کر لی تھی۔ ساس کے چہرے پر بے زاری کے تاثرات بے سبب نہیں تھے یقیناً میمونہ نے اس کے خلاف ماں کے کان بھرے تھے۔ علی کو بیٹھے کافی دیر گزر گئی تھی لیکن گھر کے کسی فرد نے بھی اسے قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ یہ اس کے لیے بڑی ہتک آمیز بات تھی مگر وہ ضبط کیے بیٹھا رہا۔ تقریباً پون گھنٹے کے بعد اس کے سسر احتشام صاحب ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو وہ احتراماً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''تمہیں یہاں قدم رکھنے کی ہمت کیسے ہوئی؟'' احتشام صاحب نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

ان کے تیور دیکھ کر پہلے تو علی کو حیرت ہوئی مگر پھر وہ سنبھل کر بولا۔ ''انکل! میں میمونہ اور فیضان کو لینے آیا ہوں۔''

''کس لیے... کون لگتے ہیں وہ تمہارے؟'' انہوں نے بھڑک کر سوال کیا۔

''انکل! آپ کیسی بات کرتے ہیں؟'' وہ لبوں پر پھیکی سی ہنسی سجاتے ہوئے بولا۔ ''میمونہ میری بیوی ہے اور فیضان......''

''خاموش۔'' انہوں نے گرج کر قطع کلامی کی۔ ''وہ اب تمہارے کچھ نہیں لگتے...... سمجھے تم اور اب یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ ملازموں سے دھکے دے کر نکلوا دوں گا۔''

''آپ زیادتی کر رہے ہیں انکل۔'' اس نے احتجاج کیا۔ ''میاں بیوی کے درمیان لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں لیکن رشتہ ختم نہیں ہوتا۔''

''آج سے تم یہ رشتہ ختم سمجھو۔''

''کیوں ختم سمجھوں؟'' اسے بھی غصہ آ گیا۔ ''وہ میری بیوی ہے، میرے بیٹے کی ماں ہے۔''

''بکواس مت کرو ورنہ پولیس کے حوالے کر دوں گا۔'' سسر نے دھمکی دی۔

''یہ رعب کسی اور کو دینا انکل! آپ اپنی بیٹی کو بے شک روک سکتے ہیں لیکن فیضان میرا بیٹا ہے اور میں اسے ساتھ لے کر جاؤں گا۔''

''بہتر یہی ہوگا کہ یہاں سے باعزت طور پر لوٹ جاؤ، نہیں تو پچھتاؤ گے۔''

"بیٹے کو لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔" اس نے دوٹوک الفاظ میں جواب دیا۔

"اوکے میں لے کر آتا ہوں۔" وہ ذومعنی انداز میں کہتے ہوئے باہر نکل گئے۔

ڈرائنگ روم سے باہر آتے ہی انہوں نے جیب سے سیل فون نکالا اور ایک نمبر ملا کر بولے۔ "ایس پی جمشید! میں احتشام احمد بات کر رہا ہوں۔"

"حکم کیجیے جناب۔" ایس پی جمشید نے کہا۔ "آج کیسے اس ناچیز کو یاد فرمایا۔"

"میرے داماد علی کو سبق سکھانا ہے۔"

"کیا کیا ہے اس نے جناب؟"

"جمشید! کتا جب پاگل ہو جاتا ہے تو اپنے مالک پر غرانے لگتا ہے۔" وہ نخوت سے بولا۔ "میرا داماد بننے سے پہلے وہ گندی نالی میں رینگنے والا ایک کیڑا تھا۔ میں نے اسے فرش سے اٹھا کر عرش تک پہنچا دیا مگر آج اس نے اپنی اوقات دکھا دی۔ اس کمینے نے میری میمونہ کو ٹارچر کیا ہے اور اب زبردستی اسے اور میرے نواسے کو اٹھانے کے لیے میرے گھر میں گھس آیا ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں جناب! میں ابھی اس کا بندوبست کرتا ہوں۔" ایس پی جمشید نے جواب دیا۔

"دیر نہیں ہونی چاہیے، میں انتظار کر رہا ہوں۔"

"پندرہ بیس منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگے گا جناب۔"

"اوکے تھینکس۔" کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

"یہ آپ نے اچھا نہیں کیا انکل۔" معاً اسے عقب سے علی کی آواز سنائی دی۔ "حقیقت حال جانے بغیر آپ نے اپنے گھر کے معاملے میں پولیس کو انوالو کر کے میرے اور میمونہ کے بیچ نفرت کی ایک دیوار کھڑی کر دی ہے۔ اس کا انجام بہت برا ہو گا۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو، واقعی اس کا انجام بہت برا ہو گا..... لیکن میمونہ کے نہیں بلکہ تمہارے حق میں برا ہو گا۔"

"میمونہ اور میں الگ الگ نہیں ہیں، میاں بیوی ہیں اور میاں بیوی گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں۔"

"تمہارے جیسے کسی بے وقوف نے بنائی ہو گی یہ مثال..... گاڑی کے دو نہیں چار پہیے ہوتے ہیں۔"

علی سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو وہ انہیں غصے سے گھورنے لگا۔

"مجھے آنکھیں مت دکھاؤ، اب بھی وقت ہے بھاگ جاؤ یہاں سے ورنہ باقی کی زندگی شرمندگی بن کر رہ جائے گی۔" انہوں نے طنزیہ انداز میں مشورہ دیا۔

"بھاگتے مجرم ہیں، میں بھاگ کر آپ کا الزام سچ ثابت نہیں کرنا چاہتا۔" علی نے دوٹوک الفاظ میں جواب دیا۔

"مطلب تم خوشی خوشی جیل کی ہوا کھانا چاہتے ہو؟"

"یہ بھول ہے آپ کی، پولیس مجھے دو دن سے زیادہ حوالات میں نہیں رکھ سکتی، میں کوئی لاوارث نہیں ہوں۔"

"لاوارث نہ ہوتے تو یوں میرے در پہ نہ پڑے ہوتے۔"

"میں اپنی محنت کی کمائی کھا رہا ہوں۔ آپ کی کمپنی مجھے گھر بیٹھے تنخواہ نہیں دیتی۔" اس نے جواباً کہا اور پھر پلٹ کر ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ گیا۔

ابھی اسے بیٹھے دس منٹ ہی گزرے تھے کہ ڈرائنگ روم میں ایک انسپکٹر تین سپاہیوں کی معیت میں داخل ہوا اور اجڈ انداز میں بولا۔ "اوئے علی تمہارا نام ہے کیا؟"

"ہاں۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "کوئی مسئلہ ہے کیا؟"

"بلے بھئی بلے...... یہ تو کوئی فلمی ہیرو لگتا ہے۔" انسپکٹر نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ "کیا ڈائیلاگ مارا ہے اس نے.....؟"

"ظلم کے بچے! اس ماے کو گرفتار کرو۔" انسپکٹر نے بگڑ کر حکم دیا۔

"کس جرم میں جناب؟" علی نے نڈر انداز میں سوال کیا۔

"اوئے طیفے!" انسپکٹر تیسرے سپاہی کی طرف متوجہ ہوا۔ "یہ ڈائیلاگ کس نے مارا تھا؟"

"سر! میں فلمیں نہیں دیکھتا۔"

"کیوں نہیں دیکھتے؟" انسپکٹر نے اسے گھورا۔

"پولیس کی بے عزتی بہت کرتے ہیں سر۔" سپاہی نے جواز پیش کیا۔

"ہاں سپاہیوں کی بہت بے عزتی کرتے ہیں۔" انسپکٹر نے قہقہہ لگایا۔

"افسروں کی بھی کرتے ہیں سر۔" اس نے جواب دیا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا...... تم تو فلمیں دیکھتے ہی نہیں ہو؟" انسپکٹر نے اسے گھورا۔

"مجھے منیر اور اقبال بتاتے ہیں سر۔" اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ روزانہ کیبل پر فلمیں دیکھتے ہیں۔"

"یہ جھوٹ بولتا ہے سر۔" ان دونوں نے یک زبان ہو کر تردید کی۔

"جھوٹ میں نہیں تم بولتے ہو۔" لطیف عرف طیفا بپھر گیا۔

"میں تھانے چل کر تم دونوں کو دکھاؤں گا سلاخیں۔" انسپکٹر نے انہیں گھورا اور پھر حکمیہ انداز میں بولا۔ "گرفتار کر لو اس ہیرو کو۔"

"کس لیے...... کیا کیا ہے میں نے؟" علی نے احتجاج کیا۔

"اوئے ہیرو! یہ سوال تھانے چل کر پوچھنا ورنہ ادھر ہی لمبا کر دوں گا۔" انسپکٹر نے دھمکی دی۔

وہ بولا۔ "لوگ ٹھیک کہتے ہیں کہ قانون اندھا ہوتا ہے۔"

"اوئے طیفے، اوئے منیرے! یہ ہمیں اندھا کہہ رہا ہے۔ اسے ذرا اپنی زبان میں سمجھاؤ کہ قانون کس طرح اندھا ہوتا ہے؟" انسپکٹر نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور تینوں سپاہی علی پر یوں جھپٹے جیسے چیل مرغی کے چوزے پر۔ دو تین منٹ کے اندر ہی انہوں نے مار مار کر علی کا حلیہ بگاڑ دیا۔

"بس اتنا کافی ہے۔" ذرا دیر کے بعد انسپکٹر نے مداخلت کی۔ "باقی کی کسر تھانے چل کر پوری کر لینا۔"

اس کے بعد انہوں نے علی کو ہتھکڑی لگائی اور تھانے کی طرف چل دیے۔ اس ساری کارروائی کے دوران گھر کے کسی فرد نے ڈرائنگ روم میں جھانکنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

☆......☆

علی پر کوئی خاص کیس تو تھا نہیں چنانچہ دوسرے روز ہی ایک دوست نے بھاگ دوڑ کر کے عدالت سے اس کی شخصی ضمانت کرائی تھی اور اب وہ اسی دوست کے ساتھ اس کے گھر میں رہائش پذیر تھا۔ سلیم نامی اس کا وہ دوست نہایت ہی مخلص انسان تھا۔ علی سے گھر بار، جاب، گاڑی اور بیوی بچہ سب کچھ چھن چکا تھا۔ اب وہ ایک کنگال شخص تھا۔ ایک ایسا شخص جس کے پاس سر چھپانے کے لیے بھی جگہ نہیں تھی۔ میمونہ پر تو وہ ویسے ہی لعنت بھیج چکا تھا تاہم اپنے بیٹے فیضان کی یادوں نے اسے تقریباً نیم پاگل کر دیا تھا۔ وہ دن رات بیٹے کی یاد میں تڑپتا رہتا تھا۔ سلیم حتی المقدور اس کی دل جوئی میں لگا رہتا تھا مگر علی کی حالت سنبھلنے کی بجائے بگڑتی چلی گئی۔ دو تین بار سلیم نے اسے بیٹے سے ملانے کی کوشش بھی کی تھی لیکن احتشام ایک ارب پتی سرمایہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ سیاست دان بھی تھا۔ وہ دو بار صوبائی اسمبلی کی نشست جیت چکا تھا، گو کہ اسے کبھی کوئی وزارت نہیں ملی تھی لیکن اپنی پارٹی میں اسے قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ چنانچہ سلیم کو اس نے نہ صرف انکار کر دیا تھا بلکہ واشگاف الفاظ میں دھمکایا بھی تھا کہ وہ آئندہ علی کا سفارشی بن کر نہ آئے ورنہ نتائج کا ذمے دار خود ہوگا۔ سلیم جیسے امن پسند اور متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے شخص کے لیے یہ دھمکی کافی تھی۔

دوسری جانب خوابوں نے بھی ہنوز علی کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ متواتر وہی خواب دیکھتا رہتا تھا۔ سلیم اس کی وجہ سے بہت پریشان رہا کرتا تھا مگر اس کے پاس علی کی پریشانیوں اور غموں کا کوئی علاج اور مداوا نہیں تھا۔ ایک دن آفس میں سلیم نے اپنے ایک کولیگ سے علی کا مسئلہ بیان کیا تو وہ بولا۔ "تمہارے دوست کی بیماری جسمانی نہیں ہے روحانی ہے۔ تم اسے کسی ایسے بزرگ کے پاس لے جاؤ جو روحانی علاج کرتا ہو۔"

سلیم نے کہا۔ "امجد یار میں تو کسی ایسے بزرگ کو نہیں جانتا۔ تمہاری نظر میں اگر ایسا کوئی شخص ہے تو مجھے بتاؤ، میں علی کو اس کے پاس لے جاؤں گا۔"

"سید انوار شاہ کو جانتے ہو؟" امجد نے استفسار کیا۔

"ہاں جانتا ہوں۔" سلیم نے اثبات میں سر ہلایا۔

"وہی ناں! جنہوں نے اسرار روحانیت پر چند کتابیں بھی لکھی ہیں؟"

"بالکل وہی، میں ایڈریس اور سیل فون نمبر دے دیتا ہوں مگر جانے سے پہلے ان سے ٹائم لے لینا وہ بہت مصروف رہتے ہیں۔"

سلیم اس دن گھر پہنچا تو لباس بدل کر سیدھا علی کے پاس جا بیٹھا، علی حسب معمول اپنے ہی خیالات میں مستغرق تھا اور اسے ابھی تک سلیم کی آمد کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔

"علی!" سلیم نے اسے اپنائیت سے متوجہ کیا۔ "تم اس قدر زندگی سے مایوس کیوں ہو گئے ہو۔ اچھے برے دن

تو آتے رہتے ہیں۔ آج غم تو کل خوشی، اسی کا نام تو زندگی ہے۔ مایوسی تو کفر ہے۔''

''پلیز سلیم!'' وہ گڑگڑایا۔ ''صرف ایک بار..... صرف ایک بار مجھے میرے فیضان سے ملادو..... میں..... میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میری آنکھیں ترس گئی ہیں اسے دیکھنے کے لیے..... نجانے وہ کس حال میں ہوگا؟''

سلیم نے اسے ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ ''یہ میرے بس میں کہاں ہے میرے دوست؟ تمہارا سسر بہت ظالم شخص ہے اسے کسی پر رحم نہیں آتا۔ پتا نہیں ایسے لوگوں کے پہلو میں دل بھی ہوتا ہے یا نہیں؟''

''میں اپنے بیٹے کے بغیر نہیں جی سکتا سلیم۔'' اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

''اللہ پر بھروسا رکھو دوست! اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔'' سلیم نے اسے تسلی دی۔ ''تمہارے دن ضرور پھریں گے۔''

''کب پھریں گے؟ جب میں سسک سسک کر مرجاؤں گا؟''

''اللہ سے شکوہ نہیں کیا جاتا میرے دوست! اس کا فرمان ہے کہ مجھے چپکے چپکے اور گڑگڑا کر پکارو۔ جب تم انسانوں کی بجائے اللہ کے سامنے دامن پھیلاؤ گے تو وہ تمہیں مایوس نہیں کرے گا۔ بس شرط خلوص نیت کی ہے، اسے زبان سے نہیں دل سے پکارو وہ سب کی سنتا ہے، تمہاری بھی ضرور سنے گا۔''

وہ چپ ہوگیا، پھر آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ ''میں یہاں کب تک تم پر بوجھ بنا رہوں گا۔ میرے لیے اگر کسی چھوٹی موٹی جاب کا بندوبست ہوجاتا تو.........''

''تم مجھ پر بوجھ نہیں ہو۔'' سلیم نے قطع کلامی کی۔ ''تم تو میرے محسن ہو، تمہاری ہی وجہ سے آج میں اتنی اہم پوسٹ پر کام کررہا ہوں..... پلیز دوبارہ ایسی بات بھی مت کرنا ورنہ مجھے دکھ ہوگا۔''

''اوکے دوست نہیں کروں گا لیکن.........''

''لیکن ویکن چھوڑو۔'' سلیم نے دوبارہ قطع کلامی کی۔ ''ہم دونوں کل صبح لاہور جارہے ہیں۔ میں نے آفس سے تین دنوں کی رخصت لے لی ہے۔''

''لاہور جاکر کیا کریں گے؟''

''بس ایسے ہی سیروتفریح کریں گے۔'' سلیم نے اصل بات چھپاتے ہوئے جواب دیا۔

''مطلب فضول خرچی کریں گے؟''

''اس میں فضول خرچی کہاں سے آگئی یار..... وہاں میرا ایک دوست رہتا ہے، اس نے بلایا ہے۔''

''تو پھر میری کیا ضرورت ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''تم خود چلے جاؤ۔''

''اس نے میرے ساتھ ساتھ تمہیں بھی دعوت دی ہے۔'' سلیم نے پھر جھوٹ کا سہارا لیا۔

''مجھے وہ کیسے جانتا ہے؟''

''میں اس سے تمہارا غائبانہ تعارف کراچکا ہوں اور وہ تم سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہے۔''

''کیوں..... کس لیے؟'' وہ الجھ گیا۔

''وہ خوابوں کی تعبیر کا علم جانتا ہے۔'' سلیم سچ بولنے پر مجبور ہوگیا۔ ''تمہیں اس سے ضرور ملنا چاہیے۔''

''چھوڑو یار! ایسے ہی کوئی ڈھونگی ہوگا۔ بے کار میں وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''تم نے ''ککھ تھلے پہاڑ'' والی کہاوت سنی ہے کبھی؟'' سلیم نے سوال کیا۔

''ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''نہ صرف سنی ہے بلکہ اس کا مطلب بھی اچھی طرح جانتا ہوں اور یہ سرائیکی زبان کی کہاوت ہے۔''

''تو بس ٹھیک ہے ہم بھی یہی آس لے کر لاہور جائیں گے۔'' سلیم نے حتمی انداز میں جواب دیا۔

☆......☆

سید انوار شاہ اس وقت اپنی نشست گاہ میں چند لوگوں کے بیچ بیٹھے ایک خاص موضوع پر نہایت دھیمے انداز میں گفتگو کررہے تھے۔ یہ فرشی نشست تھی، دبیز کارپٹ پر گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے مگر حاضرین میں سے کسی نے بھی تکیے کے ساتھ ٹیک نہیں لگائی ہوئی تھی۔ سلیم اور عدنان علی ایک ملازم کی رہنمائی میں نشست گاہ میں داخل ہوئے اور سلام کرنے کے بعد خاموشی کے ساتھ ایک طرف بیٹھ گئے۔ سید انوار شاہ سفید شلوار قمیص میں ملبوس تھے۔ ان کے سرخ وسپید چہرے پر سیاہ گھنی ڈاڑھی بہت جچ رہی تھی۔ انہوں نے تھوڑی دیر تو حقوق العباد اور حقوق اللہ پر قرآن و حدیث کے حوالوں کے ساتھ روشنی ڈالی اور پھر اصل موضوع یعنی روحانیت کے متعلق حاضرین کو بتانے لگے۔

''ظاہر کی آنکھ سے دیکھنے والا چاہے کتنی ہی عظیم درس گاہوں سے فارغ التحصیل کیوں نہ ہوا ہو اس وقت تک حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتا جب تک وہ تزکیہ کی منازل طے نہ کرلے۔ بس آج کے لیے اتنا کافی ہے، باقی۔۔۔انشاء اللہ کل۔''

حاضرین جوان کی گفتگو سن کر مسحور بیٹھے تھے۔ وہاں سے رخصت ہونے لگے۔ جب علی اور سلیم کے علاوہ تمام لوگ رخصت ہو گئے تو سید انوار شاہ ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ تعارف کے بعد سلیم نے علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔'' شاہ صاحب! یہ میرے انتہائی عزیز دوست ہیں مگر آج کل گونا گوں مسائل کا شکار ہیں۔''

''اللہ بہتر کرے گا۔'' شاہ صاحب نے مسکرا کر کہا۔ ''تکلیفیں اور مسائل بے سبب نہیں آتے، ان کا کوئی نہ کوئی محرک ضرور ہوتا ہے۔''

''شاہ جی! ہم بڑی امید لے کر آپ کے آستانے پر آئے ہیں، میرے دوست پر بھی مہربانی فرمایئے گا۔''

''دکھ اور مصیبتیں ٹالنا مخلوق کے نہیں خالق کے دست قدرت میں ہوتا ہے، انسان تو محض وسیلہ بن سکتا ہے اور وہ بھی اللہ چاہے تو تب ورنہ اس کی منشا کے خلاف تو ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا۔'' اتنا کہہ کر وہ علی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''کیا نام ہے میاں؟''

''علی۔''

''پورا نام کیا ہے؟''

''عدنان شہزاد علی۔''

''ماں کا نام؟''

''سنبل۔''

''مسئلہ؟''

ان کے اس سوال پر علی نے لمحہ بھر کے لیے چپ سادھ لی اور پھر خوابوں سے لے کر بیوی اور بچے کی جدائی تک سب کہانی بیان کر دی۔

''میرے قریب آکر بیٹھو۔'' شاہ صاحب نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

علی اٹھ کر ان کے سامنے جا بیٹھا۔ تب شاہ صاحب نے باری باری اس کی ہتھیلیاں دیکھیں۔ ساتھ ساتھ اس کی فیس ریڈنگ بھی کر چکے تو بولے۔'' تمہاری ماں تمہیں جنم دے کر فوراً فوت ہو گئی تھی ناں؟''

علی کو ایک جھٹکا سا لگا۔'' آپ......آپ یہ سب کچھ کیسے جانتے ہیں؟'' اس نے تحیر کے عالم میں سوال کیا۔

''جو میں نے پوچھا ہے اس کا جواب دو؟'' شاہ صاحب نے تحکمانہ انداز میں کہا۔'' غیر ضروری سوالات مت کرو۔''

''جی ہاں فوت ہو گئی تھی۔''

شاہ صاحب بولے۔'' اس کے بعد تمہارے والد نے تمہیں ماں بن کر پالا، اس نے تمہاری خاطر ہر وہ کام سرانجام دیا جو ایک عورت کو ہی زیب دیتا ہے۔ نومولود بچے کو پالنا دنیا کا دشوار ترین کام ہے اور یہ صرف ایک ماں ہی سرانجام دے سکتی ہے، اسی لیے تو جنت ماں کے قدموں تلے بتائی گئی ہے۔ تم پر تو اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص کرم کیا تھا اور اس کا یہ کرم اب تک جاری ہے۔ تم گناہ پر گناہ کرتے گئے مگر اس رحیم ذات نے ہمیشہ تم سے صرف نظر کیا۔ سب سے پہلے تم نے ایک عورت کی خاطر اس باپ کو چھوڑ دیا جس نے تمہاری خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ اس گناہ پر قدرت تمہیں کڑی سے کڑی سزا دے سکتی تھی مگر ایسا نہ ہوا تو محض تمہارے مہربان باپ کی دعاؤں کے سبب۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمہیں خوابوں کے ذریعے صراط مستقیم دکھایا مگر تمہاری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ خوابوں میں آنے والی عورت کوئی اور نہیں تمہاری ماں ہے۔ تم دنیا کے بدبخت ترین انسان ہو جو جنم دینے والی ماں کو بھی نہ پہچان سکے حالانکہ تم نے بچپن میں اپنی ماں کی تصویر متعدد بار دیکھی تھی۔ وہ خوابوں میں تم سے اس لیے نہیں بولتی کیونکہ تم نے باپ کا دل توڑا ہے......ماں تم سے سخت ناراض ہے۔ خواب انسانوں کی رہنمائی کرتے ہیں مگر تم نے رہنمائی حاصل کرنے کی بجائے ان خوابوں کو بیماری سے تعبیر کیا تو تب ذات باری تعالیٰ نے تم پر مکافات عمل نازل فرمائی، بزرگ کہتے ہیں کہ اگر انسان سمجھے تو مکافات عمل بھی دراصل خدائے بزرگ و برتر کی اپنے بندوں پر ایک خاص مہربانی ہوتی ہے ورنہ آخرت کی سزا تو بہت کڑی ہے، کون برداشت کر سکتا ہے؟ سو جن پر اللہ مہربان ہوتا ہے انہیں ان کے گناہوں کی سزا اسی دنیا میں دے کر آخرت کے عذاب سے نجات دلا دیتا ہے۔ مکافات عمل کیا ہے؟......گناہ گار کو اس کے گناہوں کا احساس دلاتا ہے اور اس میں دوسرے انسانوں کے لیے عبرت کا سامان بھی ہوتا ہے۔ یہ قانون قدرت ہے کہ انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔ جو بونے والا گندم نہیں کاٹ سکتا......نیم کے پیڑ پر آم نہیں لگتے......تم

نے ایک باپ سے بیٹا چھینا تو بدلے میں قدرت نے تم سے تمہارا بیٹا چھین لیا تا کہ تمہیں تمہارے گناہ کا احساس دلایا جا سکے.....اب بھی اگر تم نہ سمجھے تو یاد رکھو دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت بھی گنوا بیٹھو گے۔"

لفظ کیا تھے......زہر میں بجھے ہوئے تیر تھے۔وہ رو دیا۔سلیم کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔شاہ صاحب نے اسے رونے دیا کہ یہ ندامت کے آنسو تھے۔وہ عرق انفعال تھا جسے شان کریمی موتی سمجھ کر چن لیتی ہے۔اس کی قہاری غفاری میں بدل جاتی ہے اور رحمت جوش میں آکر گناہ گار کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔جب وہ خوب رو چکا تو شاہ صاحب انتہائی شفقت آمیز انداز میں بولے۔"جاؤ رب کو راضی کرنا ہے تو پہلے باپ کو راضی کرو .....پھر دیکھنا قدرت تم پر کس طرح مہربان ہوتی ہے؟"

"ہاں شاہ جی۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولا۔

"میں واقعی بدبخت ہوں۔میرے لیے خصوصی دعا فرمائیں کہ میں اپنے باپ کی مہربانیوں اور شفقت کا حق ادا کر سکوں۔پتا نہیں اللہ مجھے معاف بھی کرے گا یا نہیں؟"

"اس کی بارگاہ میں جب کوئی انسان ندامت اور پشیمانی کے آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرتا ہے تو وہ رحیم ذات کبھی اسے خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا۔"

"میرا گناہ بہت بڑا ہے شاید.........."

"اس کی رحمت سے کچھ بھی بڑا نہیں ہے۔" شاہ جی نے قطع کلامی کی اور پھر باری باری ان سے معانقہ کرنے کے بعد انہیں رخصت کر دیا۔

وہ دونوں باہر نکلے تھے کہ سامنے سے آتے ہوئے جمال کی نظر ان پر پڑی۔وہ انہیں دیکھ کر ٹھٹکا پھر وہ ان دونوں کو زبردستی اپنے ہاں لے آیا۔عدنان علی پر جو گزری تھی سن کر وہ جذباتی ہوا تھا۔اس نے عدنان علی کو مخاطب کر کے کہا۔"اب یہ مسئلہ تمہارا نہیں میرا ہے۔میں خود نمٹوں گا۔" پھر وہ ہنستے ہوئے بولا۔"تمہارے مسئلے کا حل میرے پاس ہے۔تمہارے ابا کی پریشانی بھی میں نے سلجھائی تھی۔کیسے یہ ابتداء سے سناتا ہوں۔

☆......☆

اس دن گرین کلر کی وہ فوجی جیپ مانسہرہ سے آگے گلگت جانے والی سڑک پر تیزی سے رواں دواں تھی۔جیپ میں صرف ہم دو سوار تھے۔

ہم دونوں نئے نئے یونی ورسٹی کی تعلیم سے فارغ ہوئے تھے اور اب شمالی علاقہ جات کی سیر کے لیے جا رہے تھے۔ڈرائیونگ سیٹ پر شہزاد تھا اور میں اس کے برابر میں بیٹھا تھا۔جیپ شہزاد کی ملکیت تھی۔جیپ بے شک پرانی تھی مگر اچھی حالت میں تھی۔طاقت ور انجن والی یہ جیپ پہاڑی سفر کے لیے نہایت ہی موزوں تھی۔سیٹیں بھی کشادہ تھیں اور چھت بھی بہ آسانی اتاری اور لگائی جا سکتی تھی۔

ہم دونوں وسطی پنجاب کے رہنے والے تھے۔شہزاد کا تعلق ایک دیہاتی جاگیردار گھرانے سے تھا اور اس کے والد ایک روایتی جاگیردار تھے جب کہ میں شہر کا رہنے والا تھا اور میرے ابا یونی ورسٹی میں پروفیسر تھے۔ہماری دوستی کالج کے زمانے سے شروع ہوئی تھی جو اب تک قائم تھی۔شہزاد اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا میرے دو بھائی اور ایک بہن بھی تھی۔بہن مجھ سے چھوٹی تھی اور ابھی کالج میں زیر تعلیم تھی۔دونوں بھائی مجھ سے بڑے تھے، دونوں ہی برسر روزگار اور شادی شدہ تھے۔مانسہرہ سے نکلے ہمیں کافی دیر گزر چکی تھی اور اب بھوک نے ستانا شروع کر دیا تھا۔شہزاد گاڑی چلاتے ہوئے کسی مناسب ہوٹل کی تلاش میں تھا۔چند ایک ہوٹل اس نے جان بوجھ کر چھوڑ دیے تھے۔یہ صورت حال میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔میں ویسے بھی بہت بے صبرا تھا جب کہ یہاں تو معاملہ بھی پیٹ کا تھا۔چنانچہ شہزاد نے جب پانچواں ہوٹل نظر انداز کیا تو مجھ سے صبر نہ ہو سکا۔

"خدا کے لیے یار' خود پر نہ سہی مجھ پر ہی رحم کر لو.....میں بھوک سے مرا جا رہا ہوں....." میں فریادی انداز میں بولا۔"پلیز.....اب جیسا بھی ہوٹل نظر آئے گاڑی روک دینا ورنہ میں چلتی گاڑی سے کود جاؤں گا۔"

شہزاد نے کہا۔"بے صبرے مت بنو' آگے ایک اچھا ہوٹل ہے۔وہاں کا کھانا خاصا لذیذ ہوتا ہے ورنہ یہاں کے لوگ تو گوروں کی طرح بالکل بے لذت اور پھیکا کھانا کھاتے ہیں۔مجھے سمجھ نہیں آتی یہ لوگ مرچ مسالوں سے اتنا الرجک کیوں ہیں؟"

اسی دوران شہزاد کی نظر مطلوبہ ریسٹورنٹ پر پڑی، جو دائیں ہاتھ سڑک سے تقریباً نصف فرلانگ کی دوری پر واقع تھا۔اس نے گاڑی کا اسٹیئرنگ گھمایا اور گاڑی سیدھی جا کر ریسٹورنٹ کے وسیع احاطے میں رک گئی۔وہاں پہلے سے ایک مسافر بردار بس بھی موجود تھی، جس کی سواریاں کھانے اور چائے پینے میں معروف

تھیں۔ ریسٹورنٹ کے کشادہ احاطے میں کھرے بان کی
چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور ہر دو چارپائیوں کے درمیان
لکڑی کی ایک ٹیبل موجود تھی۔ ویٹر بھاگ بھاگ
کر مسافروں کو کھانا اور چائے سرو کر رہے تھے۔

وی آئی پی مسافروں کے لیے وہاں ایک ہال بھی
موجود تھا۔ وہ دونوں بس کے مسافروں کو دیکھتے ہوئے
ریسٹورنٹ کے ہال میں داخل ہوگئے۔ ہال بالکل خالی
پڑا ہوا تھا، مگر ان کے بیٹھتے ہی ایک ویٹر حاضر ہوگیا۔

”حکم کیجیے صاب! کیا پیش کروں؟“

”بھنڈی سادہ، کریلا گوشت، مرغ پلاؤ، آلو گوشت
اور چنے کی دال۔“ ویٹر نے فرفر مینیو پیش کیا۔

”بس۔“ میں نے برا سامنہ بنایا۔

”چائے، پیسٹری، بسکٹ اور کوک، پیپسی بھی ہے
صاب۔“ ویٹر نے مینیو کا دوسرا مصرع عرض کیا۔

”کریلا گوشت، مرغ پلاؤ اور آلو گوشت ٹھیک رہے
گا۔“ شہزاد نے آرڈر دیا۔

”ابھی لایا صاب۔“ ویٹر تیزی سے باہر نکل گیا۔

پانچ منٹ کے بعد ویٹر نے کھانا سرو کر دیا تھا۔ میں
بھوکے گدھ کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑا تاہم شہزاد آرام
سے کھانا کھاتا رہا۔ پانچویں تندوری روٹی کا آخری نوالہ منہ
میں ڈالتے ہوئے میں نے ایک لمبی ڈکار لی اور
بولا۔ ”ٹھیک کہا تھا تم نے، کھانا واقعی اچھا تھا۔ زندگی میں
پہلی بار میں نے تین روٹیاں اکٹھی کھائی ہیں۔“

”تین نہیں پانچ، تمہاری گنتی کمزور ہے۔“ شہزاد نے
جواب دیا۔

”خدا کا خوف کرو یار!“ میں نے احتجاج کیا۔ ”میں
آدمی ہوں، کوئی گھوڑا خچر نہیں ہوں۔“

”کئی آدمیوں کے ساتھ گھوڑے اور خچر کا پیٹ لگا ہوتا
ہے۔ تم بھی انہی میں سے ایک ہو۔“

پھر اس سے قبل کہ میں اسے کوئی کرارا سا جواب
دیتا۔ باہر سے لڑنے جھگڑنے کی بلند آوازیں آنے لگیں
اور ہم دونوں تیزی سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔

”تم باہر جا کر دیکھو، میں بل ادا کر کے آتا ہوں۔“
شہزاد نے کاؤنٹر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا اور میں سر ہلاتا
ہوا باہر نکل گیا۔

شہزاد جب کاؤنٹر پر بل ادا کرنے کے
بعد باہر نکلا تو وہاں اچھا خاصا ہنگامہ برپا تھا۔ بس کا
ڈرائیور اور کلینزر ایک ادھیڑ عمر باریش شخص سے الجھے ہوئے
تھے۔ باریش شخص کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی بھی تھی جو ایک
طرف سہمی کھڑی تھی۔ لڑکی کا پورا بدن سوائے آنکھوں کے
ایک سیاہ رنگ کی چادر میں چھپا ہوا تھا۔ شہزاد نے مجھ سے
صورتِ حال جاننے کے لیے استفسار کیا تو میں نے کہا۔

”دفع کرو یار، ان کا کوئی کرایے کا معاملہ ہے۔“

”کیسا کرایے کا معاملہ؟“ شہزاد نے سوال کیا۔

”یہ شخص کہتا ہے کہ اس نے گلگت تک کا کرایہ ادا
کر دیا ہے جب کہ بس کا عملہ اس بات سے انکاری ہے۔
دل چسپ بات یہ ہے کہ اس شخص کے پاس ٹکٹ بھی نہیں
ہے۔ ایسے میں ڈرائیور اور کلینزر اس کی بات ماننے کے لیے
قطعی تیار نہیں ہیں۔“ میں نے تفصیل بتائی۔

”ٹکٹ کھو بھی تو سکتا ہے یار۔“

”یہ شخص بھی یہی کہتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”سر! پلیز اس بے بس شخص کی ہیلپ کریں۔“ ان
کے قریب موجود ایک نوجوان نے شہزاد سے استدعا کی۔

شہزاد بولا۔ ”ہیلپ تو تب کروں گا، جب مجھے سچ اور
جھوٹ کا پتا چلے گا۔ کیا پتا اس شخص نے واقعی کرایہ نہ
دیا ہو؟“

”اس بات کا میں چشم دید گواہ ہوں سر۔“ نوجوان
نے پُرجوش انداز میں کہا۔ ”اس نے میرے سامنے ٹکٹ
کٹوایا تھا۔ یہ باپ بیٹی میرے آگے والی سیٹ پر تھے۔“

”تم سچ کہہ رہے ہو؟“ شہزاد کا انداز مشکوک تھا۔

”سو فی صد سچ سر! مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت
ہے؟“ نوجوان نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ وہ
شہزاد کو آرمی آفیسر سمجھ رہا تھا اور اس کی وجہ ان کی جیپ
تھی۔ اب شہزاد کے لیے مداخلت ناگزیر ہوگئی۔ وہ آگے
بڑھا اور پھر بس کے ڈرائیور کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

”تمہیں یقین کیوں نہیں آتا کہ یہ شخص سچ کہہ رہا ہے؟“

”آپ کی تعریف جناب؟“ ڈرائیور نے طنزیہ
انداز میں پوچھا۔

”ادھر دیکھو۔“ شہزاد نے اپنی جیپ کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ ہے میرا تعارف، کافی ہے کہ مزید
کراؤں؟“

جیپ کو دیکھ کر ڈرائیور کے غبارے سے یوں ہوا نکلی
جیسے ہمارے ہاں اکثر پانی کے نلکوں سے نکلتی

ہے۔ڈرائیور کا رنگ متغیر ہوگیا۔ایک آرمی آفیسر کے سامنے اس کی اوقات ہی کیا تھی، سو وہ اپنی جان بچانے کے لیے اپنے کلینر پر چڑھ دوڑا۔"گدھے کے بچے! تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا، اس نے جب کرایہ دے دیا تھا تو تم نے اس کا ٹکٹ کیوں نہیں کاٹا؟ اس کا مطلب ہے کہ تم ٹکٹوں میں گھپلا کرتے ہو؟"

"استاد جی! یہ ......یہ......تم کیسی بات کر رہے ہو......میں بھلا ایسا کیوں کروں گا؟" کلینر نے بوکھلا کر جواب دیا۔

"بکواس مت کرو۔" ڈرائیور نے اسے ڈانٹ پلائی اور پھر شہزاد سے معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔"صاب! غلطی میرے کلینر کی ہے مگر اس کی جگہ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔"

"کلینر کی کوئی غلطی نہیں ہے۔" ادھیڑ عمر شخص نے کہا۔"اس نے میرا اور میری بیٹی کا ٹکٹ کاٹا تھا مگر تم نے ہماری سیٹ پر اپنے دوستوں کو بٹھا کر جان بوجھ کر ہم پر الزام لگا دیا کہ ہم بغیر ٹکٹ کے سفر کر رہے ہیں۔اب شرافت اسی میں ہے کہ ہمارا کرایہ واپس کردو، ہم تم جیسے بے ایمان شخص کے ساتھ سفر کرنا نہیں چاہتے۔"

"نہیں ابا! ایسا مت کریں، ہم لیٹ ہو جائیں گے۔" لڑکی نے مداخلت کی۔"ہم اسی بس میں سفر کریں گے۔"

"کبھی نہیں۔" اس نے انکار میں سر ہلایا۔"میں یہاں سے پیدل گلگت چلا جاؤں گا لیکن اس بے ایمان کے ساتھ سفر نہیں کروں گا۔"

"اوئے! ان کا کرایہ واپس کردو۔" ڈرائیور نے کلینر کو حکم دیا۔

کلینر نے استاد کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈال کر چند نوٹ نکالے، انہیں گنا اور پھر ادھیڑ عمر شخص کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولا۔"گن لو پورے ہیں میں نے ایک روپیا بھی نہیں نکالا۔"

معاملہ رفع دفع ہوتے ہی تمام سواریاں اپنی اپنی نشست پر جا بیٹھیں۔ڈرائیور نے بس اسٹارٹ کی اور پھر تیزی کے ساتھ ریسٹورنٹ کے احاطے سے نکل کر پختہ روڈ کی طرف روانہ ہوگیا۔اب ریسٹورنٹ کے احاطے میں وہ باپ بیٹی، اور ہم رہ گئے تھے۔

"انکل! آپ نے بس چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔" شہزاد مخاطب ہوا۔"جب کہ آپ کے ساتھ بیٹی بھی ہے۔"

"بات اچھے برے کی نہیں ہے بیٹے! بلکہ اصول کی ہے۔بے ایمان شخص کی معیت میں سفر کرنا مجھے پسند نہیں ہے اور نہ ہی اسے میرا ضمیر گوارا کرتا ہے۔"

"اچھی بات ہے انکل......لیکن آپ کو جانا کہاں ہے؟" شہزاد نے سوال کیا۔

"گلگت......وہاں میں ایک اسکول میں پڑھاتا ہوں۔"

"اوہ......تو آپ ایک استاد ہیں۔آپ کا اسم شریف؟"

"احمد حسین۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"اگر آپ محسوس نہ کریں تو ہم آپ کو اپنے ساتھ گلگت تک لے جاسکتے ہیں۔" شہزاد نے اسے پیش کش کی۔"ہم بھی گلگت ہی جا رہے ہیں۔"

"شکریہ بیٹے! تم لوگ تکلیف کیوں اٹھاتے ہو۔ہم بس سے چلے جائیں گے، ابھی تھوڑی دیر کے بعد دوسری بس آجائے گی۔"

"انکل! اس میں تکلیف کی کون سی بات ہے؟" میں جو اتنی دیر سے چپ تھا مداخلت کرتے ہوئے بولا۔"ہم کوئی کندھے پر اٹھا کر تو نہیں لے جائیں گے......جیپ ہے ہمارے پاس بالکل نویں نکور۔"

"یہ کون ہے؟" ماسٹر احمد نے شہزاد سے پوچھا۔

"یہ جمال احمد بدبخت ہے اور بدقسمتی سے میرا دوست ہے۔" شہزاد نے ہنس کر بتایا۔

"یہ کیسا نام ہے بھئی؟" ماسٹر نے چونک کر سوال کیا۔

"شاعروں کے نام ایسے ہی ہوتے ہیں انکل......دراصل بدبخت اس کا تخلص ہے۔کافی مشہور شاعر ہے، بس کوئی چھاپتا نہیں ہے اسے ورنہ آج اس کے بے شمار فین ہوتے اور لوگ احمد فراز کو بھول کر......"

"یہ بکواس کر رہا ہے انکل۔" میں نے قطع کلامی کی۔

"میں تو شاعروں اور شاعری کے سخت خلاف ہوں، تاہم یہ حضرت خود یہ نامعقول شوق رکھتے ہیں اور ایک گھٹیا میگزین میں ان کی شاعری چھپتی بھی رہتی ہے۔ایک بار اپنی شاعری اس نے ایک ادبی میگزین کو بھجوائی تو میگزین کے ایڈیٹر کا جواب آیا سوری جناب ہم لطیفے نہیں چھاپتے۔"

ماسٹر احمد نے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔"کیوں بھئی! کیا تمہارا دوست سچ کہہ رہا ہے؟"

شہزاد نے کہا۔ ''اس میں صرف اتنا سچ ہے کہ میں شاعری کرتا ہوں بقیہ ساری بکواس کو آپ کسی سیاسی لیڈر کا بیان سمجھ لیجیے۔''

''بہت خوب بھئی۔'' ماسٹر نے دوبارہ قہقہہ لگایا۔

''سیر پہ سوا سیر والا معاملہ ہے۔ ویسے تم دونوں مجھے آرمی سے نہیں لگتے اور ابھی تک تم لوگوں نے اپنا تعارف بھی نہیں کرایا حالانکہ سب سے پہلے تعارف کرایا جاتا ہے۔''

''تعارف کا موقع ہی کہاں ملا ہے انکل۔'' شہزاد بولا۔ ''ویسے میرا نام شہزاد ہے جب کہ میرے دوست کا نام آپ کو معلوم ہے۔ ہم دونوں کا تعلق پنجاب سے ہے اور ابھی ابھی یونی ورسٹی کی تعلیم سے فارغ ہوئے ہیں۔ میرے ابو ایک روایتی قسم کے زمین دار ہیں جب کہ یہ حضرت ایک پروفیسر کے برخوردار ہیں۔ میں ایک ''پینڈو'' ہوں اور یہ شہری ہے۔ اس وقت ہم دونوں گلگت اسکردو کی سیر کے لیے جارہے ہیں۔''

اس کے بعد ماسٹر کے استفسار پر شہزاد نے اسے اپنے اور میرے متعلق سب کچھ تفصیل کے ساتھ بتا دیا۔ ان کے بارے میں سب کچھ جان لینے کے بعد ماسٹر بولا۔ ''ٹھیک ہے میں تم لوگوں کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوں مگر میری ایک شرط ہے۔''

''کیسی شرط؟'' شہزاد نے متحیر ہو کر پوچھا۔

''میرا گھر گلگت میں ہے اور وہاں تم لوگ مجھے میزبانی کا موقع ضرور دو گے۔''

''او کے، ہمیں منظور ہے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔

☆......☆

گلگت میں ماسٹر احمد کے گھر میں رہتے ہوئے شہزاد اور جمال کو تین دن ہو چکے تھے۔ ماسٹر احمد ان کی خوب خاطر مدارات کر رہا تھا۔ وہ واقعی ایک مہمان نواز شخص تھا۔ اس دوران ان دونوں نے جی بھر کر گلگت کی سیر کی تھی۔ اونچے فلک بوس پہاڑوں پر چڑھے تھے۔ سرسبز و شاداب وادیوں میں گھومے تھے۔ میں نے خوب ڈٹ کر خوبانیاں کھائی تھیں۔ تاہم شہزاد میری کی طرح پیٹو نہیں تھا۔ ہاں سیر کرنے اور گھومنے پھرنے کا اسے بے حد شوق تھا۔ وہ روزانہ صبح سویرے ناشتا کرنے کے بعد سیر کے لیے نکل جایا کرتا تھا۔ ناشتا ماسٹر احمد کی بیٹی لایا کرتی تھی۔ اس کا نام سنبل تھا اور وہ میٹرک تک پڑھی ہوئی تھی۔ حسین اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ ہم دونوں کی بہت عزت کرتی تھی۔ سنبل کے علاوہ ماسٹر کا ایک بیٹا بھی تھا جو پانچویں کلاس میں پڑھ رہا تھا اور اس کا نام ریحان تھا۔ ان تین دنوں کے اندر ہی شہزاد' سنبل کے لیے اپنے دل میں لطیف جذبات محسوس کرنے لگا تھا۔ سنبل بھی اسے پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھتی تھی مگر ابھی تک ان دونوں کے درمیان کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی جسے محبت کا نام دیا جاسکتا۔

چوتھے روز جب سنبل ان کے کمرے میں ناشتا لے کر پہنچی تو اس وقت شہزاد نہا دھو کر تیار ہو چکا تھا جب کہ میں حسب معمول خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔

''یہ آپ کا دوست سوتا بہت ہے۔'' وہ ناشتے کی ٹرے ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے کیا؟''

''ارے مسئلہ کیا چیز ہے یہ حضرت تو سرتاپا مسائل ہیں۔ ملک کو اتنے مسائل درپیش نہیں ہیں، جتنے اس بے چارے کو ہیں۔ اب میں آپ کو اس کا کون کون سا مسئلہ بتاؤں؟''

وہ مسکرائی۔ ''سبھی بتا دیں......ہوسکتا ہے ابو کے پاس ان کے کسی مسئلے کا حل موجود ہو؟''

''آپ کے ابو کے پاس میرے نہیں بلکہ اس کے مسئلے کا حل موجود ہے اگر آپ تعاون فرمائیں تو اس بے چارے کا مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔'' میں نے لحاف سے سر نکال کر جواب دیا اور سنبل جھینپ کر رہ گئی۔

''بکواس مت کرو۔'' شہزاد نے آنکھیں نکالیں۔ ''ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

''ٹھیک کہتے ہو تم سے برا کون ہوسکتا ہے؟ یہ تو میں ہوں کہ تمہارے ساتھ گزارا کر رہا ہوں۔ تمہارا باطن تمہارے ظاہر سے زیادہ کالا ہے اسی لیے تو زبان سے بھی اچھی بات نہیں نکلتی۔''

''اب میرا بھائی اتنا کالا بھی نہیں ہے۔'' سنبل نے مداخلت کی۔ ''بس تھوڑا سا سانولا ہے۔''

''واہ کیا کہنے بھئی۔'' میں نے نعرہ لگایا۔ ''بہن ہو تو ایسی ویسے، اباجی کہتے ہیں کہ میں سانولا نہیں ہوں بلکہ پکے رنگ کا ہوں۔''

''انکل بالکل ٹھیک کہتے ہیں، کالا رنگ پکا رنگ ہی تو ہوتا ہے۔ چاہے جتنی کریمیں استعمال کرلو رنگ ویسے کا ویسا ہی رہتا ہے۔''

"چلو کوئی بات نہیں، لوگ کہتے ہیں کہ کالے دل والے ہوتے ہیں اور گورے ہرجائی۔ اپنی میڈم نے بھی تو یہی گایا ہے ناں کہ کالا شاہ کالا میرا کالا اے دلدار تے گورے آں نوں پراں کرو۔" میں نے باقاعدہ گا کر جواب دیا۔

"لیکن میڈم نے سارے دلدار تو گورے رنگ کے ہی چنے تھے۔ ان میں تو کوئی ایک بھی تیری طرح کا حبشی نہیں تھا۔"

"زبان نوں لگام دے اوئے بے غیرتا!" میں لحاف پھینک کر بستر پر کھڑا ہو گیا۔ "میں تے نتھ پادیاں گا۔"

"کیا بات ہے جہال بھائی کی۔" سنبل نے ہنس کر کہا۔ "اس طرح تو کوئی فلمی ہیرو بھی نہیں بول سکتا۔"

"اس گدھے نے سلطان راہی کی سب فلمیں دیکھ رکھی ہیں۔ اس کی جنرل نالج بس پنجابی فلموں تک ہی محدود ہے۔"

"پنجابی فلموں تک کیوں محدود ہے؟ میں نے ہسٹری میں ایم اے کیا ہے جو دل چاہے پوچھ لو؟" میں نے سینہ پھلاتے ہوئے جواب دیا۔

"او کے۔" شہزاد نے اثبات میں سر ہلایا۔ "محمد بن قاسم کے سسر کا کیا نام تھا اور وہ کس عہدے پر کام کرتے تھے؟"

"یہ سوال ہی غلط ہے؟"

"کیوں غلط ہے؟"

"سیدھی سی بات ہے عرب کئی کئی شادیاں کرتے ہیں، اب مجھے کیا معلوم کہ اس کے کتنے سسر تھے؟"

"چلو تم اس کے کسی ایک سسر کا نام بتا دو؟"

"نہیں معلوم......تم کوئی دوسرا سوال پوچھ لو۔"

"او کے......یہ بتاؤ کیا لیلیٰ سچ مچ کالی تھی؟"

"مجھے کیا پتا' کیا وہ میرے ماموں کی بیٹی تھی؟" میں نے جھنجلا کر جواب دیا۔

"اچھا یہ بتاؤ ہیر کا چچا کس پاؤں سے لنگڑا تھا؟"

"میں رانجھا نہیں ہوں یار۔" میں چلایا۔

"ایم اے ہسٹری تو ہو ناں؟"

"جہنم میں گئی ہسٹری۔" میں پاؤں پٹختے ہوئے باتھ روم میں گھس گیا۔ شہزاد نے ایک قہقہہ لگایا اور پھر سنبل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"دیکھا' آپ کا بھائی کس قدر ذہین ہے۔ میں نے تین سوال پوچھے مگر اسے کسی سوال کا جواب بھی معلوم نہیں تھا۔"

"آپ کے سوال ہی اوٹ پٹانگ تھے، وہ کیا جواب دیتا؟"

"چلو تو پھر آپ ہی ایک آسان سے سوال کا جواب دے دیں؟"

"پوچھیے۔"

"میں آپ کو کیسا لگتا ہوں؟"

"م م......مجھے......کیا پتا جی۔" اس......نے شرما کر کہا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

☆......☆

سنبل کا شرما کر بھاگ جانا شہزاد کے لیے گرین سگنل تھا۔ چنانچہ اب وہ کسی ایسے موقع کا منتظر تھا جب وہ کھل کر سنبل سے اظہار محبت کر سکتا۔ میں ان دونوں کے دلی جذبات سے آگاہ تھا لیکن مجھے شہزاد کا سنبل میں دلچسپی لینا پسند نہیں تھا کیونکہ میں شہزاد کے والد چودھری مراد کو اچھی طرح جانتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ چودھری صاحب کبھی بھی سنبل کو بطور بہو کے قبول نہیں کریں گے۔ میرے نزدیک ان دونوں کی یہ محبت کسی طوفان کا پیش خیمہ تھی مگر وہ شہزاد کو کوشش کے باوجود اپنے اس خدشے سے اب تک آگاہ نہیں کر سکا تھا۔ اس روز جب رات کا کھانا کھا کر ہم اپنے کمرے میں پہنچے تو یونہی باتوں باتوں میں شہزاد نے سنبل کا ذکر چھیڑ دیا۔

"یار! میں سنبل کے متعلق سنجیدہ ہوں، مجھے کوئی مشورہ دو......کیا کروں؟"

"تیرے سنجیدہ ہونے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔" میں نے جواب دیا۔

"کیوں نہیں ہوگا' وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔" اس نے فخریہ انداز میں جواب دیا۔

"اس نے کب کیا ہے تجھ سے محبت کا اظہار؟"

"اظہار محبت تو ابھی تک میں نے بھی نہیں کیا اس سے۔"

"تو پھر کیا تجھے الہام ہوا ہے کہ تجھ سے محبت کرتی ہے؟"

وہ بولا۔ "محبت لفظوں کی محتاج نہیں ہوتی میرے دوست! یہ تو نگاہوں سے محسوس کیے جانے والے ایک جذبے کا نام ہے، جو دل میں نہاں ہوتا ہے وہ آنکھوں سے

عیاں ہوتا ہے۔ میں نے اس کی آنکھیں پڑھی ہیں، وہ سو فی صد مجھ سے پیار کرتی ہے۔"

"تو نے سنبل کی آنکھیں تو پڑھ لی ہیں لیکن شاید انکل مراد کی آنکھیں کبھی نہیں پڑھیں۔ وہ کبھی بھی سنبل کو بہو کی صورت میں قبول نہیں کریں گے، اس لیے اپنے دل سے یہ خیال نوچ کر پھینک دو ورنہ تیرے ساتھ بہت برا ہوگا۔ تو کہیں کا بھی نہیں رہے گا۔"

"یہ بعد کی باتیں ہیں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

"مطلب تو آگ میں کودنے کے لیے تیار ہے؟"

"ہاں۔" اس کے لہجے سے عزم جھلکنے لگا۔ "میں اس آگ میں کودنے کا حتمی فیصلہ کر چکا ہوں۔"

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ آگ صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے گل وگلزار ہوئی تھی؟"

"جذبہ سچا ہو تو آگ کا سمندر بھی عبور کیا جاسکتا ہے۔"

"ایسے ڈائیلاگ فلموں میں اچھے لگتے ہیں اور جن پر فلمائے جارہے ہوتے ہیں وہ عملی زندگی میں ایک ندی بھی عبور نہیں کرسکتے۔ آدمی بن عاشق مت بن، یہی تیرے حق میں بہتر ہوگا۔"

"تم دوست ہو میرے کہ دشمن؟" وہ جھنجلا گیا۔ "میں نے تم سے مشورہ مانگا ہے، لیکچر دینے کو نہیں کہا۔"

"یہ مشورہ ہے لیکچر نہیں ہے اور میں دوست بن کر ہی تجھے دے رہا ہوں۔ اگر یہ لیکچر لگتا ہے تو بھاڑ میں جا، میں تجھے..... نہیں روکوں گا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم اس معاملے میں میری کوئی مدد نہیں کروگے؟" اس نے مایوسی کے عالم میں پوچھا۔

"کیوں نہیں کروں گا؟" میں استہزائیہ انداز میں بولا۔ "انکل مراد جب جوتے مار کر تجھے گھر سے آؤٹ کریں گے تو سیدھے میرے پاس چلے آنا، کھانا پینا اور رہائش فری ملے گی۔ اس سے زیادہ میں تیری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔"

"لعنت ہے تم پر، ایک بار نہیں سو بار۔"

"سو بار کیوں، بے شمار بار بھیجو..... مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔"

"اچھا اب بکواس بند کرو۔" اس نے غصے سے کہا اور دندناتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کا رخ گھر کے لان کی طرف تھا۔ وہ ٹہلنا چاہتا تھا، میری باتوں نے اسے پریشانی میں مبتلا کردیا تھا۔ جونہی اس نے طویل کاریڈور عبور کیا، ایک دم ٹھٹک کر رک گیا۔ لان میں ماسٹر احمد کے ساتھ کوئی شخص بحث میں الجھا ہوا تھا۔ چاندنی میں وہ دونوں اسے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ماسٹر احمد قدرے نیچی آواز میں بول رہے تھے جب کہ دوسرا شخص سخت طیش کے عالم میں تھا۔ اس کی آواز واضح طور پر شہزاد کی سماعتوں تک پہنچ رہی تھی۔

"مجھے سنبل کا رشتہ چاہیے یا پھر دو دن کے اندر اپنی رقم..... فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔" وہ جو کوئی بھی تھا بڑی بدتمیزی سے بول رہا تھا۔

سنبل کا نام سن کر شہزاد کا دل بے اختیار دھڑک اٹھا۔ وہ دونوں اس سے تقریباً تیس گز کی دوری پر چھوٹے سے لان کے وسط میں کھڑے تھے۔ لان کے اردگرد پھولوں اور مختلف قسم کے پودوں کی کیاریاں تھیں جب کہ وسط میں امریکن گھاس تھی۔ ان دونوں کے نزدیک دو کرسیاں بھی رکھی ہوئی تھیں مگر وہ بیٹھنے کی بجائے کھڑے ہوئے تھے۔

"اپنی گندی زبان سے میری بیٹی کا نام مت لو۔" ماسٹر احمد نے دھیمی آواز میں کہا۔ "ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔"

"واہ ماسٹر جی' واہ۔" وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔ "اب میری زبان گندی ہوگئی ہے....... اگر تم سنبل کے باپ نہ ہوتے تو میں تمہیں ابھی مزہ چکھادیتا۔"

"شمیر خان! میری برداشت کا امتحان مت لو۔" ماسٹر نے طیش کے عالم میں کہا۔ "ورنہ دھکے مار کر یہاں سے نکال دوں گا۔"

"شمیر خان کو دھکے مارنے والا ابھی پیدا ہی نہیں ہوا، تم خود کو سمجھتے کیا ہو؟ دو ٹکے کے ماسٹر! تمہاری اتنی اوقات کہ مجھے دھکے مار کر نکال سکو؟"

"تم فوراً دفع ہوجاؤ یہاں سے۔" ماسٹر تمام احتیاط بالائے طاق رکھتے ہوئے چلایا۔

"نہیں جاتا۔" اس نے ہٹ دھرمی سے کہا۔ "جو کچھ بگاڑنا ہے بگاڑلو..... میں بھی تو دیکھوں کہ تم کتنے بڑے طرم خان ہو؟"

ماسٹر کی قوت برداشت جواب دے گئی، ایک سیکنڈ میں اس کا دایاں ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور پھر "چٹاخ" کی آواز آئی۔ تھپڑ شمیر خان کے گال پر پڑا تھا۔

"حرام زادے۔" تھپڑ کھا کر شمیر خان پاگل ہوگیا اور بھوکے گدھ کی طرح ماسٹر پر جھپٹ پڑا۔ اس نے ماسٹر کو گریبان سے پکڑا اور اس کے چہرے پر تھپڑوں کی بارش کردی۔ ماسٹر نہ صرف اس کے مقابلے میں کمزور بلکہ ڈھلتی ہوئی عمر کا شخص تھا۔ جوابی وار کرنا تو دور کی بات تھی وہ بے چارہ تو اپنا دفاع کرنے سے بھی قاصر تھا۔ اب شہزاد کے لیے مداخلت ناگزیر ہو چکی تھی۔ وہ بھاگتا ہوا لان میں پہنچا اور شمیر خان کو عقب سے جکڑ لیا۔ شمیر خان نے اسے ایک گالی دیتے ہوئے خود کو چھڑانے کے لیے زور لگایا مگر شہزاد کی مضبوط گرفت سے نہ نکل سکا۔ تب وہ جھنجلا کر شہزاد کو گندی گالیاں دینے لگا۔ شہزاد جو پہلے ہی غصے سے کھول رہا تھا، گالیاں سن کر مزید غصے میں آگیا۔

"میں نے تیرے جیسا بے غیرت انسان آج تک نہیں دیکھا۔" شہزاد نے اس کی پیٹھ پر ایک گھونسا رسید کرتے ہوئے کہا۔ "ایک بوڑھے پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے بھی تجھے شرم نہیں آئی؟"

"تم کون سے غیرت مند ہو.....مجھے دھوکے سے پکڑ کر خود کو ہیرو سمجھ رہے ہو؟.....ایک بار مجھے چھوڑ دو پھر میں تمہیں بتاتا ہوں کہ غیرت کسے کہتے ہیں؟" شمیر خان نے اسے طعنہ دیتے ہوئے جواب دیا۔

اس کا طعنہ سن کر شہزاد کے تن من میں جیسے آگ لگ گئی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے اسے چھوڑ دیا اور اپنی شرٹ کی آستینیں چڑھاتے ہوئے بولا۔ "آجا اور دکھا مجھے غیرت...... کم آن ہٹ می...... شاباش.....جلدی کرو......"

"نہیں بیٹے!" ماسٹر نے مداخلت کی۔ "تم اس غنڈے کے منہ مت لگو.....یہ بہت خطرناک......"

"آپ بس تماشا دیکھیں انکل۔" شہزاد نے قطع کلامی کی۔ "میں اس گیدڑ کا کیسے حلیہ بگاڑتا ہوں۔"

"تیری تو........" شمیر خان نے ایک گالی بکتے ہوئے اس پر چھلانگ لگادی مگر شہزاد غافل نہیں تھا۔ وہ تیزی سے ایک طرف ہٹ گیا اور شمیر خان اپنے ہی زور میں زمین سے جا ٹکرایا، پھر اس سے قبل کہ وہ دوبارہ اٹھ کر اپنے پیروں پہ کھڑا ہوتا، شہزاد کی لات اس پر پڑی اور وہ جو اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا دوبارہ زمین بوس ہوگیا۔ اب اس کے منہ سے بوچھاڑ کی صورت میں گالیاں نکل رہی تھیں۔ وہ شہزاد کا شجرہ بعض ناپاک جانوروں سے جوڑ رہا تھا لیکن شہزاد نے اس کی بکواس پر کوئی توجہ نہ دی۔ اپنی زبان گندی کرنے کی بجائے اس نے اس کی ٹھکائی کرنا مناسب سمجھا کہ یہی اس کا بہترین علاج تھا۔

"اٹھ مرد بن....." شہزاد نے دوسری لات اس کے پہلو میں رسید کرتے ہوئے کہا اور شمیر خان کی چیخ نکل گئی۔

"چلاؤ مت.......غیرت ہے تو اب اٹھ کر دکھاؤ۔"

شہزاد نے حقارت سے کہا اور پھر اسے لاتوں پہ رکھ لیا۔ وہ ایک فربہ بدن درمیانے قد کا بلتستانی تھا جب کہ شہزاد اس کے مقابلے میں چھریرے بدن کا مالک تھا اور قد میں بھی اس سے اونچا تھا۔ دوران تعلیم مارشل آرٹ سے بھی اسے لگاؤ رہا تھا۔ اگرچہ اپنے اس شوق کو اس نے پایہء تکمیل تک نہیں پہنچایا تھا مگر پھر بھی بہت سارے داؤ پیچ وہ سیکھ گیا تھا۔ چنانچہ چند ہی لمحوں میں اس نے شمیر خان کی کچھ اس طرح سے دھلائی کی جیسے ملٹری کے دھوبی ملٹری یونی فارم کی کرتے ہیں۔ شمیر خان کی چیخیں سن کر مجھ سمیت ماسٹر کے سارے گھر والے لان میں جمع ہو چکے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے شمیر خان کو شہزاد کے پنجہء استبداد سے نجات دلائی۔ شمیر خان اب اس کتے کی طرح ہانپ رہا تھا جو شکار کے پیچھے دوڑتا رہا ہو۔

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا بیٹے۔" معاملہ ٹھنڈا ہوتے ہی ماسٹر متفکر انداز میں شہزاد سے مخاطب ہوا۔ "تم لوگ تو چلے جاؤ گے مگر مجھے یہیں رہنا ہے۔ یہ شخص تو میرا اور میرے گھر والوں کا جینا دوبھر کردے گا۔"

"یہاں کیا اس کے باپ کا راج ہے۔" وہ بولا۔ "آپ فکر کیوں کرتے ہیں، میں اس کا پکا بندوبست کر کے جاؤں گا۔"

"پکا بندوبست......مگر کیسے؟" ماسٹر نے الجھ کر پوچھا۔

"یہاں میرا ایک کزن کیپٹن ہے۔ بس آپ دیکھتے جائیں کہ میں اس کا کیا حشر کرتا ہوں؟ یہ آئندہ آپ کے سائے سے بھی دور بھاگے گا۔"

"مم......مجھے جانے دیں جی۔" شہزاد کا ارادہ جان کر شمیر خان فریادی انداز میں بولا۔ "میں ماسٹر صاحب سے اپنی غلطی کی معافی چاہتا ہوں۔"

"یہ غلطی نہیں تھی مسٹر' غنڈا گردی تھی اور تمہیں اس کے نتائج بھگتنا ہوں گے۔" شہزاد نے دوٹوک الفاظ میں جواب دیا اور پھر ماسٹر کی طرف متوجہ ہوگیا۔ "انکل!

آپ فون اٹھا کر ہمارے کمرے میں لے آئیں، میں اور جمال اسے لے کر آرہے ہیں۔''

''خد.....خدا.....کے لیے.....م.....مجھے جانے دیں جی۔'' شمیر خان گڑگڑایا۔ ''م.....میں آئندہ.....ماسٹر صاحب کے.....نزدیک سے بھی نہیں گزروں گا۔ یہ میری پہلی اور آخری غلطی سمجھ کر چھوڑ دیں جی۔''

''تمہیں شاید اونچا سنائی دیتا ہے؟'' میں نے مداخلت کی۔ ''چلو ورنہ اسکول کا زمانہ یاد دلا دیں گے.......ڈنڈا ڈولی کا مطلب سمجھتے ہو ناں؟''

''مسخرے بازی چھوڑو جمال۔'' شہزاد نے مجھے ڈانٹا اور شمیر خان کو بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف لے جانے لگا، جب کہ میں اسے پیچھے سے دھکیل رہا تھا۔ چند لمحوں کے اندر ہم نے اسے کمرے کے اندر پہنچا دیا، جہاں ماسٹر احمد پہلے ہی ٹیلی فون لیے موجود تھا۔

شہزاد نے اپنے کزن مدثر کا نمبر ملایا اور اسے شمیر خان کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔

مدثر نے کہا۔ ''تم بے فکر رہو میں ابھی اس کا بندوبست کر دیتا ہوں۔ اسے وہاں روکے رکھو میں پولیس بھجوا رہا ہوں۔''

''پولیس تو اسے چھوڑ دے گی یار۔'' شہزاد نے خدشہ ظاہر کیا۔

''پولیس کے باپ کا راج ہے کیا؟'' وہ بولا۔ ''پولیس اسے ہم سے پوچھے بغیر چھوڑنے کی غلطی نہیں کرے گی لیکن میں پھر بھی اپنے کمانڈنگ آفیسر سے بات کر لیتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، جیسا تم مناسب سمجھو کرو۔''

☆.....☆

شمیر خان والے معاملے کے بعد نہ صرف سنبل بلکہ ماسٹر احمد کی نگاہوں میں بھی شہزاد کی عزت دوچند ہو گئی تھی۔ شہزاد نے اپنے ذرائع استعمال کرتے ہوئے شمیر خان کو ہمیشہ کے لیے وہاں سے آؤٹ کر دیا تھا۔ ماسٹر احمد کے ذمے شمیر خان کا ڈیڑھ لاکھ روپے واجب الادا تھے جو شہزاد نے دو دنوں کے اندر چکا دیا تھا۔ شہزاد کے اس پُرخلوص عمل نے ماسٹر احمد اور اس کے اہل خانہ کے دل جیت لیے تھے۔ خصوصاً سنبل تو بے حد خوش تھی۔

اس دن صبح کے وقت وہ ذرا دیر سے ناشتا لے کر ان کے کمرے میں داخل ہوئی تو شہزاد بستر پر لیٹا ہوا تھا جب کہ میں برآمدے میں تھا۔

''جمال بھائی کدھر ہیں؟'' اس نے ناشتے کی ٹرے ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''زندگی میں پہلی بار وہ صبح کی سیر کرنے نکل گیا ہے۔''

''اور آپ کیوں نہیں گئے؟'' اس نے ذومعنی انداز میں سوال کیا۔

''میں آپ کا منتظر تھا۔ اب چلا جاؤں گا۔''

''اگر آپ ایسی باتیں کرتے رہیں گے تو پھر میں یہاں نہیں ٹھہروں گی۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

''رکو سنبل مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔'' شہزاد بستر سے اتر کر اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''میں..میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اگر تمہیں کوئی اعتراض ہے تو بلا جھجک مجھے بتا دو.....میں تم سے کوئی شکوہ نہیں کروں گا۔''

''م.....مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے جی۔'' اس نے شرما کر کہا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

وہ اپنی ہی دھن میں گنگنا رہا تھا کہ میں کمرے میں داخل ہوا اور اسے گنگناتے دیکھ کر بولا۔ ''او بھائی! یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ یہ بھدی آواز میں کس کو گانے سنائے جا رہے ہیں؟''

''مت پوچھ میرے یار آج میں کتنا خوش ہوں۔'' اس نے پُرجوش انداز میں جواب دیا۔

''او کے.....نہیں پوچھتا۔''

''پوچھ پوچھ میرے یار۔''

''ناشتے میں چائے کی بجائے بھنگ تو نہیں چڑھا لی؟ جب پوچھتا ہوں تو کہتے ہو مت پوچھ اور جب نہیں پوچھتا تو کہتے ہو پوچھ پوچھ.......تجھ پر کسی جن کا سایا تو نہیں پڑ گیا۔''

''سنبل مجھ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہے۔ ابھی تمہارے آنے سے قبل اس سے میری بات ہوئی ہے، وہ راضی ہے، بس ماسٹر صاحب سے بات کرنی پڑے گی۔''

''اوہ.....تو یہ بات ہے۔'' جمال نے کہا۔ ''لیکن ماسٹر صاحب سے بات کون کرے گا؟''

''تم کرو گے اور کون کرے گا؟''

”میرا ابھی خودکشی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ مجھے تو معاف ہی رکھو، میں یہ احمقانہ قدم نہیں اٹھا سکتا۔“

”دوست بن کر سوچو، دشمن بن کر نہیں۔“

”اوں ہوں۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں انکل مراد کا عتاب مول نہیں لے سکتا۔ میری طرف سے پکا انکار سمجھو۔“

”لعنت ہے تمہارے جیسے دوست پر۔“

”کوئی پروا نہیں...... تم جتنی بار چاہو مجھ پر لعنت بھیج سکتے ہو۔“

”میرے لیے نہ سہی، سنبل کے لیے ہی..........“

ایسے ہی وقت سنبل کی امی صفیہ بیگم اندر داخل ہوئیں اور شہزاد کی بات ادھوری رہ گئی۔

”کیا باتیں ہو رہی ہیں بھئی؟“ صفیہ بیگم نے مسکرا کر پوچھا۔

”کک...... کچھ نہیں آنٹی...... بس ایسے ہی مذاق کر رہے تھے۔“ شہزاد نے بوکھلا کر جواب دیا۔

”یہ تم لوگوں نے ابھی تک ناشتا کیوں نہیں کیا؟“

”بس ابھی کرنے ہی والے تھے کہ آپ پہنچ گئیں۔“

”اب تو یہ ٹھنڈا ہو چکا ہوگا۔“ اس نے آگے بڑھ کر ٹرے اٹھا لی۔ ”خیر کوئی بات نہیں میں دوبارہ گرم کر دیتی ہوں۔“

شہزاد بولا۔ ”رہنے دیں آنٹی...... بس ایسے ہی ٹھیک ہے۔ آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں؟“

وہ مسکرائی۔ ”اس میں تکلیف والی کون سی بات ہے بیٹے! مائیں آخر کس لیے ہوتی ہیں؟“

”شکریہ آنٹی۔“

”کوئی بات نہیں، میں ابھی گرم کر کے لاتی ہوں۔“

وہ ٹرے اٹھا کر چل دی۔

”انہوں نے شاید ہماری باتیں سن لی ہیں؟“ جمال نے خدشہ ظاہر کیا۔

”نو پرابلم، جو کل ہونا ہے وہ آج ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے؟“

”تم اپنے ساتھ مجھے بھی بے عزت کراؤ گے۔“

”فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔“ شہزاد نے تسلی دی۔ ”یہاں کے لوگ گھر آئے مہمانوں کو بے عزت نہیں کرتے۔“

”میری چھٹی حس کہتی ہے کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے؟“

”چھٹی حس گدھوں کے پاس نہیں ہوتی، جینئس لوگوں کے پاس ہوتی ہے۔“ شہزاد نے مسکرا کر جواب دیا۔

اسی اثنا میں صفیہ بیگم ناشتا گرم کر کے لے آئی۔ اس نے ٹرے ٹیبل پر رکھ دی اور پھر شہزاد سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”بیٹے! ناشتا کرنے کے بعد اندر آ جانا مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“

”آ جاؤں گا آنٹی۔“ شہزاد نے فرماں برداری سے جواب دیا اور صفیہ بیگم بغیر کچھ کہے واپس پلٹ گئی۔

☆......☆

شہزاد اس وقت صفیہ بیگم اور ماسٹر احمد کے سامنے سر جھکائے بیٹھا تھا اور میں دروازے سے کان لگائے ہوئے تھا۔ ماسٹر احمد کو صفیہ بیگم نے فون کر کے بلوایا تھا۔ صفیہ بیگم نے سنبل کے بارے میں ان دونوں کی پوری گفتگو سن لی تھی۔ چونکہ معاملہ بیٹی کا تھا اس لیے اس نے شوہر کو بھی بلوا لیا تھا۔ ان دونوں میاں بیوی کو شہزاد اور اپنی بیٹی کی محبت پر کوئی اعتراض نہیں تھا تاہم وہ شہزاد کے باپ کی رضامندی سے یہ رشتہ کرنے کے خواہاں تھے۔ چنانچہ انہوں نے بغیر کسی لگی لپٹی کے اپنی اس خواہش کا اظہار شہزاد کے سامنے کر دیا تھا۔ شہزاد اب سر جھکائے انہی سوچوں میں مستغرق تھا جب کہ دونوں میاں بیوی جواب طلب انداز میں اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔

”انکل!“ قدرے توقف کے بعد شہزاد نے سر اٹھایا۔ ”بابا جان ایک روایتی جاگیردار ہیں وہ کبھی بھی میری بات نہیں مانیں گے۔“

”تو پھر ایسی صورت حال میں، میں کیا کر سکتا ہوں بیٹے! تمہارا باپ ایک جاگیردار ہے اور سچ پوچھو تو میں جاگیرداروں سے بہت ڈرتا ہوں۔ اس کی رضامندی کے بغیر یہ رشتہ کیسے ممکن ہے؟“

”انکل! میں بابا جان سے بات کر سکتا ہوں لیکن زبردستی اجازت طلب نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ بخوشی میری بات مان لیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس جرم میں مجھے عاق کر دیں۔“ شہزاد نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

”تم بات تو کرو...... ہو سکتا ہے وہ مان جائیں۔“ ماسٹر صاحب نے اصرار کیا۔

اس وقت وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹیلی

فون ان کے سامنے ٹیبل پر رکھا ہوا تھا۔ شہزاد نے ریسیور اٹھایا اور اپنے گھر کا نمبر ڈائل کر دیا۔ ساتھ ہی اس نے اسپیکر بھی آن کر دیا۔ تیسری بیل کے بعد شہزاد کی سماعتوں سے اپنی ماں کی آواز ٹکرائی۔ "ہیلو...... کون؟"

"بے جی! کیسی ہیں آپ؟" اس نے فرماں برداری سے پوچھا۔

"میں تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں...... تم سناؤ کب واپس آ رہے ہو؟"

"بے جی! ابھی تو مجھے دس روز ہوئے ہیں، اتنی جلدی کیسے واپس آ سکتا ہوں؟"

"میرے لعل! میں نے واپسی کا پوچھا ہے یہ تو نہیں کہا کہ ابھی واپس آ جاؤ؟"

"باباجان کہاں ہیں...... مجھے ان سے بات کرنی ہے......؟" اس نے سوال کیا۔

"وہ تو ابھی ناشتا کرنے کے بعد اٹھے ہیں۔ تم ہولڈ کرو میں دیکھتی ہوں شاید لان میں ٹہل رہے ہوں۔"

"ٹھیک ہے بے جی میں انتظار کر رہا ہوں۔"

"ہیلو برخوردار!" ذرا دیر کے بعد شہزاد کو اپنے باپ کی بارعب آواز سنائی دی۔ "تم ٹھیک تو ہو ناں...... کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟ میں نے تمہارے اکاؤنٹ میں مزید رقم بھی جمع کرا دی ہے۔"

"باباجان! مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔" اس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کہا۔

"تو کرو ناں...... میں سن رہا ہوں۔"

"مم...... میں...... میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"کہاں...... کس کے ساتھ؟" مراد علی نے الجھ کر پوچھا۔

جواب میں شہزاد نے بلا کم و کاست ساری صورتِ حال اسے بتا دی۔

دوسری جانب چند لمحوں کے لیے بالکل خاموشی چھا گئی۔ شہزاد کا دل بے اختیار دھڑکنے لگا۔ نہ جانے اس کے باباجان کس کیفیت سے گزر رہے تھے؟ فون پر وہ ان کی صورت نہیں دیکھ سکتا تھا، اس لیے کوئی بھی اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔

"تم فوراً بلکہ اسی وقت واپس آ جاؤ۔" چند لمحوں کے بعد ریسیور میں سے مراد علی کی تحکمانہ آواز ابھری۔

"پلیز باباجان! آپ ذرا ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچیں۔" وہ منت کے انداز میں بولا۔ "میں ماسٹر صاحب کو زبان دے چکا ہوں۔"

"میری اجازت کے بغیر تم نے یہ اہم فیصلہ کس طرح کر لیا؟" وہ پھنکارے۔ "لوٹ آؤ ورنہ بہت برا ہوگا۔"

"میں زبان سے نہیں پھر سکتا باباجان۔" اس نے ہمت کا مظاہرہ کیا۔ "بھلے آپ مجھے جان سے ہی کیوں نہ مار ڈالیں...... اب میں پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔"

"نافرمان، بے ادب!" مراد علی چلایا۔ "اگر تم نے ایسا کچھ کیا تو میں تمہیں عاق کر دوں گا۔"

"کر دیں باباجان مگر میں پھر بھی آپ ہی کا بیٹا کہلاؤں گا۔" اس نے بغیر کسی ردِعمل کے شائستہ لہجے میں جواب دیا۔

"آج سے میں خود کو بے اولاد سمجھوں گا۔" اتنا کہہ کر مراد علی نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

"انکل! اب میں ایک عام آدمی ہوں۔" وہ ریسیور کو کریڈل پر رکھتے ہوئے بولا۔ "ابا حضور نے مجھے عاق کرنے کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔ اب میں آپ کا فیصلہ سننے کا منتظر ہوں، چاہیں تو انکار کر دیں یا پھر مجھے اپنی فرزندی میں قبول کر لیں۔"

"فکر نہ کرو بیٹے! اللہ بہتر کرے گا۔" ماسٹر احمد نے اسے تسلی دی۔

اس واقعے کے ٹھیک پانچ دن کے بعد شہزاد اور سنبل کی شادی نہایت سادگی کے ساتھ انجام پا گئی۔ شہزاد کی طرف سے جمال اور کیپٹن مدثر کے علاوہ کوئی بھی اس شادی میں شریک نہیں ہوا تھا تاہم ماسٹر احمد کے بہت سے رشتے داروں نے شرکت کی تھی۔

☆......☆

وہ ایک محل نما کوٹھی تھی اور شہزاد علی وہاں گزشتہ پانچ برس سے تنہا زندگی بسر کر رہا تھا۔ سنبل سے شادی کرنے کے بعد اس کے باپ نے واقعی اسے عاق کر دیا تھا مگر باپ کی وفات کے بعد سب کچھ اسے بہ آسانی واپس مل گیا تھا۔ باپ کی زندگی میں اس نے کبھی اس کوٹھی میں قدم نہیں رکھا تھا۔ اس نے بائیس برس کا طویل عرصہ میرے ہاں شہر میں بسر کیا تھا۔ شادی کے بعد سنبل نے صرف دو برس ہی اس کا ساتھ دیا تھا۔ سنبل کی موت میٹرنٹی ہوم میں ہوئی تھی۔ تمہاری ڈیلیوری کے دوران ہی وہ اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ شہزاد کو سنبل کے ساتھ وہ آخری ملاقات اب تک یاد تھی۔

سنبل کے آخری الفاظ اب تک اس کی سماعتوں میں گونج رہے تھے۔اس نے نہایت ہی بے بسی کے عالم میں شہزاد سے ایک ایسی التجا کی تھی جس کی سزا آج بھی شہزاد بھگت رہا تھا۔سنبل نے نزع کے عالم میں اس سے التجا کی تھی۔

”شہ..... زاد..... مم..... میرے مرنے..... کے بعد..... دو..... سری..... شا..... دی..... مت..... کرنا..... میرے..... بچے کو..... ماں اور..... باپ..... دونوں..... کا..... پیار دینا..... میرے..... حصے کی وفا..... اور پیار..... میرے بچے..... کو دینا.......“

سنبل کے مرنے کے بعد شہزاد نے خود کو نومولود بیٹے کی دیکھ بھال کے لیے وقف کردیا تھا۔وہ تمہیں اپنے ہاتھوں سے فیڈر کے ذریعے مصنوعی دودھ پلاتا تھا۔نہلاتا تھا۔غلاظت صاف کرتا تھا۔اس کی راتوں اور دن کا چین لٹ گیا تھا مگر وہ کبھی بھی حرف شکایت زبان پر نہیں لایا تھا۔عشق میں جان دینا آسان ہے لیکن کسی کے ہاتھ میں زندگی کی ڈور تھمانا مشکل ترین کام ہے۔لوگ زندوں سے کیے گئے وعدے ایفا نہیں کرتے اور وہ ایک مری ہوئی عورت سے کیا گیا عہد نبھا رہا تھا۔اسے تم میں اپنی سنبل کی صورت دکھائی دیتی تھی۔وہ پانچ سال تک تمہارا آیا بنا رہا، یہ عرصہ اس پر بہت کٹھن گزرا مگر جب تم نے اسکول جانا شروع کیا تو اس نے بھی ایک فرم میں جاب کرلی۔وہ ہمیشہ کے لیے مجھ پر بوجھ بننا نہیں چاہتا تھا۔چنانچہ جاب ملتے ہی اس نے دو کمروں کا ایک فلیٹ کرایے پر لے لیا اور پھر دو سال کے عرصے میں وہ اس فلیٹ کا مالک بن چکا تھا۔

جب کبھی بھی میں اس سے ملنے کے لیے آتا تھا تو اسے شادی کرنے کا مشورہ ضرور دیا کرتا تھا، جب کہ وہ ہر بار مجھ سے یہی کہتا تھا کہ وہ سنبل سے بے وفائی نہیں کرسکتا۔تب میں اسے سمجھاتا کہ عورت کے بغیر گھر گھر نہیں ہوتا بلکہ قبرستان ہوتا ہے لیکن وہ مجھ کو بڑی خوب صورتی سے ٹال دیا کرتا تھا۔وقت دھیرے دھیرے گزرتا گیا اور شہزاد کی جوانی ادھیڑ عمری میں ڈھل گئی۔جس روز تم نے ایم بی اے کی ڈگری حاصل کی اس روز شہزاد کی خوشی قابلِ دید تھی۔اس خوشی کو انجوائے کرنے کے لیے اس نے میری پوری فیملی کو کھانے پر انوائٹ کرلیا۔اس دعوت کا اہتمام شہر کے مہنگے ترین فائیو اسٹار ریسٹورنٹ میں کیا گیا۔اس روز شہزاد نے خوب دل کھول کر خرچ کیا تھا۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد تم نے کچھ عرصہ تو آرام کیا اور پھر جاب کی تلاش میں دفاتر کے چکر لگانے لگے۔پھر تمہیں ایک اچھی کمپنی میں جاب مل گئی۔دو ماہ کے بعد کمپنی کے مالک کی اکلوتی بیٹی کا تم پر دل آگیا مگر کمپنی کے مالک کو ان کی یہ محبت بہت ناگوار گزری۔اس نے پہلے پہل تو بیٹی کو پیار سے سمجھایا، پھر غصہ دکھایا لیکن جب بیٹی کسی صورت نہ مانی تو اس نے بیٹی کے سامنے اس شرط پر ہتھیار ڈال دیے کہ تم کو یہ شادی کرنے کے لیے اپنا گھر چھوڑنا پڑے گا۔اس قتالہ عالم نے جب تم پر زور دیا تو وہ گھر چھوڑنے پر تیار ہوگئے۔اسی روز آفس سے واپس آنے کے بعد جب تم نے شہزاد سے اس سلسلے میں بات کی تو شہزاد کو اپنی سماعتوں پر بالکل یقین نہ آیا۔

”تم..... تم ایک لڑکی کی خاطر اپنے باپ کو چھوڑنے کی بات کررہے ہو؟“ اس نے حیرانی اور دکھ کی ملی جلی کیفیت میں پوچھا تھا۔

”ابو! میں اس سے بہت پیار کرتا ہوں۔“ تم نے کہا تھا۔”اگر وہ مجھے نہ ملی تو میں مرجاؤں گا۔“

”میں نے تمہیں شادی کرنے سے کب منع کیا ہے؟..... بے شک شادی کرو لیکن گھر چھوڑنے کی بات مت کرو بیٹے! میں بھی تمہارے بغیر نہیں جی سکتا۔“

”ابو! یہ میری ہونے والی بیوی کی خواہش ہے ورنہ میں تو آپ کو نہیں چھوڑنا چاہتا۔“

”واہ بیٹے واہ۔“ وہ طنزیہ انداز میں بولا تھا۔”تم نے ایک لڑکی کی خواہش پر اس باپ کو قربان کردیا جس نے تمہیں ماں بن کر پالا، جس نے اپنی جوانی تم پر واردی، جو سرما کی لمبی راتیں محض اس لیے جاگ جاگ کر گزارتا رہا کہ تمہاری نیند نہ ٹوٹے۔تمہاری ماں نے تو صرف تمہیں جنم دیا تھا باقی سب کچھ تو اس باپ نے کیا ہے۔اپنے ہاتھوں سے غلاظت صاف کی ہے، لوریاں سنائی ہیں۔ارے! میں نے کیا کچھ نہیں کیا..... یقین نہیں آتا تو جاکر انکل جمال سے پوچھ لو؟..... میں نے صرف باپ کا نہیں ماں کا فرض بھی نبھایا ہے۔“

”میں نے کب انکار کیا ہے آپ کی مہربانیوں اور محبت سے؟“ تم نے قدرے شرمسار انداز میں بولا۔”شادی کرنے کے بعد میں ان لوگوں کو منالوں گا، بس دو تین ماہ کے لیے آپ کو اکیلے رہنا پڑے گا، اس کے بعد میں آپ کو یہاں سے.......“

”لوگ بیٹیوں کو بیاہ کر رخصت کرتے ہیں۔“ اس

نے قطع کلامی کی۔ ''اور تم مجھے بیٹے کو رخصت کرنے کا مشورہ دے رہے ہو...... تمہیں باپ کی عزت و وقار کا کچھ بھی احساس نہیں ہے۔ لوگ کیا کہیں گے؟''

''لوگ صرف باتیں کرتے ہیں ابو! میں اور آپ تو کیا وہ تو معاذ اللہ نبیوں کو بھی معاف نہیں کرتے۔''

''تم جب فیصلہ کر چکے ہو تو پھر مجھ سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے؟''

''ضرورت ہے ورنہ آپ سے اجازت کیوں مانگتا؟...... چپ چاپ شادی کر لیتا۔''

''او کے..... اگر یہ بات ہے تو پھر میں اجازت نہیں دے سکتا۔'' شہزاد نے حتمی انداز میں جواب دیا۔

''پلیز ابو پلیز.....'' وہ گڑگڑایا۔ ''یہ میری زندگی کا سوال ہے۔''

''میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے۔ اگر تمہیں منظور نہیں ہے تو پھر جاؤ...... جو دل چاہے وہی کرو۔''

دوسرے دن تم آفس گئے تو پھر لوٹ کر نہیں آئے۔ باپ کی محبت پر تم نے اپنے شان دار مستقبل کو ترجیح دی تھی۔ تمہارے گھر چھوڑ کر جانے کے تقریباً دو ماہ بعد تمہارے دادا فوت ہو گئے اور شہزاد شہر والا فلیٹ بیچ کر گاؤں چلا گیا، جہاں تمہاری دادی اکیلی رہ گئی تھی مگر چھ ماہ کے بعد وہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ اب شہزاد دس کنال پر بنی ہوئی وسیع و عریض اور شان دار کوٹھی میں تنہا رہ گیا تھا۔

☆......☆

اس دن جب وہ صبح سویرے جاگا تو بے حد پریشان تھا۔ سنبل کو گزشتہ رات اس نے پہلی بار خواب میں دیکھا تھا۔ خواب میں سنبل اسے بار بار علی کا خیال رکھنے کی تاکید کر رہی تھی۔ وہ علی کے متعلق بے حد متفکر تھی۔

''تو کیا علی واقعی کسی مصیبت میں گرفتار ہے؟''

یہ وہ سوال تھا جو جاگتے ہی اس کے ذہن میں گونجا تھا، مگر اس سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ علی کو گھر سے نکلے پانچ برس بیت چکے تھے اور ان پانچ برسوں کے اندر اس نے ایک بار بھی باپ سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ علی اس قدر کٹھور اور سنگدل نکلے گا یہ شہزاد نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا حالانکہ اس نے شہزاد کے لیے اپنا سب کچھ تج دیا تھا۔ وہ چاہتا تو سنبل کے مرنے کے بعد شادی کر سکتا تھا۔ اس کے لیے رشتوں کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن اپنی محبوب بیوی سے کیا ہوا عہد اسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ اس عہد کو نبھاتے نبھاتے

جامِ جہاں نما

برّاعظم پاک و ہند میں اردو کا پہلا اخبار جو 27 مارچ 1922ء کو کلکتے سے ہری ہروت نے جاری کیا لیکن چند ہفتوں کے بعد ناشرین نے محسوس کیا کہ اردو اخبار کی مانگ بہت کم ہے اس لیے انہوں نے اسے فارسی زبان میں شائع کرنا شروع کیا۔ ایک سال بعد اس کا اردو ضمیمہ شائع ہونے لگا۔ یہ اخبار ہفت روزہ تھا اور چندہ دو روپے ماہانہ تھا۔ زیادہ تر خبریں مقامی انگریزی اخباروں سے ترجمہ کر کے دی جاتی تھیں۔ دیسی ریاستوں کے حالات خبر ناموں سے اخذ کیے جاتے تھے۔ یورپی قارئین اس اخبار کو اردو زبان میں مہارت حاصل کرنے کے لیے پڑھتے تھے۔ انہی دنوں دخانی جہازوں کی ایجاد کے باعث یورپی اخبارات نو مہینے کی بجائے تین مہینے میں ہندوستان آنے لگے جس سے ہندوستانی اخبارات میں مقابلتاً تازہ خبریں چھپنے لگیں۔ اخبار کی زبان سادہ اور انداز بیان سلجھا ہوا تھا۔ پہلے ایڈیٹر کا نام منشی سدا سکھ تھا اور چھاپنے کی ذمہ داری ولیم پیٹرسن کاپ کنس اینڈ کمپنی کے سپرد تھی۔ 23 جنوری 1828ء کو اخبار کا اردو ایڈیشن بند کر دیا گیا۔

مرسلہ: انور عباس حیدری۔ جام پور

آج وہ رہگزر زیست پر تنہا رہ گیا تھا۔ جمال کے علاوہ کوئی بھی اس کا ہمدرد اور ساتھی نہیں رہا تھا۔

ناشتا کرتے ہوئے اس کا ذہن انہی خیالات میں الجھا رہا۔ آخر کار وہ علی کو ڈھونڈنے کا تہیہ کر کے قدرے مطمئن ہو گیا۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے چند گھریلو کام نمٹائے اور پھر سیل فون نکال کر جمال کو کال کرنے لگا مگر جمال کا سیل فون آف تھا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد اس نے دوبارہ ٹرائی کیا لیکن سیل فون بہ دستور آف تھا۔ وہ جھنجلا گیا۔ تقریباً نصف گھنٹے کے بعد اس نے تیسری بار جمال کا نمبر ٹرائی کیا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ وہ جھنجلائے

ہوئے انداز میں باہر نکلا اور سیدھا پورچ کا رخ کیا جہاں اس کی چمچماتی ہوئی بی ایم ڈبلیو موجود تھی۔ یہ گاڑی اس نے دو ماہ قبل ہی باہر سے منگوائی تھی۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور پورچ سے باہر آگیا۔ اب اس کا رخ کوٹھی کے مین گیٹ کی طرف تھا۔ گیٹ کے نزدیک پہنچ کر اس نے گاڑی روک دی۔ وہ نیچے اترا اور تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھا۔ ایسے ہی وقت ڈور بیل بج اٹھی۔ اس نے گیٹ کھولا تو سامنے جمال موجود تھا۔

"تم اور یہاں؟" اس نے تحیر کے عالم میں پوچھا۔

"کیوں....؟" جمال مسکرایا۔ "کیا میرے یہاں آنے پر پابندی ہے؟"

"گدھے! میں تین بار تجھے کال کرنے کی کوشش کر چکا ہوں۔ تیرا سیل فون کہاں ہے؟"

"وہ تو اب تک چور بازار میں پہنچ چکا ہوگا..... بلکہ ہوسکتا ہے اب تک بک بھی چکا ہو۔"

"اوہ آئی سی۔" اس نے افسوس کا اظہار کیا۔ "میں بلاوجہ تجھے گالیاں دیتا رہا۔"

"تیری گالیوں کا میں نے کب برا منایا ہے یار؟" جمال اس سے گلے ملتے ہوئے بولا۔ "مجھے پتا ہے تیری گالیوں میں بھی پیار ہوتا ہے۔"

"چل چھوڑ زیادہ مسکہ مت لگا۔" اس نے الگ ہوتے ہوئے جواب دیا اور پھر عین اسی لمحے اس کی نظر جمال کی گاڑی میں موجود اشخاص پر پڑی تو جیسے وہ پل بھر کے لیے پتھر کا بن کر رہ گیا۔ گاڑی میں اس کا اور سنبل کا عسلی کسی اجنبی نوجوان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ عسلی کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ باپ بیٹے کی نگاہیں ملیں تو وقت جیسے ٹھہر سا گیا دونوں پلکیں جھپکائے بغیر ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی نگاہوں میں جیسے صدیوں کی پیاس تھی۔ وہ پورے پانچ برس کے بعد ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔

"عسلی......" شہزاد کے ہونٹ لرزے اور پھر اس کی آواز بھرا گئی کوشش کے باوجود وہ کچھ نہ بول پایا تاہم اس کی آنکھیں ضرور برسنے لگی تھیں۔

عسلی کی کیفیت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ برسوں بعد اپنے باپ کو سامنے دیکھ کر اس کی آنکھیں جل تھل ہوگئیں مگر اس نے گاڑی سے باہر پاؤں رکھنے کی ہمت نہ کی۔ اسے ڈر تھا کہ باپ اسے دھتکار دے گا۔

"جاؤ عسلی۔" سلیم نے اسے ٹہوکا لگایا۔ "انکل کے قدموں میں گر جاؤ۔"

"کس منہ سے جاؤں سلیم۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ "کیسے ابو کا سامنا کروں...... مم..... میں نے ان کے ساتھ بہت برا کیا ہے...... کاش..... میں نے ایسا نہ کیا ہوتا..... کاش اس وقت......"

"تم وقت ضائع کر رہے ہو۔" سلیم نے اسے ٹوک دیا۔ "جاؤ انکل تمہیں گلے لگانے کے لیے بے چین نظر آ رہے ہیں۔"

ایسے ہی وقت شہزاد گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ عسلی نے تیزی سے گاڑی کی کھڑکی کھولی، نیچے اترا اور بھاگتا ہوا باپ کے قدموں میں گر گیا۔

"مم..... مجھے..... معاف کر دیں ابو..... معاف کر دیں..... میں بہت گناہ گار ہوں۔" اس نے روتی ہوئی آواز میں التجا کی۔ "اگر آپ نے مجھے معاف نہ کیا..... تو اللہ بھی مجھے معاف نہیں کرے گا۔"

شہزاد جھکا اور اسے بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کرتے ہوئے بولا۔ "باپ کے گلے نہیں لگو گے؟"

وہ "ابو" کہتے ہوئے باپ سے لپٹ گیا۔ دونوں کچھ کہنے کی بجائے بس روئے جا رہے تھے شاید لفظوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ کافی دیر تک دونوں ایک دوسرے سے لپٹے رہے۔ باپ بیٹے کا یہ ملن دیکھ کر جمال اور سلیم کی آنکھوں میں بھی پانی اتر آیا تھا۔ جب جذبات کا طوفان تھم گیا تو دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوگئے۔ تب جمال کھنکار کر بولا۔ "یہ ٹریجڈی سین ختم کر دو یار! میں بھوک سے مرا جا رہا ہوں کچھ کھانے پینے کا انتظام کرو، تم دونوں تو بس روئے جا رہے ہو۔"

شہزاد اپنی بھیگی پلکیں صاف کرتے ہوئے بولا۔ "بس ہمیشہ کھانے کے پیچھے ہی پڑے رہنا، ابھی تو بارہ بھی نہیں بجے اور تمہارے پیٹ میں مروڑ اٹھنا شروع ہوگئے۔"

دونوں بوڑھے ہوگئے تھے مگر ان کی نوک جھونک اسی طرح چلتی رہتی تھی۔ اب بھی وہ ٹین ایجرز کی طرح ایک دوسرے کو مخاطب کیا کرتے تھے۔

☆......☆

"تمہاری بیوی تو ٹھیک ٹھاک ہے ناں؟" کھانے سے فراغت کے بعد شہزاد نے عسلی سے پوچھا۔

"وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے ابو۔" وہ نادم انداز میں

بولا۔ ”اور...... اور...... آپ کے پوتے کو بھی ساتھ لے گئی ہے۔“

”کیوں...... کس لیے؟“ شہزاد نے سوال کیا۔

علی کا سر جھک گیا تاہم اس نے ساری رام کتھا وضاحت کے ساتھ بیان کر دی۔

”میں ملک احتشام کو چھوڑوں گا نہیں۔“ شہزاد کے جاگیردارانہ لہو نے جوش مارا۔ ”اس کی اوقات ہی کیا ہے...... میں اس کا وہ حشر کروں گا کہ وہ مرتے دم تک یاد رکھے گا، جس کمپنی سے اس نے تمہیں نکالا ہے میں وہ کمپنی ہی خرید لوں گا...... بلکہ اس کا سب کچھ خرید کر اسے کوڑی کوڑی کا محتاج بنا دوں گا۔“

”نہیں ابو!“ عدنان نے انکار میں سر ہلایا۔ ”آپ ایسا کچھ بھی نہیں کریں گے۔ وہ جو کچھ بھی ہیں میرے سسر ہیں اور سسر باپ کی جگہ ہوتا ہے۔ میں نے برسوں پہلے ایک باپ کا دل توڑا تھا جس کی سزا اب تک بھگت رہا ہوں...... اب مجھ میں ایک اور باپ کا دل توڑنے کی ہمت نہیں ہے۔ میں نے اپنا فیصلہ اس منصف اعلیٰ پر چھوڑ دیا ہے جس کی عدالت میں رشوت، سفارش اور مرتبہ نہیں چلتا، وہاں صرف انصاف ہوتا ہے اور میرا ایمان ہے کہ میرے ساتھ بھی انصاف ہوگا۔“

”یہ...... یہ تم کہہ رہے ہو؟“ اسے اپنی سماعتوں پر یقین نہ آیا تو حیرت سے بیٹے کی شکل دیکھنے لگا۔

”ہاں ابو...... اور مجھے آپ سے بھی یہی امید ہے۔“ علی نے جواب دیا۔

جمال اور سلیم نے بھی علی کے اس فیصلے کی نہ صرف تائید کی بلکہ اسے سراہا بھی۔

”ٹھیک ہے بھئی۔“ شہزاد نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”اگر تم سب کی یہی مرضی ہے تو پھر یوں ہی سہی...... لیکن میری ایک شرط ہے؟“

”شرط...... کیسی شرط ابو؟“ علی کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

”میں تمہاری دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں..... کیا پتا تمہاری بیوی واپس آئے ہی نہ اور میں......“

”بوڑھے ہو گئے ہو مگر عقل داڑھ ابھی تک نہیں نکلی۔“ جمال نے قطع کلامی کرتے ہوئے مداخلت کی۔ ”بچہ پُر امید ہے اور ابا نا امید...... یہ بعد کی باتیں ہیں، جب علی کی شادی کرنا ہوگی تو رشتہ میں اور علی کی آنٹی تلاش کریں گے...... تم اپنی جاگیر سنبھالو، سمجھے تم۔“

”یہ تم میرے معاملات میں ٹانگ اڑانا کب چھوڑو گے؟“

”جب تک زندہ ہوں تب تک...... ہاں مر گیا تو پھر تمہیں نہیں ٹوک سکوں گا۔“

”جب بھی نکالنا منہ سے بری بات ہی نکالنا۔“

”میں اپنے مرنے کی بات کر رہا ہوں یار......“

”بکواس نہ کر۔“ اس نے بھڑک کر قطع کلامی کی۔ ”اب اگر تم نے مرنے کی بات کی تو خدا کی قسم میں تجھے آئی سے پہلے مار ڈالوں گا۔“

ان دونوں کی اس نوک جھونک نے علی اور سلیم کو قہقہے لگانے پر مجبور کر دیا۔

عصر کے وقت انہوں نے سلیم کو رخصت کر دیا کیونکہ آفس سے اس کی بہت زیادہ چھٹیاں ہو چکی تھیں تاہم جمال کو کسی نے جانے کی اجازت نہ دی۔ ویسے وہ خود بھی دو تین دن ان کے ہاں رہنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

عدنان شہزاد علی ایک بار پھر وہی خواب دیکھ رہا تھا لیکن اب کی بار وہ خواب میں اکیلا نہیں تھا۔ میمونہ اور فیضان بھی اس کے ہمراہ تھے۔ وہی چشمے کا کنارا، وہی وادی، وہی پرندے، تتلیاں، پھول اور پھل تھے۔ چاروں طرف قدرت کے حسین مناظر پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے ایک ہاتھ میں میمونہ کا ہاتھ جب کہ دوسرے ہاتھ میں فیضان کا ہاتھ تھا۔ وہ تینوں خوشی خوشی اس حسین و جمیل وادی کی سیر کر رہے تھے کہ معاً پھولوں کی اوٹ سے وہی حسین و جمیل اور پری پیکر عورت نمودار ہوئی اور چشمے کے پانی میں سے گزرتی ہوئی عین ان کے مقابل پہنچ کر رک گئی۔ اس کے چہرے پر ایک ملکوتی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی اور وہ علی کو نہایت ہی پیار بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

”ماں۔“ بالکل غیر ارادی طور پر علی کے منہ سے نکلا اور پھر وہ دونوں بغل گیر ہو چکے تھے۔ علی کے بعد وہ میمونہ سے گلے ملی اور پھر اس نے فیضان کو گود میں اٹھا لیا اور اس کے چہرے پر والہانہ انداز میں بوسے دینے لگی۔

اس کے بعد ماں نے اس سے اور میمونہ سے ڈھیروں باتیں کیں۔ اس روز وہ بے حد خوش تھی۔ اس نے انہیں وادی کی خوب سیر کرائی اور پھر انہیں خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گئی۔ ادھر ماں رخصت ہوئی اور ادھر علی کی آنکھ کھل

گئی۔ عین اسی وقت قریبی مسجد میں صبح کی اذان ہونے لگی۔ علی اٹھا، لائٹ جلائی اور اٹیچڈ باتھ روم میں گھس گیا۔ جب وہ وضو کرنے کے بعد کمرے سے باہر نکلا تو اس نے باپ کو منتظر پایا۔ غالباً وہ اسے جگانے کے لیے آیا تھا۔

''گڈ۔'' اسے نماز کے لیے تیار دیکھ کر شہزاد نے خوشی کا اظہار کیا۔ ''آؤ چلیں۔''

یہ ان کی روزانہ کی روٹین تھی۔ وہ صبح کی نماز قریبی مسجد میں ادا کیا کرتے تھے۔ باجماعت نماز پڑھنے کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ علی کی طبیعت ہشاش بشاش ہو جاتی تھی۔ باجماعت نماز ادا کرنے کے بعد جب وہ واپس پہنچے تو صبح کا اجالا پھیل چکا تھا اور خانساماں نے ان کے لیے ناشتا لگا دیا تھا۔ چنانچہ دونوں آمنے سامنے بیٹھ کر ناشتا کرنے لگے۔

''ابو! آج میں نے پھر امی کو خواب میں دیکھا ہے۔ اب وہ مجھ سے ناراض نہیں ہیں۔'' اس نے ناشتا کرتے ہوئے بتایا۔

شہزاد مسکرایا۔ ''تو پھر کیا باتیں ہوئی ہیں بھئی؟''

باپ کے استفسار پر اس نے خواب کے واقعات بیان کرنا شروع کر دیے۔

''بیوی اور بیٹا ساتھ تھے مگر باپ کو بھول گئے؟'' وہ خواب سنا کر خاموش ہوا تو شہزاد نے مصنوعی ناراضی کا اظہار کیا۔

وہ بولا۔ ''ابو جی! خواب تو خواب ہوتے ہیں۔ میمونہ اور فیضان اب کہاں ہیں میرے ساتھ؟''

''ہاں بھئی یہ بات تو ہے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اب مجھے ہی دیکھ لو شاید میں دنیا کا بدقسمت ترین دادا ہوں جس نے ابھی تک اپنے پوتے کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ تم کم از کم اس کی کوئی تصویر ہی لے آتے۔''

''تصویر تو ہے ابو جی۔''

''کدھر ہے؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''میرے سیل فون میں..... میں ابھی لاتا ہوں۔'' وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

چند لمحوں کے بعد وہ سیل فون لے آیا اور پھر باپ کو فیضان کی تصویریں دکھانے لگا۔ شہزاد پوتے کی ایک ایک تصویر کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ تبصرہ بھی کیے جا رہا تھا کہ اچانک ہی اس کی آواز بھرا گئی اور پھر نہ چاہتے بھی اس کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔

''ابو جی! آپ رو رہے ہیں؟'' علی نے کرب کے عالم میں پوچھا۔

''بہت..... بہت پیارا ہے یار تیرا بیٹا۔'' اس نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کی آنکھیں بالکل دادی پر گئی ہیں..... کاش یہ ہمارے پاس ہوتا۔''

ایسے ہی وقت سیل فون بج اٹھا۔ ''لو تمہاری کال ہے۔'' شہزاد نے فون اس کی طرف بڑھا دیا۔

علی نے فون لے کر جھلملاتی ہوئی اسکرین پر نظر ڈالی تو بے اختیار اس کا دل دھڑک اٹھا۔ اسکرین پر میمونہ کا نام جھلملا رہا تھا۔ اس نے کال ریسیونگ بٹن پریس کرتے ہوئے سیل فون کان سے لگا دیا۔

''علی! پلیز مجھے یہاں سے لے جاؤ..... ابھی فوراً۔'' اسے میمونہ کی پریشان کن آواز سنائی دی۔

''ہوا کیا ہے..... فیضان تو ٹھیک ہے ناں؟'' اس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ سوال کیا۔

''ہاں، وہ بالکل ٹھیک ہے اور رات دن تمہیں پکارتا رہتا ہے۔''

''کیا تم اپنے گھر میں ہو؟''

''ہاں..... جلدی سے آجاؤ۔''

''لل..... لیکن انکل..... وہ کیا تمہیں اجازت دیں گے؟''

''انہی کے کہنے پر تو میں تمہیں فون کر رہی ہوں، انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے۔'' میمونہ نے جواب دیا۔

''اوکے، میں اور ابو ابھی آرہے ہیں۔'' اتنا کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

''ابو جی!'' وہ سیل فون جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ کی بہو اور پوتا آپ کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ ہم ابھی انہیں لینے جا رہے ہیں۔''

''کیا..... کیا سچ کہہ رہے ہو؟'' شہزاد نے حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں پوچھا۔

''بالکل سچ کہہ رہا ہوں ابو! منصف اعلیٰ نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے۔ کیس ہمارے حق میں ڈگری ہوگیا ہے۔''

''ہاں بیٹے! جو اسے وکیل کرتا ہے وہ کبھی نہیں ہارتا۔'' شہزاد نے جواب دیا اور پھر اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلکنے لگے۔